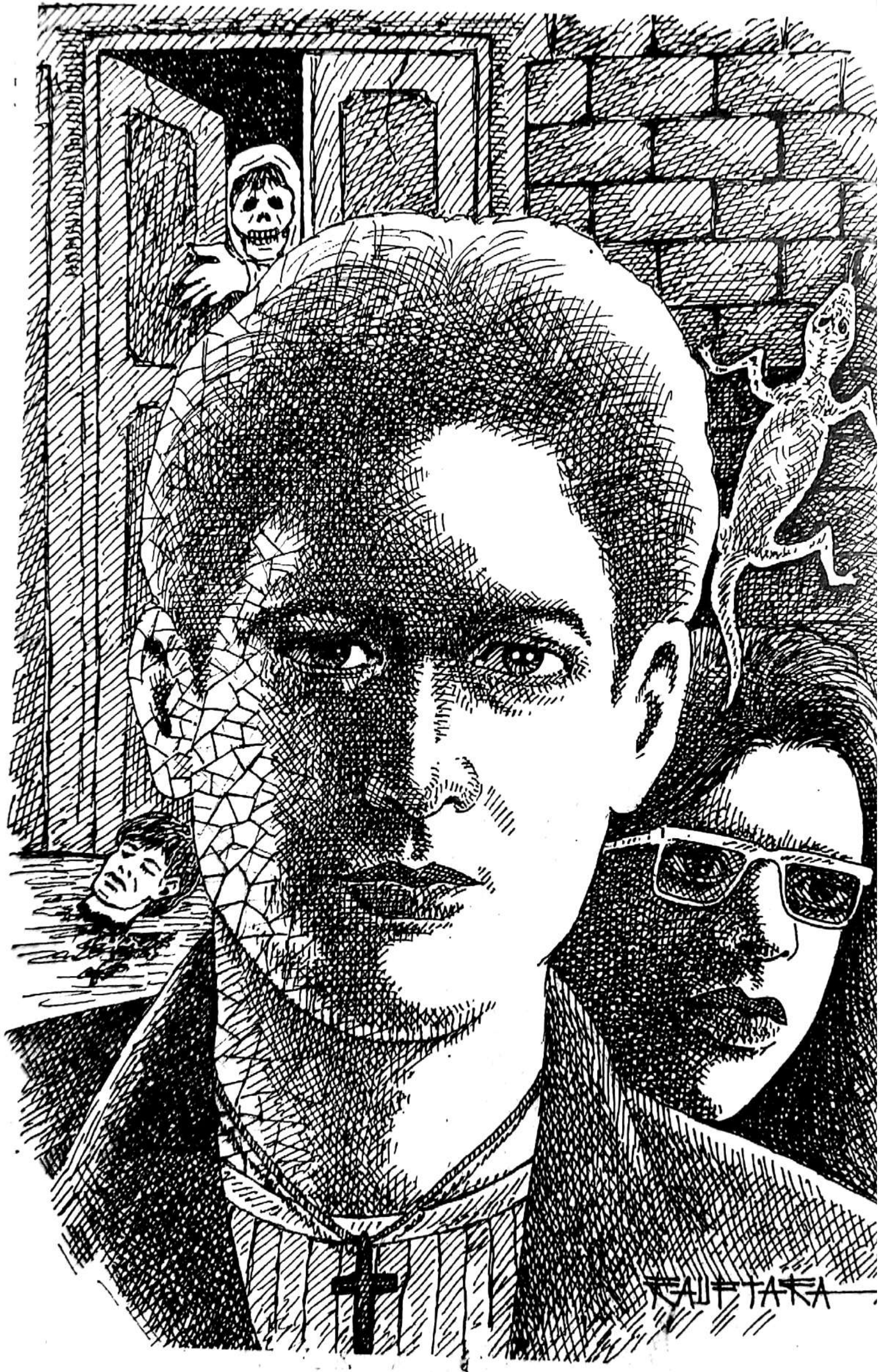
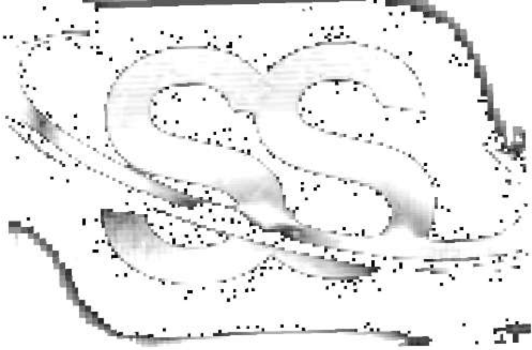
ایس امتیاز احمد کلیکشن

(ڈر ڈائجسٹ سے انتخاب)




ایس امتیاز احمد کلیکشن
(ڈر ڈائجسٹ سے انتخاب)
(1)
Adobe Stock





کفن پوش

ایس امتیاز احمد - کراچی

ھر قدم پر چونکا دینے والی بات کرنا اپنے زور قلم سے رات کو دن اور دن کو رات کرنا اس کا مشغلہ ھے۔ وہ لکھتا ھے اور خوب لکھتا ھے۔ آپ نے سلا سر کی بے شمار مختصر کھانیاں پڑھی ھوں گی۔ آج ان کا ایک یادگار ناول "کفن پوش" آپ کی نذر ھے۔ اس ناول میں کھیں آپ اشکبار ھوں گے اور کھیں حیرت زدہ یھی ھنری کے دماغ کا کمال ھے اور یھی سلا سر کی تحریر کا کرشمہ۔

ہنری سلاسر۔ آپ لوگوں کا جانا پہچانا مصنف۔ انگریزی کا ہنگامہ پرور ادیب

دوائیوں اور فرنیچر کے وارنش سے موت کی بو محسوس ہو رہی تھی۔ گرزسن ہاؤس کے جس حصے میں مسز بلینگر کا قیام تھا وہاں لکھنے کی میزوں، الماریوں اور زینے کے جنگلوں پر وارنش کیا گیا تھا۔ وارنش میں جو سنہرا پاؤڈر ملا ہوا تھا اس کی بو پوری عمارت میں پھیل گئی تھی۔ یہ اسی کی ذہنی پیداوار تھی اس کا خیال تھا کہ بالائی منزل کی خواب گاہ میں جو لاش ہے نوکروں کی توجہ اس طرف سے ہٹانے کے لئے انہیں مصروف رکھنا ضروری ہے۔

گیل گرزسن کو یہ بات 12 مارچ 1955ء کو معلوم نہیں تھی کہ وارنشڈ کی اس بو کی وجہ سے وہ عمر بھر کے لئے ایک نا قابل توجیہہ اداسی اور کرب میں مبتلا ہو جائے گی۔ وہ اس وقت صرف چھ سال کی تھی۔ دوسری منزل کی سیڑھیاں اترتے وقت اس کا ننھا منا ہاتھ زینے کے جنگلے کی پاش پر پھسل رہا تھا وہ پنجوں کے بل چل رہی تھی۔ بر کے جوتوں اور دبیز قالین کی وجہ سے ہلکی سی چاپ بھی پیدا نہیں ہو رہی تھی۔

وہ زینے کے بالائی حصے میں رک گئی۔ لیکن درو ازے کی چٹخنی کھلی ہوئی تھی۔ وہ سمجھ گئی کہ کوئی اس کی ماں کے کمرے سے باہر نکل رہا ہے۔ اس کے ذہن پر خوف نے جو ردعمل کیا وہ اس کے تحت دوڑ پڑی۔ ہال کی طرف جانے والے راستے کے آخری حصے میں ایک ٹاور نما کلاک تھا جسے گھر کے تمام افراد دادا جان کا کلاک کہتے تھے لیکن گیل اپنے بچپن کے سبب اسے ایک شاندار قلعہ سمجھتی تھی۔ یہ چھپنے کے لئے ایک مناسب مقام تھا۔ گیل اسی کلاک کے پیچھے دبک گئی۔ اچانک اس کی سماعت سے اپنے چچا کی گونج دار آواز ٹکرائی۔ جس کی وجہ سے گھڑیال کی نازک اسپرنگ تھرتھرانے لگے تھے۔ انہوں نے کیا کہا تھا کہ کسی وقت تک یہاں پہنچ جائیں گے؟

''ایک گھنٹے میں جناب۔'' مسز بلینگر نے جواب دیا۔

''میری خواہش ہے کہ وہ جلدی آ جائیں۔ میں نو بجے کی فلائٹ پر پہنچنا چاہتا ہوں۔ کیا تم نے بچی کو کہیں دیکھا ہے؟''

''نہیں جناب۔''

''میرا بیٹا کہاں ہے؟''

''وہ نیچے ہے مسٹر سوان۔''

گیل کا چچا زینے کے جنگلے سے جھکا اور اس نے بم کے دھماکے جیسی آواز میں اپنے بیٹے کو پکارا۔ پاٹرز گیل نے گراؤنڈ فلور سے فوراً ہی لڑکے کی آواز سنی۔ اس کے بعد اسے اپنے چچا کی گرج دار آواز ایک بار پھر سنائی دی'' کیا

تم نے اپنی کزن کو کہیں دیکھا ہے؟''

''نہیں ڈیڈ۔''

''اس سے کہو کہ خواب میں آجائے۔''

''لیکن ڈیڈ! مجھے معلوم نہیں کہ وہ کہاں ہے؟''

''اسے تلاش کرو اور بتاؤ کہ تابوت برداروں کی آمد سے پہلے اپنی ماں کو دیکھنے کا یہ آخری موقع ہے۔''

اگر چہ اس جملے کا کوئی مطلب نہیں تھا لیکن در حقیقت یہ ایک گہری بات تھی جو گیل جیسی چھ سالہ بچی کہ سمجھ میں نہیں آسکتی تھی۔ وہ گھڑیال کی حفاظتی دیوار کے قریب رکھی ہوئی ایک پیٹی میں دبک کر بیٹھ گئی اس لمحے پائزر کی آواز سنائی دی۔ وہ اسے پکار رہا تھا۔ وہ طویل ہال کمرے کے دروازے کھول کھول کر مختلف کمروں میں جھانک کر اسے تلاش کر رہا تھا۔ وہ چودہ سال کا لڑکا تھا اسے گیل کی ماں کے مرنے سے کوئی دلچسپی نہیں تھی اور نہ اس سوگوار ماحول کا کچھ خیال تھا۔ ''گیل۔ تم کہاں ہو؟''

اس نے اپنی کتاب کے اس فارمولے کو یاد کرنے کی کوشش کی جس کے ذریعے ایک پری کسی دیو کی نظروں سے غائب ہوگئی تھی اسے فارمولا یاد کرنے میں ناکامی ہوئی۔ البتہ پائزر اسے تلاش کرنے میں کامیاب ہوگیا۔ ''تم یہاں کیا کر رہی ہو؟'' وہ جواب دینے کے بجائے کانپ گئی۔

''تمہیں کیا تکلیف ہے گیل۔ کیا تم بیمار ہو؟'' پائزر نے کہا اور ہاتھ بڑھائے وہ پیٹی میں سمٹ گئی۔ اس کی آنکھوں سے گہرا خوف جھلک رہا تھا۔ ''آؤ باہر نکلو کیا تم اپنی ماں کو نہیں دیکھنا چاہتیں؟''

''نہیں۔'' گیل نے بڑی مشکل سے کہا۔

''تمہارے لئے یہ آخری موقع ہے۔ اس کے بعد گورکن اسے لے جائیں گے۔'' پائزر کے اس جملے نے اس کے دل کے نازک تاروں کو چھولیا اور اس کی ننھی آنکھوں میں آنسو آگئے۔ اس نے ان آنسوؤں کو پینے کی کوشش کی لیکن کامیابت نہ ہوسکی۔ آنسو اس کے رخساروں پر ڈھلک آئے تھے۔ پائزر نے اس کی کلائی تھام لی۔ ''احمق لڑکی تمہیں اپنی ماں کو دیکھنا چاہیے اس کے بعد تم اسے کبھی نہیں دیکھ سکو گی۔''

''نہیں، میں اسے دیکھنا چاہتی۔'' اس نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔ پائزر اسے کھینچنے لگا۔ لیکن وہ خود کو چھڑانے کی کوشش کرنے لگی دونوں میں عجیب اور معصومانہ سی جھپٹ ہو رہی تھی۔ ''مجھے چھوڑ پائزر میں اس کمرے میں نہیں جاؤں گی۔''

گراؤنڈ فلور سے اطلاعی گھنٹی بجنے کی آواز سنائی دے رہی تھی۔ پائزر نے اس کا ہاتھ چھوڑ دیا اور زینے کے جنگلے سے لگ کر کھڑا ہوگیا گیل نے اسے ایک طویل سانس لیتے ہوئے سنا اس کے ہونٹ بے آواز سیٹی بجانے کے انداز میں سکڑے ہوئے تھے وہ لکڑی کی پیٹی سے نکلی اور اس کے قریب جا کھڑی ہوئی۔ اس نے جھک کر نیچے دیکھا۔ دروازے میں تین آدمی تھے۔ ان میں سے دو نے ایک جیسے جیکٹ پہن رکھے تھے۔ تیسرے آدمی کے جسم پر سیاہ ماتمی لباس تھا۔ وہ ایک دبلا پتلا اور طویل القامت آدمی تھا۔ اس نے اپنا سیاہ فلیٹ ہیٹ سر سے اتارا اور بالوں پر ہاتھ پھیرنے لگا۔

''گورکن۔'' پائزر نے سرگوشی کی۔

وہ دروازے سے اندر داخل ہوئے اور سیڑھی کی طرف بڑھے۔ گیل نے ان میں سے ایک کے ہاتھ میں کینوس اور شمع ہدایت دیکھی لیکن وہ ان چیزوں کی اہمیت سے ناواقف تھی۔ وہ ان کے قریب سے گزر کر اوپر گئے اور پھر گیل نے انہیں اپنی ماں کے کمرے میں داخل ہوتے دیکھا۔ پائزر نے اس کی آنکھوں میں جھانک کر سرگوشی کی۔ یہ تمہاری ماں کو لینے آئے ہیں۔ تم اب بھی اسے نہیں دیکھ سکو گی۔ تمہیں بہت دیر ہوگئی ہے یہ لوگ اسے بہت دور لے جائیں گے۔ جانتی ہو یہ تینوں تمہاری ماں کو ایک لکڑی کے صندوق میں بند کر دیں گے۔

گیل خاموشی سے اپنے کزن کی طرف دیکھتی رہی اس کے سپاٹ لہجے سے اس کا جسم کانپ رہا تھا۔

''یہ حقیقت ہے۔'' پائزر کی آواز قدرے بلند ہو گئی۔ ''گورکنوں کا یہی کام ہے یہ لاش کو تابوت میں رکھ کر اسے زمین میں دفن کر دیتے ہیں۔''

وہ باہر آتے دکھائی دیے۔ انہوں نے گیل کی ماں کی لاش اٹھا رکھی تھی۔ سفید کفن میں لپٹی ہوئی لاش ان کے ہاتھوں پر تھی۔ گیل نے محسوس کیا کہ پاٹزر نے جو کچھ بھی کہا تھا بالکل درست کہا تھا۔ اس کی ماں کو دفن کرنے کے لئے اس سے دور لے جایا جا رہا تھا۔ یہی وہ لمحہ تھا کہ گیل خوف کی وجہ سے اپنی چیخوں پر قابو نہ پاسکی اور خاموش ماحول اس کی دلدوز چیخوں سے گونجنے لگا۔

☆......☆......☆

مسز بیلنگر نے اسے جو دودھ دیا تھا وہ آنسوؤں کی آمیزش سے نمکین ہو گیا تھا۔ اس سے پہلے گیل کبھی کوئی کھانا یا دودھ اس کے اپنے بستر پر نہیں دیا جاتا تھا لیکن یہ ایک ایسی رات تھی جب اس کی دل جوئی کے لئے ہر بات خلاف معمول کی جارہی تھی۔ اس نے مسز بیلنگر کی طرف دیکھا اور بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔ ”کیا سب لوگ جا چکے ہیں؟“

”ہاں۔ سب لوگ جا چکے ہیں بیٹی۔ تمہارا انکل سوان اور کزن پاٹزر اس وقت اپنے گھر کے راستے میں ہوں گے۔ انہیں افسوس ہے کہ وہ کل تدفین کے موقع پر یہاں موجود نہیں ہوں گے کیونکہ تمہارے چچا کو لندن میں ایک انتہائی اہم کاروباری معاملے کے لئے جانا ہے۔ تمہیں لندن کے بارے میں یاد ہے نا؟ میں نے تمہیں وہاں کی بہت سی تصویریں دکھائی تھیں۔ بہر حال اب تم سو جاؤ میں نیچے جا رہی ہوں، کام ختم کر کے اوپر آ جاؤں گی اور رات بھر تمہارے ساتھ رہوں گی۔ ٹھیک ہے نا؟“ ملازمہ نے چابی سے گھومنے والا بندر میز پر رکھ دیا اور گیل کی پیشانی چوم کر نیچے چلی گئی۔

خواب دیکھنے سے پہلے ہی وہ بیدار ہو گئی۔ سب سے پہلے اس کی نگاہ بندر پر پڑی۔ وہ خاموش کھڑا تھا پھر اسے موت کے کے بارے میں یاد آ گیا۔ اپنی ماں کی لپٹی ہوئی لاش اس کی آنکھوں میں گھوم گئی۔ اچانک دروازے پر دستک ہوئی گیل نے نگاہ اٹھا کر دیکھا۔ دروازہ آہستہ آہستہ کھل رہا تھا۔

☆......☆......☆

ایک آدمی اس کا تعاقب کر رہا تھا۔ اس کی بغل میں چمڑے کا ایک تھیلا تھا جس میں ماڈلنگ کا سامان تھا۔

وہ سوچ رہی تھی کہ آخر سب آدمیوں کے ہاتھ کیوں ہوتے ہیں۔ صرف ناک اور آنکھیں کیوں نہیں ہوتیں۔ وہ ناک بہت خوبصورت بناتی تھی۔ اس نے گلی پار کی تو تعاقب کرنے والے نے بھی ایسا ہی کیا۔ یہ دیکھنے کے لئے کہ کیا وہ شخص واقعی اس کا تعاقب کرنے والے نے بھی ایسا ہی کیا۔ یہ دیکھنے کے لئے کہ کیا وہ شخص واقعی اس کا تعاقب کر رہا ہے اس نے دوسری مرتبہ سڑک کو پار کیا۔ وہ بہت تھکی ہوئی تھی اس لئے اسے کچھ سنانا نہیں چاہتی تھی۔ کیا صرف صبح کا ہونا ہی کم خرابی کی بات تھی۔ ہر صبح اس کے لئے کسی سزا سے کم نہیں تھی اور رات بھر اسے کڑی آزمائش سے گزرنا پڑتا تھا۔ گزشتہ رات تمام راتوں سے بڑی تھی۔ وہ ایک دو گھنٹوں سے زیادہ نہیں سو سکی تھی۔ خوفناک خواب اس کے ذہن پر مسلط تھے۔

وہ تیز تیز چلتی رہی یہاں تک کہ آرٹ گیلری کے قریب پہنچ گئی اب وہ خود کو محفوظ سمجھ رہی تھی اس کے قدم خود بخود سست پڑنے لگے۔ بالآخر وہ رک گئی تاکہ پیچھا کرنے والا قریب آ کر رک جائے یا آگے بڑھ جائے وہ رک گیا اور شوکیس کی طرف متوجہ ہوا جیسے اسے آرٹ سے گہری دلچسپی ہو۔ اس نے گہری نگاہ سے تعاقب کرنے والے کو دیکھا۔ وہ ایک مصور کے شاہکار کے پاس کھڑا تھا۔ دیکھنے میں پرکشش تھا۔ دبلا پتلا آدمی جس کے کندھے زیادہ کشادہ نہیں تھے۔ اس کے ہاتھ خوبصورت تھے لیکن ایسے نہیں جنہیں وہ آسانی سے بنا سکے۔ مصوری میں ہاتھوں کو بناتے وقت اسے شروع ہی سے دشواری ہوتی تھی اسے یقین تھا کہ اس آدمی کی ناک بنانا کچھ مشکل نہیں ہے۔

وہ اچانک دروازے سے اندر داخل ہوئی آدمی کے چہرے پر ایسے تاثرات ابھرے جیسے اسے پہلی بار دیکھا ہو اور اس نے آرٹ لیگ تک اس کا تعاقب نہ کیا ہو۔ وہ ایک فاقہ زدہ آرٹسٹ نظر آتا تھا جیسے ہی یہ خیال اس کے ذہن میں آیا اس کا منہ بن گیا۔ گیل تو خود کو کم از کم

ایسا بھی نہیں سمجھتی تھی۔

☆......☆......☆

جب وہ کلاس میں داخل ہوئی تو مسٹر لیب لنگ موجود تھا وہ اپنے شاگردوں کے درمیان گھومتا ہوا بار بار ان کے کندھے پر جھک جاتا تھا۔ ایک نظر ان کے کام کی طرف ڈال کر وہ اس زندہ ماڈل کی طرف متوجہ ہو جاتا تھا جو کلاس کے سامنے فرش پر موجود تھا۔ وہ کبھی کسی کے کام کی تعریف نہیں کرتا تھا بلکہ اس کی زبان شکایت کرنے کی عادی تھی۔ گیل تین ماہ سے اس کلاس میں آ رہی تھی۔ کبھی کبھی وہ اپنی گھنی مونچھیں اس کے کندھے پر جھکا کر تصویر کو دیکھتا اور کہتا تھا۔ ''بہت خوب'' گیل اب تک یہ فیصلہ نہیں کر سکی تھی کہ وہ کس چیز کی تعریف کر رہا ہے اس کی بنائی ہوئی تصویر کی تعریف یا سینے کے اس ابھار کی جو کندھے سے یقیناً خوش نما نظر آتا ہوگا۔

گیل اپنی مخصوص نشست پر بیٹھ گئی۔ اس کے قریب ہیلن کا ایزل تھا اس نے اپنی سہیلی کی طرف دیکھا اور مسخروں جیسا منہ بنا کر بولی۔

''اس بار کیا بہانہ کر رہی ہو ڈارلنگ؟''

''ایک آدمی مسلسل میرا تعاقب کر رہا تھا۔''

''یہ کوئی نئی بات تو نہیں۔''

''میرا مطلب تھا کہ واقعی ایسا ہوا ہے۔ وہ میرے گھر سے آرٹ لیگ کی عمارت تک آیا ہے۔''

''کیا تم نے اس کی طرف دیکھا تھا؟''

''صرف ایک لمحے کے لئے۔'' گیل نے جواب دیا۔

''کوئی بوڑھا آدمی ہوگا۔''

''نہیں۔'' گیل نے کہا۔ ''وہ ایک نوجوان ہے۔ پرکشش اور خوبصورت۔''

''پھر تو تمہیں شکایت نہیں کرنی چاہیے۔ بہر حال کبھی اس آدمی کو بھی دیکھنا جو میرا پیچھا کرتا ہے۔''

کلاس کے بعد انہوں نے سینڈوچ لنچ خریدا اور پارک میں کل آئے ہیلن گہری نگاہ سے اسے دیکھ رہی تھی۔

''بہر حال۔ بتاؤ رات کیسی گزری؟''

گیل نے انکار میں گردن ہلائی۔ ''کوئی فرق نہیں پڑا۔ بالکل وہی حال رہا جو میں روزانہ صبح تمہیں سناتی ہوں ہیلن تمہیں معلوم ہے کہ میرا جواب وہی ہے۔ جو پہلے دن تھا۔ میں ان لوگوں کو میں سے ایک ہوں جنہیں رات بھر نیند نہیں آتی۔''

''تو پھر تم ایسی کیوں ہو؟ میرا مطلب ہے نیند جیسی اہم ضرورت کو پورا کئے بغیر تمہارا حسن اور صحت کیوں برقرار ہے۔ تم اتنی حسین کیوں نظر آتی ہو؟''

''شاید تمہیں ملعوم نہیں میری صحت کے متعلق باتیں لیور رسٹ کے سینڈوچز جیسی دلچسپ ہیں، بر سبیل تذکرہ، یہ تو بتاؤ کہ تم ان چیزوں کو حلق سے کیسے اتارتی ہو؟''

''مجھے آئرن کی شدید ضرورت ہے۔'' ہیلن نے منہ چلاتے ہوئے سرسری لہجے میں کہا۔ ''سنو ڈارلنگ اگر میں تم سے کوئی ذات بات کروں تو کہیں تم محسوس تو نہیں کروگی۔؟''

''میرا مطلب تھا کہ واقعی ایسا ہوا ہے۔ وہ میرے گھر سے آرٹ لیگ کی عمارت تک آیا ہے۔''

''کیا تم نے اس کی طرف دیکھا تھا؟''

''صرف ایک لمحے کے لئے۔'' گیل نے جواب دیا۔

''کوئی بوڑھا آدمی ہوگا۔''

''نہیں۔'' گیل نے کہا۔ ''وہ ایک نوجوان ہے۔ پرکشش اور خوبصورت۔''

''پھر تو تمہیں شکایت نہیں کرنی چاہیے۔ بہر حال کبھی اس آدمی کو بھی دیکھنا جو میرا پیچھا کرتا ہے۔''

کلاس کے بعد انہوں نے سینڈوچ لنچ خریدا اور پارک میں نکل آئیں ہیلن گہری نگاہ سے اسے دیکھ رہی تھی۔

''بہر حال۔ بتاؤ رات کیسی گزری؟''

گیل نے انکار میں گردن ہلائی۔ ''کوئی فرق نہیں پڑا۔ بالکل وہی حال رہا جو میں نے روزانہ صبح تمہیں سناتی ہوں ہیلن تمہیں معلوم ہے میرا جواب وہی ہے۔ جو پہلے دن تھا۔ میں ان لوگوں میں سے ایک ہوں جنہیں رات بھر نیند نہیں آتی۔''

''تو پھر تم ایسی کیوں ہو؟ میرا مطلب ہے نیند

جیسی اہم ضرورت کو پورا کیے بغیر تمہارا حسن اور صحت کیوں برقرار ہے۔ تم اتنی حسین کیوں نظر آتی ہو؟''

''شاید تمہیں معلوم نہیں میری صحت کے متعلق باتیں لیوررسٹ کے سینڈوچز جیسی دلچسپ ہیں، برسبیل تذکرہ، یہ تو بتاؤ کہ تم ان چیزوں کو حلق سے کیسے اتارتی ہو؟؟''

''مجھے آئرن کی شدید ضرورت ہے۔'' ہیلن نے منہ چلاتے ہوئے سرسری لہجے میں کہا۔

''سنو ڈارلنگ اگر میں تم سے کوئی ذاتی بات کروں تو کہیں تم محسوس تو نہیں کروگی؟''

''کہتی رہو میں سن رہی ہوں۔''

''ابھی ابھی تم نے لیوررسٹ کا ذکر کیا تھا۔ دو سال پہلے میں بہت موٹی تھی میرے جسم پر گوشت ہی گوشت تھا۔ اس دوران میں ایسے ہی خواب دیکھا کرتی تھی اور رات بھی چیختی رہتی تھی۔''

''کیا تم؟'' گیل نے حیرت سے کہا۔ ''تم مزاق کررہی ہو۔''

''ہر تصویر کے دو رخ ہوتے ہیں گیل اور تم صرف ایک ہی پہلو کو دیکھتی ہو۔'' اس نے اپنا مرغن سینڈوچ کاغذ کی تھیلی میں ٹھونستے ہوئے کہا۔ میں تمہیں بتاتی ہوں کہ ایک رات میرا کیا حال ہوا تھا۔ ہیلن نے کہا۔ ایک رات میں غسل خانے میں گئی اور بلیڈ نکال کر اپنی کلائیاں کاٹ لی تھیں۔

اس نے لمبی آستین والے بلاؤز کے بٹن کھولے تو گیل کو پہلی بار احساس ہوا کہ وہ کلائیوں کو چھپانے پر مجبور ہے۔ دونوں کلائیوں پر باریک اور لمبے سفید نشانات اب بھی موجود تھے۔ گیل یہ دیکھ کر قوت گویائی کھو بیٹھی۔

''تم نے دیکھ لیا ڈارلنگ۔'' ہیلن نے کہا۔

''میں نے ایک عجیب حرکت کی تھی۔ مجھے فوراً نفسیاتی وارڈ میں بھیج دیا گیا۔ جب میں وہاں سے باہر نکلی تو مجھے ایک ماہر نفسیات کی نگرانی میں دے دیا گیا تھا۔ اس کا نام ڈاکٹر وانر تھا وہ ایک نوعمر ڈاکٹر تھا اور ان دنوں امتحان پاس کرکے پہلی بار اس پیشے میں آیا تھا۔ خدا اس کی داڑھی کے ایک ایک بال پر اپنی رحمتیں نازل کرے۔''

''کیا اس نے ہی تمہاری مدد کی تھی۔؟''

''اس نے میری زندگی کی حفاظت اور مجھے بچالیا تھا۔''

''کیا تم اب بھی اس سے ملتی ہو؟''

''مہینے میں صرف ایک بار تاکہ ہم ایک دوسرے کو بھول نہ جائیں۔'' وہ مسکرانے لگی۔

ڈارلنگ میں تم سے جو ذاتی بات کرنا چاہتی تھی وہ یہی ہے کہ کیا تم بھی کبھی کسی ایسے آدمی سے ملی ہو؟''

☆......☆......☆

مسز بیلنگر اس وقت اپنے چوڑے اور گداز پیروں سے باورچی خانے میں گھوم رہی تھی۔ اس نے دروازے کو ایک دھماکے سے بوند ہونے کی آواز سنی۔ اس نے کارپٹ سلیپر اتارے اور پہننے کے عام جوتے پہن لئے وہ نہیں چاہتی تھی کہ گیل اس کے پیروں کے بدنما داغ دیکھ سکے اس کے پیروں کی یہ حالت شروع سے نہیں تھی بلکہ گیل کی ماں کے مرنے کے بعد انہوں نے گلنا شروع کر دیا تھا۔ اس نے میڈ کلینک علاج کروایا تھا اور ڈاکٹر نے دونوں پیروں کی چند نسیں کاٹ دی تھیں۔

گیل سیدھی اوپر اپنے میں میں چلی گئی تھی۔ اس نے انٹرکام کا بٹن دباتے ہوئے کہا۔

''کیا تم ٹھیک ٹھاک ہوگئیں؟''

''ہاں۔ ایما میں بالکل ٹھیک ہوں۔ حسب معمول تھکن محسوس کر رہی ہوں۔ میرا خیال ہے رات کے کھانے سے پہلے کچھ دیر آرام کرنا چاہیے۔''

''وہ پولیس والا آج بھی آیا تھا کیا نام ہے اس کا ہمیں ہمیشہ اس کا نام بھول جاتی ہوں۔''

''لیفٹیننٹ مارچ۔''

''ہاں وہی۔ اس کا کہنا ہے کہ وہ پیٹرول کار کے بارے میں کچھ نہیں کرسکتا۔ وہ اپنا روٹ نہیں بدل سکتا۔''

''میرا بھی یہی خیال تھا کہ وہ ایسا ہی کہے گا۔''

"اس نے مشورہ دیا ہے کہ تمام تالوں کو بدل دینا ہی ہمارے لئے بہتر ہے۔ اور اگر ممکن ہو تو ایک نگراں کتا رکھ لیں۔ بہر حال اس سلسلے میں ہمیں کچھ نہ کچھ خود ہی کرنا پڑے گا۔"

"کتے سے گوریلا رکھنا بہتر ہوگا۔ کیا خیال ہے؟ کیا ہرٹز اپنے گوریلے کرائے پر دیتا ہے ایما؟"

"میرا خیال ہے جان، تمہیں بہت زیادہ نیند آرہی ہے۔"

"ہاں ایما۔" اس نے کہا۔ "نیند تو اتنی آرہی ہے کہ شاید میں کپڑے بھی نہ بدل سکوں، بہر حال تم مجھے ساڑھے سات بجے مجھے بزر بجا کر اٹھا دینا۔ ٹھیک ہے۔"

"ٹھیک ہے۔" بوڑھی ملازمہ نے آہ بھرتے ہوئے کہا۔ اس نے ریسیور رکھ دیا اور جوتے بدلنے لگی۔ وہ خوش تھی کہ اسے زیادہ تک دک ان جوتوں میں پاؤں بند نہیں رکھنے پڑیں گے۔ ابھی ایک گھنٹہ ہی گزرا تھا کہ اسے انٹر کام کے اسپیکر سے عجیب آوازیں سنائی دیں۔ اس کا مطلب تھا کہ گیل کے ذہن پر نیند کا اتنا غلبہ تھا کہ وہ سوئچ کو آف تک نہیں کر سکی تھی، مسز بیلنگر کے کانوں سے ہسٹریائی چیخیں اور سسکیاں ٹکرا رہی تھیں۔ یہ آوازیں بلا شبہ بلائی منزل کی خواب گاہ سے آرہی تھیں۔ اور وہ انہیں انٹر کام کے ریسیور سے سن رہی تھی۔ اس نے دونوں ہاتھ کانوں پر رکھ لئے۔

"اوہ خدایا۔" یہ کہہ کر وہ اپنے دکھتے ہوئے پیروں سے گھسٹتی ہوئی زینے کی طرف بڑھی وہ جانتی تھی کہ سوتے ہی گیل کوئی خواب دیکھنے لگی ہے۔ انتہائی خوفناک خواب جو اس کی زندگی کو اجیرن کر رہے تھے۔ لیکن اس سے پہلے یہ چیخیں کبھی انٹر کام کے ذریعے سنائی نہیں دی تھیں اور آوازیں بھی اتنی دردناک نہیں ہوئی تھیں۔ یہ چیخیں ان چیخوں سے بہت مختلف تھیں جنہیں اس نے چھ سالہ گیل کے حلق سے نکلتے سنا تھا۔

"مجھے تو یہ محسوس ہو رہا ہے جیسے میری داڑھی تمہیں بہت متاثر کر رہی ہے۔" ڈاکٹر وارنے کہا۔

"یہ ایک مضحکہ خیز بات ہے۔" گیل نے سرد لہجے میں کہا۔ "میرا بھی تمہارے بارے میں یہی خیال ہے۔ کم از کم تمہارا داڑھی میں خلال کرنے کا انداز واقعی متاثر کن ہے۔"

وہ ہنس پڑا۔ اس کے سفید، نوکیلے اور مضبوط دانت نظر آنے لگے۔ وہ گردن کو پیچھے جھکا کر قہقہہ مارتا تو اس کی داڑھی کی نوک لرزنے لگتی تھی۔

"میں نے آج سے دس سال پہلے کالج سے رخصت ہوتے وقت داڑھی رکھی تھی۔ تم یقین کر دیا نہ کرو اس وقت داڑھی کو بہت عجیب سمجھا جاتا تھا۔ لیکن اب یقیناً یہ کوئی ایسی ممتاز بات نہیں رہی۔"

"سوائے بوڑھے آدمیوں کے۔" گیل نے کہا۔

"ہاں۔" وانر نے قہقہہ مار کر کہا۔ "تم ٹھیک سمجھی ہو۔"

"کیا تم نے اسی وجہ سے داڑھی بڑھا رکھی ہے کہ اپنی عمر سے زیادہ نظر آؤ۔"

"ہاں کچھ ایسی ہی بات ہے۔ دراصل بوڑھوں کو تجربہ کار سمجھا جاتا ہے۔ اور مریض اس سے زیادہ متاثر ہوتے ہیں، یا پھر ممکن ہے میں اپنے مثالیے کی یاد میں اسے رکھنے پر مجبور ہوں کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ میں بالکل سگمنڈ جیسا ہوں میں کسی دن اس بات کا تجزیہ ضرور کروں گا۔"

"کیا تم اپنی فیس کے متحمل ہو سکتے ہو؟"

وانر کا قہقہہ اس بار گرج دار تھا۔ "بہر حال ہم مریض کی بجائے ڈاکٹر پر بحث کر رہے تھے۔"

"میں نے یہ تو نہیں کہا کہ میں مریضہ ہوں میں صرف اس موضوع پر بات کرنا چاہتی ہوں۔"

"ٹھیک ہے۔ آؤ باتیں کریں۔ ان باتوں سے مجھے تمہارے بارے میں کچھ ایسی باتیں معلوم ہوں گی جنہیں کوئی نہیں جانتا۔"

"مجھے بتاؤ کہ تم کیا دریافت کرنا چاہتے ہو؟"

"میرا خیال ہے پہلے مجھے وہ باتیں کرنا چاہئیں جو میں پہلے سے جانتا ہوں، تمہاری سہیلی۔"

"کیا اس نے میرے متعلق کچھ کہا تھا؟"

"ہاں...... جب وہ اپنے بارے میں بات نہیں

کرتی تو اکثر تمہارا ذکر رہتا ہے اس نے بالکل اسی انداز میں تمہاری باتیں کی ہیں جس طرح وہ اپنے دوست اپنی بلی یا اپنے باپ کے بارے میں کہتی ہے۔ بالکل سرسری لہجے میں۔"

"وہ تمہیں کیا کچھ بتا چکی ہے؟"

"یہی کہ تم یتیم ہو۔ تمہارا باپ تمہاری پیدائش سے کچھ عرصے بعد مر گیا تھا۔ اور جب تمہاری عمر صرف چھ سال تھی تو تمہاری ماں کا بھی انتقال ہو گیا تھا۔ تم ٹھیک سے سو نہیں سکتیں۔ تمہیں برے برے خواب ستاتے ہیں تم داڑھیوں والے آدمیوں سے بھی مل چکی ہو جن کی دیواروں پر بالکل ایسے ہی ڈپلومے ہیں جیسا کہ میرے ہاں آویزاں ہے۔"

"ان میں سے کوئی داڑھی والا نہیں تھا۔ بس سب ہی عمر رسیدہ ڈاکٹر تھے۔"

ڈاکٹر وانر خاموش ہو گیا۔ اس نے کرسی کی پشت سے ٹک کر نرم لہجے میں کہا۔

"سب سے پہلا سوال میں یہ کرنا چاہتا ہوں کہ کیا واقعی تمہاری ماں نے خودکشی کی تھی؟"

ایک لمحے کے لئے گل کو کوئی جواب ہی نہیں بن پڑا۔ وہ غالباً یہ سوچ رہی تھی کہ ڈاکٹر وانر نے آخر کیسے اندازہ لگا لیا کہ اس کی ماں کی موت خودکشی سے واقع ہوئی تھی۔ یہ حقیقت کیسے ظاہر ہوئی۔ بالآخر وہ پوچھے بغیر نہ رہ سکی۔ "یہ بات تمہیں کیسے معلوم ہوئی ڈاکٹر؟"

"کوئی ایسی بات نہیں۔" ڈاکٹر نے اطمینان سے کہا۔ "میں صرف یہ سوچ رہا تھا کہ وہ ایک اداکارہ تھی جس کا نام کریسی بلیک تھا اس نے ایک دولتمند آدمی گز سن سے شادی کی تھی اور بالآخر اس نے خودکشی کر کے اپنا خاتمہ کر لیا تھا۔" اس کا لہجہ مزید نرم ہو گیا۔ "وہ اب بھی کبھی کبھی رات کی نشریات میں نظر آتی ہے۔ کیا تم نے کبھی اسے دیکھا ہے؟"

"نہیں میں اپنی ماں کی پرانی فلمیں نہیں دیکھتی۔ میں انہیں برداشت ہی نہیں کر سکتی وہ مجھے عجیب اور اجنبی اجنبی سی محسوس ہوتی ہے۔"

"یہ بہت بری بات ہے۔ بہر حال اگر تم ان فلموں کو دیکھتیں تو تمہیں معلوم ہو جاتا کہ میرے اندازے کی کیا وجہ ہے۔"

"ہاں میں جانتی ہوں کہ ہم میں بہت مشابہت ہے۔"

"کیا مشابہت کے علاوہ بھی کوئی مماثلت ہے؟" ڈاکٹر نے سوال کیا۔ گیل نے نگاہ اٹھا کر وانر کی طرف دیکھا ان کی آنکھیں گویا ایک دوسرے سے چپک گئیں۔ یہ طلسم اس وقت ٹوٹا جب وانر نے مخصوص انداز میں داڑھی کی نوک کو چھوا۔ "ممکن ہے یہ سوال تمہیں گراں گزرا ہو، بہر حال کیا تمہارے کچھ رشتے دار بھی ہیں۔"

"صرف ایک چچا ہے۔ سوان اور اس کا بیٹا پائرز۔"

"کیا تم ان کے ہاں جا کر بھی رہتی ہو؟"

"نہیں۔ میرا چچا اکثر کاروباری دوروں پر رہتا ہے۔ زیادہ تر یورپ میں مقیم رہتا ہے لیکن اس نے میرے تحفظ کے لئے انتظامات کر رکھے ہیں۔ بینک سارے معاملات کی دیکھ بھال کرتی ہے۔"

"بینک......؟" ڈاکٹر نے دہرایا۔

"ہمارے خاندان کی دولت کا معاملہ ہے۔ بینک بھی ان معاملات کو نمٹانے کی مجاز ہے اور وہ اسے خوش اسلوبی سے نمٹا رہی ہے۔ میری ماں نے کچھ اسی انداز کی وصیت کی تھی۔" اس کا لہجہ قدرے تلخ ہو گیا۔

"میرا خیال ہے یہ کہنا کسی حد تک غلط ہے کہ میں یتیم ہوں۔ ٹرسٹ کے افسران میرے والدین اور سرپرست ہیں۔"

ڈاکٹر وانر پہلی بار اپنے ڈیسک سے اٹھا اس کا جسم یہ چغلی کھا رہا تھا کہ وہ ٹینس کا زبردست کھلاڑی ہے وہ اس ہک کی طرف بڑھا جہاں اس کا چرمی کوٹ ٹنگا ہوا تھا اس نے کوٹ کی جیبیں ٹٹول کر کچھ تلاش کرنا شروع کیا۔ جب وہ دوبارہ گیل کی طرف متوجہ ہوا تو اس کا لہجہ مزاح کے عنصر سے پاک تھا۔

''نہیں مس گرزن۔'' اس نے کہا۔

'' مجھے شبہہ ہے کہ ہینک ماں کا بہترین نعم البدل ہے جب تمہارے گھٹنے میں چوٹ آتی ہے تو تم ہینک کی طرف نہیں دوڑ سکتیں۔ تنہائی کا احساس ہو تو ہینک اس احساس کو دور نہیں کر سکتی۔'' وہ اس کے بالکل سامنے آ کر کھڑا ہو گیا۔ اس کے ہاتھ میں سگریٹ کا پیکٹ تھا۔'' اور جب کبھی تم خوفزدہ ہوتی ہو تو ہینک تمہاری کیا مدد کر سکتی ہے؟''

جب وہ اپارٹمنٹ ہاؤس کے سائبان سے باہر نکلی تو اس نے ویران گلی میں دونوں طرف دیکھا وہ حیرت سے یہ سوچنے پر مجبور ہو گئی کہ پارک ایونیو پیدل چلنے والوں کے لئے اس قدر پرکشش کیوں ہے، پھر اسے خیال آیا کہ وہاں اسٹوروں کی کمی ہے۔ شاپنگ کے لئے کھڑکی نہیں ہے۔ وہ نیویارک کے رہنے والوں کی پیدل چلنے کی عادت اور دیگر موضوعات پر غور کرتی رہی۔ وہ جانتی تھی کہ ذہن کو اس طرح مصروف رکھ کر در حقیقت وہ اس احساس کو زائل کرنا چاہتی ہے جو ڈاکٹر جوئل وانر کے کلینک میں بیٹھ کر ہوا تھا۔ وہ وہاں پورے پچاس منٹ تک بیٹھی رہی تھی۔ آخری تیس منٹ بہت جان لیوا تھے۔ یہ وہ وقفہ تھا جب وانر نے اس کے ماضی کو کریدنے کی کوشش کی تھی۔ وہ میکسنگٹن ایونیو کی طرف گھوم گئی۔ اور اس کی آنکھیں مسلسل ایک '' کافی شاپ'' کی متلاشی رہیں۔

ایک کیفے ٹیریا کے سامنے رک کر اس نے فیصلہ کیا کہ یہاں بیٹھ کر وہ اپنے بارے میں تفصیل سے غور کر سکتی ہے جب سے بچپن رخصت ہوا تھا وہ بھاری غذا سے کنارہ کش تھی۔ اس نے سوچا کہ کیوں نہ آج خوب سیر ہو کر کھائے۔ لیکن اگلے ہی لمحے اس نے بچپن کو کھرچ کر ذہن سے پھینک دیا۔ ایک دن کی حد تک بس اتنا ہی کافی تھا۔

کاؤنٹر پر اس نے سات تہوں والا ایک کیک منتخب کیا اور کافی کی پیالی اٹھالی۔ دیوار کے قریب اس نے ایک خالی میز دیکھی اور اطمینان سے بیٹھ گئی۔ اس وقت کیفے میں زیادہ گاہک نہیں تھے۔ اسے ایک دبلا پتلا آدمی نظر آیا اس نے ہاتھوں میں ٹرے اٹھا رکھی تھی۔ وہ میزوں کے درمیان گھوم رہا تھا۔ گیل نے محسوس کیا کہ وہ اس کی قریبی میز پر بیٹھنا پسند کرتا ہے لیکن اس نے قریبی میز کی بجائے اسی جگہ کو منتخب کیا جہاں وہ خود بیٹھی ہوئی تھی۔

'' اگر میں کچھ دیر تمہارے ساتھ بیٹھ لوں تو کوئی حرج نہیں'' اس نے مسکرا کر کہا اور ٹرے میز پر رکھ دی اس ٹرے میں سیاہ کافی کی ایک پیالی اور ہلال نما سویٹ رول رکھا ہوا تھا۔ گیل نے سر سے پاؤں تک اس شخص کو بغور دیکھا اور کہا۔ '' مجھ سے دور رہو۔''

وہ بیٹھ گیا۔ گیل نے جو ردعمل ظاہر کیا وہ جارحانہ تھا۔ وہ یوں اچھل کر کھڑی ہوئی جیسے پیروں تلے اسپرنگ لگے ہوئے ہوں۔ اٹھتے وقت غیر ارادی طور پر اس نے اپنی ٹرے بھی اٹھالی تھی۔

'' مس گرزن۔ پلیز۔'' اس نے استدعا کی۔ '' مجھ سے دور نہ جاؤ۔''

'' تم میرا نام کیسے جانتے ہو؟''

'' میں تمہارے بارے میں بہت سی باتیں جانتا ہوں۔ تمہارا گام گیل گرزن ہے اور تم آرٹ لیگ میں مصوری کی طالبہ ہو۔ تم اس گلی کے سب سے بڑے مکان میں تنہا رہتی ہو۔ راتوں کو تم سو نہیں سکتیں، ممکن ہے یہ سب کچھ اس چاکلیٹ کیک کی وجہ سے ہو جنہیں تم بڑی رغبت سے کھاتی ہو۔''

'' تم میرا تعاقب کرتے رہے ہو۔ آخر کیوں؟''

'' میرا نام اسٹیو ٹائز ہے۔'' اس نے کہا اور منتظر نگاہوں سے گیل کی طرف دیکھا۔

'' میرا پیچھا کرنے کے لئے تمہاری خدمات کس نے حاصل کی ہیں؟''

'' تمہاری حفاظت کے لئے یہ ضروری ہے میری بات پر یقین کرو۔'' وہ خاموش ہو گئی۔ حفاظت کے لفظ نے اسے بہت کچھ سوچنے پر مجبور کر دیا تھا۔ یہ لفظ صرف ایک ہی جگہ سے وابستہ کیا جا سکتا تھا۔

'' دی ہینک۔'' اس نے سپاٹ لہجے میں کہا۔ '' کیا

تم فیڈیوسری کے لئے کام کرتے ہو؟''

''نہیں مس گیل۔ میں ذاتی طور پر یہ کام کر رہا ہوں۔ ہینک نے میری خدمات یقیناً حاصل کی ہیں لیکن میں ہینک کا ملازم نہیں ہوں۔''

''اس میں کیا فرق کی بات ہے؟''

''مسٹر ٹیڈ سکو کا خیال ہے کہ تمہاری پریشانی کا سبب معلوم کرنا ضروری ہے۔ ہینک یہ سراغ لگانا چاہتی ہے کہ آ کر وہ کیا پراسرار بات ہے جو تمہیں مسلسل پریشان کر رہی ہے؟''

''تمہارے علاوہ یہ بات کسی اور کے لئے نہیں کہی جاسکتی۔ تم ہی میری پریشانی کا باعث ہو۔''

نوجوان نے ایک طویل سانس لی۔ ''گزشتہ مہینے تم نے کئی بار پولیس کو طلب کیا تھا۔''

''میں نے صرف ایک بار پولیس کو بلایا تھا۔'' گیل نے ناخوشگوار لہجے میں کہا۔

''بعد میں ہر مرتبہ مسز بیلنگر نے انہیں فون کیا تھا۔ وہ میری پرانی ملازمہ ہے۔''

''کیا اس نے یہ سب کچھ تمہاری استدعا پر کیا تھا؟''

''میں نے اپنے گھر میں چند آوازیں سنی تھیں۔ میں سوچ رہی تھی کہ شاید کوئی چور یا نقب زن اندر گھس آیا ہے پولیس نے بعد میں خیال ظاہر کیا مجھے غلط فہمی ہوئی تھی۔ مکان کی کوئی چیز گم نہیں ہوئی اور نہ ہی کوئی ایسا نشان نظر آیا جس سے کسی کے زبردستی گھسنے کا علم ہوتا۔ بہر حال پولیس نے اس معاملے کی زیادہ پرواہ نہیں کی۔''

''بہر حال یہ بات مسٹر ٹیڈ کے لئے پریشانی کا باعث ہے تمہیں معلوم ہونا چاہیے کہ ہینک ہر اس معاملے میں دلچسپی لینے پر مجبور ہے جو تم پر گزرتا ہے۔''

یہ بات گیل کو ناگوار محسوس ہوئی۔ اس نے تلخی سے کہا۔ ''دی فیڈیوسری ہینک۔ مسٹر ٹیڈ سکو ایک بوڑھی اور موٹی مرغی جیسا آدمی ہے جو مامتا کے فرائض سرانجام دینا چاہتا ہے۔ میں ذرا سا چھینکتی ہوں تو نہ جانے کیوں اس کی ہینک کے سنگ مرمر پر کپکپی طاری ہو جاتی ہے۔''

''کیا تم پولیس کی تحقیقات سے مطمئن تھیں؟ کیا وہ تمہیں یہ باور کرانے میں کامیاب ہوگئی کہ سب کچھ محض تمہارا واہمہ تھا؟''

''اوہ سمجھی۔'' گیل نے ہونٹ دانتوں تلے دبالیا۔

''تم ایک پرائیوٹ سراغرساں ہو اور تم اپنے موکلوں کا کام عوامی مقامات پر بھی کرنے سے گریز نہیں کرتے یہی بات ہے نا؟''

''تم میرے بارے میں پہلے سی ہی غلط فہمی کا شکار ہو، بھلا میں تمہیں کیسے سمجھاؤں۔ سنو۔ اگرچہ پولیس اس مکان میں کسی کے پیروں کے نشانات یا قفل شکنی کا سراغ نہیں لگاسکی تاہم اس بات کا امکان ہے کہ تم نے جو کچھ سنا تھا وہ ایک حقیقت ہو۔ ممکن ہے اس عمارت پر کسی کی نگاہ خاص ہوا اور وہ وہاں کچھ ڈھونڈتا پھر رہا ہو۔ اس بات کا بھی امکان ہے کہ وہاں کوئی جال پھیلایا جارہا ہو۔ اور یہ آواز محض ریہرسل کرتے وقت پیدا ہو رہی ہو۔ شاید کوئی تمہاری دیواری تجوری صاف کرنا چاہتا ہے یا ایسی ہی کوئی دوسری بات بھی ہوسکتی ہے۔''

''میرے پاس کوئی ایسی تجوری نہیں ہے۔ چاندی کی چند ذاتی زیورات کے لئے معمولی سا سیف ضرور ہے۔ میں اپنی قیمتی اشیاء گھر میں رکھنے کی عادی نہیں ہوں۔''

''اس کے باوجود عمارت میں ایک قیمتی شے ضرور ہے۔''

''اور وہ کیا ہے مسٹر؟'' گیل نے حیرت سے کہا۔

''وہ تم ہو مس گیل۔'' اسٹیوٹائز نے کہا۔ ''ہم کیس معمولی سرقے کا سراغ نہیں لگا رہے ہیں۔ دوسرے جرائم بھی موجود ہیں۔ اغوا اور استحصال جیسے جرائم۔ اگر یہ سب......'' وہ ایک لمحے کے توقف سے بولا۔

''ان سب اندازوں کے بعد تمہیں شدید نگرانی میں رکھنا ضروری ہے۔''

وہ ایک بار پھر کھڑی ہوگئی اس نے ناگواری کے اظہار کے لئے ٹرے کو دیوار کی طرف دھکیلا اور سخت لہجے میں کہا۔ ''مجھے افسوس ہے مسٹر ٹائز میں آج مزید گفتگو نہیں کرسکتی، اور تم مسٹر ٹیڈ سکو سے کہہ سکتے ہو کہ مجھے اب عمارت میں کوئی پراسرار آواز سنائی نہیں دیتی اور مجھے یقین

ہے کہ ابمیں کبھی کوئی ایسی آواز نہیں سنوں گی۔ جو میرے لئے پریشانی کا باعث ثابت ہو۔"

"میرے پاس اسے بتانے کے لئے اس سے زیادہ اہم باتیں موجود ہیں۔"

"ٹھیک ہے جو جی میں ائے کہہ دینا لیکن یہ بتانا نہ بھولنا کہ مجھے اس کی ان خفیہ سرگرمیوں سے نفرت ہے۔ اور یہ غلیظ اور غیر اخلاقی سراغ رسانی مجھے بالکل پسند نہیں۔ نہیں تم مت کہنا۔ میں خود اسے بتاؤں گی مسٹر ٹائز کہ دو دسمبر کو میرا اکائونٹ اس کے بینک سے دوسری جگہ منتقل ہو جائے گا اگر یہ تاریخ تمہارے لئے اہم نہیں تو اسی سے معلوم کرلینا کہ یہ بات کتنی اہمیت رکھتی ہے۔"

"یہ اس کی سالگرہ کا موقع ہے۔" ٹیڈ سکو نے کہا۔

"پھر کیا ہوا؟"

"یہ کوئی معمولی سالگرہ نہیں ہے اس کے والدین نے جو ٹرسٹ قائم کیا تھا اس کی رو سے مس گیل اپنے پورے اکاؤنٹ اور جائیداد کو اپنے ہاتھ میں لینے کی مختار ہے اگر وہ واقعی ہمارے بینک سے حساب کرنا چاہتی ہے تو ایسا کرسکتی ہے۔ غالباً اب تم اس تاریخ کی اہمیت سے واقف ہوگئے ہوگے۔"

اسٹیو ٹائز نے بینکر کی ڈیسک سے ایک پیپر نائف اٹھا اور ناخن صاف کرنے لگا۔ اگر ٹیڈ سکو اس کی چچی کا شوہر نہ ہوتا تو وہ یقیناً غصے سے بھڑک اٹھتا۔ اگر وہ اتنا ہی سنگ دل ہوتا جتنا کہ مس گیل خیال کرتی تھی تو شاید وہ اس پر چڑھ دوڑتا وہ اس کی طرف دیکھ کر مسکرا رہا تھا۔

"یہ مت سوچو کہ میں فکر مند ہوں۔" اس نے کہا۔

"مس گزسن اور بینک کئی برسوں سے ایک دسرے کے ساتھ ہیں۔ ہم نے ہمیشہ اس کے مفاد کی نگہداشت کی ہے مجھے ذاتی طور پر اس کی دولت یہاں سے منتقل ہونے میں نقصان ہے لیکن میں ایسے نقصانات کی پرواہ نہیں کرتا جو کسی گاہک کے محض غصے کی وجہ سے ہوتا ہے۔ لیکن مجھے اس بچی سے محبت ہے اور اسے اس وقت ہماری مدد کی شدید ضرورت ہے۔"

"میں نے اس پولیس والے کو دوبارہ بھی دیکھا تھا۔" اسٹیو نے کہا۔

"بالڈرچ؟"

"ہاں۔ میرا خیال تھا کہ دوسری مرتبہ اس سے ملاقات خوشگوار رہے لیکن معلوم ہوتا ہے وہ مجھے سے مل کر خوش نہیں ہوا۔"

"وہ کیا کہہ رہا تھا؟"

اسٹیو نے کندھے اچکائے۔

"بالکل وہی کچھ جو وہ پہلے بھی کہہ چکا ہے۔ صرف اتنا سا فرق رہا کہ اس بار لہجہ بہت سخت اور توہین آمیز تھا۔ اس کا کہنا ہے کہ ہر کال کے بعد بہ غور ایک ایک چیز کو دیکھا گیا تھا۔ اس کا خیال ہے کہ لڑکی نے ایک بار بھیڑیا آیا کہہ کر ان کی پریشانی سے لذت محسوس کی تھی اور اب وہ بھیڑیا آیا کہنے کی کی عادی ہوگئی ہے لہٰذا اس طرف توجہ نہیں دی جاسکتی اس کے علاوہ وہ کیا کہہ سکتا تھا؟"

ٹیڈ سکو نے ایک سرد آہ بھری۔ "وہ اس کے ماضی سے آگاہ ہیں کیا میں نے یہ بات تمہیں بتائی تھی؟"

"بالڈرچ نے اس کی طرف بھی اشارہ کیا تھا۔ اسے یہ باتیں کس نے بتائی تھیں؟ کیا تم نے؟"

"بالڈرچ نے اس کی طرف بھی اشارہ کیا تھا۔ اسے یہ باتیں کس نے بتائی تھیں؟ کیا تم نے۔"

اس کے چچا کے چہرے پر دکھ کے تاثراتف ابھر آئے۔ "آخر تم یہ کیوں سوچ رہے ہو کہ میں مس گزسن کے خلاف کوئی سازش کر رہا ہوں؟ میں ایسا نہیں کر رہا ہوں۔ میں سچے دل سے اس کا مفاد چاہتا ہوں۔ ہم سب ہی اسے چاہتے ہیں۔ اس کی دولت کا شاید تمہیں اندازہ نہیں گزسن کی جائیداد کئی کارخانوں، زمینوں، اور سینکڑوں اداروں پر مشتمل ہے جن میں لاکھوں افراد کام کرتے ہیں اور ہر آدمی کو اپنی مالکہ کا مفاد عزیز ہے۔"

"ان سب باتوں سے قطع نظر بینک میں اس کا اکاؤنٹ سب سے بڑا ہے؟"

"ہاں۔ یہ حقیقت ہے۔ اس کے بعد ممکن ہے بینک دیوالیہ ہی ہو جائے لیکن اسٹیو اس بات کو ذہن میں رکھو کہ ہم مشینری کو حرکت میں رکھتے ہیں۔ گر اس لڑکی کا

ذہنی توازن ٹھیک نہیں ہے یا وہ غیر ذمے داری کا مظاہرہ کرتی ہے تو اس مشینری کو بہت بڑا نقصان پہنچے گا۔ ممکن ہے یہ مشینری کام کرنا ہی چھوڑ دے۔ ہم نہیں چاہتے کہ ایسا ہو۔‘‘

’’میں اس سے بات کر چکا ہوں۔ وہ مجھ سے صاف صاف بات کر چکی ہے۔ اس کے لہجے میں ہسٹریا کا ہلکا سا بھی تاثر نہیں تھا۔‘‘

’’سنو...... اس وقت گیل گزسن کی عمر بارہ سال تھی جب اسے دماغی اسپتال سے رخصت کیا گیا تھا۔ وہ میڈ جیسے بڑے اسپتال میں تھی۔

’’ٹیڈ کو نے کہا۔‘‘ اس کی ماں ہسٹریائی کیفیت کا شکار تھی اسی وجہ سے اس نے خودکشی کی تھی۔ اس قسم کی جنونی کیفیت موروثی مرض کی حیثیت رکھتی ہے۔ یہ ایک کے بعد دوسری نسل میں منتقل ہو جاتی ہے اسٹیو کیا تمہیں یہ بات معلوم نہیں؟ اس کی بھوری اور خوبصورت آنکھوں پر دھوکہ نہ کھاؤ مجھے اس بات سے کوئی دلچسپی نہیں کہ تم کیا رائے قائم کرتے ہو، بہر حال یہ ایک طے شدہ بات ہے کہ مس گیل گزسن کسی دماغی عارضے میں مبتلا ہے۔‘‘

دھم...... دھم...... دھم

بلا شبہ یہ ایک ایسی آواز تھی جیسے کوئی نرم لیکن ٹھوس اور بھاری بھرکم گول چیز گزسن ہاؤس پر اتری ہو۔ جیسے کوئی فنکار چکنی مٹی کے ڈھیر پہ گرتا ہے بالکل اسی انداز میں وہ چیز چھت پر گری تھی اس چیز کی آواز دوبارہ سنائی دی تو اسے یہ محسوس ہوا جیسے خواب گاہ کے اوپر بالا خانے میں کوئی چیز ہے۔ پر اسرار و ہیبت ناک۔

گیل نے اس سے پہلے بھی بہت سی پر اسرار آوازیں سنی تھیں اور اس نے ہر بار مختلف انداز میں سوچا تھا۔ اس کی دانست میں عمارت کی کڑیاں اور شہتیر پرانے ہو چکے تھے اور دباؤ یا ہوا کے تیز جھونکوں سے آواز پیدا کرتے تھے۔ کبھی وہ سوچتی کہ گراؤنڈ فلور کی ٹائلز پرانی ہو کر چیخ رہی ہیں لیکن ہر بار جیسے ہی کسی کے دھم سے گرنے کی آواز سنائی دیتی وہ بستر پر اچھل کر بیٹھ جاتی اور چیخ چیخ کر اپنی بوڑھی خادمہ کو پکارنے لگتی تھی۔ مسز بیلنگر نے پہلی بار پولیس کو اطلاع دی تو لیفٹیننٹ بالڈرچ کا درشت چہرہ سامنے آیا۔ ایک بار تو وہ خود ہی بالا خانے میں سراغ لگانے پہنچ گئی تھی لیکن اسے یہ اندازہ ہوا کہ یہ کوئی شیطانی چکر نہیں ہے جب تیسری بار ایسا ہی ہوا تو بوڑھی ملازمہ نے اسے بانہوں میں سمیٹ لیا اور شفقت سے کہا کہ وہ کسی وہم کا شکار ہے یا اس نے کوئی بھیانک خواب دیکھا ہے۔

جب اس نے ڈاکٹر وانر کو اس پر اسرار صورت حال سے آگاہ کیا تو اس نیک ہری توجہ اور سکون سے اس کی باتوں کو سنا تھا۔ اس نے ہر بات پر گہری دلچسپی ظاہر کرنے کے بعد کہا تھا۔ ’’جب تم ان آوازوں کو سنتی ہو تو ہر بار کیوں خوفزدہ ہو جاتی ہو؟ کیا اس کی وجہ صرف یہ نہیں ہے کہ تم میں خود اعتمادی کا فقدان ہے؟ تم میں جرات کی کمی ہے۔‘‘

یہ باتیں اس وقت گیل کے ذہن میں چکرا رہی تھیں۔ رات کے دو بج کر پندرہ منٹ ہوئے تھے اور وہ پسینے میں بھیگی ہوئی بستر پر بیٹھی ہوئی تھی۔ وہ اب اس چیز کے اعادے کی منتظر تھی۔

اس نے تیسری بار آواز سنی۔ وہ خوفزدہ ہو چکی تھی لیکن اسے معلوم تھا کہ کیا کرنا ہے۔ اس نے آج رات اپنی خادمہ کو آوازیں نہیں دیں۔ وہ بستر سے اٹھی اور گاؤن پہن کر سلیپر پہننے لگی۔ وہ خواب گاہ سے نکلی اور ہال وے میں پہنچی۔ اس کے ایک کنارے اب بھی دادا جان کا گھڑیال تھا۔ یہ پہلو محفوظ تھا لیکن دوسری جانب غیر محفوظ تھی۔ اس طرف زینہ تھا۔ چند سیڑھیاں تھیں جن کا خاتمہ بالا خانے میں ہوتا تھا وہ سوچ رہی تھی کہ ڈاکٹر وانر اس اقدام پر یقیناً فخر کرے گا۔ وہ زینے چڑھنے لگی۔ اس نے بالا خانے کے دروازے میں ہاتھ ڈالا اور سوئچ تلاش کیا۔ اسے آن کرنے میں تھوڑی سی کوشش کرنی پڑی۔ استعمال نہ ہونے کی وجہ سے کھٹکا سخت ہو چکا تھا۔ کمرے میں فوراً ہی روشنی نہیں ہوئی یہ ایک تاریک کمرہ تھا اور بلب کمزور تھا۔ تھوڑی دیر بعد اسے زرد روشنی کا احساس ہوا۔ دھندلی روشنی جس میں صاف نظر نہیں آتا تھا۔ اس کا دل دھک

سے رہ گیا۔

ایک نیچے شہتیر سے اس کی ماں کی بے جان لاش جھول رہی تھی۔ اس کی سپید گردن کے گرد بجلی کا تار لپٹا ہوا تھا۔ اس کے جسم پر وہی لباس تھا جو گیل کے ذہن میں آج بھی محفوظ تھا۔ فرش پر ڈھلکا ہوا نیلا ساٹن زرد روشنی میں جھلمل جھلمل کر رہا تھا۔

مسز بیلنگر اس سے لپٹی ہوئی تھی۔ آخر وہ اس سے کیوں لڑ رہی تھی؟ وہ اس کے بازوؤں کو کیوں جکڑ رہی تھی۔ خود وہ عجیب حالت کا شکار تھی۔ اسے کانوں میں اپنے دڑتے ہوئے خون کی سرسراہٹ محسوس ہو رہی تھی۔ اس کے حلق سے احتجاج بھری چیخیں نکل رہی تھیں۔ وہ چیخ چیخ کر اسے خاموش رہنے کے لئے کہہ رہی تھی۔ ایک لمحے کے لئے اسے احساس ہوا کہ خادمہ اس کے رخسار پر طمانچہ مارنے والی ہے اور پھر اسے یاد آیا کہ ہسٹریا کے علاج میں عموماً ایسا کیا جاتا ہے۔ رفتہ رفتہ اسے احساس ہوا کہ مسز بیلنگر اس کی مخالف نہیں ہے بلکہ وہ اسے پرسکون رکھنے کی کوشش کر رہی ہے وہ اسے بتا رہی تھی کہ وہ کون ہے۔

''اوہ یہ میں ہوں۔ اوہ یہ میں ہوں۔'' گیل نے دیوانہ وار سوچا۔ ''میں پاگل ہوگئی ہوں۔'' اسی دوران اسے ہسٹریائی کیفیت کی وجہ بھی سمجھ میں آ گئی۔ وہ مسز بیلنگر کو بتانے لگی۔

''میں جانتی ہوں جان میں جانتی ہوں۔'' مسز بیلنگر نے اسے ہموار کرتے ہوئے کہا۔

''لیکن یہاں ایسی کوئی چیز نہیں تھی، تم خود ہی دیکھ لو وہ سب کچھ تمہارا وہم تھا جس نے ممکن ہے وقتی طور پر یہ شکل اختیار کر لی تھی۔'' مسز بیلنگر نے اس کا ہاتھ تھاما اور دوبارہ بالا خانے کے دروازے کی طرف بڑھی۔ زرد روشنی اب بھی اس کمرے میں پھیلی ہوئی تھی۔ وہ کانپ گئی۔ اس نے ڈرتے ڈرتے اس شہتیر کی طرف دیکھا جس سے اس کی ماں کی لاش جھول رہی تھی۔ وہاں صرف نیلا لباس تھا جسے ایک تار کے ذریعے لٹکایا گیا تھا۔

''بس یہاں تو صرف یہی کچھ ہے۔'' مسز بیلنگر نے کہا۔ ''تم نے اپنی ماں کا لباس دیکھا تھا وہ تمہیں نظر نہیں آئی تھی اگر اس جگہ کوئی اور ہوتا تو اس سے بھی یہ غلطی سرزد ہو سکتی تھی جان بہرحال اب تم اس بات کو ذہن سے جھٹک دو۔ آؤ چلیں۔''

''نہیں۔'' اس نے ڈاکٹر وانر سے کہا۔ ''مسز بیلنگر غلط کہہ رہی تھی۔ جو کچھ میں نے دکھا تھا وہ کسی اور کو نظر نہیں آ سکتا تھا۔''

''میں تمہارا مطلب سمجھ رہا ہوں۔ وہم بہت ہی انفرادی حیثیت کے حامل ہوتے ہیں۔ ذاتی خوف سے پرانی اور مدفون شبیہیں مجسم ہو کر سامنے آ جاتی ہیں۔

سنو گیل۔'' ڈاکٹر نے پرسکون لہجے میں کہا۔ ''کیا تم نے اس سے پہلے بھی کبھی کوئی ایسا منظر دیکھا تھا۔؟''

''نہیں۔'' گیل نے انکار میں گردن ہلائی۔ ''میں نے اپنی ماں کی لاش کبھی نہیں دیکھی۔ میں نے اس کی لاش خودکشی کے وقت اور اس کے بعد بالکل نہیں دیکھی تھی۔ مسز بیلنگر نے ہی اس کی لاش کو بالا خانے میں دریافت کیا تھا۔'' اس کی آنکھوں کی درمیانی لکیر گہری ہوگئی۔

''اور ہاں، مجھے تو پہلے یہ بھی معلوم نہیں تھا کہ میری ماں نے کس کمرے میں خودکشی کی تھی۔ کل رات مسز بیلنگر نے بتایا تھا کہ میری ماں نے بالا خانے کی شہتیر سے بجلی کا تار باندھ کر خودکشی کی تھی۔ جب میں بچی تھی تو کسی نے اس حادثے کے متعلق تفصیل سے مجھے نہیں بتایا تھا۔ بلکہ مجھ سے ہر وہ بات پوشیدہ رکھنے کی کوشش کی گئی تھی جو میرے ذہن پر اثر انداز ہو سکتی تھی۔''

''ممکن ہے کہ تم نے خود ہی ان تفصیلات کو جاننا ضروری نہیں سمجھا ہو۔'' ڈاکٹر وانر نے نرمی سے کہا۔ ''دماغ ایسی چیزوں کو رد کرنے کا عادی ہے جو اسے ناگوار گزرتی ہیں ممکن ہے یہ باتیں تمہیں پہلے سے معلوم ہوں لیکن تم انہیں بھول گئی ہو......!''

اس شام آرٹ کلاس میں وہ کچھ بدلی بدلی سے نظر آ رہی تھی اور وہاں بھی نیا پن موجود تھا۔

''تم میں تو کشش کچھ اور بڑھ گئی ہے ڈارلنگ۔'' ہیلن نے کہا۔

''ادھر دیکھو۔'' اس نے سر کے اشارے سے ایک

طرف توجہ دلائی۔ گیل نے ادھر دیکھا تو اس کا دل حلق میں اٹک گیا۔ اسٹیو ٹائز وہاں موجود تھا۔ وہ ایک ایزل پر اسکیچ بنا رہا تھا۔ اس کا انہماک دور ہی سے بناوٹی محسوس ہو رہا تھا۔ جب اس نے ادھر دیکھا تو ٹائز نے اس کی طرف انگلیاں نچائیں اور مسکرانے لگا۔

''یہ وہی نوجوان ہے جو میرا تعاقب کرتا رہا ہے۔''

''اور تم اس کے بارے میں شکایت بھی کرتی رہی ہو۔'' ہیلن خوش دلی سے مسکرانے لگی۔

اسٹیو نے ایزل سے کاغذ اتارا اور ان کی طرف بڑھا۔ اس نے کاغذ کو لپیٹ لیا اور ایزل کے سامنے رک گیا۔ اس نے تنقیدی نگاہ سے اسکیچ کی طرف دیکھا۔ ''جانتی ہو اس میں کیا خامی ہے؟''

وہ حیرت سے اس کی طرف دیکھنے لگی۔ ''کیا خامی ہے؟''

''مصوری میں فاصلے کا ظاہری تناسب فطری طور پر تم بائیں طرف رہو تو بہتر اسکیچ تیار کر سکتی ہو۔ تمہیں ہمیشہ کمرے کے دوسرے حصے میں ایزل کو رکھنا چاہیے۔'' اسٹیو نے وضاحت کی۔

''کیا واقعی یہی بات ہے؟'' گیل کی حیرت برقرار رہی۔

''آزما کر دیکھ لو۔ اگر اسکیچ پہلے سے بہتر نہ بنے تو میں ذمے دار ہوں۔'' اس نے ایزل کا رخ بدل دیا لیکن گیل اب کام کے موڈ میں نہیں تھی۔ اس نے لہجے کو قدرے سرد رکھتے ہوئے کہا۔ ''کیا بینک کو معلوم ہے کہ وہ تمہارے آرٹ کلاس کے اخراجات بھی برداشت کر رہی ہے؟''

''میں برسوں سے پینٹنگ کر رہا ہوں۔''

''تصویریں یا دیواریں اور چھتیں؟''

''ذرا اپنا اسکیچ تو دکھاؤ۔'' ہیلن نے بے تکلفی سے کہا۔

''گھبرانے کی ضرورت نہیں، میں گیل کی سہیلی ہوں۔'' اس نے اپنا تعارف کرایا اور فراخ دلی سے مسکراتی رہی۔

''میں تنقید کے معاملے میں بہت حساس ہوں مس ہیلن اس لئے ادھوری تصویریں دکھانا پسند نہیں کرتا۔'' اس نے گیل کی طرف متوجہ ہو کر کہا۔

''آج رات کے کھانے کے بارے میں کیا خیال ہے؟''

''مجھے افسوس ہے۔'' گیل نے بے اعتنائی کا مظاہرہ کیا۔

''کل دوپہر کا کھانا؟''

''نہیں، شکریہ۔'' گیل کی رکھائی برقرار رہی۔

''صبح کا ناشتہ چائے یا کافی وغیرہ وغیرہ؟'' اسٹیو نے اصرار کیا اپنا اسکیچ اس کے سامنے کر دیا، وہ ایک شاندار تصویر تھی جسے دیکھ کر گیل خوش ہو گئی۔ وہ مسکرانے لگی تو اسے احساس ہوا کہ اب اس نوجوان کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا اس نے دعوت قبول کر لی۔

وہ دیر تک نہاتے رہے اور پھر ساحلی ریستوران میں کھانے کے لئے بیٹھ گئے۔ یہ جگہ گفتگو کے لئے مناسب نہیں تھی وہاں بہت شور ہو رہا تھا۔ گھر کی طرف واپسی کے دوران بھی زیادہ بات چیت نہیں ہوئی بلکہ دوستانہ خاموشی طاری رہی۔ وہ دونوں ہی بری طرح تھک گئے تھے۔ جب وہ گرزن ہاؤس کی پارکنگ میں پہنچے تو رات کے نو بجے سے زیادہ وقت ہو چکا تھا۔ اسٹیو نے اس کے ساتھ اندر جانے کی خواہش ظاہر کی۔ گیل کے چہرے پر ہچکچاہٹ دیکھتے ہی وہ جلدی سے بولا۔

''میں اس عمارت کو اندر سے دیکھنا چاہتا تھا تاکہ یہ معلوم کر سکوں کہ کہیں سے کسی نقب زن کے اندر داخل ہونے کا امکان تو نہیں۔''

''اگر تم صرف اسی وجہ سے اندر جانا چاہتے ہو۔'' گیل نے سرد لہجے میں کہا۔ تو تمہیں یہ بات بھول جانی چاہیے۔''

''یہ تو صرف پہلی وجہ تھی۔ اسٹیو نے شریر لہجے میں کہا۔

''دوسری وجہ یہ ہے کہ میں تمہیں بہلانا چاہتا ہوں۔''

''ایک ہی وقت میں دونوں جواب غلط ہیں مسٹر ٹائز۔ خدا حافظ شب بخیر۔'' وہ گاڑی سے اتر کر گھر میں داخل ہوئی۔ جب وہ اپنے کمرے میں پہنچی تو ایک تحریری رقعہ ہال کی میز کے لیمپ کے نیچے رکھا ہوا تھا۔ یہ مسز بیلنگر کی تحریر تھی۔ ''میں اپنی بہت کے ہاں جا رہی ہوں گیل۔ گیارہ بجے سے پہلے واپس آ جاؤں گی۔''

دو گھنٹے کی تنہائی کے احساس نے فوری ردعمل کیا۔ وہ جلدی سے باہر بھاگی اس نے دروازہ کھولا تو اسٹیو واپس جا رہا تھا اس کی تیز آواز سن کر وہ رک گیا اور اس نے پلٹ کر دیکھا۔ ''کیا بات ہے گیل؟''

''تم اندر آ سکتے ہو۔'' اس نے کہا۔ ''لیکن تمہیں صرف اپنی پہلی وجہ کو ذہن میں رکھنا چاہیے۔''

جب اسٹیو نے دروازے اور کھڑکیوں کا جائزہ لینا شروع کیا تو اس کے انداز میں عجیب سی تبدیلی آ گئی۔ اب وہ ایک کھلنڈر نوجوان دکھائی نہیں دیتا تھا بلکہ وہ ایک منجھا ہوا سراغ رساں نظر آ رہا تھا اس نے بھی لیفٹیننٹ کی طرح اور بالکل اسی جیسے سوالات کئے اور اثبات میں سر ہلاتا رہا۔ اس نے اپنی تحقیقات کو ایک ڈائری میں درج کیا اور پھر گیل کو ساتھ لے کر تہہ خانے میں اتر گیا اس نے بالا خانے کی تلاشے تنہا ہی جا کر لی تھی۔ اور اس کے بعد گیل کی خواب گاہ میں واپس آ گیا تھا۔ گیل نے گہری نگاہ سے اس کی طرف دیکھا تو اس نے مسکرا کر کہا۔ میں فی الحال پہلی وجہ کے مطابق ہی کام کر رہا ہوں۔ اس نے گیل سے دریافت کیا کہ اسے سنائی دینے والی آوازیں کیا صرف با خانے سے ہی سنائی دیتی ہیں۔

''نہیں......!'' گیل نے جواب دیا۔

''اس کے علاوہ تم کیسی آوازیں سنتی رہی ہو؟''

''صرف آوازیں۔ ان آوازوں کی وضاحت بہت مشکل ہے مسٹر ٹائز۔ کبھی تو یہ آوازیں کمرے سے آتی ہیں اور کبھی زینے سے کبھی کبھی کوئی آواز الماری سے نکلتی ہے اور پھر ایسی ہی آوازیں بالا خانے سے بھی سنائی دیتی ہیں۔ ایک بار تو مجھے یہ احساس ہوا کہ میری خوابگاہ کا دروازہ کھل رہا ہے لیکن یہ ایک ناممکن سی بات ہے۔''

''اس کے ناممکن ہونے کی کیا وجہ ہے؟''

''میں اس دروازے کو ہمیشہ مقفل رکھتی ہوں۔''

''غالباً اس مقصد کے لئے تم چابی استعمال کرتی ہو؟''

گیل نے اسے تالے کی ساخت اور اسے بند کرنا کا طریقہ سمجھایا اس تالے کو چابی کے ذریعے باہر سے کھولا جا سکتا تھا لیکن اس کی صرف ایک فالتو چابی تھی۔ اور وہ مسز بیلنگر کی تحویل میں رہتی تھی۔

''ممکن ہے تم صرف مسز بیلنگر کے قدموں کی آہٹ سنی ہو؟'' اسٹیو نے کہا۔

''نہیں اس بے چاری کے پاؤں خراب ہیں۔ وہ چلنے کی بجائے بیٹھنے کو ترجیح دیتی ہے۔ ایک روز غالباً تین ہفتے پہلے وہ نیچے تھے کہ میں نے وہ خوفناک خواب دیکھا تھا۔ اس روز وہ باورچی خانے میں تھی اور اس نے میری چیخیں انٹرکام سے سنیں تھیں۔'' گیل نے وضاحت کرتے ہوئے کہا۔ کیا تم اپنے اس خواب کو تفصیل سے سنانا پسند نہیں کرو گی؟

''غالباً تم یہ کہنا چاہتے ہو کہ میرا بینک میرے خوابوں کو تجزیہ کروانا چاہتا ہے۔''

''نہیں۔'' اسٹیو مسکرانے لگا۔ ''ہم یہ کام تمہارے ڈاکٹر وانر کے لئے چھوڑ دیں گے۔''

''میرا خیال ہے تمہیں اس تک پہنچنے میں کوئی خاص دشواری نہیں ہوئی ہوگی۔'' گیل نے طنزیہ لہجے میں کہا۔

گیل کی خواب گاہ میں کوئی غیر معمولی چیز نہیں تھی اگر وہاں کچھ تھا تو اسٹیو اس تلاش کرنے میں کامیاب نہیں ہوا تھا اس نے ملحقہ دروانیے کی طرف دیکھا اور گیل سے دریافت کیا کہ برابر والے کمرے میں کون رہتا ہے یا وہ کمرہ کس کے پاس تھا'

''یہ کمرہ میری ماں کے پاس تھا۔''

''کیا وہ اس کمرے میں اپنا زیادہ تر وقت گزارتی تھی؟''

''صحت خراب ہونے کے بعد اس کا وقت اسی کمرے میں گزرتا تھا۔''

''غالباً وہ علاج کے لئے کسی اسپتال میں نہیں گئی تھی۔؟''

''نہیں اس کا علاج گھر میں ہی ہوتا رہا تھا۔ وہ خوفزدہ تھی۔ اسے خدشہ تھا کہ اس کو گھر سے دور کیا جا رہا ہے۔ اس لئے وہ گھر سے اسپتال میں منتقل ہونا نہیں چاہتی تھی۔ بہرحال اب حالات تمہارے سامنے ہیں۔ میں نہیں چاہتی کہ بینک بلاوجہ میرے معاملات میں دخیل ہو۔''

اسٹیو اس کی طرف بڑھا اس نے گیل کو اپنی بانہوں میں لے لیا اور اسے حیرت ہوئی کہ گیل نے مزاحمت کرنے کی بجائے اپنے ہونٹ بوسے کے لئے آگے بڑھا دیئے تھے۔ وہ ایڑی سے دروازہ بند کرنا ہی چاہتا تھا کہ اس کی نگاہ ریچھ کے کھلونے کی طرف اٹھ گئی۔ اس کا منہ اور چہرہ ناگواری سے سکڑا ہوا تھا۔

ٹیڈیسکو اوقت اپنے دفتر میں ایک پرنٹ دیوار پر چپکا رہا تھا یہ اگلے روز صبح کی بات ہے۔ کیا تم نے مجھے صرف یہی دکھانے کے لئے بلایا تھا؟'' اسٹیو نے کہا۔

''نہیں بلکہ ہماری آمدنی میں اضافہ ہونے والا ہے۔ مجھے امید ہے اسٹیو کہ تم اسے پسند کرو گے۔ ایک گم شدہ وارث کی تلاش کے بعد اس کے دادا کی طرف سے دس ہزار ڈالر ہمیں مل سکتے ہیں۔ اس کا نام اپیل گارڈ ہے۔''

''اوہ، تو یہ ایک نیا معاملہ ہے سین پرانے معاملے کا کیا ہوا؟'' اسٹیو نے حیرت سے کہا۔

''گرزسن کیس؟ تم نے بہت شان دار کام کیا ہے برخوردار۔ اب ہمیں گیل کی طرف سے کوئی خطرہ نہیں۔ وہ تمہاری محبت کے جال میں پھنس گئی ہے۔''

''کیا تم سب جگہ اسی طرح باتیں کرتے پھر رہے ہو؟'' اسٹیو نے ناگواری سے کہا۔

''فی الحال یہ سمجھ لو کہ تمہارا کام مکمل ہو گا ہے۔ ہمارے کندھوں پر ذمے داریوں کا بوجھ بڑھ گیا ہے اور تھوڑی سی آمدنی بھی بڑھ گئی ہے۔'' بینکر نے خوش دلی کہا۔

''لیکن تمہیں معلوم ہونا چاہئے کہ گیل نے بینک سے نفرت کرتی ہے اور وہ عمر کے پچیسویں سال میں پہنچتے ہی بینک بدل لے گی۔ وہ لڑکی پاگل نہیں ہے۔''

ٹیڈیسکو نے سنجیدگی سے اس کی طرف دیکھا اور ایک طویل سانس لے کر کہا۔ ''ٹھیک ہے برخوردار خوب صورت لڑکیاں تمہارے نزدیک پاگل نہیں ہوسکیں۔ محبت سے دل دھڑکنے لگیں تو یہ یقین دلانا اور بھی مشکل ہو جاتا ہے لیکن میں پوچھتا ہوں کہ تم اس حقیقت کو کیوں نظر انداز کر رہے ہو جو ہماری ذاتی تحقیق کے بعد سامنے آئی ہے؟ کیا تم ان تمام باتوں کا کوئی دوسرا جواز پیش کر سکتے ہو جو اس کے ساتھ ہو رہی ہیں؟''

''اگر تم کوئی دوسرا جواب چاہتے ہو تو میرے پاس وہ بھی موجود ہے۔'' اسٹیو نے سخت لہجے میں کہا۔

''میں سن رہا ہوں برخوردار'' ٹیڈیسکو نے سنجیدگی سے کہا اور منہ چلانے لگا۔

''مجھے یقین ہے کہ اس شیطانی کارنامے کے پیچھے کوئی ایسا ہاتھ کام کر رہے ہیں جو اس کا سب کچھ چھین لینا چاہتا ہے۔'' اسٹیو نے کہا اور اپنے چچا کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال دیں۔

''یہ بات میرے وہم و گمان میں بھی نہیں تھی کہ تمہارا دماغ کام کر رہا ہے۔'' ٹیڈیسکو نے گھومنے والی کرسی میں تقریباً گرتے ہوئے کہا۔

''میں صرف یہ معلوم کرنا چاہتا ہوں کہ اگر گیل کو کچھ ہو گیا تو ساری جائیداد کسے ملے گی؟''

''غالباً اس کے چچا گلبرٹ سوان کے نام منتقل ہو گی۔''

''تم اس کے بارے میں کیا جانتے ہو؟'' اسٹیو نے کہا۔ ''کیا وہ ایک دولت مند آدمی ہے؟''

''یہ بات میرے علم میں نہیں کہ اس کے پاس کتنی دولت ہے۔''

''اس کا صاف مطلب ہے وہ گیل کے بعد اسے بے اندازہ دولت مل سکتی ہے۔ اگر اس لڑکی کو کسی سینی ٹوریم

میں پہنچا دیا جائے تو کیا ہوگا؟"

ٹیڈ یسکو خاموش رہا۔ پھر اس نے گہری سنجیدگی سے کہا۔ "تم نے گذشتہ پندرہ منٹ میں یہ دوسری عجیب بات کی ہے اگر تمہارا خیال یہ ہے کہ گیل یہ سب کچھ کسی کوے سوچے سمجھے منصوبے کے ردعمل کے طور پر کر رہی ہے تو میں تمہارے تخیل کی داد دیئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ یہ خیال غلط ہے برخوردار اسے ذہن سے نکال دو۔"

"کچھ بھی سہی۔ مجھے مسٹر سوان کا پتہ بتاؤ۔ میں اس سے ملنا چاہتا ہوں۔"

ٹیڈ یسکو نے گھڑی کی طرف دیکھا۔ "مجھے افسوس ہے کہ اس وقت ایک اہم ملاقات ہونے والی ہے۔ لہذا تمہیں یہاں سے فوراً رخصت ہو جانا چاہیے۔"

"میں وعدہ کرتا ہوں کہ میں کوئی احمقانہ قدم نہیں اٹھاؤں گا۔ اور جو کچھ بھی کروں گا اس میں بینک کو ملوث نہیں کروں گا۔ اور نہ تمہیں میرے اخراجات برداشت کرنے پڑیں گے۔" اسٹیو نے اصرار کیا۔

ٹیڈ یسکو نے اپنا قلم جیب میں رکھا اور کرسی سے اٹھ کھڑا ہوا۔ وہ بینک کی طویل راہداری میں خاموشی سے چلنے لگا۔ اسٹیو اس کے ساتھ ساتھ رہا۔ دروازے تک وہ منت سماجت کرتا رہا۔ "چچا ساؤل۔" اس نے استدعا کی۔

"میں یہ بات ذاتی احسان خیال کروں گا۔ کم از کم میرے لئے یہی ممکن بنا دو کہ میں اس شخص سے بات کر سکوں۔ میں صرف اپنے تجسس کی تسکین چاہتا ہوں۔"

بینکر نے ایک طویل سانس لی۔ "میں تمہارے اس تجسس کی تسکین اسی وقت کر سکتا ہوں۔ اگر تمہارا خیال یہ ہے کہ گیل کا چچا سوان اس پر اسرار صورت حال کے پیچھے کوئی کام کر رہا ہے تو تمہارا اندازہ غلط ہے۔ گلبرٹ سوان اور اس کا بیٹا تقریباً اکیس سال سے یورپ میں مقیم ہیں۔ اب یہ خیال ذہن سے نکال دو۔ اگر تم واقعی کسی سے گفتگو کرنے کے لئے بے چین ہو تو تمہیں اس ماہر نفسیات سے بات کرنی چاہیے۔ جو گیل کا علاج کر رہا ہے۔"

ڈاکٹر وانر نے اسٹیو ٹائز کو ناپنے والی نگاہ سے دیکھا۔ اس کی نگاہ اس قدر تیز اور گہری تھی کہ اسٹیو کو احساس ہونے لگا۔ ڈاکٹر نے اس کا قد، اس کا وزن اور سالانہ آمدنی تک کا اندازہ لگا لیا ہے۔ اس احساس کے باوجود وہ صبر وتحمل سے بیٹھا ڈاکٹر کی طرف دیکھتا رہا۔ حتی کہ وانر نے اس کے سوال کا جواب دینے کے لئے لب کشائی کی۔ کیا میں بد روحوں اور آسیبی عمارتوں پر یقین رکھتا ہوں؟ اس نے اسٹیو کا سوال دہرایا۔ "نہیں لیکن میں آسیب زدہ لوگوں پر ضرور یقین رکھتا ہوں۔"

"میں اس کے بارے میں نہیں کہہ رہا تھا مسٹر ٹائز اور نہ ہی کچھ کہنا چاہتا ہوں۔"

"غالباً تم اپنی مریضہ کے بارے میں کوئی، انکشاف نہ کر کے اخلاقی قدروں کی پاس داری کر رہے ڈاکٹر۔" اسٹیو نے عجیب سے لہجے میں کہا۔

"لیکن میں درخواست کروں گا کہ کم از کم اس معاملے میں ایسا نہ کرو۔"

"کیا یہ استدعا بینک کی جانب سے ہے؟ یا یہ تمہارا ذاتی معاملہ ہے؟"

"جیسا کہ میں تمہیں بتا چکا ہوں کہ ٹرسٹ ڈیپارٹمنٹ نے گیل کی حفاظت کے لئے میری خدمات۔" اسٹیو نے لہجہ بدلتے ہوئے کہا۔

"تمہیں معلوم ہے ڈاکٹر کہ مجھے اس کے ہر ردعمل کی رپورٹ پیش کرنے کا حکم دیا گیا ہے تاکہ ٹرسٹ یہ اندازہ لگا کر کوئی مناسب اقدام کرے کہ کہیں لڑکی دماغی طور پر کسی مرض میں مبتلا تو نہیں۔"

"کیا تم نے وکالت بھی پڑھ رکھی ہے؟" وانر نے خشک لہجے میں کہا۔ "کیا تم نے ذاتی طور پر کوئی اندازہ لگایا ہے؟" اس نے ہاتھ ملتے ہوئے کہا۔

"ذاتی طور پر میرا خیال ہے کہ اس کی ضرورت نہیں ہے۔"

"گویا تم کوئی فیصلہ کر چکے ہو۔"

"ہاں مجھے یقین ہے کہ وہ دماغی مرض میں مبتلا نہیں ہے میرے خیال میں وہ ایک حصہ سے زیادہ جذباتی لڑکی ہے۔ میں اس بات پر یقین نہیں کر سکتا کہ وہ اپنے بالا

خانے سے پراسرار آوازیں سن رہی ہے۔''

''کیا اس نے تمہیں بتایا ہے؟''

''ہاں وہ مجھے سب کچھ بتا چکی ہے۔'' اسٹیو نے کہا۔

''اور تم نے بلا تاخیر یہ بات بینک تک پہنچادی تھی۔'' ڈاکٹر کا لہجہ مزید خشک ہوگیا۔

''میں انہیں اطلاع دینے پر مجبور تھا۔''

''کیا تمہیں معلوم ہے کہ بینک اس بات کو گیل کے خلاف استعمال کرسکتی ہے؟ پاگل پن کی آڑ لے کر۔''

''یہی وجہ ہے کہ میں تم سے بات کرنے آیا ہوں۔'' اسٹیو نے اس کی بات کاٹ دی۔ ''میں نہیں چاہتا کہ اس لڑکی پر ہلکی سی بھی آنچ آئے۔''

ڈاکٹر وانر بہ غور اس کی طرف دیکھتا رہا اب اس کی آنکھوں میں پہلے جیسی سختی نہیں تھی بلکہ وہ نرم نگاہ سے اسے دیکھ رہا تھا اس کے چہرے سے بھی سختی کم ہوگئی تھی اس نے ایک طویل سانس لی اور دھیمے لہجے میں کہا۔ ''غالباً تم مددگار ثابت ہوسکتے ہو۔''

''کیا میں......؟'' اسٹیو اچھل پڑا۔ ''ہاں ہاں کیوں نہیں بتاؤ میں کیا کرسکتا ہوں۔؟''

''گیل گزسن ایک عجیب مسئلے سے دوچار ہے۔ اس کی یادداشت میں چند ایسی باتیں محفوظ ہیں جنہیں وہ عام حالت میں بھول چکی ہے۔ وہ کثرت بے خوابی کا شکار رہی ہے اس کے گرد ایک فرضی آسیب کا حلقہ ہے جسے توڑنا بہت ضروری ہے۔''

''وہ مجھے بتا چکی ہے۔''

''کیا اس نے تمہیں اس رات کے بارے میں بھی بتایا ہے۔ جب اس کی ماں نے خودکشی کی تھی؟ اس رات گیل نے کوئی ایسی خوفناک بات محسوس کی تھی یا دیکھتی تھی جو بالآخر اس کے دماغ پر اثر انداز ہورہی ہے۔''

اسٹیو کے لہجے میں ہچکچاہٹ پیدا ہوئی۔ ''مجھے معلوم ہے کہ بچپن میں وہ بیمار رہ چکی ہے۔ مجھے یہ بھی معلوم ہے کہ اس کا تعلق اپنی ماں کی خودکشی سے ہے لیکن یہ کوئی حیرت انگیز بات نہیں۔ اس کا باپ اس کی پیدائش سے پہلے ہی مرچکا تھا اس کی ماں دیوانگی کا شکار ہوئی اور بالآخر اس نے خود کو ہلاک کرلای تھا۔ تمہارا کیا خیال ہے ڈاکٹر چھ سال کی عمر میں تم ذہنی طور پر کتنے متوازن تھے؟''

ڈاکٹر وانر نے پنسل میز پر رکھی اور اسے گھمانے لگا۔ جب گھومتی ہوئی پنسل رک گئی تو اس کا نوک دار حصہ اسٹیو کی جانب تھا۔ ''اس نے تمہیں دروازے کے بارے میں کیا بتایا ہے؟''

''کچھ بھی نہیں۔'' اسٹیو نے حیرت سے کہا۔

''کیا تمہیں معلوم ہے کہ اس رات گیل کا دروازہ کھلا تھا اور کوئی چیز اندر داخل ہوئی تھی۔ کوئی ایسی خوفناک چیز جسے دیکھنے کے بعد اس کے ذہن نے کام کرنا چھوڑ دیا اور اس کے دماغ پر ایک ایسا پردہ پڑ گیا جو آج بھی پڑا ہوا ہے؟''

''نہیں ڈاکٹر۔'' اسٹیو نے بے بسی سے کہا۔ اس نے ایسی کوئی بات مجھے نہیں بتائی کیا اس نے تمہیں کچھ بتایا تھا۔؟''

''یہ سب کچھ میں نے اس کے بیانات سے معلوم کیا ہے۔ مجھے اب تک جو معلومات حاصل ہوئی ہیں ان کا نتیجہ یہی ہے۔ کیا تمہیں معلوم ہے گزسن کے کیس کی فائل بہت موٹی ہے؟''

''اس فائل میں ان باتوں کے علاوہ کیا ہوسکتا ہے کہ اسے خوفناک خواب نظر آئے اور وہ مرنے کی حد تک خوفزدہ ہوگئی یا خوف کی زیادتی سے اس کا ذہنی توازن بگڑ گیا ہے۔'' اسٹیو نے تلخی سے کہا۔

''میڈ کلینک کے ڈاکٹروں کو ان خوابوں کے بارے میں کچھ علم نہیں تھا اس لئے وہ تجزیہ کرنے میں کامیاب نہیں ہوسکے تھے۔ گیل کے لاشعوری ذہن کی زبردست مدافعت نے یادداشت کو سامنے آنے سے روک دیا تھا۔ میں صاف گوئی سے یہ بتادینا چاہتا ہوں کہ جب تک یہ مدافعت ختم نہیں ہوتی اس کا علاج ممکن نہیں۔''

''تمہارا مطلب ہے کہ وہ اس خوفناک چیز کو ایک بار پھر سے شعوری ذہن میں لے آئے ہیں؟''

’’ہاں۔‘‘ وانر نے سنجیدگی سے کہا۔ ’’اب یہ یاد کرنا اس کے لئے ناگزیر ہے۔ کہ اسے کیا چیز اس حد تک خوفزدہ کر رہی ہے۔ اس چیز کی باقاعدہ شبیہہ سامنے آنی چاہئے۔ اس کا حلیہ ہمیں معلوم ہونا چاہیے لیکن یہ بات وہ ایک چھ سالہ بچی کی طرح نہیں بلکہ ایک پچیس سالہ عورت کی حیثیت سے سامنے لانے کی کوشش کرے۔ ورنہ اس مبہم خوف کو کون شناخت کر سکتا ہے؟‘‘

’’اور اس کے بعد وہ ذہنی طور مکمل صحت یاد ہو جائے گی؟‘‘ اسٹیو نے کہا۔ ’’لیکن اس بات کی کیا ضمانت ہے کہ وہ اس خوفناک چیز کو یاد کرنے کے بعد اس سے خوفزدہ نہیں رہے؟ ممکن ہے یہ بات اس کے لئے زیادہ خطرناک ثابت ہو۔‘‘

’’مجھے تمہاری مدد اس سلسلے میں درکار ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ وہ کم سے کم مدافعت کرے وہ سچ کا اظہار اس طرح کر دے کہ خود اسے معلوم نہ ہو سکے۔ اس خوفناک خواب کا آغاز اس رات وہا تھا جب اس کی ماں کی لاش دفن کرنے کے لئے لے جائی گئی تھی وہ اس وقت انتہائی خوفزدہ تھی۔ اس نے ماں کی لاش کو آخری بار دیکھنے سے انکار کر دیا تھا۔ یہ ایک ایسی حقیقت ہے جو اسے آج بھی تکلیف دیتی ہے۔ وہ سونے کے لیٹی تو لاش جا چکی تھی۔ نصب شب کے قریب اس نیا اپنی زندگی کا بھیانک ترین خواب دیکھا تھا۔ ہمیں صرف اتنا معلوم ہے کہ اس نے اپنی خواب گاہ کا دروازہ کھلتے دیکھا تھا۔ اور اس کے بعد اسے اتنی خوفناک چیز نظر آئی تھی جس نے اس کی دماغی حالت بے ترتیب کر دی۔‘‘

’’کیا اس رات کا منظر سامنے رکھ کر یہ تعین نہیں کیا جا سکتا کہ وہ خوفناک چیز کیا ہوگی؟‘‘

’’کیا تم مجھے بتا سکتے ہو وہ کیا تھا؟‘‘ وانر نے کہا۔

’’یقیناً۔‘‘ اسٹیو نے کہا۔ ’’میرا اندازہ ہے کہ اس نے اپنی ماں کو دیکھا تھا۔ مردہ ماں کی لاش۔‘‘

’’ہاں۔‘‘ وانر کرسی کی پشت سے ٹک گیا۔ ’’اس کا بھی یہی خیال تھا۔‘‘

’’کیا کہا؟ کس کا خیال ڈاکٹر؟‘‘

’’گیل گرسن کے چچا کا خیال۔ مسٹر سوان نے لندن روانگی سے پہلے تدفین کی تمام رسومات پوری کی تھیں۔ میڈ کلینک کے ماہر نفسیات نے اسے خط لکھا جواباً اس نے یہی وجہ بیان کی تھی۔‘‘

’’اور تمہارا ذاتی خیال کیا ہے ڈاکٹر؟‘‘ وانر کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے اسٹیو نے کہا۔

’’حقیقت تو یہ ہے کہ مجھے خود بھی معلوم نہیں۔‘‘ ڈاکٹر نے کہا اور داڑھی کی نوک کو پر خیال انداز میں چھیڑنے لگا۔

سیلیا لوسی کے جسم پر اس وقت سے کچھ زیادہ گوشت اور چربی چڑھ گئی تھی جب اسٹیو اس سے آخری بار ملا تھا۔ اسٹیو کا خیال تھا کہ اس کا آخری کام کسی ایسے قصبے میں مکمل ہوا ہے جہاں کھانے کی افراط تھی۔ ’’پیرس‘‘ اس نے کہا۔ ’’ہاں میں وہاں بہت زیادہ کھاتی رہی ہوں۔‘‘ ہو پلکیں جھکا کر اسٹیو کی طرف دیکھتے ہوئے سر ہلانے لگی۔

’’میں کل تمہارے دفتر میں تمہیں فون کروں گا۔‘‘ اسٹیو نے کہا۔

’’مجھے؟‘‘ وہ خوشی سے چیخ پڑی۔ ’’اوہ ڈارلنگ بلآخر تمہیں احساس ہو گیا کہ تم میرے لئے دیوانے ہو۔‘‘

’’میں تمہیں ایک اطلاع کے سلسلے میں فون کروں گا اور تم اپنے بیورو کے وسیع ذرائع استعمال کر کے ایک آدمی کے بارے میں بتاؤ گی۔ اس کا نام گلبرٹ سوان ہے اور وہ وہیں کا رہنے والا ہے جہاں تم رہا کرتی تھیں۔‘‘

اگلے روز جب رات کے وقت وہ گیل سے ملا تو اسے احساس تھا کہ گیل اس کی گھبراہٹ سے آگاہ ہے اس نے تین بار سیلیا کو فون کیا تھا لیکن کوئی کامیابی نہیں ہوئی تھی۔ اس نے ٹال مٹول سے کام لیا تھا جس کا واضح مقصد یہ تھا کہ وہ ایک پر تکلف دعوت کی متمنی سے آخری بار اس نے شام کو فون کیا تو جواب ملا کہ رات اسے گھر پہ فون کر کے معلوم کرے وہ سوچ رہا تھا کہ ممکن ہے اب کوئی خاطر خواہ جوب مل جائے گا۔

ڈنر پر گیل خوب چہک رہی تھی اور اسے اپنی زندگی

میں رونما ہونے والی تبدیلیوں کے بارے میں بتا رہی تھی۔

''میں نے آرٹ لیگ کو خیر باد کہہ دیا اسٹیو۔ میرے خیال میں میرا اس طرح وقت ضائع کرنا بہتر نہیں جبکہ ہیلن کے نزدیک ایسا کرنا ایک غلطی ہے تمہارا کیا خیال ہے اسٹیو؟''

نہیں یہ غلطی نہیں ہے بلکہ تمہارے احساس کے مطابق ٹھیک ہے۔''

''دراصل اب تک میں ہیلن کی وجہ سے وہاں رہی ہوں۔ اس کا دوست لیری اسے چھوڑ چکا ہے اس لئے مجھے اس سے گہری ہمدردی ہے۔''

''کون لیری......؟'' اسٹیو نے چونک کر کہا۔ اس کا ذہن فون کی طرف الجھا ہوا تھا۔

''میں اس سے کبھی نہیں ملی، لہٰذا کچھ نہیں بتا سکتی لیکن بہر حال وہ بیچاری ہیلن کے لئے بہت اہم تھا۔ اس کی حالت بہت تباہ کن ہے اسٹیو مجھے اس سے ہمدردی ہے۔''

''اوہ، میں ایک فون کر کے ابھی آتا ہوں۔'' اسٹیو نے کہا۔

سلیپا نے جب اس کی کال کا جواب دیا تو اس کا لہجہ پردرد تھا۔ ''میں جانتا ہوں ڈارلنگ تم کیا محسوس کر رہی ہو۔ لیکن یہ ایک اہم معاملہ ہے جسے نظر انداز کر کے تم مجھے نقصان بھی پہنچا سکتی ہو۔'' اسٹیو نے ماؤتھ پیس میں کہا۔

''یہ بات نہیں ہے ڈیئر دراصل میں تمہارے اس دوست کے بارے میں معلوم کر چکی ہوں لیکن مجھے افسوس ہے تمہیں خوش خبری نہیں سنا رہی ہوں۔'' سلیپا نے کہا۔

''میں تمہارا مطلب نہیں سمجھا؟''

''مر چکا ہے اسٹیو گلبرٹ سوان مر چکا ہے۔ کیا وہ تمہارا گہرا دوست تھا؟''

''نہیں۔'' اسٹیو کو کمرہ گھومتا محسوس ہونے لگا۔ ''یہ کب کی بات؟''

''چھ ماہ قبل۔'' سلیپا نے کہا۔ ''وہ اور اس کا بیٹا پائز کسی حادثے میں مر گئے تھے۔ اگر میں تمہارے پاس ہوتی ڈارلنگ تو میں۔''

اس نے ریسیور کریڈل پر پٹخ دیا۔ آگے سننا اس کے لئے دشوار تھا۔

''معلوم نہیں کیوں میرا دل رو رہا ہے۔'' گیل نے کہا۔ وہ اسٹیو سے لپٹی ہوئی سسک رہی تھی۔ اسٹیو کی قمیض جیب کے پاس سے آنسوؤں سے تر ہوگئی تھی۔ ''اس حادثے کے متعلق سننا ہی کس قدر افسوسناک ہے۔ کیا تم میری حالت کا اندازہ لگا سکتے ہو؟''

''میں سمجھ رہا ہوں۔'' اسٹیو نے کہا اور اسے بھینچ لیا اسے یوں چمٹا لیا جس کی پہلے اس نے کبھی اجازت نہیں دی تھی۔ ''میں صرف یہ سوچ رہا ہوں کہ باضابطہ طور پر تمہیں اس بات کی اطلاع کیوں نہیں دی گئی۔''

''میرا خیال ہے کسی کو اطلاع دینے کا خیال ہی نہیں آیا ہوگا۔ انکل گلبرٹ اور اس کا بیٹا ایک طویل مدت سے یورپ میں مقیم تھے۔ غالباً کسی کو یہ معلوم ہی نہیں کہ امریکہ میں اس کی کوئی بھتیجی بھی رہتی ہے۔ تمہیں یہ بات کیسے معلوم ہوئی؟''

''بس ایک ضابطے کی کارروائی کے ذریعے۔'' اسٹیو نے سرسری لہجے میں کہا۔ ''بینک کو ایک دستاویز کے سلسلے میں تاریخ درکار تھی اس سلسلے میں یہ حادثہ بھی سامنے آیا ہے۔''

آنسوؤں سے گیل کے رخسار بھیگ گئے تھے۔ وہ خود کو سنبھالنے لگی۔ ''تم بہت حساس لڑکی ہو گیل۔ تمہارے چھینکنے اور رونے کا انداز بھی پرکشش ہے۔''

''تم مجھے ہنسانے کی کوشش کر رہے ہو۔''

''بہر حال مجے اپنے چچا کے بارے میں کچھ اور بھی بتاؤ۔ وہ برطانیہ میں کیوں رہتا تھا؟ کیا وہ انگریز تھا؟''

''نہیں گیل نے کہا۔'' ''میرے والد کا خاندان برطانیہ سے تعلق رکھتا تھا لیکن یہ بہت پہلے کی بات ہے۔'' گیل نے کہا۔ ''لیکن وہ زیادہ پسندیدہ آدمی نہیں تھا مجھے اس بات کا اندازہ ان خطوط سے ہوتا ہے جو اس نے میرے والد کو لکھے تھے۔''

''میرا خیال ہے میں تمہارے چچا کو پسند نہیں کرتا تھا۔''

''میں بھی اسے ناپسند کرتی تھی۔'' گیل نے

کہا۔ ’’حالانکہ میری ملاقات اس سے صرف ایک ہی بار ہوئی تھی۔‘‘

’’یہ بات تمہارے چہرے سے ظاہر ہوتی ہے۔‘‘ ڈاکٹر وانر نے کہا۔ ’’میں تم سے بہت خوش ہوں۔‘‘

’’تمہارا مطلب میرے خوابوں سے ہے؟‘‘

’’ہاں۔ تم نے آخری خواب کب دیکھا تھا؟‘‘ ڈاکٹر نے سوال کیا۔

’’اب سے ایک ہفتہ پہلے تقریباً تین راتوں سے میں نے کوئی خواب نہیں دیکھا۔ میں کسی ننھی منی بچی کی طرح سوتی رہی ہوں۔‘‘ گیل نے مسکرا کر کہا۔ ’’لیکن میں نے اپنے ریچھ کھلونے کو ساتھ نہیں سلایا۔‘‘ کچھ دیر خاموش رہنے کے بعد اس نے کہا۔

’’میں جانتی ہوں کہ تم میری زندگی کے بعض حقائق جاننا چاہتے ہو۔ لیکن میں دانستہ کچھ بھی نہیں چھپا رہی ہوں ڈاکٹر۔‘‘

’’کیا تمہیں اسٹیو کے ساتھ......؟‘‘

’’نہیں ڈاکٹر۔ ابھی تک ایسا کوئی اتفاق نہیں ہوا۔‘‘ گیل نے جلدی سے کہا۔ ’’اس نے مجھے مجبور بھی نہیں کیا۔ غالباً وہ میری حالت اچھی طرح جانتا ہے اس لئے وہ مجھے کسی ایسی بات کے لئے مجبور نہیں کرنا چاہتا۔ جسے ذہنی طور پر قبول کرنا میرے اختیار میں نہ ہو۔‘‘

اچانک فون کی گھنٹی بجنے لگی۔ ڈاکٹر نے اٹھ کر ریسیور ہاتھ میں لیا۔ ’’اوہ ٹھیک ہے میں پندرہ منٹ بعد تم سے بات کرنے کے قابل ہوں گا۔ میں اس وقت وہاں نہیں آ سکتا ہیلن نہیں تم یہ ظاہر کرکے غالباً میری ہمدردی حاصل کرنا چاہتی ہو۔ اپنی آنکھیں بند کرلو اور آرام کرنے کی کوشش کرو، میں فارغ ہوتے ہی پہنچ جاؤں گا۔‘‘

’’کیا یہ ہیلن مام کوسٹ تھی؟‘‘

’’ہاں۔‘‘ ڈاکٹر نے کہا۔ ’’وہ چاہتی ہے کہ میں سب کام چھوڑ کر اسے دیکھنے پہنچ جاؤں۔ وہ بہت مایوس ہے۔ ہیلن نے کسی نوجوان سے محبت میں چوٹ کھائی ہے اور۔‘‘

’’ہاں میں جانتی ہوں۔ اس کا نام لیری ہے۔‘‘ گیل نے کہا۔

’’وہ بھی کسی وہم کا شکار ہے۔ اس کا خیال ہے کہ اس کی زندگی خطرے میں ہے۔‘‘

’’تمہیں فوراً کچھ کرنا چاہئے ڈاکٹر۔‘‘ گیل ہانپنے لگی۔

’’پولیس ایسی بے سروپا باتوں پر یقین نہیں کرتی۔ یہ لڑکی غالباً نشے کی عادی ہے۔ بہر حال تھوڑی ہی دیر بعد ایک ایسا مریض آنے والا ہے۔ جسے ہیلن سے زیادہ توجہ کی ضرورت ہے۔ میں اسے نظر انداز نہیں کرسکتا۔‘‘

’’کیا یہ دیکھنے کے لئے کہ وہ ٹھیک ہے میرا اس کے پاس جانا مناسب ہوگا؟‘‘

’’ہاں، تمہاری موجودگی اس کے لئے بہتر ثابت ہوگی۔ اسے باتوں سے بہلانے کی کوشش کرنا حتی کہ میں وہاں پہنچ جاؤں۔‘‘ ڈاکٹر وانر نے مسکرا کر کہا۔ اور اپنے کام میں مصروف ہوگیا۔

ہیلن جس عمارت میں رہتی تھی اس کی لفٹ ہچکولے کھاتی تھی اس کی پلاسٹک کی دیواریں نم آلود تھیں۔ گیل سوچ رہی تھی کہ اگر وہ اس جگہ رہتی تو اس کی اپنی ذہنی حالت بھی خطرے میں پڑ سکتی تھی۔ یہ ایک شکستہ حال جگہ تھی حالانکہ لوگ اس سے زیادہ گری پڑی جگہوں پر رہتے تھے۔ اس نے 12-G نمبر کے دروازے کی اطلاع گھنٹی بجائی لیکن جواب نہیں ملا اس نے کئی بار کوشش کی لیکن صورت حال ویسی ہی رہی جیسی کہ پہلی بار بٹن دبانے کے بعد تھی۔ ہیلن کو معلوم نہیں تھا کہ وہ اس کے ہاں آ رہی ہے۔ ممکن ہے وہ کہیں باہر چلی گئی ہو، اس خیال کے باوجود اس نے دروازے کو لٹو کو گھمایا۔ دروازہ کھلا ہوا تھا۔

گیل اندر داخل ہوئی۔ سامنے ایک تنگ راستہ تھا۔ سامنے کھڑکی کے پاس سنہری پتیوں سے بنا ہوا بدھ کا مجسمہ تھا۔ اچانک اس کی نگاہ ایک تحریر پر پڑی۔ وہ چونک کر ادھر دیکھنے لگی۔ یقیناً یہ کسی ایسے شخص کے لئے تھی جو اس دروازے سے اندر داخل ہوسکتا تھا۔ گیل نے جب اس تحریر کو اٹھایا تو اس کا ہاتھ کانپ رہا تھا۔ ہیلن نے کانپتے ہاتھوں سے لکھا تھا۔ ’’افسوس میں سب سے

شرمندہ ہوں۔" وہ پڑھنے لگی۔ "میرے سامنے بس اب یہی ایک راستہ تھا اس میں میرے علاوہ کسی کا کوئی قصور نہیں ہے۔" ہیلن نے کیا کیا ہے؟ اس نے سوچا اور آواز دی۔ "ہیلن؟"

وہ کمرہ نشست میں داخل ہوئی۔ وہ خالی تھا۔ خواب گاہ بھی خالی تھی لیکن باتھ روم کا دروازہ کھلا ہوا تھا۔ گیل دروازے کی طرف بڑھی۔ وہاں ہیلن موجود تھی۔ وہ ٹب میں لیٹی ہوئی تھی۔ اس کے جسم پر سفید نائٹ گاؤن تھا۔ جس میں خود جذب ہو رہا تھا۔ خون کی ایک لکیر سفید نائلون پر بہتی ہوئی نالی کی طرف بڑھ رہی تھی۔ اس خون کی ندی کا اخراج ہیلن کی دائیں کلائی تھی۔ یہ زخمی ہاتھ ٹب سے باہر جھول رہا تھا۔

گیل سکتے کے عالم میں اسے گھورنے لگی۔ اسے احساس بھی نہیں ہوا کہ کب ڈاکٹر وانر آ کر اس کے پیچھے کھڑا ہو گیا تھا اس نے گیل کو چھوا تھا اسے احساس ہوا کہ ذہنی طور پر وہ بالکل اسی طرح تاریک ہو گئی تھی جس سے مسز بیلنگر نے اسے نکالا تھا۔ ڈاکٹر کا انداز ماہرانہ تھا۔ جب وہ ہوش میں آئی تو اس کے ذہن میں ہیلن کے الفاظ گردش کرنے لگے۔

"خدا ڈاکٹر وانر کی داڑھی کے ایک ایک بال پر اپنی رحمتیں نازل کرے۔" وہ سوچ رہی تھی کہ ڈاکٹر واقعی اس تعریف کے قابل ہے۔ "یہ مر چکی ہے ڈاکٹر۔" وہ بڑبڑائی۔

"ہاں۔ مجھے افسوس ہے تمہیں یہاں تنہا نہیں آنا چاہئے تھا۔ میرا مریض جلدی رخصت ہو گیا تھا اس لئے میں فوراً ہی ادھر چل پڑا تھا۔"

ڈاکٹر نے کہا۔ گیل نے محسوس کیا کہ اسے ہیلن سے زیادہ اس کی حالت کی فکر ہو رہی ہے۔

"اس نے خودکشی کر لی ہے۔" اس نے سرگوشی کی۔ "ہم بہت دیر سے پہنچے۔"

"مجھے اس بات کی توقع نہیں تھی۔"

"کیا ہم اسے روک سکتے تھے ڈاکٹر؟"

"ہاں...... اس کے ساتھ ساتھ تمہیں بھی روکا جا سکتا تھا۔ لیکن۔" ڈاکٹر نے کہا۔ "بہرحال تم جاؤ اور سیدھی بستر پر چلی جاؤ میں نے تمہارے لئے جن گولیوں کو تجویز کیا ہے ان میں سے اک کھا کر سو جانا۔ جب تک کل صبح میں تمہیں فون نہیں کرتا بستر سے باہر نہ نکلنا سمجھ گئیں؟"

وہ اس وقت تک نہیں چیخی چلائی جب تک اپنے گھر واپس نہیں پہنچ گئی۔ وہ مسہری پر گری اور سسکیاں بھرنے لگی۔

خواب، خوابوں کا سلسلہ خوفناک خواب۔

وہ ایک تاریخ سڑک پر سائیکل چلا رہی تھی۔ مایوسی کے عالم میں سفید پٹی پر پہیوں کو برقرار رکھنے کی کوشش کر رہی تھی۔ عقب میں لمبے درختوں کی ایک طویل قطار تھی اور آسمان پر بادل چھا رہے تھے۔

ایک آدمی گلی میں اس کا تعاقب کر رہا تھا۔ وہ فٹ پاتھ پر چل رہی تھی۔ اس آدمی نے ٹوئیڈ کا لمبا کوٹ پہن رکھا تھا۔ احمقانہ چہرہ، پتلی گردن اور بھرائی ہوئی آواز اس کی سماعت سے ٹکرا رہی تھی۔ گیل نے آنکھیں کھول دیں۔ وہ اپنے بسر پر محفوظ تھی کہ بستر پر لوگ خود کو محفوظ کیوں سمجھتے ہیں؟ بستر تو خوفناک خوابوں اور موت کی جگہ ہے۔ وہ خواب کی تفصیلات کو یاد کرنے لگی۔ اس نے آنکھیں بند کر لیں اور دوبارہ تاریکی چھا گئی۔ گہری تاریکی۔

ایک آواز اس نے کوئی حرکت نہیں کی وہ چاہتی تھی کہ اس کے کان بھی آنکھوں کی طرح بند ہو جائیں......

دوسری آواز سنائی دی۔ اس نے آہستگی سے کروٹ لی اور تکیے کی طرف سمٹ کر خواب گاہ کی چھت کی طرف دیکھا لیکن وہ آواز بالا خانے سے نہیں آ رہی تھی۔ یہ آوازیں اس کے اپنے دروازے پر تھیں۔ "مسز ابیلنگر کیا یہ تم ہو۔" اس نے کہا۔

وہ بستر سے اٹھی اور دروازے کی طرف بڑھی۔ دروازہ کھولا وہ کانپ گئی۔

سامنے ہیلن کھڑی تھی کفن میں لپٹی خون آلود لاش۔ اس کی کلائیوں سے خون بہہ رہا تھا۔ اس نے اپنے زخمی بازو آگے بڑھائے۔ میرے ساتھ آؤ گیل میرے ساتھ چلو۔ ہیلن کے مردہ لبوں نے حرکت کی۔

مسز بیلنگر اپنی پوری زندگی میں فون کی گھنٹی سن کر اتنی خوش نہیں ہوئی تھی جتنی کہ اس وقت نظر آ رہی تھی دوسری جانب سے ڈاکٹر وانر بول رہا تھا اسے اطلاع ملی ہے کہ گیل نے فون کیا تھا۔

''نہیں.....فون فون گیل نے نہیں بلکہ میں نے کیا تھا۔'' بوڑھی خادمہ نے بے ترتیب سانسوں پر قابو پاتے ہوئے کہا۔ ''وہ انتہائی خوفناک حالت میں مبتلا تھی میں نے سوچا کہ کسی عام ڈاکٹر کی بجائے تمہیں ہی بلا لیا جائے اس بار گیل نے جو خواب دیکھا ہے وہ غالباً پہلے تمام خوابوں سے بہت مختلف تھا۔''

''کیا تم گیل سے بات نہیں کروا سکتیں۔''

''نہیں وہ اس وقت سو رہی ہے۔ اس کی حالت پاگلوں جیسی تھی اگر تم یہاں ہوتے۔''

'' پلیز مسز بیلنگر۔'' ڈاکٹر نے تحمل سے کہا۔ ٹھیک سے بتاؤ کیا ہوا تھا؟''

''مجھے ٹھیک سے تو معلوم نہیں میں نے گیل کی چیخ سنی تھی۔ چیخ سنتے ہی میں اوپر بھاگی وہ اپنی خواب گاہ کے دروازے میں بے ہوش اور سرد پڑی تھی۔''

''کیا وہ واقعی بے ہوش تھی؟''

''بالکل سرد اور بے ہوش۔'' خادمہ نے ڈرامائی لہجے میں۔ ''کفن کی طرح سفید پسینے میں شرابور اور خاموش میں نے اسے اٹھا کر بستر پر لٹا دیا تھا اور اس کے بعد وہ وحشیانہ انداز۔''

''کیا وہ ہذیانی کیفیت کی شکار تھی؟''

''اس کی کوئی بات بھی قابل فہم نہیں تھی۔ یقیناً اس نے کوئی انتہائی خوفناک خواب دیکھا تھا۔''

گیل کا کہنا ہے کہ وہ خواب ہی تھا اس سے زیادہ میں کچھ نہیں بتا سکتی۔ خادمہ۔؟؟ نے کہا۔ کیا یہ بات خود گیل نے کہی ہے؟''

''ہاں اس کا پورا جسم کانپ رہا تھا۔ میں نے اس پر کمبل ڈال دیا تھا۔''

''ٹھیک ہے۔'' ڈاکٹر نے پریشانی سے کہا۔ ''میرا خیال ہے اب وہ سو رہی ہے تو صبح تک سوتی رہے اور اسے بالکل نہ چھیڑا جائے۔ کیا اس نے میری تجویز کی ہوئی کوئی دوا استعمال کی تھی؟''

''میں یقین سے کچھ نہیں کہہ سکتی۔'' مسز بیلنگر نے کہا۔

''بہر حال وہ سوتی رہے گی۔ اس دوران میں ہمیں یہ سوچنا ہے کہ کیا کرنا چاہیے۔'' اس نے سلسلہ منقطع کر دیا۔ ''کچھ نہ کچھ ضرور کرنا چاہیے۔'' اس نے خود کلامی کے انداز میں کہا اور ہیلن کی طرف متوجہ ہوا۔ جو میلی کچیلی اور نیم عریاں حالت میں ایک صوفے میں بیٹھی ہوئی تھی۔ ڈاکٹر کے چہرے پر ناگواری کا تاثر ابھرا۔ ''تم خود کو صاف کر کے کپڑے کیوں نہیں بدل لیتیں؟ میں تمہیں اس حالت میں برداشت نہیں کر سکتا۔''

''بہت شکریہ، یہ سب کچھ سننے میں کتنا اچھا محسوس ہوتا ہے۔'' ہیلن نے کہا۔ اور سگریٹ ٹٹولنے لگی۔

''ہمیں باہر جانا ہے۔ جتنی جلدی کپڑے بدل سکو اتنا ہی بہتر ہے۔''

''جلدی کی کیا بات ہے؟ کیا تم کچھ پینا چاہتے ہو؟''

''نہیں بالکل نہیں۔'' ڈاکٹر کا لہجہ سخت تھا۔

ہیلن باورچی خانے کی طرف بڑھی۔ ''گیل گرزسن کی والدہ کیا کہہ رہی تھی؟'' اس نے گلاس برین انڈیلی اور چسکی لے کر کہا۔ ''تمہارے چہرے سے اندازہ ہوتا تھا جیسے اس نے تمہاری توقع کے خلاف کچھ کہا تھا۔''

''وہ بے ہوش ہو گئی تھی۔'' وانر نے کہا۔ ''بے ہوش اور سرد۔''

''اور اب وہ کس حال میں ہے؟''

''غالباً دوا کا اثر ہو رہا ہے۔ ملازمہ نے بتایا کہ وہ ہذیانی کیفیت کی شکار تھی لیکن وہ اسے پرسکون بنانے اور دوبارہ سلانے میں کامیاب ہو گئی ہے۔''

''کیا تمہارا منصوبہ کام کر رہا ہے ڈاکٹر؟''

''یقیناً۔'' وانر نے کہا۔ ''سب کچھ ٹھیک ہو رہا ہے۔''

''میں اس موضوع پر سنتے سنتے عاجز آ چکی ہوں۔''

''گویا تم یہ کہنا چاہتی ہو کہ میں ایک جاہل آدمی ہوں۔'' وانر غرایا۔

''اس یقین دہانی کے لئے تمہیں اپنا تعلیمی ڈپلومہ دکھانا پڑے گا۔'' ہیلن کا لہجہ بھی سخت ہوگیا۔ میں نے تمہارا تجزیہ کیا ہے کہ تم اپنی آپ کو دھوکہ دے رہے ہو ڈاکٹر۔''

''ملازمہ نے کہا ہے کہ وہ ہسٹریائی حالت کی شکار تھی۔''

''لیکن یہ سب کچھ کافی نہیں ہے۔''

''ہاں یہ واقعی کافی نہیں ہے لیکن۔''

''تمہیں تو بہت یقین تھا۔'' ہیلن نے طنزیہ لہجے میں کہا۔ ''اب لیکن ویکن کیوں کررہے ہو؟''

''ڈاکٹر ہیلن کو گھورنے لگا۔'' وہ موت سے خوفزدہ تھی؟

''موت سے کون خوفزدہ نہیں ہے؟''

''لیکن اس کا خوف شدید تھا۔ یہ خوف اس کے ذہن سے چپکا رہا چھ سال کی عمر میں اس کے ذہن میں جو گرہ لگی تھی وہ آج تک قائم ہے۔'' ڈاکٹر وانر نے کمرے میں ٹہلتے ہوئے کہا۔ ''اس نے دروازے میں جو غیر معمولی چیز دیکھی تھی وہ اس کی ماں کی لاش تھی اس نے خواب میں دیکھا کہ اس کی ماں قبر سے نکل کر اس کے کمرے میں آئی اور......''

''لیکن اس نے کبھی اس بات کا تذکرہ نہیں کیا۔''

''ہاں۔ اس نے کبھی اظہار نہیں کیا۔ اور وہ تمام ڈاکٹر بھی بے خبر رہے جن سے وہ پہلے مل چکی تھی۔ اس کے دماغ کو ایک بار پہلے دھچکا لگا تھا۔ کیا دوسری بار ایسا نہیں ہو سکتا؟''

''تم نے اسے خوناب یا اس سے ملتی جلتی کوئی اور چیز کیوں نہیں دی؟''

''بچپن میں علاج کے دوران اس پر جن دواؤں کو آزمایا گیا تھا وہ بہتر انداز میں اثر انداز نہیں ہوئیں۔ میری آزمائش کے مطابق اس میں قوت مدافعت شدید ہے اس لئے وہ کوئی مفید نتیجہ ظاہر نہیں ہونے دیتی۔''

''تو ڈاکٹر وانر بالکل بے بس ہو رہا ہے۔'' ہیلن نے طنزاً کہا۔

''بکواس بند کرو اور مجھے ڈاکٹر مت کہو۔'' وانر غرایا۔ مجھے ہر وقت کا مزاق بالکل پسند نہیں۔

''اگر حقیقت پسند ہو تو تم جو کچھ کرنا چاہتے ہو تسلیم کرلو کہ وہ ناممکن ہے۔''

''نہیں مجھے اپنے منصوبے پر اب بھی اعتماد ہے۔ ہم سے چند غلطیاں ہوئی ہیں۔ اس نوجوان نے گیل گرسن کی خوداعتمادی کو بہت بڑھادیا ہے۔''

''ہاں وہ ایک ذہین نوجوان ہے۔''

''میں جب چاہوں اس سے نجات حاصل کرسکتا ہوں۔ میں سوچ رہا تھا کہ شاید ہمارے لئے مددگار ثابت ہو۔'' ڈاکٹر وانر نے سنجیدگی سے کہا۔

''تم کتنے عرصے تک انتظار کرنا چاہتے ہو؟''

''اب زیادہ عرصہ نہیں لگے گا۔'' وانر نے پیشانی پر بل ڈالتے ہوئے کہا۔ ''یہ صورت حال برقرار نہیں رہ سکتی جب اس کی ماں پاگل ہوئی تھی تو اس کی زندگی میں کوئی مرد نہیں تھا۔ کوریا میں اس کا شوہر کھو گیا تو اس کے بعد کوئی مرد اس کی جگہ لینے میں کامیاب نہیں ہوا تھا۔ گیل گرسن جوان ہوئی تو اس نے بھی ماں کی طرح اس کمی کو محسوس کیا۔ یہ ایک ایسی نفسیاتی بات ہے جو پاگل پن کی طرح موروثی ثابت ہوتی ہے۔ اور کچھ عجب نہیں کہ بالآخر اس بات کا حل وہ بھی وہی نکالے جو اس کی ماں نے نکالا تھا۔''

''میں شرط لگانے کے لئے تیار ہوں کہ گیل خودکشی نہیں کرسکتی۔''

''اسی لئے میں اسٹیوٹائز کو نشانہ بنانا چاہتا ہوں۔ اس کے بعد لڑکی اپنی ماں کی طرح اس صورت حال کا شکار ہوجائے گی جو بالآخر اسے خودکشی پر مجبور کردے گی۔ اگر وہ اس نوجوان کو کھو بیٹھی تو یقیناً ایسا ہی ہوگا۔''

''بعض اوقات میں سوچنے لگتی ہوں کہ تم اس لڑکی کی دولت حاصل کرنے کے لئے اس سے شادی کرنا چاہتے ہو۔''

''تمہارا یہ خیال احمقانہ ہے۔'' ڈاکٹر نے کہا۔ ''وہ

مرنے کے بعد ہی میرے لئے فائدہ مند ثابت ہوسکتی ہے۔'' اس نے ہیلن کو اپنی آغوش میں گھسیٹ لیا دونوں والہانہ انداز میں لپٹ گئے۔

''اوہ ڈاکٹر وانز تم کتنے اچھے ہو۔'' ہیلن نے سر گوشی کی۔

''مجھے اس نام سے مت پکارا کرو تم میرا نام اچھی طرح جانتی ہوں۔''

''ہاں پائز۔ ڈارلنگ پائز۔ سوئٹ پائرز''

نصف گھنٹے بعد وہ باتھ روم میں گئی تو شاور کی پھوار کے نیچے پانی کی سرسراہٹ کے علاوہ اسے کچھ اور آوازیں بھی سنائی دیں۔ وہ دواؤں کے کیبنٹ میں کچھ ٹٹول رہا تھا۔ اس نے دریافت کیا کہ وہ کیا کررہا ہے؟

''اس بات کا اطمینان کررہا ہوں کہ میری کوئی چیز یہاں نہ رہ جائے؟''

''کیا کہہ رہے ہو، میں ٹھیک سے نہیں سن سکی۔'' وہ چیخی۔

''پرواہ نہ کرو۔ وانز نے کہا۔ خاموشی سے نہاتی رہو۔''

ڈاکٹر وانز جو درحقیقت گیل گزسن کے چچا کا بیٹا پائز تھا کام میں مصروف رہا۔ اس کی جیب میں ایک ڈائری تھی جس میں منصوبے کی ہر چیز کا تفصیلی تذکرہ تھا وہ ہر کام کو احتیاط اور ضابطے کے تحت کرنا پسند کرتا تھا۔ اس کے منصوبے کا نام ''گولڈن ڈور'' تھا۔ ہیلن اس کی واحد مددگار اور ساتھی تھی۔ جب اسے حادثہ پیش آیا تو پائرز نے مہذب دنیا سے دور ایک جھونپڑے میں دو ہفتے گزارے تھے اور اسے یہ معلوم نہیں ہوا تھا کہ اس کا باپ سوان زندہ ہے یا نہیں۔ ان دو ہفتوں میں اس نے منصوبہ بندی کی تھی۔ گیل گزسن کی عمارت کی چابیاں حاصل کرکے اس میں شیطانی چکر چلانا اس کے لئے کوئی بڑی بات نہیں تھی۔

ہیلن غسل خانے سے باہر نکلی تو وہ اس کے برہنہ جسم کو دیکھتا رہا۔ ہیلن نے خشک تولئے کے لئے کہا۔ اس نے تولیہ دیا۔ وہ اسے عجیب نگاہ سے دیکھ رہی تھی۔ ''کیا بات ہے ہیلن تم مجھے اس طرح کیوں دیکھ رہی ہو؟''

''میں نہاتے وقت سوچ رہی تھی کہ تمہارا منصوبہ کامیاب نہیں ہوگا۔''

''انتظار کرو اور دیکھتی رہو۔''

''وہ محبت میں مبتلا ہے۔'' ہیلن نے افسردگی سے کہا۔ ''میں جانتی ہوں کہ اس نوجوان کا گیل پر کتنا گہرا اثر ہے۔''

جب اسے اسٹیو کی حقیقت کا علم ہوگا تو اس پر کیا اثر ہوگا؟ میرا مطلب ہے جب اسے یہ معلوم ہوگا کہ بینک نے اسٹیو کی خدمات اس لئے حاصل کی ہیں کہ گیل گزسن کو پاگل ثابت کرسکے۔''

''نہیں پائرز۔ میں عورت ہوں اس لئے عورت کی فطرت سے واقف ہوں۔ وہ اسے معاف کردے گی۔ میں تم جیسے احمق کو برداشت کررہی ہوں کیا یہ مثال ناکافی ہے؟''

''بکواس بند کرو۔ ناکامی کا کوئی امکان نہیں ہے۔'' پائرز نے سرد لہجے میں کہا۔

''وہ خود کو پاگل سمجھنے پر کبھی آمادہ نہیں ہوگی۔'' ہیلن غرائی۔

''تم تنگ نظر ہو۔ لوگ جب اس کے رویے کی رپورٹ دیکھیں گے تو کیا فیصلہ کریں گے؟ کیا یہ کم بات ہے کہ اس نے اپنی مردہ سہیلی ہیلن یعنی تمہیں دیکھا تھا؟ میں اسے خودکشی کرنے پر مجبور کرنا چاہتا ہوں۔''

''لیکن اگر اس نے خودکشی نہیں کی تو؟''

''ایسی موت ضرور واقع ہوگی جو اس کی دماغی حالت سے خودکشی ثابت ہوگی۔''

''کیا مطلب ہے تمہارا؟'' ہیلن کانپ گئی اور تولیہ اس کے جسم سے سرک کر گر گیا۔ اسے اپنی برہنہ حالت کا احساس نہیں تھا۔ وہ آنکھیں پھاڑے خوفزدہ آنکھوں سے پائرز کو گھور رہی تھی۔

''یہی کہ اگر اس نے اپنے ہاتھوں مرنے کی کوشش نہیں کی تو اسے راستے سے ہٹا دیا جائے گا۔''

''اوہ خدایا۔ میں یقین نہیں کرسکتی کہ تم اسے قتل

کر دو گے۔ کیا یہ بات شروع ہی سے تمہارے ذہن میں نہیں تھی؟''

''یہ میرے پاس آخری حل تھا۔''

''نہیں ڈیئر...... میں قتل جیسا بھیانک اور گھناؤنا جرم برداشت نہیں کرسکتی میں اب تک صرف اس لئے معاونت کرتی رہی ہوں کہ تم اس احمق اور دولت مند لڑکی کو پاگل ثابت کر کے اس کی بدے اندازہ دولت حاصل کرنا چاہتے ہو اور اس طرح ہم دونوں کامیاب اور خوش وخرم زندگی بسر کریں گے۔''

پائرز خاموش رہا اور دواؤں کے کیبنٹ کو دوبارہ ٹٹولنے لگا۔

مسز بیلنگر نے جب اسٹیو کے لئے دروازہ کھولا تو اسے دیکھ کر خوش ہوگی۔ اس نوجوان کو دیکھ کر اسے سکون کا احساس ہوتا تھا۔ ''گیل بیدار ہوگئی ہے اس نے کہا۔ لیکن وہ بستر پر لیٹی چھت کو گھور رہی ہے۔ اس نے تو مجھ سے بھی کوئی بات نہیں کی۔''

''تم اس سے خاص طور پر کیا معلوم کرنا چاہتی تھیں؟''

''میں نئے ڈاکٹر سے رابطہ قائم کرنا چاہتی تھی۔'' مسز بیلنگر نے کہا۔ ''لیکن اس بجائے دوسری آواز سنائی دی۔ بعد میں اس نے خود فون کیا۔ اس کہا کہ گیل کو رات بھر سونے دیا جائے۔''

''رات جو کچھ ہوا اس کے بارے میں بتاؤ کیا عمارت میں آوازیں سنائی دی تھیں۔''

''نہیں گیل نے رات اپنی خواب گاہ کے دروازے پر کوئی غیر معمولی چیز دیکھی تھی۔ کوئی روح یا شاید بھوت۔''

اسٹیو نے گیل کے دروازے پر دستک دی۔ جب بار بار دستک کا جواب نہیں ملا تو وہ اندر داخل ہوا۔ چند لمحوں تک تو گیل اسے خوفزدہ نگاہوں سے دیکھتی رہی پھر چیخ مار کر بستر سے اٹھی اور اس کی بانہوں میں سما گئی وہ سسکیوں کے درمیان نہ جانے کیا کیا کہتی رہی۔ اسٹیو پیار سے اس کے بالوں کو سنوارتا اور اسے سمجھاتا رہا۔ بالآخر گیل نے کہا۔ ''ہیلن!''

''کیا تمہاری سہیلی ہیلن؟ اسے کیا ہوا؟''

''وہ مر چکی ہے۔'' گیل نے کہا۔ ''وہ اسٹیو اس نے کل رات خودکشی کی تھی اس نے اپنی کلائیاں کاٹ لی تھیں اور خون زیادہ مقدار میں بہنے سے اس کی موت واقع ہوگئی۔''

''کیا تم نے خود اس کی لاش دیکھی تھی؟''

''ہاں۔ سہ پہر کے بعد میں ڈاکٹر وانر کے ہاں تھی۔ ہیلن نے اسے فون کیا اور خودکشی کی دھمکی دی وہ بہت مصروف تھا۔ میں وہاں گئی تو اس وقت تک وہ خود کو ہلاک کر چکی تھی۔''

''اوہ، تم تم ہیلن کے اپارٹمنٹ میں گئی تھیں؟''

''ہاں لیکن مجھے بہت دیر ہوگئی تھی۔ میں جب وہاں پہنچی تو وہ مر چکی تھی۔ اس کی کلائیوں سے خون بہہ بہہ کر نالی میں جا رہا تھا۔'' گیل نے کہا۔

''گیل کیا تمہیں یقین ہے؟ کہیں ایسا تو نہیں کہ تم نے خواب اور کسی حقیقت کو ملا دیا ہو۔ میرا مطلب ہے تم کسی وہم میں تو مبتلا نہیں ہوگئیں۔''

''میں یقین سے کہہ سکتی ہوں۔ اس کی لاش میں نے خود دیکھی تھی اور اس کے بعد وہ یہاں آئی میں سچ کہہ رہی ہوں اسٹیو وہ کفن پہنے یہاں آئی تھی۔''

''وہ بری طرح کانپنے لگی۔ اسٹیو نے اسے دونوں بانہوں میں سنبھال رکھا تھا اس کی حالت رفتہ رفتہ ہسٹریائی ہوتی جا رہی تھی۔

''گیل، ڈارلنگ تم اس وقت پریشان ہو تم نے خوفناک خواب دیکھا ہے اور......''

''نہیں۔ یہ حقیقت ہے میرے چہرے کی طرف دیکھو اسٹیو۔'' اس نے گیل کی طرف دیکھا اس کی آنکھیں شمع کی طرح روشن تھیں۔ ''میں پورے اعتماد سے کہہ سکتی ہوں کہ میں نے ہیلن کو رات کے وقت دیکھا تھا۔ اس نے میرے دروازے پر دستک دے کر مجھے جگایا۔ میں بستر سے اٹھی اور دروازہ کھولا۔ وہ دروازے کے سامنے کھڑی تھی۔''

''نہیں ڈارلنگ...... ایسا نہیں ہے''

''اس کے جسم پر وہی خون آلود لباس تھا جو اس نے مرتے وقت پہن رکھا تھا۔ اس کی کلائیوں پر بھی خون

تھا اس نے یوں بانہیں پھیلا رکھی تھیں۔'' گیل نے عملاً بانہیں پھیلائیں۔''اس نے مجھ سے بات بھی کی تھی۔''

''کیا بات؟'' اسٹیو نے حیرت سے کہا۔

''اس نے کہا تھا میرے ساتھ آؤ۔''

''گیل پلیز سنو میں تم سے بحث نہیں کرنا چاہتا بلکہ میں تمہاری بات پر یقین کئے لیتا ہوں۔ میرے ذہن میں ایک خیال پیدا ہوا ہے۔ تم اس لڑکی کو کتنے عرصے سے جانتی ہو؟ تم اس سے پہلی بار آرٹ لیگ میں ہی ملی تھیں نا؟''

گیل نے نفی میں سر ہلایا۔'' ہماری ملاقات ایک کیفے میں ہوئی تھی۔ ہم دونوں ایک ہی میز پر تھیں۔ اس کے پاس اپنے آرٹ کے نمونے تھے اور ہمارے درمیان اس موضوع پر بات چیت ہوئی تھی۔''

''اس کا مطلب ہے کہ تم اس لڑکی کے بارے میں زیادہ نہیں جانتی ہو۔''

''اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔ ہم دونوں سہیلیاں تھیں اور رات کو میں نے۔''

ممکن ہے تم جو کچھ سوچ رہی ہو در حقیقت ویسا نہیں ہے۔ میرا مطلب یہ بھی تو ہوسکتا ہے وہ تم نے لاش کی بجائے خود ہیلن کو زندہ حالت میں دیکھا ہو۔ کیا یہ خیال تمہارے ذہن میں نہیں آیا۔

''یہ تم کیسی باتیں کررہے ہو ڈارلنگ؟''

''مردہ عورت دروازوں پر دستک نہیں دیتیں اور نہ ہی باتیں کرتی ہیں اگر تم اس امکان پر نظر ثانی کرو کہ تمہیں ہیلن کی خون آلود لاش نظر نہیں آئی تھی۔''

''لیکن میں اس کی لاش دیکھ چکی ہوں۔ کٹی ہوئی کلائیاں۔ بلیڈ اور بہتا ہوا خون۔''

''اگر یہ سب کچھ محض ڈرامہ ہوا تو؟''

''تمہارا غلط خیال ہے اسٹیو ہیلن نے پہلی بار خود کشی نہیں کی۔ میں اس کی کلائیوں پر پہلے بھی نشان دیکھ چکی ہوں۔ اس کے علاوہ ہیلن نے خودکشی کے متعلق تحریر بھی چھوڑی تھی۔''

''یہ بھی تو ممکن ہے کہ وہ ڈرامے کا پہلا منظر ہو جو محض دوسرے منظر کو اثر انگیز بنانے کے لئے تیار کیا گیا تھا۔''

''تمہارا مطلب ہے اس کی یہاں آمد دوسرا اور متاثر کن منظر تھا؟''

''ہاں تم ٹھیک سمجھ رہی ہو۔ وہ اس ذریعے سے عمارت میں داخل ہوئی جسے وہ ماضی میں استعمال کرتی رہی ہے۔ میں تو یہ اندازہ لگانے پر مجبور ہوں کہ اس نے پہلی بار نہیں بلکہ مسلسل کئی مہینوں تک ایسے مناظر سے تمہیں ہراساں کیا ہے مجھے خود اپنی باتوں پر سر دست پورا یقین نہیں ہے۔ لیکن میں اس نظریے کی تحقیقات ضرور کروں گا۔''

''تم کیا کرنا چاہتے ہو ڈارلنگ؟'' گیل نے ہانپ کر کہا۔

''میں معلوم کروں گا کہ کیا ہیلن واقعی مر چکی ہے یا زندہ ہے۔ اور کیا وہ واقعی تمہاری سہیلی ہے؟''

ویسٹ اینڈ کی طرف جاتے ہوئے اسٹیو کے خیالات ذہن میں گڈمڈ ہورہے تھے۔ بار بار اس کا شبہ اپنے بینکر کی طرف جارہا تھا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ کہیں اس کا چچا اپنے مفاد کی خاطر تو یہ ڈرامے بازی نہیں کررہا۔ جب اس کا ذہن سوچتے سوچتے آگے بڑھا تو وہ یہ بھی غور کرنے پر مجبور ہوا کہ ممکن ہے بینک کے دیگر افسران ذاتی لالچ کے تحت ایسا کررہے ہوں۔ ان کے علاوہ بھی کوئی ہستی گیل گرسن کی دولت حاصل کرنے کے لئے پیچیدہ راستہ اختیار کرسکتی ہے اور وہ کون ہے؟

ٹیکسی ویسٹ اینڈ کے قریب پہنچی تو اسے ایک پولیس ایمبولینس نظر آئی جو اسی وقت عمارت کے سامنے سے رخصت ہوئی تھی اس نے دیکھا کہ دو پٹرول کاریں بھی وہاں کھڑی ہیں۔ پولیس والوں کا وہاں ہجوم تھا۔ افسران ادھر سے ادھر آ جارہے تھے۔ وہ ٹیکسی سے اترا اور ایک پولیس والے سے وجہ معلوم کی۔

''ایک عورت نے خودکشی کی ہے۔'' پولیس والے نے کہا۔ اس کا نام ہیلن مام کوسٹ تھا۔''

اس نے اسٹریئرنگ پر جھے ہوئے اپنے ہاتھوں کی طرف دیکھا۔ سفید دستانوں میں لپٹے ہوئے اس کے

ہاتھ گولائی میں منجمد تھے۔ اس نے اپنے باپ کی تمام عادتوں میں سے صرف ایک اسی عادت کو اختیار کیا تھا وہ ایک کروڑ پتی آدمی بننے کے خواب دیکھ رہا تھا۔ اسے اپنے مستقبل کے بارے میں صرف چند خوف تھے۔ چند دروازے ایسے تھے جو بند ہو سکتے تھے۔ دروازوں کا خیال اس کے ذہن میں آتا تو اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ رقصاں ہو جاتی تھی۔ یہ بات تو یقینی تھی کہ اسے امریکہ سے دور رہنا پڑے گا۔ وہ محتاط آدمی تھا۔ اس نے واقف کاروں کا حلقہ نہیں بنایا تھا۔ وہ کام مکمل کر کے ہر ممکن جلدی سے یورپ واپس جانا چاہتا تھا وہ سوچ رہا تھا کہ وی آنا کے اسپتال میں شدید دوسری شکایت لے کر داخل ہو جائے گا۔ اس کا خیال تھا کہ اپنے ہر شناختی نشان کو ذہن سے نکال دے گا۔ اور ایک نفسیاتی مریض کا کردار ادا کرے گا۔ جس کی یادداشت حادثے کے بعد کھو گئی تھی۔ اس کے بعد اسپتال میں ہی اسے اس کی شخصیت کے بارے میں بتاتے ہوئے یہ اعلان کیا جائے گا۔ ''تم ایک امیر آدمی مسٹر سوان جونیئر بہت امیر آدمی جسے اس کی بہن کی خودکشی کے دولت ملی ہے۔''

''ڈاکٹر وانر......!''

وہ خود کو پائزر کی شخصیت میں اس قدر ڈھال چکا تھا کہ اپنے نقلی نام کو سن کر فوری طور پر چونک نہیں سکا۔ وہ زینے پر رک گیا۔ اس وقت وہ گیل گرزسن کی عمارت میں تھا۔ اس نے پلٹ کر دیکھا۔ اسٹیوٹائز سامنے کھڑا تھا۔ اس کے ہاتھوں میں ایک ٹرے تھی۔

''اوہ مجھے معلوم نہیں تھا کہ تم یہاں موجود ہو مسٹر اسٹیو۔''

''میں یہیں ہوں'' اسٹیو نے کہا۔ ''میں گیل کے لئے کھانا لے جا رہا تھا۔''

''لاؤ یہ مجھے دے دو تاکہ میں کھانے کے دوران اس سے باتیں بھی کر سکوں۔'' وانر نے کہا۔

''میرے پاس اس سے بہت خیال ہے۔ کیوں نہ اس سے پہلے ہم دونوں ہی بات کر لیں۔ مسز بیلنگر۔'' وہ خادمہ کی طرف گھوما۔ ''کیا تم اس کھانے کو چند منٹ کے لئے گرم رکھ سکتی ہو؟ میں ذرا ڈاکٹر سے بات کرنا چاہتا ہوں۔ گیل اب یہ کہنے لگی ہے کہ وہ اپنی ماں کی وجہ سے پاگل ہو رہی ہی۔ اس کا خیال ہے کہ خون کے ذریعے اس کے جسم میں ایسے جراثیم موجود ہے جو دماغ پر اثر انداز ہو رہے ہیں۔ میں یہ پوچھنا چاہتا ہوں کہ ڈاکٹر کی اس بات میں کتنی صداقت ہے؟''

''موروثی پاگل پن کے بارے میں بہت ہی پیچیدہ قسم کی رائے موجود ہیں۔''

''کیا یہ مرض آئندہ نسل میں منتقل ہو سکتا ہے؟''

''ہاں، اس کے زیادہ تر امکانات ہیں۔''

''بہرحال تم گیل کو یہ یقین دلانے کی کوشش کرو کہ اسے دماغی اسپتال میں نہیں بھیجا جائے گا۔ اگر وہ مسلسل اس موضوع پر سوچتی رہی تو ممکن ہے کوئی خطرناک قدم اٹھا لے۔''

ڈاکٹر وانر نے اثبات میں سر ہلایا اور زینے کی طرف بڑھ گیا۔

''اگر تم چیخنا چاہتی ہو تو چیخو۔'' اس نے گیل سے کہا۔ ''تم اس سے پہلے بھی میرے سامنے چیخ چکی ہو۔''

''میں چیخنا نہیں چاہتی۔ میں ایسا نہیں کر سکتی۔'' گیل بولی۔ ''غالباً کراہنے کا مطلب دوسروں کی ہمدردی حاصل کرنا ہے۔''

ڈاکٹر نے محبت سے اس کے چہرے پر آئی ہوئی لٹ کو سنوارا۔

جیسے وہ کوئی ننھی بچی ہو۔ ''کتنا دانش مندانہ جواب ہے گیل لیکن میری رائے میں یہ چرب زبانی کی ایک مثال ہے۔''

''لیکن یہ حقیقت ہے۔'' گیل نے کہا۔ ''میں نے اب تک اس بات کا مشاہدہ کیا ہے جب میں خوفزدہ ہوتی ہوں یا ایسی ہوئی کوئی دوسری بات ہوتی ہے تو چیخنے سے آرام نہیں ملتا۔ آنسو بھی بےکار جاتے ہیں۔''

''مجھے ان باتوں کی روشنی میں غور کرنا پڑے گا۔''

''کیا اسٹیو ابھی تک یہیں ہے؟ وہ کھانا لینے گیا تھا۔''

''ہاں وہ موجود ہے اور کھانا لا رہا ہے۔ دراصل

میں تم سے ملنا چاہتا تھا۔ میں چاہتا ہوں کہ اس موضوع پر سنجیدگی سے بات ہو جائے گیل میں صاف گوئی سے بات کرنا چاہتا ہوں تا کہ لائحہ عمل طے کیا جاسکے۔''

''مجھے افسوس ہے۔'' گیل نے اس کا ہاتھ تھام لیا۔ میں احمق ہوں میں نے تمہاری دی ہوئی گولیوں میں سے ایک سے زیادہ گولیاں استعمال کی تھیں لیکن اس سے خاصی مدد ملی۔ ان گولیوں میں کیا ہے ڈاکٹر؟ کا کی مارٹینی کا جوہر؟''

وانر کی پیشانی سلوٹوں سے سمٹ گئی۔ ''ہمیں سنجیدگی سے فیصلہ کرنا ہے۔ اب انتظار نہیں کیا جاسکتا۔ اگر ہم نے دیر کی تو تمہارے بارے میں رائے قائم کر لی جائے گی۔ تمہارا حالیہ وہم ایسا ہے کہ کوئی اسے نظر انداز نہیں کر سکتا۔ یہ علامت خطرے کا پیش خیمہ ہے۔ حقائق ظاہر کررہے ہیں کہ مرض جڑ پکڑ چکا ہے۔'' وانر نے محسوس کیا کہ وہ اس کی طرف متوجہ نہیں۔ اس نے گیل کی تھوڑی پکڑ کر اس کی آنکھوں میں جھانکا۔ تو اسے جھٹکا لگا۔ وہ مسکرا رہی تھی۔ ''میں تمہیں یہ احساس دلانا چاہتا ہوں گیل کہ صورت حال نازک ہو چکی ہے۔''

''ہاں میں بھی محسوس کر رہی ہوں کہ وہ سنجیدہ تھا۔''

''کون؟ کس کی بات کر رہی ہو؟''

''اسٹیو۔ اس نے مجھ سے شادی کی درخواست کی ہے۔ معلوم نہیں میں نے اسے کیا جواب دیا تھا۔ ہاں یا نہیں۔ مجھے یاد نہیں میں سوچ رہی تھی کہ وہ سنجیدہ ہے یا نہیں۔''

''گیل۔'' ڈاکٹر وانر نے کہا۔ ''مین چاہتا تھا کہ اس نوجوان کے بارے میں زبان بند رکھوں۔ مجھے حقیقت کا علم ہو چکا ہے میں چاہتا تھا کہ تمہیں اس حقیقت سے آگاہ کر دوں۔''

''کہیں تمہارا اشارہ بینک کی طرف تو نہیں ہے؟''

''ہاں۔ تم نے ٹھیک اندازہ لگایا لیکن میں اس سے بھی کچھ زیادہ کہنا چاہتا ہوں۔ کیونکہ میں محسوس کر رہا ہوں کہ وہ بینک کی طرف عائد کئے ہوئے فرائض سے آگے بڑھ کر کچھ اور چاہتا ہے۔''

''مجھے یقین ہے کہ اس نے تمہیں پاگل خانے کے بارے میں نہیں بتایا ہوگا۔ جہاں بینک نے تمہیں بھیجنے کا پہلے سے منصوبہ بنا رکھا ہے۔ وہ تمہیں پاگل ثابت کرنا چاہتا ہے تا کہ بینک تمہاری رقم کو اپنی مرضی کے تحت کر کے بالآخر قبضہ کر لے۔''

''نہیں میں اس بات پر یقین نہیں کر سکتی۔''

''اس نے اپنے کام کی تفصیلات مجھے بتائی تھیں اور وہ اس سے کہیں زیادہ کر چکا ہے۔ اس نے عدالت میں پیش ہو کر بیان دینے والے ڈاکٹروں میں میرا نام بھی شامل کیا ہے اس نے بینک کی طرف سے مجھے بہت بڑی رقم کی پیش کش کی تھی۔ مجھے یقین ہے کہ تم اس پیش کش کرنے والے آدمی کا نام ضرور جانتی ہوگی۔''

وہ سمٹ کر تکیے سے لگ گئی۔ گھبراہٹ چہرے سے عیاں تھی۔ ''میں ان باتوں کو ظاہر نہیں کرنا چاہتا تھا لیکن اب پانی سر سے گزر رہا ہے اس نے اب تم سے شادی کی درخواست کی ہے اس سے تمہیں ان ارادوں کا علم ہو جانا چاہیے جو در حقیقت کار فرما ہیں۔ وہ ایک خود غرض نوجوان ہے۔'' گیل کی آنکھوں میں جو چمک تھی وہ زائل ہوگئی۔

''بینک کا منتظم اعلیٰ اس نوجوان کا چچا ہے۔ اس طرح ظاہر ہوتا ہے کہ اس سازش میں دونوں شریک ہیں۔'' وانر نے کہا اور اطمینان سے سر ہلایا کیونکہ اس کی مریضہ پوری طرح اس کی باتوں کے جادو سے مسحور ہوگئی تھی اور وہ مکمل توجہ اور انہماک سے سن رہی تھی۔

''میرے خیال میں یہ لڑکی تم سے زیادہ ذہین ہے برخوردار۔'' ٹیڈیسکو نے کہا۔

''جس انداز میں وہ آج کل جارہی ہے اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ کوئی غلط قدم نہیں اٹھائے گی۔''

''وہ کسی دماغی اسپتال میں جانے کی بجائے مرنا پسند کرے گی۔'' اسٹیو نے کہا۔

''جتنی دولت اس کے پاس موجود ہے اس سے وہ اپنے لئے ذاتی اسپتال بھی بنوا سکتی ہے جہاں اس کے علاوہ کوئی دوسرا مریض نہیں ہوگا۔ اور درجنوں ڈاکٹر اس کی دیکھ بھال کر سکتے ہیں۔ میں ڈاکٹر وانر سے ذاتی طور پر متفق نہیں ہوں۔''

”کیا تم نے کبھی ڈاکٹر وانر سے ذاتی طور پر گفتگو نہیں کی۔؟“

”وہ ڈاکٹروں کی فہرست میں شامل نہیں ہے غالباً اس کی نظریات کی شدت سے مخالفت کی گئی تھی۔“

”تم نے یہ کسی ڈائریکٹری میں دیکھا تھا۔“

”ایک ایسی کتاب جس میں تمام ڈگری ہولڈرز کی فہرست شامل ہوتی ہے ان میں ڈاکٹر وانر کا نام کوئی ذکر سرے سے موجود ہی نہیں ہے۔“

مسز بیلنگر نے دریافت کیا کہ اب گیل کی طبیعت کیسی ہے؟ اس نے جواب دیا کہ مریضہ کو ایسی دوا دی گئی ہے جس سے وہ پرسکون نیند سے لطف اندوز ہونے کے علاوہ صدمے کے اثرات سے بھی محفوظ رہے گی۔

”مسز گزسن نے جس رات خودکشی کی تھی اس کے بارے میں گیل سے بات کرتا رہا ہوں۔ میرا خیال ہے اس رات کو تم بھی نہیں بھولی ہوگی مسز بیلنگر؟“

”میں اس رات کو کبھی نہیں بھول سکتی چاہے مری عمر سو سال ہو جائے۔“

”غالباً وہ تمہیں پسند کرتی تھی؟“

”وہ بہت پیاری لیکن غمگین عورت تھی۔ جب مجھے ملازم رکھا گیا تھا تو اس کی ذہنی حالت بگڑ چکی تھی۔ اسی طرح اس کی بچی کی ہستی منتشر ہوگئی تھی۔“

”ہاں میں جانتا ہوں کہ وہ افسوس ناک حالت تھی۔“

”اس وقت گیل کی عمر صرف چھ سال تھی۔ ایک ہی سال میں اس کے والدین اس سے جدا ہوئے تھے اس کے بعد صرف دو افراد زندہ ہیں جنہیں وہ اپنے خاندان سے متعلق سمجھ سکتی ہے۔“

”تم شاید مسٹر سوان اور اس کے بیٹے پائرز کا ذکر کر رہی ہو؟“

”ہاں گیل کے چچا نے کبھی اپنے بھائی کو یاد نہیں کیا۔ البتہ قرض مانگنے کے لئے تقاضے کے خطوط گاہے گاہے آتے تھے۔ وہ خاندان کا غریب ترین آدمی تھا لیکن وہ زندگی برطانوی شاہ کی طرح گزارتا تھا۔“

ڈاکٹر وانر نے اثبات میں سر ہلایا۔ اس کے ہونٹوں پر مخفی اور پراسرار مسکراہٹ تھی۔ وہ اس وقت عمارت کے باورچی خانے میں بیٹھے ہوئے تھے۔ وہ سوچ رہا تھا کہ بڑھیا اس کے بارے میں خواب رائے زنی کر رہی ہے۔

”مجھے سوان کا بیٹا بالکل پسند نہیں آیا تھا۔ وہ اپنی چچی کی لاش کی موجودگی میں یہاں کہرام برپا کئے ہوئے تھا۔“

”کیا گیل کے ان رشتے داروں کا خط آئے بہت دن ہو گئے ہیں؟“

”انہوں نے گیل کی ماں کی تدفین کا بھی انتظار نہیں کیا تھا اور فوراً لندن واپس چلے گئے تھے۔“

”مجھے وہ شخص شینک کبھی نہیں بھولے گا جس نے تدفین کے فرائض سرانجام دیئے تھے اور جس کی خدمات مسٹر سوان نے حاصل کی تھیں۔ اس کا چہرہ اتنا بھیانک تھا کہ مجھے خوف سے جھرجھری آ گئی تھی۔ وہ نصف شب کے وقت لاش کو لینے آیا تھا۔“

”آدھی رات؟ یہ تو لاش لے جانے کا بڑا عجیب وقت تھا۔“ ڈاکٹر نے کہا۔

”وہ پہلے چھ یا ساڑھے چھ بجے آیا تھا۔ اس کے بعد آدھی رات کے وقت غالباً اپنا بریف کیس لینے آیا تھا۔ جسے وہ یہاں بھول گیا تھا میں گیل کے لئے دودھ گرم کر رہی تھی اس لئے اسے بریف کیس تلاش کرنے کی اجازت دے دی تھی اسے اپنا بریف کیس نہیں ملا۔ اگلے روز صبح مسز گزسن کے کمرے میں ملا تھا۔ اس کے چند ہی لمحوں کے بعد بچی کی چیخ سنائی دی تھی۔ میں بریف کیس چھوڑ کر ادھر بھاگی تھی۔“

”کیا تم نے اس آدمی شینک کے جانے کی آواز سنی تھی؟“

”ہاں وہ بیرونی دروازے کو ایک دھماکے سے بند کر کے گیا تھا۔“

”گویا تم نے اپنی آنکھوں سے اسے جاتے نہیں دیکھا تھا؟“

”نہیں۔ میں اس وقت یہاں باورچی خانے میں تھی۔“ مسز بیلنگر نے کہا۔

''مسز بیلنگر۔ کیا یہ ممکن نہیں کہ جب مسٹر شینک کو اس کا بریف کیس نہیں ملا تو اس نے اس کی تلاش جاری رکھی ہو؟''

''میں تمہارا مطلب نہیں سمجھی۔'' خادمہ نے حیرت سے کہا۔

''میرا مطلب ہے ممکن ہے وہ بالائی منزل میں اسے تلاش کرنے گیا ہو۔''

''اگر وہ اوپر جاتا تو اسے بریف کیس ضرور مل جاتا۔ وہ کرسی پر سامنے ہی رکھا ہوا تھا۔''

''میں خواب گاہ کے دروازوں کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ ان میں کتنی مماثلت ہے۔'' ڈاکٹر وانر نے کہا۔ وہ اس عمارت کو اچھی طرح نہیں جانتا تھا ممکن ہے وہ بھولے سے کسی دوسرے دروازے میں داخل ہو گیا ہو کیا یہ ممکن نہیں ہے مسز بیلنگر؟'' اس نے بڑھیا کے بازو پر ہاتھ رکھا جو سرد ہو رہا تھا۔ ''جانتی ہو میں اب تک غلط آدمی کو سامنے رکھے ہوئے تھا۔ مجھے چاہئے تھا کہ اس سلسلے میں تم سے پہلے ہی بات کر لیتا۔'' اس کے ہونٹوں پر عجیب سی مسکراہٹ رقصاں تھی۔ پراسرار اور خبیث مسکراہٹ۔

''کیا میں آپ کا نام دریافت کر سکتا ہوں؟''

''ڈاکٹر جوئل وانر۔''

''کیا آپ ہی وہ ڈاکٹر ہیں جو علاج کر رہے ہیں۔ میرا مطلب ہے یہ آپ کا نام ہے یا مرحوم کا؟''

وانر ہنس پڑا۔ ''دراصل میں یہاں معلومات حاصل کرنے آیا ہوں۔ مجھے ایک شخص مسٹر شینک کی تلاش ہے۔ مجھے اس کا نام کا پہلا حصہ معلوم نہیں ہے۔''

''غالباً اس نام کا کوئی آدمی یہاں موجود نہیں ہے۔''

''وہ کچھ عرصے پہلے یہاں کا مالک یا منتظم تھا۔''

''کتنے عرصے پہلے کی بات ہے؟''

''مجھے افسوس ہے کہ میری معلومات بیس سال پرانی ہیں، لیکن ان کی صحت میں کوئی شبہ نہیں اسی فرم نے مسز کریسی گرزسن کی تدفین کی تھی اور مسٹر شینک انچارج تھا۔''

''میں یہاں ایک ماہ سے ہوں جناب، اس لئے مجھے انتظامیہ کے بارے میں بالکل معلوم نہیں۔''

''مجھے امید ہے کہ تم اسے تلاش کرنے میں میری مدد کرو گے۔ ممکن ہے وہ کسی دوسرے ادارے میں چلا گیا ہو۔ اس شخص سے ملاقات بہت ضروری ہے۔''

''مجھے افسوس ہے جناب میں شاید آپ کی مدد نہیں کر سکتا۔ میں زیادہ آدمیوں کو نہیں جانتا۔'' اس آدمی نے کہا۔

''بہر حال میں مسٹر فینی سے معلوم کرتا ہوں، وہ جنرل منیجر ہے جب اس سے اس فرم کا اجرا ہوا ہے اس وقت سے وہ یہیں ہیں ممکن ہے انہیں معلوم ہو۔''

وہ شخص کمرے سے گیا تو ڈاکٹر وانر نے اثبات میں سر ہلایا۔ مسز بیلنگر نے نادانستگی میں انتہائی قیمتی معلومات فراہم کر دی تھیں۔ اس کی سادگی بہت کارآمد ثابت ہو سکتی تھی۔ میڈیکل کلینک جہاں گیل کو بچپن میں زیر علاج رکھا گیا تھا وہاں دیگر وجوہات پر تحقیق ہوتی رہی لیکن اصل وجہ کی طرف کسی کا دھیان ہی نہیں گیا تھا۔ اسے یاد آ گیا تھا کہ اس رات کیا باتیں ہوئی تھیں۔ اس نے گیل سے کہا تھا۔ ''یہ تمہاری ماں کو لینے آئے ہیں۔ یہ اسے تم سے دور لے جائے گا۔ یہ شخص اسے ایک لکڑی کے صندوق میں بند کر دے گا۔'' وانر نے اثبات میں سر ہلایا۔ بالکل یہی بات تھی۔ ''یہ گورکنوں کا کام ہے گیل۔'' اسے اپنی باتیں یاد آ رہی تھیں۔

''یہ لاش کو صندوق میں بند کر کے دفن کر دیتے ہیں۔'' لیکن اس گورکن سے ایک عجیب غلطی ہوئی تھی۔ اسے یہ تو معلوم تھا کہ لاشیں کہاں دفن کی جاتی ہیں لیکن یہ بھول گیا کہ بریف کیس کہاں رکھا تھا۔ وہ اپنا بریف کیس لینے واپس آیا تھا لیکن دروازوں میں مماثلت کی وجہ سے وہ گیل کے دروازے پر پہنچ گیا۔ گیل دروازہ کھلنے کی آواز سن کر بیدار ہو گئی۔ گورکن واپس آیا تھا۔ خوفناک گورکن جس کے بارے میں وہ پائرز سے سن چکی تھی کہ وہ آدمیوں کو تابوت میں بند کر دیتا ہے۔ بچی یہ سمجھی ہو گی کہ وہ اسے دفن کرنے کے لئے آیا ہے اور ایک بدصورت گورکن کو آدھی رات کے وقت دیکھ کر اس پر کیا گزری تھی۔ اس کا اندازہ اب ڈاکٹر وانر کو اچھی طرح ہو گیا تھا۔ یہی وہ خوفناک

حقیقت تھی جس نے گیل کی زندگی کو طوفانوں سے ہمکنار کر دیا تھا۔ اور جس کی طرف کسی نے توجہ نہیں دی تھی۔

''بہت بڑی خوش خبری ہے۔'' وانز نے کہا اور مسکرانے لگا۔

وہی شخص اس کے سامنے کھڑا یہ مژدہ سنا رہا تھا۔ ''مسٹر فینی ہی وہ واحد آدمی ہے جنہیں مسٹر شینک کے بارے میں معلوم ہے۔ اس کا پورا نام کالون شینک ہے۔ وہ کبھی اس فرم کا مالک تھا لیکن بعد میں اس نے فرم مسٹر فینی کے ہاتھ فروخت کر دی تھی اور خود ریٹائر ہو گیا تھا۔''

''ریٹائر......'' وانز نے ہموار لہجے میں کہا۔

''جہاں تک میرا خیال ہے یہ ریٹائرمنٹ جبری تھی۔ مسٹر فینی کا کہنا ہے کہ وہ حد درجہ شراب نوش تھا۔ اور س کی صحت جواب دے گئی تھی۔''

''یہ کتنے عرصے پہلے کی بات ہے۔'' ڈاکٹر وانز نے مردہ لہجے میں کہا۔

''پانچ سال پہلے۔''

''کیا شینک اس شہر کو چھوڑ کر جا چکا ہے؟''

''نہیں مجھے یقین ہے کہ وہ یہیں ہے مسٹر فینی کا بیان ہے کہ اس کی طرف سے ہر سال کرسمس کارڈ آتے ہیں اور انہیں بروک لائن سے ہی ڈاک کے حوالے کیا جاتا رہا ہے۔ ممکن ہے ڈائریکٹری میں اس کا پتہ موجود ہے۔ میں آپ کو وہ پتہ زبانی نہیں بتا سکتا۔''

''ہاں میں نے اس طرف توجہ ہی نہیں۔ میں ڈائریکٹری میں تلاش کرتا ہوں۔'' وہ تجہیز و تکفین کرنے والی فرم سے باہر نکل آیا۔ نصف گھنٹے بعد اسے شینک کا نمبر مل گیا اس نے نمبر ڈائل کیا اور اگلے ہی لمحے ایک آواز سن کر اس کے ہونٹوں پر سفاک اور فاتحانہ مسکراہٹ کھیلنے لگی۔

ڈاکٹر وانز نے جب شینک کا چہرہ دیکھا تو سن ہو کر رہ گیا۔ اس کے ذہن میں جو شبیہہ موجود تھی اسے اس نے اپنے بچپن میں دیکھا تھا اس وقت وہ ایک جسیم آدمی تھا اور اس نے سیاہ ماتمی لباس پہن رکھا تھا۔ وہ خوفناک اور درشت چہرے کا مالک تھا لیکن اب اس کا چہرہ اور بھی بھیانک اور ہیبت ناک ہو گیا تھا۔ اس کی آنکھوں کی جگہ دو گڑھے تھے جن میں بے حد چمک دار آنکھیں تھیں۔ وقت اور کثرت مے نوشی نے اس کا حلیہ بگاڑ کر رکھ دیا تھا۔ وہ اب بھی ایک خوفناک گورکن تھا۔

''میں ڈاکٹر وانز ہوں۔'' پائزر نے اپنا تعارف کرایا۔

''فون پر تم نے جو کچھ کہا تھا، میری سمجھ میں نہیں آیا تھا۔'' شینک نے کہا تم مجھ سے کیا چاہتے ہو؟''

میں نے تمہیں بتایا تھا کہ میری ایک مریضہ کا معاملہ ہے۔ میرا خیال ہے اس کا نام تو تمہارے لئے اہم نہیں ہے لیکن مارچ 1955ء میں تم اس کی ماں کو دفن کیا تھا۔ یہ ان دنوں کی بات ہے جب تم اسٹسارتھ مور فرم کے مالک تھے۔ بہر حال اس مریضہ کا نام مس گیل سن ہے۔

''نہیں۔'' شینک نے انکار میں گردن ہلائی۔ ''میں اس نام کی کسی لڑکی کو نہیں جانتا۔ تم مجھ سے لوگوں کے نام یاد رکھنے کی توقع نہیں کر سکتے۔ میں اب تک بیسوں بلکہ ہزاروں کو دفن کر چکا ہوں، کس کس کا نام رکھوں گا۔''

''یہ نام تمہیں یاد ہونا چاہئے۔ تھیوڈر گرسن ایک رئیس آدمی تھا جو کوریا میں ہلاک ہوا تھا۔ اسی نے کرسی بلیک نامی ایک اداکارہ سے شادی کی تھی۔ تم نے اس کی تدفین کے فرائض سر انجام دیئے تھے کچھ یاد آیا؟''

شینک کا سر انکار میں حرکت کرتا رہا۔

''تم اس گھر میں اپنی کوئی چیز بھول گئے تھے۔''

''گورکن نے سر کھجایا۔ کچھ یاد تو آ رہا ہے شاید میں اپنا قلم بھول گیا تھا۔''

''بریف کیس۔'' ڈاکٹر وانز نے یاد دہانی کرائی۔

''تم نے ٹھیک کہا لیکن مجھے عمارت اور مکین یاد نہیں رہے۔''

''چونکہ پولیس کو یہ نام اچھی طرح معلوم ہیں اس لئے تم نہیں بھول سکتے۔''

''پولیس۔'' شینک چونک پڑا۔ پولیس کا اس معاملے میں کیا تعلق ہے؟''

''مجرم اپنا کام کر کے نکل جاتا ہے اور ایک طویل عرصے تک غائب رہ کر غالباً یہ سمجھ لیتا ہے کہ اب اسے کوئی تلاش نہیں کر سکتا۔'' ڈاکٹر وانز نے خالص نفسیاتی طرف

عمل اختیار کرتے ہوئے کہا۔

''مجرم...... مجرم...... پولیس یہ تم کیسی باتیں کر رہے ہو نوجوان میری سمجھ میں تو کچھ نہیں آتا۔''

''تم زینے طے کر کے بلا اجازت اوپر گئے تھے کیا یہ غلط ہے؟''

''ہاں یہ حقیقت ہے میں اپنا بریف کیس تلاش کرنے گیا تھا۔ اس میں میرے تمام کاغذات بند تھے۔''

''کیا تمہیں تمہارا بریف کیس مل گیا تھا۔''

''ہاں۔'' شینک نے کہا۔ ''وہ مرنے والی کمرے میں تھا۔''

''نہیں گورکن تمہیں وہ بریف کیس نہیں ملا تھا۔ بلکہ ملازمہ نے اگلے روز اسے تمہاری فرم کے پاس بھجوایا تھا۔ تمہیں وہ بریف کیس اس لئے نہیں ملا تھا کہ تم نے صبح دروازہ نہیں کھولا تھا۔''

''ایسی تو کوئی بات نہیں تھی۔''

''تم پہلی بار اس گھر میں گئے تھے اس لئے غلطی سے دوسرا دروازہ کھل دیا تھا۔ تمہیں اس وقت احساس نہیں تھا کہ تم گیل گرزسن کی خواب گاہ کے دروازے پر ہو لیکن بہرحال یہ تمہاری غلطی نہیں تھی۔''

''ہاں یہ میری غلطی نہیں تھی مجھے معلوم نہیں تھا کہ وہ بچی کا کمرہ ہے۔ مجھے تو یہ بات بھی معلوم نہیں تھی کہ وہاں کوئی بچہ بھی ہے یا نہیں۔''

''وہ بچی چیخ پڑی تھی۔ چھ سال کی بچی نے تمہیں اپنے کمرے میں داخل ہوتے دیکھ اور اس کا ذہن منتشر ہو گیا۔''

''ہاں وہ اتنے زور سے چیخی تھی کہ میں خوف زدہ ہو کر چمگادڑ کی طرح بیرونی دروازے تک پہنچ گیا تھا۔ بوڑھے گورکن نے کہا۔'' اس کے بعد میں عمارت سے بھاگ نکلا تھا۔''

''لیکن کیوں؟ تم وہاں وضاحت کرنے کے لئے ٹھہرے کیوں نہیں؟''

''میں بتا چکا ہوں کہ خوف زدہ ہو گیا تھا مجھے زینے سے اوپر نہیں جانا چاہئے تھا میں نہیں چاہتا تھا کہ کوئی میرے بارے میں کسی غلط فہمی کا شکار ہو۔ میں نے اس بچی کے ساتھ کوئی زیادتی نہیں کی تھی۔ اس بات کا تذکرہ کسی سے نہیں کرنا ورنہ اور موقعوں کی طرح پھر کوئی الزام لگ جائے گا۔''

''کیا مطلب؟'' وانر نے حیرت سے کہا۔

''میں نے کبھی کسی بچے یا بچی سے زیادتی نہیں کی لیکن لوگ۔ میں قسم کھا سکتا ہوں۔''

وانر کا جی چاہا کہ کھل کھلا کر ہنس پڑے۔ فکر نہ کرو مسٹر شینک۔ بہرحال مجھے تمہاری مدد کی ضرورت ہے میں تمہیں کوئی نقصان نہیں پہنچاؤں گا۔ یہ میرا وعدہ ہے میں اپنی مریضہ کی مدد کرنا چاہتا ہوں۔''

''لیکن کیسے؟ میں پولیس کے پاس نہیں جاؤں گا۔''

''میں چاہتا ہوں کہ آج شام تم اس جگہ مجھ سے ملو۔'' وانر نے ایک کاغذ پر گیل گرزسن کے گھر کا پتہ لکھ دیا اور گورکن کو سمجھا بجھا کر وہاں سے چلا آیا۔

''تمہاری دوا کا وقت ہو گیا ہے۔'' ڈاکٹر وانر نے کہا۔

''کیا مجھے دوا استعمال کرنی پڑے گی؟'' گیل نے کرب سے سوال کیا۔

''ہاں میں جانتا ہوں کہ تم ہر وقت خواب ناک حالت میں رہنا پسند نہیں کرتیں لیکن تمہارے لئے یہی فائدہ مند ہے۔''

گیل نے گولیاں لے لیں۔ اس نے گولیوں کی تعداد پر کوئی تبصرہ نہیں کیا اور خاموشی سے نگل گئی بعد میں اس نے کہا۔

''تین گولیوں کا غالباً یہ مطلب کہ آج رات بھر نیند طاری رہے؟''

''میں چاہتا ہوں کہ تم کل رات سے زیادہ پرسکون نیند سوتی رہو۔'' ڈاکٹر وانر نے کہا اور کمرے سے نکل کر خادمہ کو تلاش کرتا ہوا باورچی خانے میں پہنچا۔

''میں یہ معلوم کرنے آیا تھا کہ کیا تمہیں نیند میں مدد کے لئے کوئی چیز چاہیے؟''

''میں نے کل صبح تین بجے تک بالکل نیند نہیں

لی۔'' خادمہ آہ بھرتے ہوئے کہا۔

''میں تو رات بھر اس بے چاری کی آوازیں سننے کا انتظار کرتی رہی تھی۔ میں سوچ رہی تھی معلوم نہیں کب اسے میری مدد کی ضرورت پڑ جائے۔''

''میں تمہاری پریشانی کے بارے میں آگاہ ہوں۔ میں چند گولیاں لایا ہوں، مجھے امید ہے کہ ان سے تمہیں خاطر خواہ مدد ملے گی۔'' اس نے جیب ٹٹولی۔ اسی لمحے فون کی گھنٹی بجنے لگی۔

مسز بیلنگر نے ریسیور اٹھایا۔ چند لمحوں تک سنتی رہی پھر اس نے سوگواری سے سر ہلایا۔ ''نہیں میرا خیال ہے ایسا نہیں ہے۔ مسٹر ٹائیز۔ تمہیں معلوم ہے اس نے دیگر اوقات میں کیا کہا تھا بہر حال اس وقت ڈاکٹر یہاں موجود ہے اور غالباً یہ چاہتا ہے کہ وہ کچھ نیند لے لے۔ بہت اچھا اس نے ریسیور ڈاکٹر وانر کی طرف بڑھا دیا۔ وہ تم سے بات کرنا چاہتا ہے۔''

وانر ایک لمحے تک سوچتا رہا پھر اس نے ریسیور لیا اور خوش دلی سے کہا۔ ''اوہ یہ تم ہو مسٹر ٹائیز۔'' انداز ایسا ہی تھا جیسے وہ کسی عزیز اور پرانے دوست سے مخاطب ہو۔

''کیا بات ہے ڈاکٹر امریکن نفسیاتی انجمن میں تمہارا نام کیوں نہیں ہے۔'' اسٹیو نے کہا۔

ڈاکٹر وانر کو فون کا ڈائل اپنی آنکھوں کے سامنے گھومتا محسوس ہوا۔ اس نے جلدی سے انگلیوں کی پوریں دیوار پر جما کر سہارا لیا۔ ''معاف کرنا، میں سمجھا نہیں تم کیا کہہ رہے تھے۔؟''

''میں کہہ رہا تھا۔'' اسٹیو نے عجیب لہجے میں کہا۔ ''تمہارے نام کا اندراج ڈائریکٹری میں نہیں ہے۔ میں نے طبی انجمن کو فون کیا تھا ان کا کہنا ہے کہ ممکن ہے تم ابھی ابھی تعلیم سے فارغ ہوئے ہو، لیکن تمہاری طرف سے کوئی درخواست وہاں موجود نہیں ہے۔''

''یہ بات کس نے کہی تھی کہ مجھے اپنے نام کو درج کروانے کی ضرورت ہے؟''

''میں نے نیویارک بھی فون کیا تھا لیکن کچھ معلوم نہیں ہوا۔ تم نے ڈپلومہ کہاں سے حاصل کیا تھا ڈاکٹر؟''

''میں تمہیں اپنی تعلیمی قابلیت کے بارے میں کاغذات دکھانے کا کوئی ارادہ نہیں رکھتا، لیکن چونکہ تم مصر ہو تو میں بتا رہا ہوں کہ وہ ڈپلومہ جھے اس ملک میں نہیں دیا گیا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ میرا نام ملکی ڈاکٹروں کی فہرست میں شامل نہیں ہے۔''

''تم نے وہ ڈپلومہ کہاں سے حاصل کیا تھا؟''

''وی آنا سے۔'' ڈاکٹر نے کہا۔ ''وی آنا یونیورسٹی سے اب اگر تم برا نہ مانو تو مجھے مریضہ کے پاس جانا چاہئے۔'' اس نے دوسری طرف طرف سے کوئی جواب سنے بغیر سلسلہ منقطع کر دیا اور مسز بیلنگر کی طرف دیکھ کر مسکرانے لگا۔ جیب سے لفافہ نکالا اور خواب آور دوا دیتے ہوئے کہا۔

''یہ دونوں گولیاں ابھی کھا لو تو تمہیں آدھ گھنٹے بعد نیند آنے لگے گی اس کے بعد امید ہے تم پرسکون نیند سو سکو گی۔''

''بہت بہت شکریہ ڈاکٹر؟'' خادمہ نے کہا۔

وانر اسے دیکھتا رہا۔ بڑھیا نے گولیاں حلق سے اتار لیں۔ یہ اتنی طاقت ور دوا تھی کہ اگر کسی بھینسے کو کھلا دی جاتی تو وہ بھی رات بھر بے سدھ پڑا رہتا۔ چند سیکنڈ میں بڑھیا جمائیاں لینے لگی۔ وانر ہنسنے لگا۔ ''میرا خیال ہے تمہیں نیند کی شدید ضرورت ہے۔ جاؤ بستر پر چلی جاؤ مسز بیلنگر۔''

''کیا تمہیں یقین ہے کہ گیل کو میری ضرورت نہیں پڑے گی؟''

''ہاں وہ خود بھی بے سدھ پڑی سوتی رہے گی۔ میں خود بھی باہر جا رہا ہوں۔ تم آرام سے سو جاؤ۔ وہ زیر لب مسکراتا ہوا دروازے کی طرف بڑھ گیا۔

ڈاکٹر وانر باورچی خانے سے نکل کر سیدھا کمرہ نشست میں پہنچا۔ اس کے چہرے پر طمانیت تھی اور آنکھیں غیر معمولی انداز میں چمک رہی تھیں۔ اس نے شراب کا ڈبل پیگ تیار کیا۔ اگر چہ عام حالات میں اسے ضرورت نہیں پڑتی تھی لیکن آج اسے شراب کی ضرورت شدت سے محسوس ہو رہی تھی۔ اس نے ایک ہی سانس میں گلاس خالی کیا اور اطمینان سے ایک صوفے پر بیٹھ گیا

اس کے کان اطلاعی گھنٹی کی ایک آواز پر لگے ہوئے تھے۔
شینک دس بجے کے فوراً بعد آ گیا۔ وانز حیران تھا کہ اس نے بیس سال بعد اس عمارت کو اتنی آسانی سے کس طرح پہچانا ہوگا۔ اس کی نگاہ گورکن کے ہاتھوں پر پڑی۔ وہ کانپ رہے تھے وانز اسے بتا چکا تاھ کہ اس کی ضروت صرف مریضہ کے علاج کے لئے ہے ورنہ اسے کوئی خطرہ نہیں۔ اسے محسوس ہوا کہ اب اسے بوڑھے شرابی گورکن کو ایک بار پھر اطمینان دلانا پڑے گا۔ ''گھبرانے کی ضرورت نہیں۔'' اس نے کہا۔ ''جو کچھ تمہیں کہا گیا ہے اس پر عمل کرو اس کے بعد تمہیں کبھی تکلیف نہیں دی جائے گی۔''
''میں اسے پسند نہیں کرتا۔'' گورکن نے کہا۔ ''کسی کو اس کام پر مجبور کرنا بڑی عجیب بات ہے۔''
''دراصل یہ ایک طرح کا ڈرامہ ہے۔ تم نے شاید کوئی نفسیاتی کھیل نہیں دیکھا بعض لوگ بچپن میں کسی چیز سے خوفزدہ ہو کر اس کا خوف لاشعوری میں دبا لیتے ہیں۔ اس خوف کو دور کرنے کے لئے ضروری ہے کہ انہیں ایک بار پھر اسی حالت سے دوچار کر دیا جائے۔ بہر حال یہ کوئی مشکل کام نہیں ہے۔''
''نہیں، یہ بہت مشکل کام ہے۔'' گورکن نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔
''کیا تم کچھ پینا پسند کرو گے؟'' اس نے یہ کہہ کر گلاس میں شراب انڈیلی گورکن نے سرخ آنکھوں سے اسے گھورتے ہوئے کہا۔ ''کیا تمہیں یقین ہے کہ کوئی مصیبت نہیں آئے گی۔''
''مصیبت صرف تمہارا عدم تعاون ہے غالباً تم سمجھ گئے ہو گے؟'' وہ اسے ساتھ لے کر ہال کمرے میں آیا۔ سابق گورکن نے خوف زدہ نگاہ سے زینے کی طرف دیکھا۔ یہ وہی زینہ تھا جس پر وہ بیس سال پہلے چڑھا تھا۔ ''صرف ایک بات کا خیال رکھنا، ڈاکٹر نے کہا اور ایک لپٹی ہوئی چیز اس کی طرف بڑھا دی۔ ''اسے کھولو اور ساتھ لے جاؤ۔''
خواب خوابوں کا وہی سلسلہ۔
وہ اڑتی ہوئی کہیں جا رہی تھی کہ یکایک اندھیروں میں گرتی چلی گئی اس کے باپ اور اس نے بھورا ہیٹ پہن رکھا تھا۔ اور سرخ آنکھوں سے اسے گھور رہا تھا۔ وہ ہال کمرے کے خوفناک کلاک کے سامنے کھڑی تھی اور اس کی خوفناک آواز اس کے دل ودماغ پر ہتھوڑوں کی طرح برس رہی تھی۔ ڈنگ ...... ڈونگ...... ڈنگ...... ڈونگ...... عجیب اور دہشت ناک آوازوں کا سلسلہ اچانک کسی چیز کے گرنے کا دھماکہ ہوا۔ اس کی آنکھیں کھل گئیں۔ گہری خاموشی پھر وہی آواز۔ خاموشی کا وقفہ اور پھر کسی کے گرنے کا دھماکہ۔ ایک طویل وقفہ وہ خاموش لیٹے ہانپتی رہی۔ دروازہ چرچرانے کی آواز ابھری اس کی نگاہ دروازے کی طرف اٹھی۔ کیا دروازے کا لٹو گھوم رہا ہے؟ دروازہ مقفل ہے۔ وہ سوچنے لگی لیکن اس وقت تو دروازہ کھل رہا تھا۔
ہال کے دروازے کے سامنے راہداری میں گورکن کی شبیہہ ابھری۔ خوفناک شکل۔ استخوانی ہاتھ اس نے دوسرے ہاتھ سے کوئی چیز سینے سے چمٹا رکھی تھی۔ ایک ہاتھ سے وہ دروازہ کھول رہا تھا۔ تابوت میں لاشیں دفن کرنے والا اس کے کمرے میں داخل ہو رہا تھا۔ گیل کا حلق خشک ہو گیا۔ کمرے میں آوازیں گونجنے لگیں۔ وہ یوں چل رہا تھا جیسے قالین کی بجائے وہاں ناہموار زمین ہو۔ وہ لڑکھڑاتا ہوا آگے بڑھا گیل کے حلق سے سانس کی آمدورفت بند ہونے لگی۔
وہ رک گیا دروازے اور گیل کے بستر کے درمیان خوفناک چہرے والا گورکن کھڑا تھا۔ اس کا چھپا ہوا ہاتھ کوٹ کے نیچے سے نکلا اس نے جو چیز چھپا رکھی تھی جب اس سے ہاتھ سخت کر کے اسے سامنے کیا تو کسی دھات کی چمک پیدا ہوئی۔ اس کے ہاتھ میں وہ چھوٹا سا بیلچہ تھا۔ جس سے قبر کھودتے ہیں موت بھیانک جبڑے پھاڑے گیل کے گرد ناچنے لگی اور کمرہ خوفناک چیخوں سے لرزنے لگا۔
وہ بری طرح اس کے چہرے کو ناخنوں سے نوچ رہی تھی اس کے رخسار لہولہان تھے اور ناک سے کھال ادھڑ گئی تھی وہ چیختی ہوئی جدوجہد کرتی رہی حتی کہ ڈاکٹر وانز کی آواز سنائی دی۔ ''رک جاؤ گیل خدا کے لئے رک جاؤ۔''

اس نے دونوں ہاتھوں سے اپنا چہرہ پیٹ لیا جیسے ہسٹریائی کیفیت ختم کرنا چاہتی ہو۔ ڈاکٹر وانر نے اسے کندھوں سے پکڑا اور تکیوں پر جکڑ لیا۔

''گورکن۔'' وہ ہانپتی ہوئی بولی۔ وہ یہاں تھا وہ مجھے لینے آیا تھا بالکل اسی انداز میں جس طرح اس رات یاد آیا تھا۔''

''نہیں۔'' وانر نے کہا۔ ''یہاں کوئی نہیں تھا تم نے کوئی دوسرا بھوت دیکھا ہوگا کوئی اور وہم اس کے علاوہ کچھ نہیں۔''

''یہ وہی تھا۔ میں قسم کھا سکتی ہوں۔ وہ زینے سے اوپر آیا اور میری لاش لے گیا تھا۔ وہ اس رات بھی میرے کمرے میں آیا تھا۔ میں تمہیں یقین سے کہہ سکتی ہوں اوہ میں اس بات کو کیسے بھول سکتی ہوں؟''

''نہیں بچپن کی یادیں دب چکی ہیں۔ تم نے اس رات کیا یہ سمجھا تھا کہ وہ تمہاری ماں کی طرح تمہیں بھی تابوت میں بند کرنے کے لئے آیا تھا؟''

''ہاں میرا ابھی یہی خیال تھا۔ اف''

''گویا تم یہ سمجھ رہی تھیں کہ اب تابوت میں بند ہونے کی تمہاری باری ہے۔'' وہ دوبارہ سسکنے لگی۔ ''ہاں میں اس بات کو نہیں بھول سکتی۔ وہ لمحہ میری زندگی کا بد ترین لمحہ تھا۔''

''ہاں۔ یہ ایک سزا تھی ان خیالات کی سزا جن کے تحت تمہاری اماں نے خودکشی کی تھی۔''

''لیکن میں نے خواب نہیں دیکھا۔ نہ اس رات دیکھا تھا اور نہ آج رات دیکھا ہے۔''

''ہاں وہ خواب نہیں تھا۔ گورکن اپنا بریف کیس لینے آیا تھا۔'' وانر نے کہا۔

''بریف کیس؟ کیسا بریف کیس؟'' گیل نے حیرت سے کہا۔ ''میں کہتی ہوں آج بھی وہ یہاں موجود تھا۔ اس کا جسم تمہارے جسم کی طرح ٹھوس تھا۔''

''یہ بات تم نے ہیلن کے بارے میں بھی کہی تھی۔''

''میں کہتی ہوں وہ آیا تھا۔ اس کے پاس کوئی چیز بھی تھی۔''

''کیا چیز؟'' وانر نے گہری دلچسپی سے کہا۔

''میں نہیں بتا سکتی تم یقین نہیں کرو گے؟'' وہ چلانے لگی۔ ''اس کے پاس دھات کا چھوٹا بیلچہ تھا اس نے بیلچہ میری طرف بڑھایا جیسے کہنا چاہتا ہو کہ مجھے دفن کردے گا۔''

''لیکن تمہارا دروازہ مقفل تھا۔'' وانر نے نرم لہجے میں کہا۔ میں نے اسے مسز ہیلنگر سے چابی لے کر خود مقفل کیا تھا۔''

''اس نے دروازہ کھولا تھا اور وہ یہاں موجود تھا۔''

گیل ہسٹریائی انداز میں چیخی۔ ''یہ وہم نہیں تھا وہ تکیے پر ادھر ادھر سر مارنے لگی۔'' میری مدد کرو...... میری مدد۔

''تمہیں مدد کی واقعی ضرورت ہے اور اس کا باقاعدہ علاج ہونا چاہئے۔''

''کیا تمہارا مطلب اسپتال سے ہے؟'' وہ اچھل کر بیٹھ گئی۔ ''یہ نہیں ہو سکتا۔ مر مر جاؤں گی۔''

''اگر تم نے علاج نہیں کرایا تو واقعی مر جاؤ گی۔'' وانر نے کہا۔ اب تمہارے سامنے دو ہی راستے ہیں۔ اسپتال چلی جاؤ یا۔''

''یا کیا کروں؟'' گیل نے جلدی سے کہا۔

''تمہیں وہی راستہ اختیار کرنا پڑے گا جو تمہاری ماں نے اختیار کیا تھا۔'' اس نے جیب سے لفافہ نکالا اور دس کیپسول ہتھیلی پر رکھ لئے۔ ''ایک کیپسول رات بھر سلائے گا۔ دو کیپسول اس سے زیادہ گہری نیند، تین کیپسول مزید گہری نیند...... چار...... پانچ...... چھ...... سات۔'' اس نے کیپسول گیل کے ہاتھ میں دیئے۔ اور بہ غور اس کی طرف دیکھا جب وہ مطمئن ہو گیا کہ اس کی بات اچھی طرح سمجھ گئی ہے تو وہ مطمئن ہو کر باہر نکل گیا۔

''جوئل وانر پلیز...... جوئل...... گیل نے اسے پکارا۔

ڈاکٹر نے پلٹ کر دیکھا۔ وہ زینے پر کھڑی تھی۔ اس کا نائٹ گاؤن سلوٹوں سے بھرا ہوا تھا۔ اس کے رخسار آنسوؤں سے بھیگے ہوئے تھے۔ اور وہ کسی معصوم بچی کی طرح بے بس نظر آ رہی تھی۔ اس کے ذہن میں وہ چھ سالہ بچی گیل گھوم گئی جسے اس نے بالکل اسی حالت میں دیکھا تھا۔ ''تمہیں ایسا کرنا پڑے گا گیل۔'' اس نے تحکمانہ لہجے

میں کہا۔ ”ورنہ صبح تمہیں پاگل خانے بھیج دیا جائے گا۔“

”میں ایسا نہیں کر سکتی۔“ وہ چلائی۔ ”میں ٹھیک ہوں بالکل ٹھیک اور تندرست ہوں۔“

”جاؤ خواب گاہ میں چلی جاؤ۔“ وہ غرایا۔

”نہیں۔ میں وہاں نہیں جاؤں گی۔“

ڈاکٹر نے اس کے قریب پہنچ کر سختی سے کلائی تھام اور دروازے کی طرف دھکیلنے لگا۔ ان میں جدو جہد ہونے لگی۔ بالکل ویسی ہی جدو جہد بیس سال پہلے ہوئی تھی۔ اچانک گیل کے ذہن میں وہ منظر گھوم گیا۔ اس نے بہ غور ڈاکٹر وانز کی طرف دیکھا۔

”تم پائزر ہو۔“ اس نے سرگوشی کی۔ ”تم بالکل اسی جیسی ہو۔“

پائزر کا دل دھک سے رہ گیا۔ اس نیا سے پہچان لیا تھا۔ اب اس کے پاس صرف ایک ہی صورت باقی تھی اور وہ اس موقع کو ہاتھ سے کھونا نہیں چاہتا تھا۔

بالا خانے میں اسے رسی نہیں مل سکی۔ اتفاقات بھی کتنے عجیب ہوتے ہیں۔ اس کے مرنے کے لئے بجلی کا تار وہاں موجود تھا وہ لڑکی کو گرد آلود فرش پر نہیں چھوڑنا چاہتا تھا۔ وہ بے ہوش اور بے سدھ تھی وہ اسے کوئی چوٹ نہیں مارنا چاہتا تھا۔ اپنی رفیق ہیلن کو ہلاک کرنے کے لئے اس نے جس سفا کی کا مظاہرہ کیا تھا وہ یہاں نہیں کرنا چاہتا تھا۔ اس منظر کو یاد کر کے وہ کانپ گیا۔

اس نے جب گیل کو فرش سی اٹھایا تو اس کے ہاتھ کانپ رہے تھے۔ اسے اپنے ہی پسینے کی بو محسوس ہو رہی تھی۔ اس نے گار کو اوپر باندھ دیا تھا اب صرف گیل کو لٹکانا باقی تھا۔ اور اسے یہ کام بہت بھاری اور مشکل محسوس ہو رہا تھا اس نے کرسی رکھی ہی تھی کہ اچانک اطلاعی گھنٹی چیخ اٹھی۔

وہ کانپ گیا۔ وہ خاموش رہا سوچ رہا تھا کہ ملاقاتی خود ہی تنگ آ کر چلا جائے گا۔ لیکن ایسا نہیں ہوا گھنٹی کی مسلسل آوازیں اس کے اعصاب پر حملہ آور ہو رہی تھی۔ وہ ہوش میں آ گیا۔ دروازہ بند کر کے اور گیل کو تار پر لٹکا چھوڑ کر وہ نیچے بھاگا دروازہ کھولا تو سامنے اسٹیو ٹائیز اسے گھور رہا تھا۔

”تو تم ابھی تک یہیں ہو۔“ اسٹیو نے کہا۔ ”بہت خوب ڈاکٹر میں تم سے بہت سی باتیں کرنا چاہتا ہوں۔“

”مجھے اس وقت مدد کی ضرورت ہے۔“ ڈاکٹر نے ہانپتے ہوئے کہا۔ ”گیل نے خودکشی کرلی ہے۔“

اسٹیو نے اسے ایک طرف دھکیلا اور اوپر بھاگا۔ وانز اس کے تعاقب میں جانے کی بجائے پارکنگ کی طرف دوڑا۔ اس نے اپنی کار اسٹارٹ کی اور دیوانوں کی طرح ڈرائیو کرتا ہوا باہر نکل گیا۔ اس کا ذہن ماؤف ہو رہا تھا۔ اس نے خود کو سنبھالنے کی کوشش کی لیکن ناکام رہا۔ اس کے اعصاب جواب دے گئے تھے۔ اس نے دونوں ہاتھ آنکھوں پر رکھ لئے اور کار ایک سو دس میل کی رفتار سے سامنے والی دیوار کی طرف بڑھتی چلی گئی۔ ایک خوفناک دھماکہ ہوا اور ہر طرف شراروں کی بارش ہونے لگی۔

بینکر ہاتھ ملتا ہوا ٹہل رہا تھا۔ ”تم نے مجھے ابھی تک یہ نہیں بتایا کہ گیل کے گھر رات کے وقت کیوں گئے تھے؟“

”وی آنا یونیورسٹی سے معلومات حاصل کرنے کے بعد مجھے یقین ہو گیا تھا کہ ڈاکٹر وانز فراڈ ہے۔“ اور سب سے زیادہ ہمیں اس گورکن کا شکر گزار ہونا چاہئے جس نے بروقت اطلاع دی تھی۔ اس نے بیس سال پہلے جو کچھ کیا تھا اس کا ازالہ ہو گیا۔ اب گیل کبھی آہٹوں یا آوازوں سے خوفزدہ نہیں ہوگی۔ کیوں گیل؟“

گیل نے شرما کر اسٹیو کی طرف اور پھر اس خوفناک گورکن کی طرف دیکھا جس کا چہرہ اس کے ناخنوں سے زخمی ہو گیا تھا۔ ”میری بچی۔“ گورکن نے اٹھ کر اس کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔ ”میری بچی مجھے معاف کر دینا۔ آسمانی باپ تمہاری ماں پر اپنی رحمتیں نازل کرے۔ اگر تمہیں بھی خودکشی کے بعد دفن کرنا پڑتا تو شاید میں اپنے ہاتھ ہی کاٹ لیتا۔“





آسیبی بلی

ایس امتیاز احمد۔کراچی

عورت کی آواز سنائی دی، خدا کے واسطے مجھے اس جگہ سے فوراً باہر لے چلو میں ایک لمحہ بھی نہیں ٹھہر سکتی، ورنہ میرے دل کی دھڑکن بند ہوجائے گی اور میں ……

خوف و ہراس کے گرداب میں بل کھاتی عجیب وغریب دل پر ہیبت طاری کرتی کہانی

یہ ناقابل فراموش اور عبرتناک حادثہ نورمبرگ کے پرانے قلعہ میں پیش آیا تھا، میں جس زمانے کا ذکر کررہا ہوں، اس زمانے میں نورمبرگ کا یہ پرانا قلعہ سیاحوں کے لیے کچھ زیادہ کشش نہ رکھتا تھا۔ اس کی بڑی وجہ یہ تھی کہ جرمنی کے اس دور افتادہ اور بہت پرانے شہر تک پہنچنے کی سہولتیں کچھ زیادہ نہ تھیں اور بہت کم لوگ ایسے تھے جو دور دراز کا سفر طے کرکے اور سینکڑوں مصیبتیں برداشت کرنے کے بعد نورمبرگ پہنچتے تھے۔ دوسری جنگ عظیم کے دوران میں نازیوں نے نورمبرگ کو بڑے پیمانے پر استعمال کیا، اس لیے اس کی شہرت دور دور تک پھیل گئی اور جب سیروسیاحت سے دلچسپی رکھنے والوں کو پتہ چلا کہ نورمبرگ میں بارہویں صدی عیسوی کی عمارتوں کے آثار موجود ہیں، تو وہ اسے دیکھنے کے لیے جوق درجوق آنے لگے۔

ان دنوں میری شادی ہوئے دو ہی ہفتے گزرے تھے اور ہم میاں بیوی یورپ کے کئی ملکوں کی سیر کرتے ہوئے ایک روز فرینکفرٹ کے ریلوے اسٹیشن پر اترے، تو ہماری ملاقات جوسپین سے ہوئی وہ خوبصورت نوجوان نہایت باتونی اور مسخرے پن کی حد تک ہنس مکھ امریکی سیاح تھا جس نے جلد ہی ہم سے گہری دوستی کرلی۔ وہ منہ ٹیڑھا کرکے جب تیزی سے انگریزی بولتا، تو میری بیوی کے لیے اپنی ہنسی ضبط کرنا مشکل ہو جاتا، جوسپین کی باتیں بڑی دلچسپ ہوتیں۔

وہ اپنی بہادری اور سیاحت کے ایسے ایسے عجیب قصے بیان کرتا کہ حیرت ہوتی تھی۔ اگرچہ مجھے بعد میں احساس ہوگیا کہ وہ جھوٹ بولنے کے فن میں اپنا ثانی نہیں رکھتا، تاہم ایسے ساتھی کی موجودگی ہمارے لیے بہت اچھی ثابت ہوئی اور وہ تفریح کا بہت عمدہ ذریعہ بن گیا۔

نورمبرگ کا قلعہ دیکھنے کی تجویز بھی اس نے پیش کی تھی اور میری بیوی امیلیا کو ایسی عمارتیں دیکھنے کا از حد شوق تھا فوراً آمادہ ہوگئی۔ نورمبرگ دریائے پیگنیز کے دونوں کناروں پر آباد ہے۔ ایک حصہ پرانا شہر کہلاتا ہے اور دوسرا حصہ نیا شہر۔ پرانا شہر تمام تر قرون وسطیٰ کے رومن فن تعمیر کا بہت اچھا نمونہ ہے یہاں شہر کے چاروں طرف اونچی فصیل ہے جس میں چار بڑے دروازے 128 سیڑھیاں ہیں۔ شہر کا یہ حصہ زیادہ تر پہاڑیوں کے اوپر آباد ہے جو شمال سے مغرب کی جانب پھیلتی چلی گئی ہیں اور اسی مقام پر سرخ پتھروں کا بنا ہوا وہ عظیم الشان قلعہ واقع ہے جس کے ایک کمرے میں یہ عبرتناک حادثہ پیش آیا تھا جو میں آگے چل کر بیان کرنے والا ہوں۔

نورمبرگ کا قدیم قصبہ اس قلعہ سے نیچے آباد ہے۔ چونکہ یہ قلعہ سب سے اونچی چٹان پر تعمیر کیا گیا ہے اس لیے اس کی فصیل سے شہر کا نظارہ بڑی آسانی سے کیا جاسکتا ہے۔ قلعہ کی شمالی فصیل کے ساتھ ساتھ ایک بہت گہری کھائی ہے جو صدیوں سے پانی نہ ملنے کی وجہ سے پیاسی ہے۔

رومن بادشاہوں کے عہد حکومت میں یہ کھائی جسے دیکھ کر خوف پیدا ہوتا ہے یقیناً پانی سے بھری رہتی ہوگی اور خدا ہی بہتر جانتا ہے کہ اس میں کتنے آدمی گر گر کر ہلاک ہوئے ہوں گے۔

مجھے بتایا گیا تھا کہ اکثر مجرموں کو جب اذیتیں دے دے کر ہلاک کیا جاتا، تو اس کے بعد لاشوں کو کھائی میں پھینک دیا جاتا تھا۔ ان دنوں اس کی گہرائیوں میں گوشت خور مچھلیاں بھی بڑی تعداد میں پرورش کی گئی تھیں، یہ لاشیں ان مچھلیوں کا من بھاتا کھاجا تھیں۔

اس خشک کھائی نے زمین کا بہت سا حصہ گھیر رکھا تھا۔ اس لیے نورمبرگ کے گورنر نے اسے استعمال کرنے کا عجیب طریقہ اختیار کیا۔ اس نے یہاں درختوں اور پودوں کی بہت سی قسمیں لگوادی تھیں اور کہیں کہیں پھولوں کے تختے بہار دکھا رہے تھے قلعہ کی فصیل کے ساتھ ان کا نظارہ بہت ہی بھلا معلوم ہوتا ہے۔ فصیل سے اس کی گہرائی اندازاً پچاس ساٹھ فٹ ہوگی۔ اس سے پرانے شہر کے مکانات دکھائی دیتے ہیں جن کی سرخ سرخ ڈھلوان چھتیں تیز دھوپ میں خوب چمکتی ہیں۔ دائیں جانب، قلعہ کی فصیل کے ساتھ ہی وہ چھوٹی بڑی برجیاں اور گنبد دور تک پھیلے ہوئے تھے جن میں پہرے دار رہا کرتے تھے اور انہی کے درمیان ایک بڑے سے گنبد کے نیچے قلعہ کا سب سے اہم کمرہ بنا ہوا تھا جسے خاص طور پر دیکھنے کے لیے ہم یہاں آئے تھے۔

یہ وہ کمرہ تھا جو سینکڑوں آدمیوں کی جانیں لے چکا تھا۔ اسی کمرے میں وہ عجیب و غریب مشینیں رکھی ہوتی تھی جن کی مدد سے انسان صدیوں سے اپنے ہی جیسے انسانوں پر ظلم، اذیت اور عذاب کے طریقے آزماتا چلا آیا ہے۔ یہاں بادشاہ مجرموں کو ایسی ہولناک سزائیں دیتے تھے کہ آج بھی انہیں سن کر رونگٹے کھڑے ہوجاتے ہیں۔

ہم نے فیصلہ کیا کہ پہلے پورے قلعے کی سیر کرلیں اور پھر اس ہیبت ناک کمرے کو سب سے آخر میں دیکھیں تاکہ ہماری طبیعتیں یہ ناخوش گوار اثر کم سے کم

قبول کریں۔ اسی دوران میں ہم تینوں ذرا آرام کے لئے فصیل کے قریب جا کھڑے ہوئے اور جھک کر کھائی میں لگے ہوئے پھولوں کے تختوں اور درختوں کو دیکھنے لگے۔ تیز اور روشن دھوپ میں یہ نظارہ آنکھوں کے لئے بڑا فرحت انگیز اور خوش گوار تھا۔ رنگ برنگ پھولوں کے تختے بڑے بڑے خوشنما قالینوں کی صورت میں ہمارے سامنے جھومتے لگتے اور ہمیں یوں محسوس ہوتا جیسے قدرت کے بنائے ہوئے ان حسین قالینوں میں حرکت پیدا ہوگئی ہے۔ قلعے کی سیر کرتے ہوئے ہم واقعی تھک گئے تھے اور اب کچھ دیر آرام کرنا چاہتے تھے، مگر وہاں بیٹھنے کی کوئی جگہ نہ تھی جگہ ہوتی بھی تو اس کھلے آسمان تلے دھوپ میں بیٹھتے بھی کہاں؟ دفعتہً میری بیوی نے انگلی سے ایک جانب اشارہ کیا اور ہم نے جھک کر ادھر دیکھا تو ایک دلچسپ تماشا نظر آیا۔

سیاہ رنگ کی ایک بڑی بلی جس کی کھال دھوپ میں خوب چمک رہی تھی، فصیل کے عین نیچے دھوپ میں آرام سے لیٹی تھی اور اس کا بچہ جس کا رنگ بھی سیاہ تھا، قریب ہی کھیل رہا تھا۔ بلی اپنی لمبی دم ہلاتی اور بچہ اس کی طرف جھپٹتا، کبھی وہ دم پر پنجہ مارتا اور کبھی اسے اپنے منہ میں دبالیتا اور پھر زور لگا کر اپنی ماں کو گھسیٹنا چاہتا۔ بلی اپنے پاؤں کو جنبش دے کر بچے کو آہستہ سے پرے دھکیل دیتی اور دم زور زور سے ہلانے لگتی۔ اس پر بچہ اور جوش میں آکر اچھلنے کودنے لگتا۔ غالباً اسے اس کھیل میں بڑا مزہ آرہا تھا۔

چند منٹ تک ہم تینوں نہایت دلچسپی سے یہ تماشہ دیکھتے رہے۔ پھر یکایک امریکی نوجوان نے قریب پڑا ہوا ایک پتھر اٹھایا اور ہنس کر بولا۔

''ذرا دیکھنا میں آپ لوگوں کو ایک اور دلچسپ کھیل دکھاتا ہوں میں یہ پتھر ان کے قریب پھینکتا ہوں۔ وہ دونوں حیران ہوں گے کہ پتھر کہاں سے آن گرا۔''

''ارے یہ کیا غضب کرتے ہو۔'' میری بیوی نے اسے روکتے ہوئے کہا۔ وہ ڈر جائیں گے کیوں ان کا مزا کرکرا کرنے کی فکر میں ہو۔''

''مادام، آپ قطعاً نہ گھبرایئے...... یہ کھیل اور دلچسپ بن جائے گا۔''

''اچھا بھئی تمہاری مرضی...... مگر خدا کے لئے ذرا احتیاط سے پتھر پھینکنا، کہیں تم اس پیارے سے ننھے بچے کو زخمی نہ کردو۔''

''اجی آپ خواہ مخواہ ڈرتی ہیں کیا میں بچہ ہوں جو ایسی بے احتیاطی کروں گا۔'' امریکی نوجوان نے گردن ہلا کر کہا۔

''مادام، میں تو ایسا رحم دل آدمی ہوں کہ میں نے آج تک کسی چیونٹی کو بھی نہیں مارا۔''

''لیکن شیر اور چیتے ہلاک کرتا رہا ہوں۔'' میں نے لقمہ دیا۔ وہ قہقہہ لگا کر ہنسا اور اپنا ہاتھ بڑھا کر پتھر نیچے پھینک دیا۔

آہ...... وہ منحوس لمحہ جب اس امریکی نے پتھر نیچے پھینکا جو کہ مجھے ساری زندگی یاد رہے گا، کیونکہ ہوا کے زور سے وہ وزنی پتھر تیزی سے نیچے گیا اور بلی کے معصوم بچے کے سر پر جا لگا اور ہمارے دیکھتے ہی دیکھتے بلی کے بچے کا سر پھٹ گیا اور بھیجا باہر نکل آیا۔ چند سیکنڈ تک تڑپنے کے بعد وہیں ٹھنڈا ہوگیا۔

اب ہم تینوں آنکھیں پھاڑے بلی کے بچے کی لاش کو دیکھ رہے تھے جو چند ثانیے پیشتر زندگی اور حسن کا بہترین تصور تھا۔

مجھے یوں محسوس ہوا جیسے اس غیر متوقع حادثے نے میرے جسم کو بھی سرد کردیا ہے۔ ایک لمحہ کے لئے سوچنے اور سمجھنے کی قوتیں بے کار ہوگئیں۔ یہی حال میری بیوی اور امریکی نوجوان کا تھا، بلکہ میری بیوی کا تو خوف کے مارے چہرہ بھی زرد پڑ گیا تھا۔

پتھر گرتے ہی سیاہ بلی نے نظر اٹھا کر ہماری جانب دیکھا۔

خدا کی پناہ...... اس کی بڑی بڑی سبز آنکھیں یک دم انگاروں کی مانند سرخ ہوگئیں اور اس کا جبڑا بھیانک انداز میں کھل گیا...... اس نے اپنی شعلہ بار نگاہیں ہم تینوں پر جمادیں۔

میرے بدن میں دہشت سے تھرتھری چھوٹ گئی اور میری بیوی تو تقریباً غش کھا کر میرے اوپر ہی آن پڑی۔ سیاہ بلی نے پلٹ کر اپنے تڑپتے ہوئے بچے کی جانب دیکھا جو جان کنی کے آخری مراحل سے گزر رہا تھا۔ اس کی چھوٹی چھوٹی ٹانگیں کانپ رہی تھیں اور سر پر سے سرخ سرخ خون کی نکلتی ہوئی پتلی سی دھار نے اس کا سارا جسم لت پت کردیا تھا۔

بلی کے حلق سے ایک دردناک چیخ نکلی، وہ اچھل کر اپنی جگہ سے اٹھی اور نہایت محبت سے اپنے مرے ہوئے بچے کا جسم چاٹنے لگی۔ اس کا جبڑا اپنے بچے کے تازہ خون میں بھر گیا اور جب اس نے منہ کھولا، تو اس کے لمبے سفید چمکتے ہوئے دانت دیکھ کر میرا کلیجہ بھی حلق میں آ گیا۔ اس کے لمبے لمبے نوکیلے ناخن بھی پوری طرح باہر نکلے ہوئے تھے اور اس وقت وہ جوش اور انتقام کا ایسا نمونہ بن گئی تھی کہ بیان کرنے کے لئے میرے پاس الفاظ نہیں۔

چند لمحے تک وہ نہایت غضب آلود اور نفرت انگیز نظروں سے امریکی کو تکتی رہی اور پھر پوری قوت سے دوڑتی ہوئی آئی اور قلعہ کی پتھریلی دیوار پر چڑھنے کی کوشش کرنے لگی۔ اس کے حلق سے اب غراہٹوں اور چیخوں کی دلدوز آوازیں نکل رہی تھیں۔

بلی کا یہ غیظ وغضب اور نفرت کی حالت دیکھتے ہوئے مجھے یقین تھا کہ اگر اس کا بس چلے تو وہ امریکی نوجوان کی بوٹیاں اڑا دے گی۔ اس خوفناک شکل اور غرانے، چیخنے اور سفید دانت دکھانے کا انداز اتنا ڈراؤنا تھا کہ میری بیوی اسے برداشت نہ کرسکی۔ اسے ہوش میں لانا ابھی میرے لیے ایک مسئلہ بن گیا۔

بلی بار بار دوڑتی ہوئی آتی اور قلعہ کی سنگین اور غیر ہموار دیوار پر چڑھنے کی کوشش کرتی، مگر ہر مرتبہ پیٹھ کے بل نیچے گر جاتی، تاہم اس کے جوش وخروش میں اضافہ ہی ہوتا جارہا تھا۔ ایک مرتبہ جب وہ اس کوشش میں ناکام ہوکر نیچے گری، تو اپنے مرے ہوئے بچے پر جا پڑی اور بلی کا سارا جسم خون میں لت پت ہوگیا۔

امریکی وہیں کھڑا بلی کی ان حرکات کو دلچسپی سے دیکھ رہا تھا۔ شاید اس کے لئے یہ بھی ایک پرلطف تماشا تھا میں جلدی سے اپنی بیوی کو وہاں سے ہٹا کر ذرا فاصلے پر ایک جگہ سائے میں لے گیا اور اسے ہوش میں لانے کی تدبیریں کرنے لگا۔ چند منٹ بعد امیلیا ہوش میں آ گئی، لیکن اس کی آنکھوں سے خوف کے آثار نمایاں تھے۔

امیلیا کو وہیں چھوڑ کر جب میں دوبارہ دیوار کے قریب گیا تو جیسپن نے کہا۔

''میں نے دنیا میں ایک سے ایک خوفناک درندے دیکھے ہیں، مگر جس وحشی پن کا مظاہرہ سیاہ بلی کر رہی ہے، یہ میرا پہلا مشاہدہ ہے۔'' اس کا غصہ ہر لمحے بڑھتا ہی جارہا تھا۔ اس کے بعد وہ اسی طرح کا ایک اور قصہ بیان کرنے لگا جسے میں نے ڈھنگ سے نہیں سنا، کیونکہ میں بلی کی عجیب وغریب حرکات دیکھنے میں لگا ہوا تھا۔ بلی نے پندرہ یا بیس مرتبہ دیوار پر چڑھنے کی کوشش کی اور ایک بار تو وہ کافی اوپر آ گئی تھی کہ پیر پھسل جانے کے باعث دھڑام سے نیچے گری۔ یقیناً اسے سخت چوٹ لگی تھی، لیکن بلی نے اس چوٹ کی کوئی پروانہ کی اور نئے ولولے کے ساتھ دوبارہ دوڑتی ہوئی آئی اور دیوار پر چڑھنے لگی۔ یہ دیکھ کر امریکی کہنے لگا۔

''اس جانور کی ہمت پر آفرین ہے...... ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ دیوار پر چڑھ کر ہی دم لے گی، مگر افسوس کہ وہ یہاں کبھی نہ پہنچ سکے گی۔ تھوڑی دیر بعد جب اس کا غصہ سرد پڑ جائے گا تو وہ اس حادثے کو بھول جائے گی...... افسوس...... صد افسوس...... مجھے بالکل معلوم نہ تھا کہ پتھر اس کے بچے کو لگ جائے گا...... یہ حادثہ بالکل اتفاقیہ ہوا ہے، ورنہ میری نیت اسے ہلاک کرنے کی نہ تھی خیر...... اب جو ہونا تھا ہوگیا...... اس اس بچے میں دوبارہ جان نہیں ڈالی جاسکتی۔''

اتنا کہہ کر وہ پیچھے ہٹ گیا اور اس کے پیچھے ہٹتے ہی بلی نے بھی دیوار پر چڑھنے کی کوشش ترک کردی اور وہیں بیٹھ کر اپنی غضب ناک نظروں سے اوپر دیکھنے لگی۔

پھر وہ مجھ سے مخاطب ہوکر کہنے لگا،

''کرنل، مجھے افسوس ہے کہ اس حادثے نے آپ کو ذہنی کوفت میں مبتلا کر دیا۔ آہ...... میں دیکھتا ہوں کہ آپ کی بیوی نے تو اس کا بہت ہی زیادہ ناگوار اثر قبول کیا ہے۔ مجھے ان سے معذرت کرنی چاہیے۔''

یہ کہہ کر وہ اس جگہ جہاں میری بیوی آرام سے لیٹی تھی۔

''مادام...... کیا آپ مجھے معاف نہ کریں گی...... یقین کیجیے اس میں میری کوئی خطا نہ تھی، بلی کے بچے کی قسمت میں اسی طرح مرنا لکھا تھا...... اب جو ہونا تھا ہو گیا...... اسے فراموش کر دیجیے اور آئیے قلعہ کی باقی چیزیں دیکھ کر ہم جلد از جلد اس منحوس مقام سے رخصت ہوں۔''

ہم تینوں ادھر سے گزرتے ہوئے جب فصیل کے قریب آئے تو غیر ارادی طور پر ہم نے نیچے جھانکا، سیاہ بلی اسی طرح بیٹھی اوپر دیکھ رہی تھی۔ جونہی امریکی کا چہرہ اسے نظر آیا، اس نے وہیں سے چھلانگ لگائی۔ اس کے دونوں پنجے اس انداز میں باہر نکلے ہوئے تھے جیسے وہ امریکی کا منہ نوچ لینا چاہتی ہے، مگر وہ حسب معمول پھر نیچے جا پڑی۔ ساٹھ فٹ اونچی دیوار پر چڑھنا بلاشبہ بلی کے لیے ایک ناممکن بات تھی۔ امریکی نے اب خوش طبعی کا مظاہرہ کرتے ہوئے بلی کو مخاطب کیا۔

''پیاری بلی...... مجھے معاف کر دو...... میں نے جان بوجھ کر تمہارے بچے کو نہیں مارا...... میں تو دراصل تمہارا کھیل اور دلچسپ بنانا چاہتا تھا...... اب یہ اتفاق تھا کہ پتھر تمہارے بچے کو جا لگا اور وہ مر گیا۔ بخدا اس میں میرا ذرہ برابر بھی قصور نہیں...... اب تم دیوار پر چڑھنے کی کوشش چھوڑ کر بچے کے کفن دفن کا بندوبست کرو جاؤ شاباش۔''

امیلیا ایک بار پھر بلی کو دیکھ کر ڈر کے مارے کانپنے لگی اور اس نے نوجوان سے کہا۔

''ہوچسپین، تم اسے مذاق نہ سمجھو۔ بلی کا ارادہ فاسد ہے وہ اگر یہاں ہوتی تو تمہیں ضرور مار ڈالتی...... مجھے اس کی آنکھوں میں تمہارے لیے نفرت اور حقارت کی چنگاریاں سلگتی دکھائی دے رہی ہیں۔'' وہ قہقہہ مار کر ہنسا اور کہنے لگا۔

''مادام...... آپ مجھے شیر دل ہوچسپین کو...... اس حقیر بلی سے ڈراتی ہیں جس نے نہ جانے کتنے درندوں کو موت کے گھاٹ اتار دیا ہے۔ وہ بلی میرے سامنے کیا حقیقت رکھتی ہے۔ میں اب چاہوں تو نیچے جا کر آپ کے سامنے اس کا گلا گھونٹ دوں۔''

بلی نے جب ہوچسپین کا قہقہہ سنا، تو اس میں دفعتہً ایک عجیب تغیر رونما ہوا۔ اس کا سارا جوش و خروش اور غضب ناک لہجہ ختم ہو گیا اور وہ پرسکون دکھائی دینے لگی۔ اس نے پھر ہوچسپین کی طرف ایک بار دیکھا اور آہستہ آہستہ چلتی ہوئی اس طرف گئی جہاں اس کا بچہ مرا پڑا تھا اور پھر زبان نکال کر بچے کا جسم چاٹنے لگی۔

''واقعی بلی تمہیں دیکھ کر اب ڈر گئی ہے۔ دراصل اس نے تمہاری آواز سن کر اندازہ کر لیا ہوگا کہ یہ شخص تو بہت بڑی بلا ہے۔ اس سے نمٹنا آسان کام نہیں۔'' میں نے اسے چھیڑتے ہوئے کہا۔ امیلیا بھی یہ فقرہ سن کر ہنس پڑی اور ہم تینوں وہاں سے آگے بڑھے۔

تھوڑی دور جانے کے بعد جب ہم نے نیچے جھانکا تو، تو یہ دیکھ کر ہماری حیرت کی کوئی انتہا نہ رہی کہ سیاہ بلی بھی اسی جانب چلی جا رہی تھی جدھر ہم جا رہے تھے۔ اس نے منہ میں اپنے مردہ بچے کو دبا رکھا تھا۔ لیکن چند لمحے بعد جب ہم نے دیکھا تو مردہ بچہ اس کے منہ میں نہ تھا۔

بلی نے شاید اسے کسی جگہ چھپا دیا تھا۔ اسے پراسرار انداز میں تعاقب کرتے دیکھ کر امیلیا پر پھر خوف طاری ہونے لگا اور اس نے امریکی کو ہوشیار رہنے کی تاکید کی، مگر وہ بے پروائی سے ہنسا اور کہنے لگا۔

''مادام، آپ کو اس بلی سے ڈرنے کی قطعاً ضرورت نہیں۔ اگر وہ ہمارے پیچھے آتی ہے۔ تو آنے دیجیے بھلا وہ میرا کیا بگاڑ سکتی ہے؟ اور فرض کیجیے اگر اس کا ارادہ مجھے نقصان پہنچانے کا ہے تو میں ابھی آپ کے سامنے اس کا خاتمہ کیے دیتا ہوں۔'' یہ کہہ کر اس نے اپنی

کمر سے بندھا ہوا پستول نکالنا چاہا۔

''زیادہ سے زیادہ یہی ہوگا نہ کہ ایک بلی کو مارنے کے جرم میں چند منٹ کے لئے پولیس مجھے پکڑ لے گی، وہ مجھے پھانسی پر لٹکانے سے تو رہی۔''

اسیلیا نے اسے پستول نکالنے سے روکا، ورنہ وہ ضرور بلی پر گولی چلا دیتا۔

ہوچسپین نے ایک بار پھر نیچے جھانکا، تو بلی اسے دیکھ کر غرائی اور پھر جلدی سے ایک پتھر کی آڑ میں ہوگئی۔ میں اس کی یہ حرکت دیکھ کر ششدر رہ گیا تھا؟ بلی کے یوں دبک جانے پر ہوچسپین کے مہلک ارادے کا پتہ چل گیا تھا؟ بلی کے یوں دبک جانے پر ہوچسپین نے فخریہ انداز میں اسیلیا کی جانب دیکھا اور کہا۔

''دیکھا مادام آپ نے؟ یہ شریر بلی اب مجھ سے ڈرنے لگی ہے۔ میرا خیال ہے کہ اسے یہاں سے لوٹ کر اپنے مردہ بچے کی حفاظت کرنی چاہیے، کہیں دوسری بلیاں اسے ہڑپ نہ کرلیں جاؤ خالہ بلی، یہاں سے نکل جاؤ، ورنہ میرا پستول خواہ مخواہ چل جائے گا۔''

اسیلیا نے جلدی سے ہوچسپین کا ہاتھ پکڑا اور اسے گھسیٹ کر آگے لے گئی لیکن جاتے جاتے بھی امریکی نوجوان نے نیچے جھانک کر بلی سے چند مزاحیہ فقرے کہہ ہی دیئے۔

''اچھا الوداع...... خالہ بلی...... میں تم سے معذرت کر چکا ہوں کہ میں نے جان بوجھ کر تمہارے بچے کو نہیں مارا، مگر تم ہمارا پیچھا نہیں چھوڑتیں۔ بہر حال تم اب اس حادثے کو فوراً ہی فراموش کردو۔''

جلد ہی قلعہ کی اندرونی دلچسپیوں اور عجائبات کو دیکھنے میں ہم اس قدر محو ہوگئے کہ تھوڑی دیر پہلے جس ناخوشگوار حادثے نے ہمیں مکدر کردیا تھا، اس کی یاد بھی باقی نہ رہی۔

پھرتے پھراتے آخر کار ہم قلعہ کی سب سے زیادہ مشہور اور ہیبت ناک جگہ پر پہنچ ہی گئے جہاں نو سو سال پیشتر مجرموں اور جاسوسوں کو اذیتیں دے دے کر ہلاک کیا جاتا تھا۔

اس وسیع وعریض کمرے کے عمر رسیدہ چوکیدار نے ہمارا استقبال کیا۔ وہ ہمیں دیکھ کر خاصا خوش نظر آتا تھا، کیونکہ چوکیدار کی بالائی آمدنی کا ذریعہ سیاحوں کی دی ہوئی بخشش ہی ہوتی ہے، اس لیے وہ ضرورت سے زیادہ ہماری جانب توجہ دے رہا تھا۔ وہ عرصہ دراز سے اس کمرے کا چوکیدار تھا اور یہاں رکھی ہوئی ہر شے کے متعلق اس کی معلومات حیران کن تھیں۔

جب ہم کمرے کے اندر داخل ہوئے، تو ماحول کی تاریکی اور اس میں رکھی ہوئی عجیب اور پراسرار مشینوں اور ہتھیاروں نے ہمارے اعصاب پر برا اثر ڈالا۔ یہ گنبد نما کمرہ دو حصوں پر مشتمل ہے۔ اوپر کے حصے میں جانے کے لئے چند سیڑھیاں طے کرنی پڑتی ہیں۔ ہم نے پہلے نچلے کمرے کو دیکھنے کا فیصلہ کیا۔ یہاں دن کے وقت بھی ملگجا سا اندھیرا تھا۔ اس کی دیواریں بہت چوڑی اور موٹی تھیں اور کمرے میں اوپر کی جانب کوئی روشندان نہ ہونے کے باعث روشنی اور ہوا آنے کا کوئی امکان نہ تھا۔ دیواروں کا پلستر جگہ جگہ سے اکھڑ چکا تھا اور جا بجا مکڑیوں نے بڑے بڑے جالے تان رکھے تھے جنہیں صاف کرنے کا خیال شاید منتظمین کو بھی نہ آیا۔

ہم نے جب غور سے ان دیواروں کا معائنہ کیا، تو ان پر بڑے بڑے سیاہ دھبے صدیوں پرانے تھے اور یہ خون ان لوگوں کا تھا جن کو کسی جرم یا جاسوسی کے شک میں پکڑ کر اذیتیں دی جاتی تھیں چند ہی لمحے بعد ہمیں احساس ہونے لگا کہ اس بھیانک کمرے کی دیواریں زندہ ہو رہی ہیں اور ان کے اندر سے ہمیں ان بدنصیب لوگوں کے چیخنے اور کراہنے کی آوازیں سنائی دے رہی ہیں۔

اسیلیا کے چہرے کی اڑی ہوئی رنگت سے اندازہ ہوتا تھا کہ وہ کمرے کے ماحول سے ڈر رہی ہے، لیکن میری خاطر وہ بظاہر بڑی دلچسپی سے ان چیزوں کو دیکھ رہی تھی۔ خدا ہی بہتر جانتا ہے کہ کتنے آدمیوں پر ڈھائے جانے والے ظلم وستم کی داستانیں ان خونی دیواروں میں پوشیدہ تھیں۔

ہم بہت جلد گھبرا کر اس وحشت ناک جگہ سے

نکل آئے۔ چوکیدار اب ہمیں اوپر کی سیڑھیوں کے ذریعے دوسرے کمرے میں لے جا رہا تھا۔

جونہی ہم دوسرے کمرے میں داخل ہوئے، دہشت کی ایک نئی لہر ہمارے جسموں میں دوڑ گئی۔ اسلیلا نے میرا بازو سختی سے تھام لیا۔ اس کا ہاتھ کپکپا رہا تھا اور خود میرا یہ حال تھا کہ اپنے دل کے دھڑکنے کی آواز بخوبی سن سکتا تھا۔ اس کمرے کا ماحول نچلے کمرے کے ماحول سے بھی کہیں زیادہ خوف ناک تھا۔ اس کی ہر شے اندھیرے میں آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر ہمیں گھور رہی تھی اور ہم نے ان اذیت دینے والی مشینوں اور دیواروں پر لگے ہوئے سینکڑوں قسم کے ہتھیاروں کے قہقہوں کی آوازیں بھی سنیں۔

بوڑھے چوکیدار نے فوراً محسوس کر لیا کہ ہم ڈر گئے ہیں۔ اس نے جلدی سے ایک موم بتی جلائی جس کی مدھم کانپتی ہوئی روشنی وسیع و عریض کمرے میں پھیل گئی۔ اب ہم آسانی سے یہاں رکھی ہوئی چیزوں کو پہچان سکتے تھے۔ چاروں طرف دیواروں کے ساتھ ساتھ طرح طرح کی تلواریں، کلہاڑے، نیزے اور خنجر لگے ہوئے تھے۔ ان میں سے اکثر تلواریں اور کلہاڑیاں اتنی بڑی اور وزنی تھیں کہ جنہیں اٹھانا عام آدمی کے بس کی بات نہ تھی۔ غالباً ان گرانڈیل حبشی جلادوں کے استعمال میں آتی تھیں جنہیں خاص طور پر مجرموں کی گردن مارنے کے لیے تربیت دی جاتی تھی۔ ان ہتھیاروں کے قریب ہی پرانی سیاہ لکڑی کے بہت بڑے بڑے کندے بھی پڑے دکھائی دیے جن پر جا بجا کسی روغن کے دھبے جمے ہوئے تھے۔

چوکیدار نے ہمیں بتایا کہ لکڑی کے یہ وہ کندے ہیں جن پر مجرموں کو لٹا کر ان کی گردن کاٹی جاتی تھی۔ ہم نے جھک کر ان کندوں پر تلواروں کے گہرے نشان بھی دیکھے۔ کمرے کے ایک حصے میں وہ تمام چھوٹی بڑی مشینیں یکجا رکھی تھیں جو مجرموں اور جاسوسوں کو اذیت پہنچانے کے لیے استعمال کی جاتی تھیں۔ انہیں دیکھ کر ہی ہیبت طاری ہوتی تھی۔ یہاں ہم نے ایک کرسی دیکھی جس کی نشست پر لوہے کی لمبی لمبی اور نہایت تیز نوکیلی سلاخیں لگی تھیں۔

چوکیدار نے ہمیں بتایا کہ یہ موت کی کرسی ہے، اس پر مجرم کو بٹھا دیا جاتا تھا اور یہ سلاخیں اس کے گوشت میں پیوست ہو جاتی تھیں۔ ایسا مجرم کئی کئی دن جان کنی کی حالت میں مبتلا رہنے کے بعد مرتا تھا۔

اس کرسی کے علاوہ متعدد قسم کے شکنجے بھی موجود تھے جن میں انسانی جسم کو کس طرح جکڑا جا سکتا ہے کہ ذرا بھی جنبش نہ کر سکے۔ لوہے کی چھوٹی بڑی پیٹیاں لوہے کے جوتے، سر اور گردن کو جکڑنے والے شکنجے اور آہنی خول جو بھیجے کو کھوپڑی سے باہر نکال سکتے تھے۔ کمرے میں گھومتے ہوئے ہم ایک بڑی آہنی مشین کے قریب پہنچے جس کی عجیب و غریب ساخت نے امریکی نوجوان کو بہت متاثر کیا، جو ایک عورت کے مجسمے سے مشابہ تھی اور اس میں زنگ لگا ہوا تھا۔ اس کے عین وسط میں کچھ اوپر اٹھا ایک بڑا سا آہنی کڑا تھا۔ جس میں موٹا سا رسا بندھا تھا۔ اس رسے کا دوسرا سرا ایک ستون سے بندھا ہوا تھا۔ چوکیدار نے بتایا کہ اس مشین کو "آئرن ورجن" کہتے ہیں اور مجرم کو ہلاک کرنے کے لیے اس مشین سے زیادہ بہتر کوئی مشین نہیں۔ آپ اسے غور سے دیکھیے، یہ برسوں تک خون میں نہا چکی ہے۔ اور اب بھی اس کے ایک حصے پر خون کی جمی ہوئی تہہ آپ دیکھ سکتے ہیں۔

چوکیدار نے ستون سے بندھا ہوا موٹا رسا کھولا اور قوت سے اسے کھینچنے لگا۔ اب ہم نے حیرت سے اس مشین کی اوپر بنا ہوا ایک چھوٹا سا دروازہ گڑگڑاہٹ کی آواز کے ساتھ آہستہ آہستہ اوپر اٹھنے لگا۔ یہ آہنی دروازہ بہت بھاری تھا۔ کیونکہ اسے کھینچتے ہوئے بوڑھا چوکیدار جلد ہی ہانپنے لگا، تاہم اس نے دروازہ پوری طرح اوپر اٹھا دیا جس پر بہت سی نوکدار سلاخیں لگی ہوئی تھیں اور ہمیں مشین کے اندر دیکھنے کا اشارہ کیا۔ آہنی دروازہ اٹھنے کے بعد مشین کے اندر اتنی جگہ تھی جس میں ایک آدمی آسانی سے لیٹ سکتا تھا۔

چوکیدار نے ہمیں بتایا، اب آپ سمجھ گئے ہوں گے کہ یہ مشین کس کام آتی تھی۔ ملزم کے ہاتھ پیر باندھ کر اس مشین کے اندر خالی جگہ میں لٹا دیا جاتا تھا اور لوہے کے اس سلاخ دار دروازے کو آہستہ آہستہ نیچے گرایا جاتا۔ بدنصیب قیدی جب ان خوش آشام سلاخوں کو اپنی آنکھوں اور جسم کی طرف بڑھتے دیکھتا، تو موت کے لرزہ خیز خوف سے جرم کا اقبال کر لیتا اور سارے راز اگل دیتا،

لیکن بعض ایسے جرم بھی تھے جو اس حالت میں بھی زبان نہ کھولتے، تو رسے کو فوراً چھوڑ دیا جاتا اور یہ آہنی دروازہ پوری قوت سے نیچے گر جاتا اور سلاخیں قیدی کے تمام جسم میں پیوست ہو جاتیں اور وہ آناً فاناً موت سے ہمکنار ہو جاتا۔

امیلیا کے منہ سے ہلکی سی چیخ نکلی اور وہ دوڑتی ہوئی کمرے سے باہر نکل گئی۔ میں اس کے پیچھے گیا۔

''خدا کے واسطے مجھے اس منحوس جگہ سے فوراً لے چلو۔ میں یہاں اب ایک لمحہ کے لیے بھی نہیں ٹھہر سکتی، ورنہ میرے دل کی حرکت بند ہو جائے گی۔''

میں نے اسے دلاسا دیا اور کہا کہ ''ہم تو صرف یہاں کے عجائبات دیکھنے آئے ہیں اور ہمارے ساتھ ایک مہمان بھی ہے۔ وہ کیا خیال کرے گا۔'' میں اسے سمجھا بجھا کر جب واپس کمرے میں لایا، تو امریکی نوجوان اس مشین کے پاس کھڑا اس کا بغور معائنہ کر رہا تھا، مجھے آتے دیکھ کر بولا۔

''آپ کی بیوی بہت کمزور دل کی خاتون ہیں۔ بلاشبہ انہیں یہاں نہیں آنا چاہیے تھا۔ میں نے آپ کی غیر حاضری میں اس مشین کے بارے میں بعض دلچسپ باتیں چوکیدار سے معلوم کی ہیں۔ میں نے اپنے ملک کے ریڈ انڈین باشندوں کے متعلق بڑی بڑی داستانیں سنی تھیں کہ وہ اپنے دشمنوں اور حریفوں کو عجیب عجیب سزائیں دیتے تھے، مگر یہ مشین بے مثال ہے۔ خدا کی پناہ..... مجھے تو اس کی تصور ہی سے اذیت ہوتی ہے۔ لیکن میں اپنا تجربہ مکمل کر کے ہی واپس جاؤں گا۔''

''کیا کہتے ہو کیسا تجربہ؟'' میں نے حیرت سے پوچھا۔

وہ مسکرایا اور کہنے لگا۔

''یہی معمولی سا تجربہ...... میں خود کو ایک منٹ کے لیے اس مشین کے اندر لیٹ کر دیکھنا چاہتا ہوں کہ لوہے کا یہ سلاخ دار دروازہ کس طرح آہستہ آہستہ نیچے آتا ہے۔''

''نہیں، نہیں۔'' امیلیا نے کانپتی ہوئی آواز میں کہا۔ خدا کے واسطے چسپین ایسا نہ کرنا۔ کیا تم پاگل ہو گئے ہو؟''

''آپ جو چاہیں سمجھیں۔ مگر میں یہ تجربہ کر کے رہوں گا۔'' ہوچسپین نے اصرار کیا۔

''اگر آپ ڈرتی ہیں تو تھوڑی دیر کے لیے کمرے سے باہر چہل قدمی کیجیے میں آپ سے کتنی مرتبہ کہہ چکا ہوں کہ میں ڈرپوک آدمی نہیں ہوں، نہ جانے اب تک کیسے کیسے واقعات مجھ پر بیت چکے ہیں۔ آپ یقین نہیں کریں گی، لیکن یہ حقیقت ہے کہ ایک مرتبہ مونٹانا کے جنگل سے میں گزر رہا تھا کہ دشمنو نے مجھے مار ڈالنے کے لیے جنگل میں آگ لگا دی۔ میں رات بھر ایک مرے ہوئے گھوڑے کے اندر چھپا رہا، تب جان بچی۔ اسی طرح نیو میکسیکو میں مجھے سونے کی ایک کان میں جو حادثہ پیش آیا، وہ بڑا خوفناک تھا۔ دو روز تک میں ایک غار میں قید رہا جس کے دروازے پر ایک بڑا پتھر آن گرا تھا۔ غور کیجیے جب ایسے ایسے عظیم حادثوں سے میں بچ گیا تو اس دو منٹ کے تجربے سے کیا قیامت برپا ہو جائے گی۔''

میں نے دیکھا کہ وہ اپنے ہٹ کا پکا ہے اور یہ کام ضرور کر گزرے گا تو کہا۔

''اچھا..... اچھا..... جو کچھ کرنا ہے جلدی کر لو..... ہم اب یہاں زیادہ دیر نہیں ٹھہر سکتے۔ میری بیوی کی طبیعت ناساز ہوئی ہے۔''

امریکی نے مسخرے پن سے مجھے سیلوٹ کیا اور کہنے لگا۔

''جو حکم جناب کا..... بس ابھی فارغ ہوا جاتا ہوں.....''

پھر وہ چوکیدار سے مخاطب ہوا جو امریکی نوجوان کے اس خطرناک تجربے میں مدد دینے پر راضی نہ ہوتا تھا۔

''بڑے میاں تم بھی ڈر گئے؟ یہ لو اپنی جیب گرم کرو۔'' ہوچسپین نے سونے کا ایک سکہ بوڑھے کی مٹھی میں دیتے ہوئے کہا۔

''اب لپک کے ایک رسی سے میرے ہاتھ پاؤں باندھ کر اس مشین میں مجھے لٹا دو تاکہ میں اس تجربے کا وہی مزا پا سکوں جو پرانے زمانے کے مجرموں کو ملتا تھا۔''

بوڑھے چوکیدار کو پہلی مرتبہ اس معاملے کی نزاکت کا احساس ہوا۔ اس نے گھبرا کر کہا۔

''جناب، آپ یہ حرکت نہ کریں..... اس میں جان کا خطرہ ہے۔ فرض کیجئے اگر رسا میرے ہاتھ سے چھوٹ گیا تو.....؟''

امریکی نے جوش میں آ کر کہا۔ ''بڑے میاں تمہیں زیادہ دیر تک رسا پکڑنا نہیں پڑے گا، بس ایک یا دو منٹ کا کام ہے۔ اس کے بعد میرا دوست مجھے مشین سے باہر نکال لے گا۔ تم فکر نہ کرو۔ اس تجربے کی ساری ذمے داری مجھ پر ہے۔ کہو تو تحریر لکھ کر دے دوں؟''

''اچھا صاحب جس طرح آپ کہتے ہیں کرتا ہوں، مگر براہ کرم باہر کسی سے اس کا ذکر نہ کیجئے گا ورنہ میری ملازمت جاتی رہے گی، روزی کا معاملہ ہے صاحب۔''

''اجی تم پروا نہ کرو..... ذرا جلدی سے رسی تلاش کرو۔''

چوکیدار باہر گیا اور پتلی رسی کے دو لمبے لمبے ٹکڑے لے کر آیا اور پہلے اس نے ہوچسپین کے دونوں ہاتھ پشت کی طرف باندھ دیئے اور پیر باندھنے والا تھا کہ ہوچسپین نے کہا۔

''بڑے میاں، ذرا ٹھہرو، تمہاری دعا سے میں کافی صحت مند ہوں۔ تم مجھے اٹھا کر اس مشین کے اندر لٹا نہیں سکو گے، اس لیے میں خود اس میں داخل ہو جاتا ہوں۔ بعد ازاں تم میرے پیر بھی باندھ دینا۔

یہ کہہ کر وہ اٹھا اور مشین کے اندر داخل ہو کر اس اطمینان سے لیٹ گیا جیسے کسی آرام دہ بستر پر سونے کا ارادہ رکھتا ہے۔ چوکیدار نے جلدی سے اس کی دونوں ٹانگیں باندھ دیں۔

ہوچسپین اب موت کی اس مشین میں بالکل بے بس پڑا تھا، لیکن خوف کی کوئی علامت اس کے چہرے پر ظاہر نہ ہوئی، بلکہ وہ بچوں کی طرح اس کارنامے پر خوش ہو رہا تھا۔

''واہ واہ..... کیا شاندار جگہ ہے..... بھئی میرا تو جی چاہتا ہے کہ اس مشین کو اپنے ساتھ امریکہ لے جاؤں بڑی آرام دہ چیز ہے..... اچھا بڑے میاں، اب تم اس آہنی دروازے کو ذرا ڈھیل سے آہستہ آہستہ نیچے اتارو، میں دیکھوں تو سہی کہ جب یہ سلاخیں میری جانب بڑھیں گی، تو کیا مزا آتا ہے۔''

''اوہ..... خدا رحم کرے..... ہوچسپین، کیا تم اس بے ہودہ مذاق سے باز نہیں آ سکتے؟ میری بیوی چلا اٹھی بس کافی ہے..... تمہارا تجربہ مکمل ہو گیا..... اب باہر آ جاؤ.....''

ہوچسپین نے قہقہہ لگایا اور مجھ سے کہنے لگا۔ ''کرنل صاحب مہربانی کر کے اپنی ڈرپوک بیگم کو ذرا باہر گھمانے لے جائیے..... غضب خدا کا میں آٹھ ہزار میل کا سفر طے کر کے محض اس مشین کی خاطر آیا ہوں اور اب اس کے اصل تجربے سے محروم ہی چلا جاؤں؟ ہرگز نہیں ہو سکتا..... آپ پانچ دس منٹ ان کو سیر کرایئے اتنی میں یہ تجربہ پورا ہو چکے گا۔ پھر ہم اسے یاد کر کے خوب ہنسیں گے۔''

امیلیا کی حالت اگرچہ ابتر ہو رہی تھی، مگر وہ کمرے سے باہر جانے پر تیار نہ تھی۔ وہ خاموشی سے میرا بازو پکڑے ہوچسپین کی طرف تکتی رہی۔ بوڑھا چوکیدار آہستہ آہستہ، ایک ایک انچ کر کے رسا چھوڑنے لگا اور آہنی دروازہ مشین کی طرف جھکتا گیا۔

ہوچسپن کا چہرہ فرطِ مسرت سے سرخ ہورہا تھا، اس کی آنکھیں لمبی نوک دار سلاخوں پر جمی ہوئی تھیں۔ یکا یک وہ کہنے لگا۔

''کرنل، سچ کہتا ہوں کہ اپنی زندگی میں اتنا لطف میں نے پہلے کبھی نہیں اٹھایا۔ بخدا تم بھی اس تجربے کو آزما کر دیکھو۔ ارے بڑے میاں، ذرا آہستہ۔ تم تو ایک دم رسا چھوڑ دینے پر تلے ہوئے ہو؟''

بوڑھے چوکیدار نے رسا پوری قوت سے پکڑ رکھا تھا، لیکن میں دیکھ رہا تھا کہ لحظہ بہ لحظہ اس کی پریشانی اور اضطراب میں اضافہ ہورہا ہے۔ پانچ منٹ کے قلیل عرصے میں آہنی دروازہ صرف تین انچ کے قریب جھک سکا تھا۔

دفعتاً میں نے اپنے بازو پر ایک تھرتھراہٹ سی محسوس کی۔ امیلیا کی انگلیوں کی گرفت نرم پڑ رہی تھی۔ میں نے چونک کر اس کی طرف دیکھا، اس کے چہرے کا رنگ ہلدی کی مانند زرد ہورہا تھا اور ہونٹ سفید پڑ گئے تھے۔ وہ پلک جھپکائے بغیر مشین کی جانب گھور رہی تھی۔ میں نے اس کی نگاہوں کا تعاقب کیا، تو دہشت سے میری رگوں کا خون جم گیا۔

خدا کی پناہ۔

وہی منحوس کالی بلی کمرے کے دروازے میں کھڑی مشین کی جانب دیکھ کر غرا رہی تھی۔ اس کی زرد آنکھیں مشعل کی مانند روشن تھیں۔ اس کے جسم کا رواں رواں کھڑا تھا اور اپنی معمولی جسامت سے دوگنی نظر آتی تھی۔

کمرے میں داخل ہوتے ہی وہ اپنا خون آلود جبڑا کھول کر آگے بڑھی۔

ہوچسپن نے بھی اس کی آواز سن لی تھی وہ وہیں سے چلایا۔

''کرنل ذرا اس شریر کو دھتکار کر نکال دو۔''

لیکن آہ...... اس سے پیشتر کہ میں آگے بڑھتا بلی نے اپنی لمبی دم کو گردش دی اور بجلی کی مانند اچھل کر بوڑھے چوکیدار پر حملہ کیا۔ بلی کا دایاں پنجہ چوکیدار کی آنکھ پر پڑا اور آنکھ باہر آ گئی۔ بوڑھے کے حلق سے ایک دل دوز چیخ نکلی، وہ لڑکھڑا کر زمین پر گرا اور موٹا رسا اس کے ہاتھ سے چھوٹ گیا۔

میں نے رسے کو پکڑنے کے لیے چھلانگ لگائی۔ میری انگلیوں نے اسے چھو لیا، مگر اگلے ہی لمحے رسا کنڈے میں سے گزر چکا تھا۔

بدنصیب ہوچسپن کے چہرے کی آخری جھلک میں مرتے دم تک نہ بھولوں گا موت کے خوف سے اس کا چہرہ دھلے ہوئے کپڑے کی طرح سفید پڑ چکا تھا اور آنکھیں تارہ بن گئی تھیں۔

آہنی دروازہ ایک دھماکے کے ساتھ بند ہوگیا۔ ہوچسپن کے منہ سے آواز تک نہ نکل سکی اور اسی لمحے میری بیوی غش کھا کر دھڑام سے فرش پر گر گئی۔

میں نے امیلیا کو وہاں سے اٹھایا اور کمرے سے باہر برآمدے میں لے جا کر ایک بنچ پر ڈال دیا۔ اس وقت میرے ہوش و حواس بھی گم تھے۔

امریکی نوجوان کی بھیانک موت کا تصور خود میرے لیے جان لیوا تھا۔

جب میں کمرے میں گیا، تو بوڑھا چوکیدار تکلیف کی شدت سے زمین پر لوٹ رہا تھا۔ اس کا چہرہ اور کپڑے خون میں تر ہو چکے تھے میں نے رسا پکڑ کر پوری قوت سے مشین کا آہنی دروازہ اٹھایا۔ ہوچسپن کا حال دیکھ کر میری روح لرز گئی۔ لوہے کی سلاخیں اس کی کھوپڑی، سینے اور پسلیوں کو توڑ کر باہر نکل گئی تھیں۔

دروازہ اوپر اٹھتے ہی ہوچسپن کا مردہ اور مسخ شدہ جسم پرشور آواز کے ساتھ کمرے کے فرش پر گرا اور وہ منحوس سیاہ بلی جو ابھی تک موجود تھی، اس کی جانب لپکی اور ہوچسپن کے جسم سے نکلے ہوئے خون کو بڑی رغبت سے چاٹنے لگی۔ اور میں نے جھپٹ کر وہاں رکھی ہوئی بہت سی تلواروں میں سے ایک تلوار اٹھائی اور بلی کے دو ٹکڑے کر دیے۔





آخری مرحلہ

ایس امتیاز احمد-کراچی

اجنبی کے جاتے ہی نوجوان کو احساس ہوا کہ اس سے غلطی ہوگئی ہے کیونکہ زندگی بچانے کے لئے ایک لاکھ ڈالر کوئی حیثیت نہیں رکھتے تھے ایک لاکھ ڈالر دے دینا چاہئے تھے۔

ایک خودغرض اور مطلب پرست شخص کی دل دہلاتی خونچکاں بھونچکاں شاہکار کہانی

فرینک نے اپنی تیس سالہ کاروباری زندگی میں کبھی گھاٹے کا سودا نہیں کیا تھا۔ وہ ایک پیدائشی کاروباری تھا اور ہر چیز کو کاروباری نقطۂ نظر سے دیکھتا تھا۔ اس کا کہنا تھا کہ اس عالم موجودات میں انسانی ضرورت کی ہر چیز موجود ہے اور صرف چیز ہی موجود نہیں حصول کے وسائل بھی موجود ہیں۔ انسان ہر چیز خرید سکتا ہے بشرطیکہ وہ اس کی قیمت ادا کرسکتا ہو۔

لیکن جب ڈاکٹر نے اسے بتایا کہ وہ کینسر کا مریض ہے اور زیادہ سے زیادہ دو سال اور زندہ رہے گا تو اس پر سکتہ طاری ہوگیا۔ اس کی حالت اس شخص کی سی ہوگئی جسے عدالت عالیہ نے سزائے موت کا حکم سنادیا ہو۔

''شاید تمہیں غلط فہمی ہوئی ہے ڈاکٹر!'' اس نے کہا۔''میری عمر بہت لمبی ہے۔ میں کم از کم پچاس سال اور جیوں گا۔''

"عام طور پر ہم مریضوں کو اس قسم کی بات نہیں بتاتے۔" ڈاکٹر نے کہا۔ "کیونکہ اس سے انہیں سوائے مایوسی کے کچھ حاصل نہیں ہوتا لیکن تمہارا کیس ذرا مختلف ہے۔ تم ایک باہمت آدمی ہو۔ تمہارا دل مضبوط ہے اور تمہارے اندر صدمہ برداشت کرنے کی قوت موجود ہے۔"

"جس شخص کی زندگی کے صرف دو سال باقی رہ گئے ہوں اس کی قوت برداشت اسے کوئی فائدہ نہیں پہنچا سکتی۔" اس کی خود اعتمادی واپس آ گئی۔ "بہرحال میں اتنی جلدی شکست تسلیم کرنے والوں میں سے نہیں ہوں۔ کیا علاج کی کوئی بھی صورت باقی نہیں رہی؟"

"تمہارے دونوں پھیپھڑے تقریباً ختم ہو چکے ہیں۔" ڈاکٹر نے کہا۔ "ان کا علاج ناممکن ہے البتہ ایک صورت ہو سکتی ہے۔"

"کون سی صورت؟"

"اگر تمہارے جسم میں نئے پھیپھڑے لگا دیئے جائیں تو تم بچ سکتے ہو۔"

"تو پھر اس میں سوچنے والی کون سی بات ہے ڈاکٹر۔ پرانے پھیپھڑے نکال کر پھینک دو اور نئے لگا دو! میں معاوضہ دینے کے لئے بالکل تیار ہوں۔"

ڈاکٹر نے مایوسی سے سر ہلایا۔ "یہ اتنا بھی آسان کام نہیں جہاں تک پرانے پھیپھڑے نکالنے کا تعلق ہے وہ کسی بھی وقت نکالے جا سکتے ہیں۔ سوال یہ ہے کہ نئے کہاں سے آئیں گے۔ یہ کوئی اسپیئر پارٹس تو ہیں نہیں کہ بازار سے خرید لئے جائیں!"

"شہر میں روزانہ متعدد آدمی مرتے ہیں، کسی کے بھی نکال کر لگائے جا سکتے ہیں۔"

"پھیپھڑے صرف اُسی شخص کے نکالے جا سکتے ہیں جس نے اپنی زندگی میں اس بات کی اجازت دے دی ہو یا اس کے ورثا اجازت دیں اور اس بات کا اختیار صرف اسٹیٹ اسپتال کو ہے۔ کوئی پرائیویٹ کلینک ایسا کرنے کا مجاز نہیں۔"

یہ سن کر فرینک کی گھبراہٹ دور ہوگئی۔ اس نے سوچا کہ اب فکر کی کوئی بات نہیں۔ مسئلہ صرف نئے پھیپھڑے حاصل کرنے کا ہے اور اس میں ناکامی کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ وہ زیادہ سے زیادہ معاوضہ ادا کر سکتا تھا۔ اگر کوئی صورت نہ بنی تو وہ پورا آدمی خرید کر اس کے پھیپھڑے اپنے سینے میں لگوا لے گا۔

اگلے روز وہ اسٹیٹ اسپتال کے سول سرجن سے ملا اور اپنا مسئلہ پیش کیا۔

سرجن نے مایوسی کے ساتھ سر ہلایا۔ "ہم فوری طور پر تمہارے لئے کچھ نہیں کر سکتے۔ اگر تم چاہو تو ویٹنگ لسٹ میں نام لکھوا سکتے ہو۔ باری آنے پر تمہارا کام ہو جائے گا۔"

"کوئی بات نہیں کوئی بات نہیں!" فرینک نے کہا۔ "میں کچھ روز انتظار کر سکتا ہوں۔ اندازاً کتنے دن لگ جائیں گے؟"

"پانچ سال!" سرجن نے اطمینان کے ساتھ جواب دیا۔ "بلکہ کچھ زیادہ ہی اس وقت دو ہزار مریض ویٹنگ لسٹ پر موجود ہیں۔"

"لیکن ڈاکٹر میں مر جاؤں گا۔ میرے فیملی ڈاکٹر نے کہا ہے کہ میں زیادہ سے زیادہ دو سال اور زندہ رہوں گا۔ میں زیادہ سے زیادہ معاوضہ ادا کرنے پر تیار ہوں۔ میرا کیس فوری توجہ کا مستحق ہے۔"

"ہمارے پاس ہر کیس فوری توجہ کا مستحق ہے۔ ہم کسی کی حق تلفی نہیں کر سکتے۔ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ تم لوگ شروع میں کیوں احتیاط نہیں کرتے اس رپورٹ کے مطابق تمہارے پھیپھڑے بکثرت سگریٹ نوشی کے باعث ختم ہوئے ہیں۔"

"وہ تو ٹھیک ہے لیکن......"

"لیکن، لیکن!" سرجن نے غصے سے کہا۔ "کیا تم نے سگریٹ کے پیکٹ پر لکھی ہوئی وارننگ کبھی نہیں پڑھی؟ ضرور پڑھی ہوگی لیکن اور لوگوں کی طرح تم نے بھی یہی سوچا ہوگا کہ یہ وارننگ تمہارے لئے نہیں ہے۔ تم خدا کے ساتھ ابدی زندگی کا معاہدہ کر کے دنیا میں آئے ہو۔ تمہیں صرف اپنی موت نظر آ رہی ہے اس لئے پریشان ہو لیکن ہمارے پاس روزانہ تم جیسے مریض آتے

ہیں، ہمیں سب کا خیال رکھنا پڑتا ہے۔"

فرینک چند لمحے سوچتا رہا پھر بولا۔ "ڈاکٹر فرض کرو میں پھیپھڑوں کا انتظام کرلیتا ہوں۔ کیا تم......"

"کیا مطلب؟" ڈاکٹر چیخا۔ "کیا تمہارے حواس ٹھیک کام کررہے ہیں؟ وہ کون سی مارکیٹ ہے جہاں سے انسانی پھیپھڑے خریدے جاسکتے ہیں؟ اب تم جاسکتے ہو! ویٹنگ لسٹ میں نام لکھوانے کے بارے میں کیا خیال ہے؟"

"میں ویٹنگ لسٹ میں نام لکھوائے بغیر بھی مرسکتا ہوں۔"

فرینک ایک پیدائشی کاروباری تھا۔ اس معاملے میں کوئی شخص اس کے سامنے کھڑا نہیں ہوسکتا تھا۔ ابتدا میں اس نے چھوٹے کاروباری حریفوں پر سبقت حاصل کی اور بالآخر وہ بڑے حریفوں سے ٹکر لینی شروع کردی۔ وہ نہایت سائنٹیفک طریقے سے کام کرتا تھا۔ اس کے پاس دولت بھی تھی اور ذہانت بھی ان دو چیزوں کو بروقت استعمال ہی کامیابی کی ضمانت تھا۔ یعنی کب کون سی چیز خریدلینی چاہیے اور کب اسے فروخت کردینا چاہیے۔

حال ہی میں اس نے اپنے سب سے بڑے کاروباری حریف جارگوز کو شکست دی تھی۔ بوڑھا جارگوز ایک کہنہ مشق کھلاڑی تھا۔ اس کا ایک اشارہ مارکیٹ میں بحران پیدا کرسکتا تھا بلکہ حقیقت میں مارکیٹ کے اتار چڑھاؤ کا اس کے مزاج سے گہرا تعلق تھا۔ کہا جاتا تھا کہ جارگوز کو ناراض کرکے کوئی شخص مارکیٹ میں قدم نہیں جماسکتا۔ وہ چوبیس گھنٹے کے اندر جسے چاہتا دیوالیہ کردیتا تھا۔

فرینک کئی مہینوں تک جارگوز کے طریقہ کار کو سمجھنے کی کوشش کرتا رہا، پھر وہ اچانک میدان میں اُتر آیا۔ جارگوز کو وہم بھی نہیں تھا کہ فرینک جیسا معمولی کاروباری اس سے ٹکر لینے کی کوشش کرسکتا ہے۔ اس نے حسب معمول اپنے کاروبار حربے استعمال کئے فرینک پہلے ہی ان کا بندوبست کرچکا تھا۔ اس ناکامی پر جارگوز سخت چراغ پا ہوا حالانکہ نقصان بہت معمولی ہوا تھا لیکن مسئلہ دولت کا نہیں وقار کا تھا۔

اگلے روز جارگوز نے اسے فون کیا اور اس کی کامیابی پر مبارکباد دی لیکن فرینک بخوبی جانتا تھا کہ اس مبارکباد میں درحقیقت طنز چھپا ہوا تھا۔

صورت حال تشویشناک ضرور تھی مگر مایوس کن نہیں تھی۔ اگلے دو ہفتے کے دوران وہ شہر کے بہترین اسپتالوں میں گیا اور چوٹی کے ڈاکٹروں کے سامنے اپنا مسئلہ پیش کیا لیکن کوئی بھی اس کی مدد نہ کرسکا۔

ایک روز وہ ساتویں منزل پر واقع اپنے دفتر سے نکل کر سیلف سروس لفٹ میں داخل ہوا تو اس کی نظر ایک درمیانے قد کے شخص پر پڑی جو پہلے ہی لفٹ میں موجود تھا۔ اس نے ہلکے رنگ کا سوٹ پہن رکھا تھا اور چہرے مہرے سے مہذب انسان نظر آتا تھا۔ جب لفٹ کا دروازہ بند ہوگیا تو وہ فرینک کی طرف مڑا۔

"مسٹر فرینک!" اس نے کہا۔ "میں تمہیں ایک ایسے شخص کا پتہ بتا سکتا ہوں جو کئی لوگوں کے مسائل حل کرچکا ہے۔"

فرینک نے سر سے پیر تک اس شخص کا جائزہ لیا پھر بولا۔ "میرا خیال ہے کہ میں تمہیں پہلی بار دیکھ رہا ہوں۔"

"تمہارا خیال بالکل درست ہے۔ یہ ہماری پہلی ملاقات ہے اور مجھے یقین ہے کہ یہ ملاقات خوش آئند مستقبل کا پیش خیمہ ثابت ہوگی۔ مجھے جان اینڈرسن کہتے ہیں تمہارے لئے صرف جونی میں ایس ایس او سے تعلق رکھتا ہوں۔"

"ایس ایس او؟" فرینک ذہن پر زور ڈالتا ہوا بولا۔ "یہ نام بھی پہلی مرتبہ سنا ہے کیا یہ کسی ملک کی خفیہ پولیس کا نام ہے؟"

جونی کے ہونٹوں پر خفیف سی مسکراہٹ نمودار ہوگئی۔ "ایس ایس او، اسپیشل سوشل آرگنائزیشن کا مخفف ہے۔"

"اور اس تنظیم کے اغراض و مقاصد؟" فرینک نے کہا۔ "اجنبی سا نام ہے۔ کیا یہ کوئی خفیہ تنظیم ہے؟"

"اسے نیم خفیہ تنظیم کہا جاسکتا ہے۔ یہ صاحب

حیثیت لوگوں کے مسائل حل کرنے کے لیے قائم کی گئی ہے۔ کچھ مسائل ایسے ہوتے ہیں جنہیں جائز طریقے سے حل نہیں کیا جاسکتا حالانکہ مسائل جائز ہوتے ہیں اور فوری توجہ کے مستحق ہوتے ہیں۔ ہماری تنظیم مناسب معاوضے پر ان مسائل کی ذمے داری قبول کرلیتی ہے۔ ہمارے پاس ہر قسم کے ماہرین موجود ہیں۔ بعض اوقات ہمیں ایسے طریقے بھی اختیار کرنے پڑتے ہیں جنہیں کلی طور پر قانونی نہیں کہا جاسکتا۔''

فرینک کو اس کی باتوں میں دلچسپی پیدا ہوگئی۔ اس نے سوچا کہ وہ اس کا مسئلہ حل کرسکتا تھا لیکن سوال یہ پیدا ہوتا تھا کہ اس اجنبی کو اس مسئلے کے بارے میں کیسے پتا چلا۔ اس اثنا میں لفٹ گراؤنڈ پر پہنچ گئی۔

''میں تمہاری تنظیم کے بارے میں مزید جاننا پسند کروں گا۔'' فرینک نے کہا۔ ''کیوں نہ کسی ریستوران میں بیٹھ کر بات کی جائے!''

جونی نے اس کی تجویز کو پسند کیا۔ چند لمحوں بعد دونوں ایک پرسکون ریستوران کے نیم تاریک گوشے میں بیٹھے باتیں کررہے تھے۔

''ہماری تنظیم کے نمائندے ہر شعبہ ہائے زندگی میں موجود ہیں۔'' جونی بتا رہا تھا۔ ''جب کوئی صاحب حیثیت شخص کسی پریشان کن مسئلے سے دو چار ہوتا ہے تو ہمارا نمائندہ ہمیں مطلع کردیتا ہے۔''

''تو اس طرح تمہیں پتا چلا کہ مجھے نئے پھیپھڑوں کی ضرورت ہے۔'' فرینک نے کہا۔ اس کے چہرے سے اندرونی خوشی کا اظہار ہورہا تھا۔ جونی اسے فرشتہ رحمت لگ رہا تھا۔ تاہم وہ اپنے جذبات کا اظہار کرنے میں احتیاط سے کام لے رہا تھا۔ ''معاوضے کی بات کرنے سے پہلے میں یہ جاننا چاہتا ہوں کہ تمہاری تنظیم نئے پھیپھڑوں کا انتظام کہاں سے کرے گی؟''

''ہم عام طور پر اپنے اندرونی معاملات کو زیر بحث لانا پسند نہیں کرتے۔'' جونی نے کہا۔ ''اس دنیا میں ایسے لوگوں کی کمی نہیں جو صرف دوسروں کے لئے زندہ رہتے ہیں اور جیسا کہ میں بتا چکا ہوں کبھی کبھی ہمیں قانونی حدود سے تجاوز بھی کرنا پڑتا ہے۔ بہرحال ہم ہر چیز کے لئے معقول رقم خرچ کرتے ہیں۔''

''میں تمہارے اندرونی معاملات میں دخل اندازی کا کوئی ارادہ نہیں رکھتا۔ محض اپنا استعجاب دور کرنے کے لئے پوچھ لیا تھا۔ اب معاوضے کی بات ہوجائے۔''

''تمہارے کیس پر ہم ہر پہلو سے غور کرچکے ہیں۔'' جونی نے کہا۔ ''نئے پھیپھڑے لگانے کا معاوضہ ایک لاکھ ڈالر اور اس میں سودے بازی کی کوئی گنجائش نہیں۔''

''ایک لاکھ ڈالر؟'' یہ تو بہت زیادہ ہیں۔''

''ایک انسانی جان کے مقابلے میں کچھ بھی نہیں۔ کیا تم دو لاکھ کے عوض اپنا دل دینا پسند کروگے؟''

''وہ تو ٹھیک ہے لیکن......''

جونی ہاتھ اٹھا کر بولا۔ ''اس معاملے میں کوئی بحث نہیں ہوگی۔ تم اطمینان سے سوچ سکتے ہو۔ اگر ضرورت محسوس کرو تو اس نمبر پر فون کرلینا۔'' اس نے جیب سے ایک کارڈ نکال کر مزید پر رکھ دیا جس پر صرف ایک فون نمبر لکھا ہوا تھا۔ پھر وہ اپنی نشست سے اٹھا اور تیزی سے باہر چلا گیا۔

اس کے جاتے ہی فرینک کو احساس ہوا کہ اس نے غلطی کی تھی۔ زندگی بچانے کے لئے ایک لاکھ ڈالر زیادہ بڑی رقم نہیں تھی اور وہ باآسانی اسے ادا کرسکتا تھا۔ اس نے اگلے روز جونی کو فون کرکے آمادگی کا اظہار کردیا۔

''تمہیں اپنے فیصلے پر ہرگز افسوس نہیں ہوگا مسٹر فرینک!'' جونی نے کہا۔ ''اب ہماری ایک ملاقات اور ہوگی تاکہ تمہاری روانگی کے بارے میں تفصیلات طے کرلی جائیں۔''

اس فیصلے کے ٹھیک ساتویں روز فرینک میکسیکو کے ایک دشوار گزار پہاڑی علاقے میں سفر کررہا تھا۔ رات کا وقت تھا اور صاف آسمان پر پورا چاند چمک رہا تھا۔ سڑک تنگ اور ناہموار تھی۔ جگہ جگہ خطرناک موڑ تھے کار کی رفتار بمشکل تیس پینتیس میل کے درمیان تھی۔

فرینک کے وہم وگمان میں بھی نہیں تھا کہ اُسے آپریشن کے لئے اتنا لمبا چوڑا سفر کرنا پڑے گا۔ وہ کچھ خوفزدہ بھی تھا اس کے ذہن میں گونا گوں خدشات سر اٹھا رہے تھے۔

وہ سفر، سفرِ آخرت بھی ثابت ہوسکتا تھا۔

گو وہ مذہبی آدمی نہیں تھا مگر دل ہی دل میں اپنی سلامتی اور آپریشن کی کامیابی کی دعا مانگ رہا تھا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ اس نے یہ فیصلہ کرکے غلطی نہیں کی تھی۔

جونی نے اسے یقین دلایا تھا کہ ڈاکٹر رابسن ایک ماہر سرجن تھا۔ اس نے کبھی کسی مریض کو مایوس نہیں کیا تھا۔ کچھ فاصلہ طے کرنے کے بعد ان کی کار وسیع وادی میں پہنچ گئی۔ وہاں سڑک سیدھی اور صاف تھی۔ چاند کی پہلی روشنی میں وادی حسین اور سرسبز معلوم ہوتی تھی۔

تین روز قبل وہ ہوائی جہاز کے ذریعے سان ڈیگو پہنچا تھا۔ تنظیم کا ایک نمائندہ پہلے سے وہاں موجود تھا۔ اس نے رات کی تاریکی میں اسے میکسیکو اسمگل کردیا۔ یہ کارروائی ان ہدایات کے مطابق عمل میں آئی تھی جو جونی نے اسے دی تھیں۔

میکسیکو پہنچ کر اس نے فرضی نام سے ہوٹل میں قیام کیا تھا۔ اس کے دوست احباب صرف اتنا جانتے تھے کہ وہ ڈاکٹر کی ہدایت کے مطابق سان ڈیگو میں تعطیلات منا رہا ہے۔

اور اس وقت وہ میکسیکو کے نامعلوم پہاڑی علاقے میں سفر کررہا تھا۔ کار کا ڈرائیور چھوٹے قد کا میکسیکن تھا۔ تاہم وہ بڑی روانی کے ساتھ انگریزی بولتا تھا۔

''کتنا سفر باقی رہ گیا ہے؟'' فرینک نے اس سے پوچھا۔

''تقریباً ایک گھنٹہ اور لگ جائے گا۔''

''کیا تم اکثر اس طرف آتے رہتے ہو؟''

''ہاں! پہلے بھی اس سڑک پر سفر کرنے کا اتفاق ہوچکا ہے۔''

''خاصی تنگ اور خطرناک سڑک ہے۔'' فرینک نے کہا۔ ''اس پر بھاری گاڑیاں نہیں چل سکتیں۔ اسپتال کے لئے راشن اور دیگر بھاری سامان کس طرح پہنچایا جاتا ہے؟''

''بھاری سامان ہیلی کوپٹر کے ذریعے پہنچایا جاتا ہے۔'' ڈرائیور نے جواب دیا۔ ''اسپتال کے قریب ایک ہیلی پیڈ بنا ہوا ہے۔''

فرینک نے سوچا کہ اگر اسے ہیلی کوپٹر کے ذریعے پہنچایا جاتا تو زیادہ اچھا ہوتا لیکن اس طرح شاید اس کے سفر کو خفیہ رکھنا ممکن نہ ہوتا نہ معلوم انہوں نے اتنی زیادہ احتیاطی تدابیر کیوں اختیار کی تھیں! یہ بات اُسے شروع سے ہی کھٹک رہی تھی لیکن وہ اس قدر مایوس تھا کہ کوئی اعتراض نہ کرسکا اور خاموشی سے ہدایات پر عمل کرتا رہا۔ یہ بات اسے اب بھی پریشان کررہی تھی۔ اس کا اپنی دنیا سے کوئی رابطہ باقی نہیں رہا تھا۔ وہ ایک بار پھر دل ہی دل میں اپنی سلامتی کی دعا کرنے لگا۔

کچھ دیر بعد اسے کچھ فاصلے پر ٹمٹماتی ہوئی روشنی نظر آئی اور جیسے جیسے کار آگے بڑھ رہی تھی وہ روشنی نمایاں ہوتی جارہی تھی۔

''وہ سامنے اسپتال نظر آرہا ہے؟'' فرینک نے پوچھا۔

''ہاں وہ اسپتال کی روشنیاں ہیں۔''

فرینک کے دل کی دھڑکن تیز ہوگئی۔ وہ بار بار خود سے پوچھ رہا تھا۔ کیا یہ آپریشن کامیاب رہے گا؟ وہ زندگی میں پہلی مرتبہ اتنا بڑا آپریشن کرانے جارہا تھا اور خاصا خوفزدہ تھا۔

اسپتال کی عمارت جدید اور کشادہ تھی۔ ارد گرد تیز روشنی کے بلب جل رہے تھے۔ آس پاس سیب اور انگور کے درخت دیکھے جاسکتے تھے۔ ایک طرف سبزیوں کا کھیت بھی تھا۔ گویا اسپتال کے عملے کی بیشتر ضروریات وہیں سے پوری ہوجاتی تھیں۔

کار اسپتال کے صدر دروازے کے سامنے پہنچ کر رک گئی۔ ڈاکٹر رابسن اپنے دو ماتحتوں کے ہمراہ بذاتِ خود اس کے استقبال کے لئے وہاں موجود تھا۔

ڈاکٹر نے اس سے ہاتھ ملایا اور اس کی راہنمائی کرتا ہوا اندر لے گیا۔ ایک ملازم اس کے لئے برانڈی کا گلاس بھر کر لے آیا۔

''مسٹر فرینک!'' ڈاکٹر نے کہا۔ ''غسل کے لیے گرم پانی تیار ہے۔ برانڈی پینے کے بعد غسل کر لو! باتھ روم میں تمہارے لئے صاف لباس کا جوڑا بھی تیار رکھا ہے۔''

ڈاکٹر کے لہجے سے یہ اندازہ لگانا مشکل نہیں تھا کہ وہ درخواست نہیں کر رہا تھا، حکم دے رہا تھا۔ فرینک نے اس کے حکم کی تعمیل میں کوئی دیر نہیں لگائی۔

جب وہ غسل خانے سے باہر آیا تو دو ملازموں کو منتظر پایا۔ وہ اس کی راہنمائی کرتے ہوئے ایک کشادہ کمرے میں لے گئے۔ فرینک سوچ رہا تھا کہ وہ اسے بیڈ روم میں لئے جا رہے ہیں لیکن جب اس نے کشادہ کمرے کا جائزہ لیا تو دنگ رہ گیا۔ وہ جدید آلات سے لیس آپریشن روم تھا۔ دونوں ملازموں نے اسے نہایت آرام کے ساتھ آپریشن ٹیبل پر لٹا دیا اور بیلٹ باندھنے لگے۔ اسی لمحے ڈاکٹر رابسن اپنے دو نائبوں کے ہمراہ آپریشن روم میں داخل ہوا۔ وہ تینوں سبز لباس میں ملبوس تھے۔

''ڈاکٹر! کک..... کیا تم فوراً آپریشن کرنا چاہتے ہو؟''

''ہاں مسٹر فرینک!'' ڈاکٹر نے خوش دلی سے کہا۔ ''یہ کام جتنی جلدی ہو جائے اتنا ہی اچھا ہے۔'' پھر وہ اپنے معاونین کو ہدایات دینے لگا۔ اس کے معاونین نہایت تیزی اور مستعدی کے ساتھ آپریشن کا سامان میز کے اردگرد سجانے لگے۔

اس اثنا میں کمرے کا دروازہ کھلا اور ایک نرس پہیوں والا اسٹریچر دھکیلتی ہوئی داخل ہوئی۔ اس نے اس اسٹریچر کو فرینک کی میز کے ساتھ لگا کر کھڑا کر دیا۔ اس کے اوپر سفید چادر سے ڈھکا ہوا ایک جسم موجود تھا۔

فرینک نے گہرا سانس لیتے ہوئے سوچا۔ تو یہ وہ شخص ہے جس کے پھیپھڑے اس کے جسم میں لگائے جائیں گے! وہ اس کی طرف دیکھنا نہیں چاہتا تھا لیکن کوشش کے باوجود باز نہ رہ سکا۔ اس نے ہولے ہولے سر گھما کر اسٹریچر کی طرف دیکھا۔

سب سے پہلے اس کی نظر اسٹریچر پر لیٹے ہوئے شخص کے ہاتھ پر پڑی۔ وہ کسی ضعیف شخص کا جھریوں بھرا ہاتھ تھا۔ فرینک کا چہرہ غصے سے سرخ ہو گیا۔ جونی نے کہا تھا کہ اسے کسی نوجوان کے پھیپھڑے لگائے جائیں گے لیکن یہاں معاملہ بالکل الٹ تھا۔

''یہ..... آدمی تو بوڑھا ہے۔'' وہ اپنے جسم پر بندھی ہوئی بیلٹ میں کشمکش کرتا ہوا بولا، پھر اس کی نظر بوڑھے کے چہرے پر پڑی۔ اس کے ساتھ ہی اس پر گویا سکتہ سا طاری ہو گیا۔ لمحہ بھر کے لئے اسے اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آیا۔ اسٹریچر پر جو شخص لیٹا ہوا تھا وہ اسے بہت اچھی طرح جانتا تھا۔ وہ اس کا کاروباری حریف جارگوز تھا۔

''ڈاکٹر!'' فرینک چیخا۔ ''یہ کیا معاملہ ہے؟ اس شخص کو یہاں کیوں لایا گیا ہے؟''

ڈاکٹر نے اس کی طرف توجہ نہیں دی اور بدستور اپنے آلات جراحی کی دیکھ بھال میں مصروف رہا۔

''اس دنیا کے بازار میں ہر چیز مل جاتی ہے۔'' بوڑھے جارگوز نے طنزیہ لہجے میں کہا۔ ''لیکن صرف اس کو جو زیادہ بولی دینا جانتا ہو۔''

''کیا بک رہے ہو بڈھے بگلے!''

''ذرا آہستہ بولو میرے بچے!'' جارگوز نے کہا۔ ''تم اچھی طرح جانتے ہو کہ میرا دل کمزور ہے لیکن بہر حال یہ ایک عارضی کمزوری ہے۔ مجھے یقین ہے کہ تمہارا دل خاصا مضبوط ثابت ہو گا اور میرے کمزور جسم کو نئی توانائی فراہم کرے گا۔

''بہر حال اس عطیے کا بہت بہت شکریہ!''

''کیا؟'' فرینک چیخا۔

لیکن دوسرے ہی لمحے ڈاکٹر نے اس کے چہرے پر کلوروفارم کا نقاب چڑھا دیا۔



بھیانک تجربہ

ایس امتیاز احمد۔کراچی

تجربہ کرنے والا بولا میں زندہ ہوں یہ درست ہے لیکن اب میں مکمل طور پر انسان نہیں رہا میرا دماغ مائوف ہوچکا ہے اور لمحہ گزرتے ہی میری روح بے کار ہوجائے گی لیکن پھر……

چاہت وخلوص کی ایک انمٹ کہانی جوکہ پڑھنے والوں کو اپنے حصار میں لے لے گی

رات کے دو بجے ٹیلی فون کی گھنٹی بجی۔ میں لحاف میں دبکا ہوا میٹھی نیند سو رہا تھا۔ غصے اور جھنجھلاہٹ کے ساتھ میں نے ریسیور اٹھایا، میرے بھائی اینڈر کی بیوی بول رہی تھی: ”میں نے تمہارے بھائی کو قتل کردیا ہے، اس کی لاش فیکٹری کی لیبارٹری میں ہے۔ تم پولیس کو اطلاع دینے کے بعد یہاں آجاؤ۔“

”میرے بھائی کو تم نے قتل کردیا ہے! اپنے شوہر کو! کب اور کیوں؟“ میں بولتا چلا گیا۔ ”میں تمہیں اس سے زیادہ اور کچھ نہیں بتاسکتی۔“ ہیلن نے جواب دیا۔

”اور دیکھو اگر تم پولیس کو اطلاع دینے سے پہلے یہاں آئے تو پریشانی میں مبتلا ہوجاؤ گے۔ پولیس تم پر شک کرے گی۔ تم اس کے سوالات کی بوچھاڑ کا مقابلہ نہ کرسکو گے۔“ ہیلن نے یہ کہہ کر فون بند کردیا۔

میں نے فون ہی پر انسپکٹر جیرس کو اطلاع دی اور وہ چند منٹ بعد پولیس کانسٹیبل کے ہمراہ میرے مکان پر پہنچ گیا۔ میں نے شب خوابی کا لباس اتارا، کپڑے تبدیل کیے اور انسپکٹر کے ساتھ اپنے بھائی کے مکان کی طرف چل دیا۔

کار میں انسپکٹر میرے بھائی کے متعلق مجھ سے مختلف سوالات کرتا رہا۔ میں نے ہر سوال کا جواب ہاں یا نہیں میں دیا۔ میں نے اسے بتایا کہ میرا بھائی فیکٹری کی لیبارٹری میں مختلف تجربات کررہا تھا۔ وہ فیکٹری کے عقب میں پہاڑی پر اس مکان میں رہتا تھا۔ جو ہمارے دادا نے بنایا تھا اور جو کہ کافی عرصے سے خالی تھا۔

انسپکٹر نے آخری سوال پوچھا۔ ”کیا آپ کے بھائی نے اپنے تجربات کے متعلق آپ کو بھی کچھ بتایا۔؟“ میں نے جواب میں کہا۔

”وہ وزارت فضائیہ کے لیے بعض تجربات کررہے تھے۔ کئی مہینوں سے ان کی مشغولیت بہت بڑھ گئی تھی وہ لیبارٹری میں کئی کئی گھنٹے کام کرتے تھے۔ ایک دفعہ انہوں نے صرف اتنا کہا تھا کہ وہ فضاء کے ذریعے ایک چیز کو دوسری جگہ منتقل کرنے کا تجربہ کررہے ہیں۔“ میں نے بات ختم کی ہی تھی کہ پولیس کی کار فیکٹری کے دروازے پر رک گئی۔

ہم تیز تیز قدم اٹھاتے ہوئے اس کمرے میں پہنچے جہاں میرا بھائی مردہ پڑا تھا۔ بجلی کا ایک بڑا قمقمہ روشن تھا۔ فرش پر جو لاش پڑی تھی اس کا چہرہ فلیٹ سے ڈھانپا ہوا تھا، فرش پر خون بہہ کر جم گیا تھا۔ انسپکٹر نے فلیٹ چہرے سے ہٹایا۔ اتنا دہشت ناک منظر میں نے پہلے کبھی نہیں دیکھا۔ سر اور منہ کی ہڈیاں ایک دوسرے میں پیوست تھیں، بھیجا باہر نکلا ہوا تھا، چہرہ بگڑ کر اتنا خوف ناک ہوگیا تھا کہ پہچاننا مشکل تھا۔ لاش کا یہ حصہ برقی شکنجے میں پھنسا ہوا تھا۔

میں نے انسپکٹر کو بتایا کہ برقی شکنجہ آٹو میٹک ہے، بٹن دباتے ہی جب سوئی صفر پر پہنچے گی، شکنجہ کھل جائے گا۔ انسپکٹر نے فوراً پوچھا۔ ”کیا آپ کے بھائی کی بیوی اس برقی شکنجے کو حرکت دینے ٹھہرانے کے راز سے واقف ہے؟“

”قطعاً نہیں۔“ میں نے پورے اعتماد کے ساتھ جواب دیا۔ ”اور آپ یہ راز کیسے جانتے ہیں؟“ انسپکٹر نے فوراً ہی دوسرا سوال کردیا۔

میں نے اسے بتایا کہ فیکٹری کے کام سے فارغ ہو



کر جب میں لیبارٹری میں جاتا، تو میرا بھائی یہ عمل بارہا میرے سامنے دہراتا تھا۔ لیکن جب بھی ہیلن وہاں آتی، اینڈر کام روک دیتا اور جب تک وہ چلی نہ جاتی، وہ اپنا کام شروع نہیں کرتا تھا۔

انسپکٹر مقدمے کی تفتیش میں کئی ہفتے مصروف رہا۔ اس نے ہر چیز کا بغور مشاہدہ کیا، مختلف لوگوں سے ہزاروں سوال کیے، لیبارٹری میں جو کچھ بھی ملا، اسے گہری نظر سے دیکھا، لیکن اس عرصے میں ہیلن کا کردار عجیب تھا۔ وہ بالکل خاموش تھی اور ہر سوال کا جواب صرف ایک ہی دیتی تھی کہ میں نے ہی اپنے شوہر کو برقی شکنجے کے ذریعے قتل کیا ہے۔ یہ قتل کیوں کیا ہے؟ اس کا جواب وہ نہیں دینا چاہتی تھی۔ ملائمت اور دھمکی کا ہر حربہ، جو پولیس آزما سکتی تھی، اس کی زبان سے ایک لفظ نہ اگلوا سکا۔ آخر پولیس سرجن نے اسے پاگل قرار دے دیا اور ہیلن دماغی امراض کے شفاخانے میں بھیج دی گئی۔

تفتیش کے دوران میں پولیس انسپکٹر میرا گہرا دوست بن گیا۔ اس نے مجھے بتایا کہ شروع میں اسے مجھ پر قتل کا شبہ تھا، لیکن اب اسے یقین ہے کہ میں اپنے بھائی کا قاتل نہیں ہوں۔ وہ ہیلن کو بھی قاتل ماننے کے لیے تیار نہیں تھا۔ اسے چوکیدار نے بتایا تھا کہ جس رات اینڈر قتل ہوا ہے، لیبارٹری سے برقی شکنجہ چلنے کی دوبارہ آواز آئی تھی، لیکن ہیلن کا اصرار تھا کہ اس نے برقی شکنجے کو صرف ایک بار چلایا تھا۔ لاش دیکھنے سے یہ معلوم ہوتا تھا کہ برقی شکنجے میں پہلی بار اینڈر کے بازو کو کچلا گیا اور دوسری بار بازو نکال کر سر پر چوٹ لگائی گئی۔ اس طرح ہیلن کا اعتراف غلط ثابت ہوتا تھا۔

ایک روز پولیس کے چھ اعلیٰ افسر لیبارٹری میں آئے اور کئی گھنٹوں کی جستجو کے بعد انہوں نے صرف اتنی بات لکھی کہ لیبارٹری کی بعض اہم چیزیں تباہ کردی گئی ہیں۔ پولیس لیبارٹری کے ایک افسر اعلیٰ نے رپورٹ پیش کی کہ مقتول کے سر کو مخمل کے ایک ٹکڑے میں لپیٹ کر برقی شکنجے میں دبا دیا گیا ہے۔ پولیس انسپکٹر نے مجھے مخمل کا وہ ٹکڑا دکھایا۔ میں نے اسے فوراً پہچان لیا۔ یہ لیبارٹری میں کھانے کی میز پر بچھا رہتا تھا۔

ہیلن کو جس پاگل خانے میں داخل کیا گیا تھا، وہ صرف مجرموں کے لیے تھا۔ میں ہر اتوار کو اسے ملنے جاتا، کبھی کبھار انسپکٹر بھی میرے ساتھ ہوتا، لیکن ہیلن اپنے رٹے ہوئے جواب کے سوا کوئی بھی ایسی بات نہ بتاتی جس سے قتل کے راز پر سے پردہ اٹھتا۔ وہ دن بھر سویٹر بنتی، لیکن جب بھی کوئی مکھی ادھر سے گزرتی وہ کمال پھرتی کے ساتھ اسے پکڑتی، بغور دیکھتی اور چھوڑ دیتی۔ مکھیاں پکڑنے بغور دیکھنے اور چھوڑ دینے کا یہ جنون اس حد تک بڑھا کہ ڈاکٹر نے مارفیا کے انجکشن کے ذریعے اسے سلانا شروع کر دیا۔

ایک روز انسپکٹر نے مجھ سے پوچھا۔

”کیا آپ کو یقین ہے کہ ہیلن پاگل ہے؟“

”مجھے تو اس میں کوئی شک نہیں۔“

''لیکن میں سمجھتا ہوں کہ ہیلن پاگل نہیں۔ وہ بے حد ذہین ہے اور جب وہ مکھیاں پکڑتی ہے، تو غیر معمولی ذہانت کا ثبوت دیتی ہے۔ دنیا بھر کے ڈاکٹر بھی اسے پاگل قرار دے دیں، میں تسلیم نہیں کروں گا۔'' انسپکٹر نے پراعتماد لہجے میں کہا۔

''اگر آپ کی بات ٹھیک ہے، تو وہ اپنے چھ سالہ لڑکے ہنری سے سرد مہری کا سلوک کیوں کرتی ہے؟''

''ممکن ہے وہ اسے بھی خود کو پاگل کرنے کا ذریعہ سمجھتی ہو، لیکن ایک بات ضرور ہے کہ جب ہنری موجود ہوتا ہے، ہیلن مکھیاں نہیں پکڑتی، اس میں ضرور کوئی راز ہے۔''

''اچھا یہ بتایئے کہ آپ کے بھائی مکھیوں پر بھی تجربہ کرتے تھے؟'' انسپکٹر تفتیش کے انداز میں بولا۔

''مجھے کچھ معلوم نہیں، اس بارے میں آپ وزارت فضائیہ سے کیوں معلوم نہیں کر لیتے؟ اسی کے لیے تو میرا بھائی ریسرچ کر رہا تھا۔''

''ہاں میں نے پوچھا تھا، وہ لوگ مذاق اڑانے لگے کہ اس قتل سے مکھی کا کیا تعلق ہے، اس لیے میں خاموش ہو گیا۔

شام کو کھانے کی میز پر ننھے ہنری نے اچانک سوال کیا۔'' چچا جان، کیا مکھیاں زیادہ عرصے تک زندہ رہ سکتی ہیں؟''

میں اس سوال پو چونک اٹھا۔ میرے رگ و پے میں سنسناہٹ سی پھیل گئی۔ میں نے ہنری سے اس سوال کی وجہ پوچھی۔ اس نے بتایا کہ جس مکھی کو امی تلاش کر رہی ہے وہ اس نے دوبارہ دیکھی ہے۔

میں نے اس سے پوچھا کہ وہ کیسی ہے اور اسے کہاں دیکھا ہے۔

ہنری نے بتایا کہ یہ مکھی عام مکھیوں کی نسبت جسامت میں بڑے ہے، اس کا سر سفید ہے اور ٹانگیں عجیب طرح کی ہیں جنہیں دیکھ کر ہنسی آتی ہے۔ ہنری نے یہ بھی بتایا کہ اس نے یہ مکھی تھوڑی دیر ہوئی اوپر کے کمرے میں ڈیسک پر بیٹھی دیکھی تھی۔

''اور تم نے اس مکھی کو پہلی بار کب دیکھا تھا؟'' میں نے ہنری سے پوچھا۔

''جس روز پاپا کا انتقال ہوا ہے، میں نے اسے پکڑا تھا، لیکن امی نے چھڑا دیا اور پھر تھوڑی دیر بعد امی نے مجھے حکم دیا کہ میں جس طرح بھی ہو، اس مکھی کو دوبارہ پکڑ لاؤں۔''

ہنری کی یہ باتیں سن کر میرے جسم پر لرزہ سا طاری ہو گیا۔ مجھے انسپکٹر کی باتوں میں صداقت معلوم ہونے لگی۔ میں کھانے کی میز سے اٹھا اور سیدھا اوپر کے کمرے میں چلا گیا۔ میں نے ہر طرف مکھی کو تلاش کیا، کونہ کونہ چھان مارا، لیکن اس کا کہیں پتہ نہ تھا۔

میں نے اپنے بھائی اور بھابھی کی برسوں پرانی رفاقت پر نظر ڈالی۔ وہ ایک دوسرے کو بے انتہا چاہتے تھے۔ میں نے انہیں کبھی لڑتے نہیں دیکھا۔ ہیلن خوش مزاج تھی، اینڈر بھی ہنس مکھ تھا۔ اسے بچوں اور جانوروں سے بے پناہ لگاؤ تھا۔ وہ بلا کا ذہین اور اپنے کام کا رسیا تھا۔ میں نے آج تک کوئی ایسی حرکت نہیں دیکھی تھی جو اس کے دماغ میں نقص ظاہر کرتی۔ ہیلن کا کردار بھی اعلیٰ اور بے داغ تھا۔ پھر یہ خودکشی یا قتل کیوں؟'' میں سوچ سوچ کر تھک گیا انسپکٹر نے جب مکھی کا ذکر کیا تو میں نے اسے زیادہ وقعت نہیں دی تھی، لیکن ہنری نے سفید سر والی مکھی کا قصہ سنایا، تو غور و فکر کی راہیں کھل گئیں۔

میں نے انسپکٹر کو بتائے بغیر ہی خود ہی اس راز سے پردہ اٹھانے کا فیصلہ کیا۔ میں ہیلن سے ملنے کے لئے گیا دہاں اس نے حکام سے اجازت لے کر چھوٹا سا باغیچہ لگایا ہوا تھا۔ وہ مجھے اسی باغیچے میں لے گئی اور ہم دونوں لکڑی کے ایک بینچ پر بیٹھ گئے۔ ہیلن نے میرے کوٹ کے کالر پکڑتے ہوئے بڑی بے چینی سے پوچھا۔

''فرانکوئس، خدا کے لیے مجھے ایک بات بتا دو کہ کیا مکھیاں بہت دنوں تک زندہ رہتی ہیں؟''

میں نے چاہا کہ میں ہیلن کو بتا دوں کہ یہی سوال چند گھنٹے پہلے تمہارا لڑکا بھی مجھ سے کر چکا ہے، لیکن خطرہ یہ تھا کہ ہیلن اور زیادہ محتاط ہو جاتی اور جو بات اب کھلنے لگی تھی وہ ہمیشہ کے لئے راز بن جاتی۔

میں نے اسے بتایا کہ میں مکھیوں کی طویل زندگی کے متعلق تو کچھ نہیں جانتا، البتہ جس مکھی کو تم تلاش کر رہی ہو، وہ صبح میرے مطالعے کے کمرے میں موجود تھی۔

یہ سنتے ہی ہیلن بے تاب ہو کر کھڑی ہو گئی۔ اس کے چہرے پر کبھی مسرت کی سرخی آتی اور کبھی یاس کی زردی چھا جاتی۔ حیرانی سے اس کا منہ کھلے کا کھلا رہ گیا۔ اس نے اپنے دونوں ہاتھوں کو منہ پر رکھ لیا اور پھر چیختے ہوئے بولی۔

''فرانکوئس، کیا تم نے اس مکھی کو مار دیا ہے؟ وہ جواب سننے کے لیے میرے چہرے کی ایک ایک حرکت کا جائزہ لے رہی تھی۔ جب میں نے اسے بتایا کہ میں نے اس مکھی کو نہیں مارا، تو اس نے دونوں ہاتھوں سے مجھے جھنجھوڑتے ہوئے کہا۔

''تو خدارا یہ مکھی مجھے دے دو۔''

ہیلن اس وقت جذبات سے مغلوب تھی۔ وہ مکھی کے لیے اتنی بے چین تھی کہ اس وقت معمولی ذہن کا آدمی بھی اس سے راز اگلوا سکتا تھا۔ میں نے اسے دلاسا دیتے ہوئے کہا۔

''ہیلن، اگر تم اینڈر کے قتل کا صحیح واقعہ بتا دو، تو میں یہ مکھی تمہیں دے سکتا ہوں۔ یہ تفتیش کے پہلے دن ہی سے پولیس انسپکٹر کی تحویل میں ہے۔ میں جانتا ہوں کہ تم پاگل نہیں ہو، محض راز کو چھپانے کے لئے تم نے یہ روپ دھارا ہے۔

ہیلن نے اپنے سنہری بالوں کو پیچھے جھٹکتے ہوئے کہا۔

''اگر تم یہ وعدہ کرو کہ اس مکھی کو مار دو گے اور کسی صورت میں بھی اسے زندہ نہیں رہنے دو گے تو میں اس راز سے پردہ اٹھا دیتی ہوں۔ لیکن یاد رکھو یہ تمہارے مقتول بھائی کی آخری خواہش ہے۔ اگر اس مکھی کو تم نے نہ مارا تو اینڈر کی روح کو صدمہ پہنچے گا۔''

یہ کہہ کر ہیلن نے مجھے اپنے پیچھے آنے کا اشارہ کیا۔ وہ پاگل خانے کے بالائی کمرے میں گئی اور بھورے رنگ کا ایک لفافہ دیتے ہوئے بولی:

''اسے رات کو پڑھنا، یہ تمہارے لئے نہیں، پولیس انسپکٹر کے لئے لکھا تھا۔ اگر وہ مکھی کو مار دینے کا وعدہ کرلے تو یہ اسے بھی پڑھنے کے لئے دے دینا۔''

ہیلن جب اپنے کمرے کی طرف لوٹی، تو اس کی چال میں لڑکھڑاہٹ تھی اور اس کے دونوں ہاتھ کانپ رہے تھے۔

گھر آ کر میں نے ملازموں سے بتایا کہ میں آج رات صرف ہلکا سا کھانا کھاؤں گا اور اسے میرے مطالعہ کے کمرے ہی میں پہنچا دیا جائے..... میں نے لفافے کو میز پر رکھا اور دروازوں، کھڑکیوں کو بند کرنے سے پہلے بڑی احتیاط کے ساتھ کمرے کا جائزہ لیا۔ نوکر کھانا میز پر رکھ کر چلا گیا اور میں نے دروازہ اندر سے بند کر لیا۔

لفافہ چاک کرتے ہی میں نے بے چینی سے خط پڑھنا شروع کیا، اس میں لکھا تھا:

''میں نے اپنے شوہر کا قتل کیا ہے، لیکن میں قاتل نہیں۔ میں نے ان کی خواہش کو پورا کرنے کے لئے ان کا سر اور دایاں ہاتھ برقی شکنجے میں کچل دیئے ہیں۔ اپنی موت سے ایک سال پہلے میرے شوہر نے مجھے بتایا تھا کہ وہ وزارت فضائیہ کے لئے عجیب وغریب تجربات میں مشغول ہیں۔ آوازیں اور تصویریں، ریڈیو اور ٹیلی ویژن کے ذریعے ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل کرنے کا تجربہ کر رہے تھے۔ ان کا دعویٰ تھا کہ وہ بہت جلد ایک ایسا ٹرانسمیشن بنالیں گے جس کے ذریعے خوراک، اشیائے صرف اور انسان کو ہوا میں تحلیل کر کے ایک جگہ سے دوسری جگہ آواز سے زیادہ تیز رفتار کے ساتھ پہنچایا جا سکے گا۔ اس وقت نہ ریلوں، کاروں، بسوں اور جہازوں کی ضرورت ہوگی اور نہ ہی دنیا اسٹیشنوں، بندرگاہوں اور ہوائی اڈوں کی محتاج ہوگی۔ پوری دنیا کے سفر کے لئے اسٹیشن بنا دیئے جائیں گے اور اس مقصد کے لئے خاص ٹرانسمیشنوں کو استعمال کیا جائے گا۔ نیویارک سے لندن جانے کے لئے نیویارک کے ٹرانسمیشن میں مسافر بیٹھیں گے، بٹن دبا دیا جائے گا اور تمام مسافر ایک دم ہوا میں تحلیل ہو کر غائب ہو جائیں گے اور لمحہ بھر میں لندن کے ریسیونگ اسٹیشن پر پہنچ جائیں گے۔

اینڈر نے اپنی لیبارٹری میں ٹرانسمیشن سے چند فٹ

کے فاصلے پر ریسیونگ سیٹ نصب کیا ہوا تھا۔ اس نے سب سے پہلا کامیاب تجربہ ایش ٹرے پر کیا۔ اس نے ایش ٹرے میری گود میں پھینک دی اور کہا کہ اسے ٹرانسمیشن میں رکھ دو اور جب میں بٹن دباؤں گا، تو ایک سیکنڈ کے ہزارویں حصے کے اندر اندر یہ ریسیونگ سیٹ پر پہنچ جائے گی۔

میں نے ایش ٹرے ٹرانسمیشن میں رکھی اور اینڈر نے بٹن دبایا۔ ٹرے ہوا میں تحلیل ہوکر ایٹمی ذرے بن گئی اور پھر سیکنڈ سے بھی کم مدت میں یہ ذرے یکجا ہوکر ایش ٹرے کی صورت میں ریسیونگ سیٹ پر پہنچ گئے۔

میں نے ایش ٹرے ہاتھ میں اٹھائی، بالکل وہی تھی، میری حیرت کی انتہا نہ رہی۔ میں نے ہنستے ہوئے اینڈر سے کہا: ”تم یہ تجربہ کہیں مجھ پر نہ کر بیٹھنا اور میں بھی کہیں ایش ٹرے کی طرح الٹ ہوجاؤں۔“

”الٹ ہونے سے تمہارا کیا مطلب ہے؟“ اینڈر نے حیرت سے پوچھا۔ میں نے اسے ایش ٹرے کا پیندا دکھایا جس پر ساختہ جاپان کے الفاظ الٹے آ گئے تھے۔

اینڈر کا چہرہ زرد پڑ گیا۔ اس کا تجربہ ادھورا رہ گیا۔ وہ تیزی سے اپنی لیبارٹری میں چلا گیا اور اگلی صبح تک باہر نہیں نکلا، کچھ دنوں بعد اینڈر نے بتایا کہ وہ اب جاندار اشیاء کو فضا میں تحلیل کرکے دوسری جگہ زندہ صورت میں پہنچانے کا تجربہ کررہا ہے۔ میرے ذہن میں فوراً اپنی بلی آئی جو کئی روز سے غائب تھی۔ میرے پوچھنے پر اینڈر نے بتایا کہ بلی ٹرانسمیشن کے ذریعے ہوا میں تحلیل تو ہوگئی لیکن ناکام تجربے کے باعث ریسیونگ سیٹ میں نہیں پہنچی۔ اب معلوم نہیں کہ وہ خلاء میں کہاں بھٹکتی پھر رہی ہے۔

دو روز بعد اینڈر نے ایک کتے کے پلے کو آٹھ بار ٹرانسمیشن کے ذریعے ہوا میں تحلیل کیا اور آٹھوں بار وہ مکمل صورت میں ریسیونگ سیٹ پر زندہ پہنچ گیا۔ یہ بہت بڑی کامیابی تھی۔ میری اور اینڈر کی خوشی کا کوئی ٹھکانا نہیں تھا۔ ایٹم کی اس دنیا میں ایک نیا انقلاب آنے والا تھا۔ میرے شوہر نے جو تجربہ کیا تھا۔ وہ انسان کی زندگی بدل سکتا تھا۔

میں نے تجویز پیش کی کہ وزارت فضائیہ کے اعلیٰ حکام کو دعوت دی جائے اور اینڈر ان کے سامنے اپنا تجربہ دہرائے، لیکن اینڈر نے اس سے اتفاق نہیں کیا۔ اس کا خیال تھا کہ ابھی اس کے تجربے خام ہیں اور ٹرانسمیشن کے بہت سے پرزے ایسے ہیں جو خود ابھی تک اس کی سمجھ میں نہیں آئے اور جب تک وہ خود اپنی ذات پر تجربہ نہیں کرلیتا، وہ اس راز کو فاش نہیں کرے گا۔

اور پھر وہ ہولناک دن آیا جس نے مجھ سے شوہر، ہنری سے باپ اور فرانکوائس سے اس کا بھائی چھین لیا۔ اس صبح اینڈر اس خطرناک تجربے کے لئے اپنی لیبارٹری میں گیا اور دوپہر کو کھانے پر واپس نہیں آیا۔ میں نے خادمہ کو کھانا دے کر بھیجا، لیکن وہ واپس آ گئی۔ اس نے ایک رقعہ دیا جو لیبارٹری کے دروازے پر باہر کی جانب لگا ہوا تھا اور اس میں لکھا تھا کہ ”میں کام میں بہت مصروف ہوں، کوئی بھی مخل نہ ہو۔“

ان کا معمول تھا کہ جب وہ بہت زیادہ مصروف ہوتے، تو دروازے پر اس قسم کے نوٹس پن سے لگا دیا کرتے تھے۔ تھوڑی دیر بعد میں قہوہ پی رہی تھی کہ ہنری ناچتا ہوا کمرے میں داخل ہوا۔ اس نے مٹھی میں ایک مکھی پکڑی ہوئی تھی اور وہ کہہ رہا تھا: ”ممی، یہ دیکھو سفید سر کی مکھی ہے، اس کی ٹانگیں بھی عجیب طرح کی ہیں۔“

”ہنری، اسے چھوڑ دو، مکھی پکڑنا کوئی اچھی عادت نہیں۔“ میں نے اسے ڈانٹتے ہوئے کہا۔ مجھے خوب معلوم تھا کہ ہنری کا باپ جانوروں پر ظلم برداشت نہیں کرتا اور اسے جونہی معلوم ہوگا کہ ہنری نے مکھی کو ڈبیا میں بند کر رکھا ہے، تو وہ ناراض ہوگا۔

شام کے کھانے پر بھی جب اینڈر نہیں آیا، تو مجھے تشویش ہوئی اور میں دوڑتی ہوئی لیبارٹری پہنچی۔ میں نے دروازہ کھٹکھٹایا، کوئی جواب نہیں ملا، لیکن اندر قدموں کی چاپ سنائی دی اور پھر دروازہ سے باہر ایک چٹ گری جو ٹائپ کی ہوئی تھی۔ اس پر لکھا تھا:

”ہیلن میں اس وقت سخت تکلیف میں ہوں۔ ہنری کو سلا دو اور پھر ایک گھنٹے تک واپس آ جاؤ۔“

”میں سہم گئی۔ میں نے زور زور سے دروازہ کھٹکھٹایا آوازیں دیں، لیکن اینڈر نے ایک کا بھی جواب نہیں دیا۔

میں گھر لوٹ آئی، ہنری کو سلایا اور بے چین ہو کر لیبارٹری کے دروازے پر لوٹ آئی، وہاں ایک اور چٹ پڑی تھی:

''ہیلن، تم اپنے اعصاب پر قابو رکھو اور جو کچھ میں کہتا ہوں، وہی کرو۔ اس تکلیف میں صرف تم ہی میری مدد کر سکتی ہو اس وقت زندگی اور موت کے دوراہے پر کھڑا ہوں۔ مجھے پکارنا اور مجھ سے کچھ کہنا بے کار ہے۔ میں جواب نہیں دے سکتا۔ میں بولنے کی صلاحیت سے محروم ہوں۔ اگر تم میری مدد کرنا چاہتی ہو، تو دروازے پر تین بار دستک دو۔ میں سمجھوں گا کہ تم مدد کے لئے تیار ہو۔ میں نے اب تک کچھ نہیں کھایا۔ دودھ کا ایک گلاس لا دو۔''

میں نے دروازے پر تین بار دستک دے کر پورے تعاون کا یقین دلایا اور خوف و ہراس کے عالم میں دودھ لانے کے لئے دوڑی، میں پانچ منٹ ہی میں واپس آ گئی۔ دروازے پر ایک اور چٹ لگی تھی:

''ہیلن، میری ہدایات پر احتیاط سے عمل کرو۔ تم جب دستک دو گی، میں دروازہ کھول دوں گا۔ تم سیدھی میز کی طرف جاؤ، وہاں دودھ کا گلاس رکھ دو اور پھر دوسرے کمرے میں جہاں ریسیونگ سیٹ ہے، چلی جاؤ وہاں ایک مکھی کو تلاش کرو۔ میں بہت ڈھونڈ چکا ہوں، نہیں ملی۔ اب مجھے چھوٹی چیزیں نظر بھی نہیں آتیں، جب تم کمرے میں داخل ہو تو مجھے دیکھنے کی کوشش مت کرنا اور نہ ہی بات کرنے کی...... اور اب تم تین بار پھر دستک دو تا کہ میں دروازہ کھول دوں۔'' میں نے تین بار دستک دی، دروازہ کھل گیا۔ میں نے کن انکھیوں سے دیکھا کہ اینڈر دروازے کے پیچھے کھڑا ہے۔ میں نے میز پر دودھ کا گلاس رکھا اور سیدھی دوسرے کمرے میں چلی گئی۔

مجھے یوں لگا جیسے اس کمرے میں کوئی طوفان آیا ہوا ہے، بہت سے کاغذات جلے ہوئے تھے، کرسیاں اور ٹسٹ ٹیوبیں بکھری پڑی تھیں اور کھڑکیوں کے پردے اترے ہوئے تھے۔ میں نے محسوس کر لیا کہ یہاں مکھی کی تلاش بے کار ہے۔ یہ وہی مکھی ہے جو ہنری پکڑ کر لایا تھا اور میں نے جسے اڑا دیا تھا۔

اینڈر جب دودھ پی رہا تھا، اس کے منہ اور گلے کی دھیمی آواز سے معلوم ہوتا تھا کہ اسے دودھ پینے میں بڑی تکلیف ہو رہی ہے۔

''اینڈر، مجھے مکھی نہیں مل رہی ہے، میں تمہارے پاس آنا چاہتی ہوں، میں بے چین ہوں، تمہیں آخر کیا ہو گیا ہے؟ تم بتاتے کیوں نہیں؟'' یہ کہہ کر میں آگے بڑھی۔ اینڈر نے اپنے بازو، چہرے اور سر کو مخمل کے اس ٹکڑے سے ڈھانپ رکھا تھا جو عموماً کھانے کی میز پر بچھا رہتا تھا۔

''ہنری نے آج صبح ایک مکھی پکڑی تھی، وہ مجھے دکھانا چاہتا تھا، لیکن میں نے اسے اڑا دیا۔ میں نے اسے دیکھا تو نہیں، لیکن ہنری کہتا ہے کہ اس کا سر سفید تھا۔ تمہیں اس مکھی کی تو تلاش نہیں؟''

میں نے پوچھا۔

اینڈر نے ٹھنڈی سانس اور اس کا ایک ہاتھ نیچے لٹک گیا۔ میں نے خوف اور دہشت کے مارے اپنے ہونٹوں کو کاٹ لیا۔ اُف خدایا! میرے اینڈر کا بازو لمبی انگلیوں اور گوشت کا بنا ہوا نہیں تھا۔ وہ گھٹنوں سے نیچے لٹک رہا تھا اور ایک سوکھے ہوئے درخت کی شاخ معلوم ہو رہا تھا جس میں بہت سی خشک قلمیں لگی ہوئی تھیں۔

میں یہ منظر دیکھ کر تڑپ گئی۔ میں نے عاجزی اور خوشامد کے ساتھ اینڈر سے حقیقت حال معلوم کرنے کی کوشش کی لیکن اس نے خوفناک ہاتھ کے اشارے سے مجھ کو باہر جانے کا حکم دیا۔ میں باہر آ گئی۔ اینڈر نے دروازہ بند کر لیا۔ ٹائپ مشین چلنے لگی اور ایک منٹ بعد اینڈر نے دروازے سے باہر ایک چٹ پھینکی:

''ہیلن، تم کل واپس آنا۔ میں اس واقعے کو پوری وضاحت سے ٹائپ کر لوں گا۔ تم نیند لانے والی ایک گولی کھا کر سو جاؤ۔ میں صبح تمہیں تازہ دم دیکھنا چاہتا ہوں۔''

میں نے پانچ بجے کا الارم لگا دیا تھا، لیکن جب آنکھ کھلی، تو سورج پوری آب و تاب سے چمک رہا تھا، غالباً خواب آور گولیوں کی وجہ سے آنکھ نہیں کھلی۔ میں جلدی سے باورچی خانے میں گئی، ایک ٹرے میں قہوہ، ڈبل روٹی اور مکھن رکھا اور لیبارٹری کی جانب بڑھنے لگا۔ دروازہ بند تھا، تین بار دستک دینے سے اینڈر نے دروازہ کھول دیا۔ میں

نے ٹرے کو میز پر رکھا اور ٹائپ رائٹر کے پاس سے کاغذات اٹھا کر پڑھنے لگی۔ اینڈر نے دوسرا دروازہ کھولا۔ میں سمجھ گئی کہ وہ تنہا رہنا چاہتا ہے میں کاغذات لے کر دوسرے کمرے میں چلی گئی اور اس نے دروازہ بند کردیا اور قہوہ پینے لگا۔

میں نے ٹائپ کئے ہوئے کاغذات پڑھنے شروع کیے: ''تمہیں ایش ٹرے کا تجربہ یاد ہوگا جس کے حروف الٹ گئے تھے۔ میرے ساتھ بھی ایک ایسا ہی حادثہ پیش آیا ہے۔ میں نے پرسوں یہ تجربہ اپنے اوپر کیا اور خود کو ٹرانسمیشن کے ذریعے تحلیل کرلیا، لیکن بدقسمتی سے اس وقت ٹرانسمیشن میں ایک مکھی بھی تھی جسے میں نے نہیں دیکھا تھا، وہ بھی میرے ساتھ ہی ہوا میں تحلیل ہوگئی۔ اب میری صرف یہ خواہش ہے کہ ایک بار اس مکھی کے ساتھ دوبارہ تحلیل ہوجاؤں۔ خدارا تم اسے ڈھونڈو، اگر وہ نہ ملی، تو یہ سب کچھ تباہ ہوجائے گا، اور شاید میری جان بھی۔''

میں نے اس سے کہا کہ ''میں مکھی کو ڈھونڈنے میں اپنی جان کی بازی لگادوں گی، لیکن اگر تمہاری شکل وصورت بدل گئی ہے تو اس میں خوف کی کیا بات ہے۔ تم میرے شوہر ہو، کسی روپ میں بھی ہو، میں تمہیں پیار کرتی رہوں گی۔ تم دلبرداشتہ نہ ہو، خدا کے لئے مجھے اپنا چہرہ دکھادو، میں تمہیں یقین دلاتی ہوں کہ جب تک تم اپنی اصل صورت میں نہیں آجاتے، میں کسی سے بھی ذکر نہیں کروں گی۔''

لیکن اینڈر نے اس بات کا جواب نہیں دیا اور اشارے سے مجھے مکھی تلاش کرنے کا حکم دیا۔

میں نے گھر آتے ہی تمام ملازمین کو حکم دیا کہ پروفیسر صاحب کی لیبارٹری سے ایک مکھی بھاگ گئی ہے سب اسے تلاش کریں اور زندہ پکڑ کر لائیں وہ سب اس بات پر ہنسنے لگے بعد میں پولیس کو انہوں نے جو بیانات دیئے، ان میں اس مکھی کا ذکر تھا اور شاید یہی بات مجھے تختہ دار سے بچاگئی۔

میں دن بھر مکھیاں پکڑتی رہی۔ میں نے جام، چینی، گوشت اور شہد جیسی ہر وہ چیز جس پر مکھیاں ٹوٹ سکتی تھیں، کئی جگہ بکھیر دیں، لیکن جو مکھی ہنری لایا تھا اور جسے میں نے اڑوایا تھا، وہ دوبارہ نہیں ملی۔ میری مایوسی کو کوئی انتہا نہ تھی، میرا اضطراب بڑھنے لگا۔ میں سوچ رہی تھی کہ اب کیا ہوگا؟

شام کے کھانے کا وقت ہوگیا۔ میں لیبارٹری گئی، ساتھ کچھ مکھیاں بھی لے گئی، لیکن اینڈر نے ان تمام کو واپس کردیا۔ انہوں نے ابھی تک اپنے چہرے اور بازوؤں کو مخمل کے ٹکڑے سے چھپا رکھا تھا۔ وہ ہر بات کا جواب لکھ کر دیتے یا میز پر ہاتھ مار کر۔ میں نے انہیں دلاسا دینا چاہا کہ اگر مکھی نہ ملی، تو وہ زندگی سے مایوس نہ ہوں، انہیں زندہ رہنے کی کوشش کرنی چاہئے، ننھا ہنری ابھی قدم قدم پر باپ کی اعانت کا محتاج ہے، خود میری زندگی ویران ہوکر رہ جائے گی۔ میں نے ان سے کہا: ''آپ زندہ ہیں، آپ کا دماغ موجود ہے، آپ سوچ سکتے ہیں، اپ کی روح بھی ہے، اگر شکل بدل گئی ہے، تو کیا ہوا...... میں اور میرا بیٹا آپ کو اسی روپ میں دیکھ کر خوش رہیں گے۔

اینڈر نے فوراً ٹائپ کرنا شروع کیا اور ایک منٹ بعد ٹائپ کی ہوئی چٹ میری جانب پھینک دی۔ اس پر لکھا تھا: ''میں زندہ ہوں، یہ درست ہے، لیکن اب میں مکمل طور پر انسان نہیں رہا۔ میرا دماغ ماؤف ہوجائے گا اور میری روح بیکار ہوجائے گی۔''

میں نے کہا کہ ''میں دوسرے سائنس دانوں کو بلاتی ہوں، وہ آپ کو دوبارہ اصلی حالت پر لانے کی جدوجہد کریں گے۔'' لیکن اینڈر نے زور زور سے میز پر مکے مار کر اپنی ناراضگی کا اظہار کرنا شروع کردیا، وہ اس کے لئے قطعاً آمادہ نہیں تھا۔ میں نے ایک تجویز پیش کی: ''آپ ایک بار اور ٹرانسمیشن میں بیٹھ کر خود کو ہوا میں تحلیل کریں۔ ممکن ہے اس بار آپ اپنی اصلی حالت میں آجائیں۔''

''میں سات بار تجربہ دہرا چکا ہوں اور آٹھویں بار اس مکھی کے ساتھ ٹرانسمیشن میں جانا چاہتا ہوں، لیکن تمہارے کہنے سے میں آخری بار ٹرانسمیشن میں جاتا ہوں۔ تم میری طرف پشت کر کے کھڑی ہوجاؤ۔''

میں نے کمرے میں چندھیا دینے والی روشنی دیکھی اور ٹرانسمیشن چلنے کی آواز پیدا ہوئی...... میں نے گھوم کر دیکھا۔ اینڈر ہوا میں تحلیل ہونے کے بعد ریسیور سیٹ میں پہنچ چکا تھا۔ اس کا سر اور مونڈھے اب بھی مخمل میں چھپے

ہوئے تھے۔ میں نے اس کے بازو کو چھوتے ہوئے بے چینی کے ساتھ پوچھا: ''تم کیسے ہو؟ کیا تم میں کوئی تبدیلی پیدا ہوئی؟ کیا تم مکمل طور پر انسانی شکل میں آگئے ہو؟''

اس نے اپنا ہاتھ چھڑانے کی کوشش کی اور پاس پڑے ہوئے ایک اسٹول سے الجھ کر گر پڑا۔ مخمل کا ٹکڑا اس کے سر اور شانوں سے سرک گیا تھا۔ اف! میری آنکھوں نے اس وقت جو ہولناک منظر دیکھا، وہ ناقابل فراموش تھا۔ مجھ پر خوف اور دہشت کے مارے غشی طاری ہونے لگی، لیکن میں نے اپنے آپ کو سنبھال لیا۔ میں دھاڑیں مار مار کر رونے لگی، میں نے اپنے ناخنوں سے اپنے منہ کو نوچ لیا۔ میرے ہاتھ میرے ہی خون سے سرخ ہوگئے۔ میری آنکھیں اینڈر کے چہرے کو دیکھ سکتی تھیں اور نہ ہی میں انہیں بند کرسکتی تھی۔ اگر میں یہ منظر کچھ دیر اور دیکھتی رہتی، تو یقیناً موت کی آغوش میں چلی جاتی۔

اینڈر نے اس مخمل کے ٹکڑے سے دوبارہ اپنے منہ کو ڈھانپ لیا اور دوسرے کمرے میں چلا گیا۔

میں جب تک زندہ ہوں، اس دہشت ناک منظر کو کبھی نہیں بھول سکتی۔ اس کے سفید بالوں والے سر کے دونوں طرف دو بڑے بڑے بلی کے کان اُگے ہوئے تھے، ناک بھی بلی ہی کی تھی۔ آنکھوں کی جگہ دو کالی چھوٹی سی طشتریاں بنی ہوئی تھیں اور منہ کے بجائے مکھی کی سونڈ لٹکی ہوئی تھی۔ اینڈر دوسرے کمرے میں کچھ ٹائپ کررہا تھا۔ دو منٹ کے بعد اس نے میرے کمرے میں ایک چٹ پھینکی جس میں لکھا تھا:

''میری ہیلن، یہ آخری تجربہ تو اور بھی خطرناک ثابت ہوا۔ پہلے ٹرانسمیشن میں مکھی بیٹھی تھی اور تحلیل ہوتے وقت اس کے کچھ اعضاء میرے جسم میں چپک گئے تھے اور اب آخری بار تحلیل ہونے پر اس بلی کے کان اور آنکھیں میرے منہ پر لگ گئے ہیں جسے میں نے کئی ہفتے پہلے تجربے کے طور پر ٹرانسمیشن کے ذریعے ہوا میں تحلیل کیا تھا۔ اب میں تمہیں آخری بار ہدایت کرتا ہوں کہ تم برقی شکنجے کے ذریعے غیر فطری اعضاء کو کچل دو۔ بلی اور مکھی کے یہ حصے میرے نہیں ہیں۔ یہ ایٹم میں تحلیل ہوکر مجھ سے وابستہ ہوگئے ہیں۔ یہ میری آخری خواہش ہے، خدا کے لئے اسے رد نہ کرنا۔''

اینڈر نے اپنے بازو کو برقی شکنجے میں رکھا اور مجھے اشارے سے بتایا کہ بٹن کو دباؤ۔ جونہی بٹن کے دباؤ سے سوئی صفر پر پہنچے گی، شکنجہ میرے بازو کو کچل دے گا۔ نامعلوم جذبے اور خوف کے تحت میں نے کسی تامل کے بغیر بٹن دبادیا۔ سوئی صفر پر پہنچی، ایک دہشت ناک آواز پیدا ہوئی، اینڈر کا بازو کچل کر گوشت بن گیا۔ اس نے بڑی پھرتی کے ساتھ دوسری بار اپنے سر کو برقی شکنجے میں دے دیا اور میں بٹن دوبارہ دبانے پر مجبور ہوگئی۔ سوئی صفر پر پہنچی اور میرا اینڈر ہمیشہ کے لئے موت کی نیند سوگیا۔

میں نے یہ قتل اپنے پیارے شوہر کی آخری خواہش کی تکمیل میں کیا ہے، اس لحاظ سے میں قاتل ضرور ہوں۔''

ہیلن کی یہ کہانی پڑھ کر میں حیران رہ گیا۔ میں نے پولیس انسپکٹر کو ٹیلی فون پر شام کو چائے پینے کی دعوت دی۔ شام کو چائے کے بعد میں اسے اپنے مطالعے کے کمرے میں لے آیا اور اسے ہیلن کا خط دکھایا، وہ اسے بغور پڑھتا رہا۔ بیس منٹ کے بعد اس نے یہ خط مجھے واپس کردیا اور میں نے اسے آگ میں ڈال دیا۔ میں نے انسپکٹر کو بتایا کہ ''آج جب قبرستان میں گیا، تو ایک عجیب واقعہ پیش آیا۔''

انسپکٹر نے بات کاٹتے ہوئے کہا: ''اس وقت تم اپنے بھائی کی قبر پر دیا سلائی سے ایک ڈبیا جلا رہے تھے۔''

''آپ کو کیسے معلوم ہوا؟''

''اور اس ڈبیا میں ایک مکھی تھی۔'' انسپکٹر نے مجھے یہ بتا کر اور بھی حیران کردیا۔ ''لیکن یہ مکھی زندہ تھی یا مرچکی تھی؟'' انسپکٹر نے پوچھا۔ ''میں جب قبرستان آیا، تو سفید سر والی یہ مکھی، مکڑی کے ایک جالے میں پھنسی ہوئی تھی اور باہر نکلنے کی کوشش کررہی تھی۔ میں نے اسے پکڑ لیا اور ایک پتھر پر رکھ کر دوسرے پتھر سے اس کا سر کچل دیا اور پھر اسے دیا سلائی کی ڈبیا میں بند کرنے کے بعد اسے آگ لگادی۔......

آخر میرے بھائی کی موت کی ذمہ دار یہی تو تھی۔''





کمرہ نمبر 20

ایس امتیاز احمد-کراچی

حادثہ کبھی انسان کی زندگی کے تاریک پہلوئوں کو اجاگر کرتا ہے اور کبھی اجاگر پہلوئوں کو تاریک کردیتا ہے ایسے ہی ایک حادثے کی رقص کرتی ہوئی خوبصورت تحریر۔

سبق آموز دل دہلاتی اچھی کہانیوں کے متلاشی لوگوں کے لئے اچنبھے میں ڈالتی کہانی

خوش قسمتی نام کی کسی چیز کا وجود نہیں۔ بس ایک اتفاق کبھی کبھی آدمی کو کامیابیوں سے ہمکنار کردیتا ہے۔ ممکن ہے آپ اس بات سے اتفاق نہ کریں لیکن کم از کم جیک کا نظریہ یہی ہے کہ اس اتفاق سے اپنی تو انائیوں اور صلاحیتوں کے مطابق فائدہ اُٹھانا ہی خوش قسمتی ہے ورنہ یہ لفظ بے معنی ہے۔

جیک ایک ٹیکسی ڈرائیور تھا۔ افلاس کی چکی میں پستے عمر گزرتی جارہی تھی لیکن وہ مایوس نہ تھا۔ اسے صرف ایک موقع کی تلاش تھی۔ ایک ایسا موقع جس سے استفادہ کرکے وہ غربت کے منحوس سائے سے نکل جاتا۔ اس انتظار میں شب و روز گزرتے رہے۔ ٹیکسی کے پہیے متحرک رہے لیکن وہ اتفاق نہ جانے کہاں جا سویا تھا۔ اس کے باوجود وہ ہر روز یہی اُمید لے کر گھر سے نکلتا کہ ایک نہ ایک دن وہ اتفاق ضرور پیش آئے گا۔ اور

ممکن ہے آج کا دن وہی دن ثابت ہو۔
آرنالڈ ایک امیر آدمی تھا لیکن جیک کی ٹیکسی اُسے مسلسل ایک ہفتے سے ایک مخصوص وقت پر ایک مخصوص جگہ لے جاتی تھی۔ جیک چونک پڑا کہیں یہ وہی اتفاق تو نہیں جس کا مجھے ایک عرصہ سے انتظار تھا۔
یقیناً کوئی بات ضرور تھی ورنہ اس کا دل اتنی شدت سے نہ دھڑکتا۔
پیراڈائز پلاسٹک انڈسٹریز کے دفتر سے آرنالڈ ایک دوپہر باہر نکلا اور پیدل ہی ایک جانب چل دیا۔ اس وقت جیک کی خالی ٹیکسی کچھ فاصلے پر کسی سواری کے انتظار میں کھڑی تھی آرنالڈ کو اپنی ٹیکسی کی جانب آتے دیکھ کر جیک چونک پڑا لیکن اگلے ہی لمحے وہ باہر نکلا اور اس کے لئے دروازہ کھول دیا۔
وہ عقبی نشست پر بیٹھ گیا۔
''کراکو ہاؤس......!'' اس نے کہا۔
جیک نے گاڑی آگے بڑھادی۔ ٹریفک کے ہجوم سے نکل کر جب وہ ایک ویران سڑک پر پہنچا تو اُس نے عکس نما میں دیکھا۔ آرنالڈ اطمینان سے بیٹھا سگار پی رہا تھا۔ جیک آرنالڈ کو اچھی طرح جانتا تھا۔ اس کی بہن اگرچہ اس سے الگ رہتی تھی لیکن وہ جانتا تھا کہ پیگ اسی دفتر میں کام کرتی ہے جس کا مالک آرنالڈ تھا۔
آرنالڈ کے پاس ایک خوبصورت شیورلیٹ گاڑی موجود تھی جس میں وہ روز صبح دفتر آتا اور پھر اسی میں واپس گھر جاتا تھا۔ نواحی علاقے میں اس کی ایک شاندار کوٹھی تھی جس میں وہ اپنے بچوں اور حسین بیوی کے ساتھ رہتا تھا۔
آخر یہ دوپہر کے وقت کراکو ہاؤس کیوں جاتا ہے؟ اور اس مقصد کے لئے ٹیکسی استعمال کرنے میں کیا مصلحت ہے؟ یہ خیال جیک کے ذہن میں ساتویں دن آیا تھا۔ ان سات دنوں میں آرنالڈ بڑی باقاعدگی کے ساتھ دوپہر کے وقت دفتر سے نکلتا۔
پیدل وہاں تک پہنچتا جہاں اتفاق سے جیک کی خالی ٹیکسی موجود ہوتی اور پھر وہ اُسے کراکو ہاؤس جانے کا کہہ کر عقبی نشست میں دھنس جاتا تھا۔

جیک سوچتا رہا، اُلجھتا رہا لیکن یہ اُلجھن بڑ
ہی رہی، اور پھر...... رفتہ رفتہ جیک یہ محسوس کرنے لگا
آرنالڈ اس سے خاصا بے تکلف ہوگیا ہے اور ان
درمیان دوستی کی غیر مرئی لہریں دوڑنے لگی ہیں۔
اگرچہ وہ خاصے بے تکلف ہوگئے تھے لیکن کر
ہاؤس کی اس عمارت میں دوپہر کے وقت اتنی باقاعد
سے حاضری دینے کا مقصد جیک کو معلوم نہ ہوسکا او
ہی آرنالڈ نے کبھی اس موضوع پر گفتگو کی تھی۔
اس پراسرار معاملے پر غور کرتے کرتے جی
اب اس نتیجے پر پہنچ چکا تھا کہ وہ سب کی نگاہوں سے
کر اس عمارت میں مقیم کسی لڑکی سے ملنے جاتا ہے۔ ا
عمارت میں آرنالڈ دو گھنٹے گزارتا تھا۔ پہلے پہل تو جی
اُسے چھوڑ کر آگے نکل جاتا تھا لیکن اب جبکہ ان
درمیان دوستی کا جذبہ بیدار ہوگیا تھا وہ عمارت کے
دو گھنٹے بیٹھ کر اونگھ لیتا تھا۔
دو گھنٹے بعد آرنالڈ کی واپسی ہوتی، وہ اسے
اور پھر اب اسے خاصی آمدنی ہونے لگی تھی۔ آرنالڈ
دینے کے معاملے میں بہت فراخدل تھا، اور جیک
سوچنے پر مجبور ہوگیا کہ کہیں آرنالڈ سے پہلی ملاقات
وہ اتفاق تو نہیں تھا جس کی اسے تلاش تھی؟ لیکن
اسے کسی ایسے اتفاق کی تلاش تھی جس کے بعد کم ا
ٹیکسی ڈرائیونگ جیسے دھندے سے جان چھو
جاتی...... اور وہ خود ایک امیر آدمی بن جاتا...... اتنا ا
کہ کسی ٹیکسی کی عقبی نشست پر بیٹھ کر سگار کے کھرے
لگاتا ہوا کسی حسین لڑکی کی طرف سفر کرسکتا۔
جیک صبح گھر سے نکلتے وقت یہ تہیہ کرچکا تھا
آرنالڈ سے کراکو ہاؤس جانے کی وجہ ضرور دریا
کرے گا، دوپہر تک وہ شہر بھر میں ادھر سے اُدھر سوار
اُتارتا چڑھاتا رہا پھر مقررہ وقت پر اس جگہ جا پہنچا جہ
سے آرنالڈ کو لے کر کراکو ہاؤس کی طرف جانا تھا۔
انتظار بھی کتنی بُری چیز ہے، اس نے تلخ انداز
سوچا۔ اگر آرنالڈ کے انتظار میں اسے چند منٹ ہی گزر
تھے لیکن یوں محسوس ہوتا تھا جیسے کئی صدیاں بیت

اور آرنالڈ آنے کا نام ہی نہیں لے رہا تھا۔

اس نے بے چینی سے کلائی کی گھڑی پر وقت دیکھا۔ خلاف معمول آرنالڈ کو آنے میں پانچ منٹ دیر ہو گئی تھی۔ پہلے تو کبھی ایسا نہیں ہوا؟ اس نے سوچا اور طرح طرح کے اندیشے ذہن میں آنے لگے۔ وہ انہی اندیشہ ہائے دور دراز میں ڈوبا دفتر کے بغلی دروازے کو گھورتا رہا۔ جب مایوسی بڑھ گئی تو اس نے نیچے اترنے کا فیصلہ کرلیا۔ ابھی اس کا ہاتھ دروازے کے لٹو پر آکر ٹھہرا ہی تھا کہ آرنالڈ دکھائی دیا۔

وہ دھیرے دھیرے قدم اُٹھاتا بغلی دروازے سے سڑک پر آیا اور پھر کسی گہری سوچ میں ڈوبا ٹیکسی کے قریب پہنچا۔

جیک دروازہ کھولے منتظر تھا۔ جب وہ بیٹھ گیا تو دروازہ بند کرکے اسٹرنگ سنبھال لیا، پھر عکس نما میں کنکھیوں سے دیکھا۔ وہ انتہائی متفکر دکھائی دے رہا تھا۔ بجھا ہوا سگار منہ میں دبائے وہ یوں گم سم بیٹھا تھا جیسے جیک کی گاڑی میں بیٹھتے ہی روح اور جسم کا تعلق ختم ہوگیا ہو۔ حیرت کی بات تو یہ تھی کہ اس نے جیک کے سلام کا جواب تک نہیں دیا تھا۔ اور وہ مخصوص جملہ کیسے ہو دوست...... آج اس کے ہونٹوں سے ادا نہیں ہوا تھا۔

جیک نے ٹیکسی آگے بڑھا دی۔

راستہ خاموشی سے کٹ گیا۔ کراکو ہاؤس سے چند فاصلے پر ٹیکسی روک کر جیک نے عقب میں دیکھا۔ وہ اسی طرح فکرمندانہ انداز میں بیٹھا ہوا تھا۔

''منزل مقصود آ چکی ہے جناب......!''

''آں......اچھا......'' آرنالڈ نے چونک کر کہا۔

''کیا آپ کی طبیعت ٹھیک ہے مسٹر آرنالڈ؟''

''کیا کہا......؟''

''آپ کی طبیعت......'' اس نے دہرایا۔ ''آج آپ مسلسل خاموش رہے ہیں۔''

آرنالڈ نے ایک طویل سانس لیا اور بڑی توجہ سے جیک کو دیکھنے لگا۔ ''جیک......کیا تم شادی شدہ ہو؟''

جیک کی مسکراہٹ دم توڑ گئی۔ ''کون میں؟ نہیں

دو چیزیں

دو چیزیں بڑی اہم ہیں۔ اللہ کا ڈر اور اللہ کا ڈر جس شخص کو یہ دو نعمتیں نصیب ہوگئیں سمجھو اس کو دنیا کی تمام سعادتیں نصیب ہوگئیں۔ ڈر ہوگا تو گناہوں سے بچے گا۔ ڈر نصیب ہوگا تو عبادت کی لذت نصیب ہوگی۔ (اشفاق احمد)

(ایس حبیب خان-کراچی)

جناب فی الحال تو آزاد ہوں۔''

آرنالڈ نے دوبارہ آہ بھری۔ ''تو پھر تم عورت کے بارے میں کچھ نہیں جانتے۔''

''یہ تو نہیں کہہ سکتا...... لیکن میری ایک بہن ضرور ہے۔''

''کیا وہ شادی شدہ ہے؟''

''نہیں......''

''تم دونوں ایک ساتھ رہتے ہو؟''

جیک نے فوراً ہی جواب دیا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ آخر اس الجھی ہوئی گفتگو کا کیا مطلب ہے۔ اس سے پیشتر ان کے درمیان کبھی ذاتیات پر بحث نہیں ہوئی تھی۔ وہ عام قسم کی باتیں کیا کرتے تھے یہی وجہ تھی کہ جیک اس سے یہ بھی نہ پوچھ سکا کہ آخر وہ ہر دوپہر کو کراکو ہاؤس کیا کرنے آتا ہے۔ اور یہاں آمدورفت کے لئے اپنی کار کیوں استعمال نہیں کرتا؟

''تم نے میری بات کا جواب نہیں دیا۔'' آرنالڈ نے بدستور بیٹھے ہوئے کہا۔

''جی نہیں...... ہم دونوں کے پاس اپنا ایک الگ الگ فلیٹ موجود ہے۔''

اس نے اثبات میں سر ہلایا۔ ''گویا تم اس کے تقاضوں سے محفوظ ہو۔'' آرنالڈ یہ کہہ کر خاموش ہوگیا۔

جیک نے سوچا کہ آخر وہ ٹیکسی سے اُتر کر عمارت میں کیوں نہیں جا رہا۔ وہ الجھی ہوئی نگاہوں سے اس کی جانب دیکھتا رہا۔ کچھ دیر بعد آرنالڈ کے لب متحرک

ہوئے اور فکر میں ڈوبی ہوئی آواز سنائی دی۔ ''عورت بڑی ہی تکلیف دہ جنس ہے جیک بڑی ہی تکلیف دہ۔ یہ مرد کو کبھی نہیں سمجھ سکتی۔''

جیک کو ان باتوں کا مقصد تو معلوم نہیں تھا لہٰذا وہ کندھے جھٹک کر صرف یہی کہہ سکا ''میرا خیال ہے آپ ٹھیک کہتے ہیں۔''

''یہ حقیقت ہے جیک۔'' آرنالڈ نے اصرار کیا ''میکسلائن ہی کی مثال سامنے رکھو...... اوہ تم اسے نہیں جانتے، بہرحال وہ میری لیڈی سیکریٹری ہے۔ میں نے اس کی ہر خوشی پوری کی۔ وہ ابھی اس معاملے میں پیچھے نہیں رہی لیکن اب میری آخری خواہش پوری نہیں کر رہی حالانکہ میں اُسے زیورات، فرم اور کپڑے دلانے میں بہت زیادہ خرچ کر چکا ہوں۔ وہ بہت دلکش لڑکی ہے لیکن یہ نہیں سمجھ سکتی کہ میں اب کیا محسوس کر رہا ہوں۔''

''آپ کا مطلب ہے آپ کی نگاہوں میں وہ کشش ختم ہو گئی ہے؟''

''تقریباً یہی بات ہے۔''

''اور آپ اُس سے قطع تعلق چاہتے ہیں؟''

''یقیناً......'' آرنالڈ نے کہا۔ ''دراصل میں اب اس سے بیزار ہو چکا ہوں کسی لڑکی سے نباہ کرنے کے لئے تین ماہ بہت کافی ہوتے ہیں۔ میری فرم میں ایک اور لڑکی ہے، میں اُسے اپنی سیکریٹری دیکھنا چاہتا ہوں لیکن میکسلائن نے وہ جگہ خالی کرنے سے انکار کر دیا ہے۔''

''ایسے موقعوں پر عموماً تھوڑی بہت رقم کام کر جاتی ہے۔''

آرنالڈ نے انکار میں گردن ہلا دی۔ ''میں اسے ڈھائی ہزار ڈالر کی پیشکش کر چکا ہوں اور اس سے تین گناہ زیادہ مانگ رہی ہے۔ لعنت ہو جیک یہ ایک بہت بڑی رقم ہے۔ میں ڈھائی ہزار سے ایک سینٹ بھی زیادہ نہیں دے سکتا، آخر نئی لڑکی کے بھی کچھ تقاضے ہوں گے۔''

''ممکن ہے آپ کو اس کا مطالبہ پورا کرنا پڑے۔''

''نہیں'' وہ ٹیکسی سے نیچے اُتر آیا۔ ''میں آج صاف صاف گفتگو کے لئے جا رہا ہوں۔''

''اور اس کے بعد......؟'' جیک نے مایوسی سے

''کیا مطلب؟''

''کل میں بھی خود کو آپ سے الگ سمجھوں؟

آرنالڈ کے ہونٹوں پر مسکراہٹ رقصاں ہو

''نہیں جیک...... تم میرے راز دار اور رفیق ہو، تمہیں کل نئی جگہ بتا دوں گا۔''

جیک اسے عمارت کے دروازے کی جا بڑھتا دیکھتا رہا۔ آج نیند اُس کی آنکھوں سے کو دور تھی۔ وہ ان دو گھنٹوں میں دن بھر کی تکان دور ک تھا لیکن آج اُونگھنا تو درکنار گاڑی میں اطمینان بیٹھنا بھی دشوار محسوس ہو رہا تھا۔

یقیناً یہ اس لڑکی کے لئے ایک بہترین ہے۔ اس نے تلخ انداز میں سوچا۔ وہ آرنالڈ جیسے سے جو چاہے بٹور سکتی ہے لیکن نہ جانے وہ اس موقع فائدہ اُٹھانے کی صلاحیت بھی رکھتی ہے یا نہیں...... نہ جانے ایسا ہی موقع میرے ہاتھ کب آئے گا؟

آرنالڈ جس قسم کی مہم پر گیا تھا اس میں زیاد لڑکی کے ساتھ ٹھہرنے کی گنجائش نہیں تھی لیکن وہ واپس نہیں آیا۔ جیک کا خیال تھا کہ وہ جاتے ہی جیب سے نکال کر لڑکی کے سامنے رکھ دے گا اور کہتا ہوا لوٹ آئے گا کہ اس سے زیادہ ادائیگی ممکن ہے۔ پانچ منٹ گزر گئے، پندرہ اور بیس منٹ گز کے بعد پورا ایک گھنٹہ بیت گیا۔ اب جیک صرف یہ کر مطمئن ہو گیا کہ آرنالڈ جاتی بہار سے آخری خو سمیٹنے میں لگ گیا ہے۔ یا پھر یہ بھی ممکن تھا ک ضرورت سے زیادہ ہٹ دھرمی پر اتر آئی ہو۔

اچانک اُسے آرنالڈ دکھائی دیا۔ وہ بڑ رفتاری سے ٹیکسی کی جانب بڑھ رہا تھا۔ انداز گھبراہٹ مترشح تھی، پاؤں رکھتا کہیں تھا لیکن کہیں تھے۔

''جیک......'' اس نے قریب پہنچ کر ہوئے کہا۔ ''تمہیں میری مدد کرنی پڑے گی۔''

اس نے خاموشی سے آرنالڈ کے چہر

ہارہ لیا۔ اس کی آنکھوں سے گہرا خوف جھلک رہا تھا اور چہرے پر زردی پھیلی ہوئی تھی۔ جیک کے ذہن میں فوراً ہی یہ خیال آیا کہ یقیناً وہ موقع آچکا ہے جس کا وہ بڑی بے تابی سے ایک ایک پل گن گن کر انتظار کررہا تھا۔

"یقیناً...... یقیناً مسٹر آرنالڈ" اس نے بڑی سنجیدگی سے کہا۔ "آپ مجھ پر اعتبار کرسکتے ہیں......کیا بات ہے؟"

"میں نے اسے مار ڈالا" وہ کانپ کر بولا۔ "وہ میری بات نہیں سن رہی تھی......اور جب تکرار بڑھی تو وہ دروازے کی طرف بھاگ اٹھی۔ میں نے اُسے پکڑلیا اور منہ پر طمانچہ مارا......" وہ رُک کر سانسیں درست کرنے لگا پھر کہا۔ "میں اسے کوئی نقصان نہیں پہنچانا چاہتا تھا لیکن وہ تھپڑ کی ضرب سے گر پڑی اور اُس کا سر فرش سے ٹکرا گیا......" قدرے توقف کے بعد اس نے لرزتی ہوئی آواز میں کہا۔ "جیک وہ مرچکی ہے"

"وہ مارا......" جیک کا دل خوشی سے اُچھل پڑا۔ تو وہ مرچکی ہے، بہت خوب اس نے سوچا اور اس کے ساتھ اس کے جسم کی تمام قوتیں سمٹ کر جیسے دماغ کو مدد دینے لگیں۔

"کیا آپ کو یقین ہے؟"

"ہاں...... وہ بے حس وحرکت پڑی ہے"

آرنالڈ ٹیکسی سے ٹیک لگا کر بُری طرح ہانپنے لگا۔

"خود پر قابو رکھیں اور مجھے بتائیں وہ کہاں ہے؟" جیک نے کہا اور ٹیکسی سے اُتر آیا۔ وہ دل ہی دل میں ایک لاش کو ٹھکانے لگانے کی ترکیب سوچ رہا تھا۔

کمرہ تیسری منزل پر تھا۔

لفٹ خالی تھی اس لیے انہیں اوپر پہنچنے میں کوئی خاص دشواری نہیں ہوئی۔ آرنالڈ نے جیب سے فلیٹ کی چابی نکالی......قفل کھولتے وقت ہاتھ اس قدر کانپنے لگے کہ وہ سوراخ میں چابی نہ ڈال سکا جیک نے چابی لی اور دروازہ کھول دیا۔

آرنالڈ نے کمرے میں داخل ہونے سے انکار کیا اور پھر جیسے ہی جیک اندر داخل ہوا وہ بے قراری کے عالم میں دروازے کے سامنے ہی ٹہلنے لگا۔



نیک روح

ایس امتیاز احمد۔ کراچی

تمام لوگ حیرت کے سمندر میں غوطہ زن تھے ان کے ذہن میں سائیں سائیں کرتا غبار اٹھ رہا تھا، کسی کی سمجھ میں کچھ بھی نہ آرہا تھا کہ اصلی اور نقلی بھوت کون تھا۔

دل ودماغ پرخوف کا سکہ بیٹھاتی...... عجیب وغریب...... پرتجسس کہانی......

آبادی سے دور ایک دلدلی جنگلی علاقے میں ٹی وی کے ایک ہارر فلم کی شوٹنگ ہورہی تھی۔ اس میں، مجھے ممی یعنی حنوط شدہ لاش کا کردار ادا کرنا تھا۔ ایسی ممی جو حیرت انگیز طور پر زندہ ہوکر بھوت بن جاتی ہے اور خوفناک تباہی مچانے کے بعد ہیرو کے ساتھ لڑتے لڑتے دلدل میں دھنس کر مرجاتی ہے۔ فلم کی ساری شوٹنگ مکمل ہوچکی تھی بس آخری شارٹ باقی رہ گیا تھا اور عین اس وقت ہدایتکار نے کھانے کے وقفے کا اعلان کردیا۔

مجھے سخت تاؤ آیا۔ میرا پورا جسم عجیب قسم کے کپڑوں میں لپٹا ہوا تھا۔ ڈھنگ سے چل سکتا نہ بول سکتا تھا، منہ پر اس قدر بھیانک میک اپ تھا کہ عام آدمی دیکھے تو بے ہوش ہوجائے۔ میری خواہش تھی کہ لنچ کا وقفہ آخری سین کے بعد کرلیا جاتا اور میں اس تکلیف دہ میک اپ سے نجات پاکر سہولت سے کھانا کھالیتا، لیکن ہمارے پروڈیوسر صاحب تو وقت کی پابندی میں مبتلا تھے۔ میرا بگڑا ہوا موڈ دیکھ کر وہ مجھے اپنے خیمے میں لے گیا اور ہاتھ سے کوکا کولا کا ٹن کھول کر دیا اور میں بڑی مشکل سے پائپ کے ذریعے اسے حلق میں انڈیلنے لگا۔ وہ برگر کھاتے ہوئے اچانک بولا۔ ”مسٹر بروک! میں نہیں چاہتا کہ تم اس میک اپ میں مزید رہو۔ اس لیے ایک کام کرو۔“

”وہ کیا؟“ میں نے بڑی مشکل سے گھٹے گھٹے الفاظ میں پوچھا۔ ”وہ یہ کہ ہماری اس گاڑی میں پیٹرول کم ہے۔

اچھا ہو کہ تم اس میں پیٹرول ڈلوالاؤ۔ پیٹرول پمپ یہاں سے دس منٹ کی ڈرائیو پر ہے اور ڈرائیور لنچ کے بعد آئے گا تم اتنی دیر تکلیف میں رہوگے۔"

پروڈیوسر کی بات صحیح تھی اور اس کا لہجہ اس قدر ریتیموں کا سا تھا کہ مجھے اس کی بات مان لینا پڑی۔ میں نے اس سے چابی لی اور گاڑی کی طرف چل پڑا۔

جونہی میں نے گاڑی اسٹارٹ کی، پھر بارش ہونے لگی، مجھے بھلا اس کی کیا پرواہ تھی، میرا میک اپ خراب ہونے والا نہیں تھا بلکہ بھیگنے سے میری شکل مزید خوفناک ہوجائے گی، جس سے ہدایتکار اور خوش ہوگا۔

میں نے گاڑی پوری رفتار سے پیٹرول پمپ کی طرف دوڑادی۔ بارش کی شدت میں بتدریج اضافہ ہو رہا تھا۔ اور اب تو ہوا بھی زور کی چلنے لگی تھی، مگر میں نے رفتار آہستہ نہیں کی۔ پانچ منٹ کے بعد سڑک دو شاخہ ہوگئی۔ ایک قریبی قصبے کی طرف اور دوسری پیٹرول پمپ سے گزرتی ہوئی کسی دوسرے شہر کی جانب۔ میں نے پیٹرول پمپ والی سڑک کا تعین کرنے کے لئے جب بورڈ کی طرف دیکھا تو اوسان خطا ہوگئے۔ وہ کسی لٹو کی طرح گھوم رہا تھا۔ میں سوچنے لگا کہ اگر غلط سمت مڑ گیا تو معلوم نہیں مجھے کتنی دیر بھٹکنا پڑے گا۔ چنانچہ میں نے یہیں ٹھہر کر کسی گاڑی کا انتظار کرنے کا فیصلہ کیا۔

بارش کی شدت میں کمی آگئی تھی۔ مگر ہوا بڑی تیز چل رہی تھی اور اس کا شور بھی غیر معمولی تھا۔ چند منٹ انتظار کے بعد دور اندھیرے میں کسی گاڑی کی ہیڈ لائٹس نظر آئیں۔ غالباً کوئی کسان اپنے فارم سے واپس آرہا تھا۔ اس کی پھٹیچر گاڑی کے بے ہنگم شور اور لہک لہک کر اونچی آواز میں انتہائی بے سرے راگ سے یوں لگتا تھا جیسے بھوتوں کا مشاعرہ ہو رہا ہو۔ مجھے دیکھ کر اس نے گاڑی آہستہ کی اور قریب آکر ٹھہر گیا۔ اس سے پہلے کہ وہ میری شکل غور سے دیکھتا، میں نے سوال داغ دیا۔

"جناب! پیٹرول پمپ کی طرف کون سا راستہ جاتا ہے؟" اس نے بدستور گاتے ہوئے میری طرف پہلی مرتبہ دیکھا۔ اگلے ہی لمحے وہ دلدوز چیخ مارتا ہوا گاڑی کو اندھا دھند بھگا لے گیا۔

اس کے بھاگنے کے انداز میں اس قدر بدحواسی تھی کہ میری ہنسی چھوٹ گئی، مگر برا ہو میرے تکلیف دہ میک اپ کا، میں تو کھل کر ہنس بھی نہیں سکتا تھا۔ میں ابھی اپنے میک اپ کو برا بھلا ہی کہہ رہا تھا کہ ایک اور گاڑی کی ہیڈ لائٹس نظر آئیں۔ قریب آنے پر میں نے اسے بھی روکا۔ یہ ایک لوڈر گاڑی تھی۔ اس میں دو تین آدمی بیٹھے تھے۔ میں نے دور ہی سے بلند آواز میں پیٹرول پمپ جانے والی سڑک کے بارے میں پوچھا۔

"دائیں طرف والی سڑک!" ایک موٹے سے شخص نے اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ میں نے اطمینان کا سانس لیا اور اپنی گاڑی کی طرف لپکا۔ گاڑی ابھی اسٹارٹ کی تھی کہ ان کی لوڈر میرے قریب آکر ٹھہری۔ ایک شخص نے کھڑکی سے سر نکال کر میری طرف غور سے دیکھا۔ شاید وہ کوئی بات کہنا چاہتا تھا، مگر میری صورت دیکھتے ہی زور سے چیخا "یہ وہی لگتا ہے...... پکڑلو...... جانے نہ پائے۔"

اس اچانک مصیبت کے لئے میں قطعی تیار نہ تھا اگلے ہی لمحے گاڑی سے دو آدمی اترے۔ ایک کے ہاتھ میں ریوالور اور دوسرے نے شاٹ گن پکڑ رکھی تھی۔ میں نے بھاگنے کا ارادہ کیا کہ ٹھائیں کی آواز آئی۔ گولی میرے سر میں سنسناتی کرتے ہوئے گزر گئی۔ میں رک گیا، بڑے غصے سے ان کی طرف مڑا اور چیخ کر کہا۔

"بے وقوفو! اگر میں بھوت ہوتا تو تم سے کبھی نہ ڈرتا مگر میں انسان ہوں، صرف میک اپ......"

مگر شاٹ گن والے نے میری بات کاٹتے ہوئے کہا "ہمیں سب کچھ معلوم ہے...... تم ہی وہ مردے ہو جو بھوت بن کر فرار ہوگئے ہو ہمیں تمہارا حلیہ بتادیا گیا ہے...... پادری نے کہا تھا کہ اسے صلیب دینا ہوگی، تبھی اس کی روح قید ہوگی، ورنہ یہ پھر زندہ ہوجائے گا۔"

اس کے ساتھ ہی وہ چاروں، قدم پھونک پھونک کر میری طرف بڑھنے لگے۔ میں بہت ہی خوفناک اتفاق کا شکار ہو چکا تھا۔ میں چیخ چیخ کر انہیں اپنی اصلیت بتانے لگا، لیکن خوف اور میک اپ کی وجہ سے میرے منہ سے الفاظ بھی

ٹھیک طرح سے نکل نہیں رہے تھے۔ انہوں نے مجھے پاؤں رسیوں سے باندھا، بڑی بے رحمی سے گاڑی میں ڈالا اور کسی انجانی منزل کی طرف چل پڑے۔

تقریباً آدھ گھنٹے کے بعد وہ کہیں رکے اور مجھے کھینچ کر گاڑی سے باہر لے آئے۔ شاٹ گن اور ریوالور بدستور میری طرف اٹھے ہوئے تھے۔ یہ ایک خستہ حال چرچ تھا۔ وہ مجھے گھسیٹتے ہوئے ایک چبوترے پر لے گئے جس میں نصب شدہ صلیب کو دیکھ کر میرے رہے سہے اوسان جاتے رہے۔ چبوترے پر پہنچتے ہی ایک الجھے بالوں والا پاگل سا پادری معلوم نہیں کہاں سے آٹپکا اور مجھے دیکھتے ہی بولا "بالکل...... یہی ہے وہ مردود جو بھاگ نکلا تھا۔ کوئی لمحہ ضائع کیے بغیر اسے صلیب پر لٹکا دو۔"

میں نے ایک بار پھر انہیں خبردار کیا کہ وہ کسی بھوت کو نہیں بلکہ اپنے ایک جیتے جاگتے انسان کو قتل کرنے لگے ہیں، مگر ان کے سر پر خون سوار تھا اور وہ مجھے جلد از جلد پھانسی دینا چاہتے تھے۔ دو آدمیوں نے مجھے بازوؤں سے اور دو نے ٹانگوں سے پکڑ کر چبوترے پر چڑھا لیا۔ میں اپنی جان بچانے کے لئے خوب ہاتھ پاؤں مار رہا تھا، لیکن وہ مجھ سے زیادہ طاقتور تھے۔ مجھے اپنا انجام بہت قریب نظر آنے لگا تھا۔

وہ مجھے صلیب کی لکڑی پر لٹکانے میں مصروف تھے کہ گولی چلنے کی آواز آئی۔ مجھے چھوڑ کر وہ آواز کی سمت دیکھنے لگے۔ اندھیرے میں ایک سوار سرپٹ گھوڑا دوڑاتا ہوا آیا۔ گولی اسی نے چلائی تھی۔ اس نے پے در پے مزید فائر کیے۔ وہ مجھے باندھنے والوں کو نشانہ بنا رہا تھا۔ "لو بھوت کا ساتھی آ گیا۔" کہتے ہوئے بھاگ نکلے۔

آنے والے اجنبی نے چبوترے سے ذرا ہٹ کر اپنا گھوڑا باندھا اور پھر محتاط انداز سے قدم اٹھاتا ہوا میرے قریب آیا۔ مجھے غور سے دیکھنے کے بعد اس نے چبوترے کے تین چکر لگائے اور منہ ہی منہ میں کچھ منتر پڑھے۔ پھر وہ چبوترے پر چڑھا اور مجھ پر تین بار پھونک ماری۔ میں خاموشی سے یہ سب کچھ دیکھتا رہا۔ اس کی اب تک کی حرکتوں سے یہ ثابت ہو گیا کہ وہ بھی مجھے کوئی بھوت ہی سمجھ رہا ہے۔ یہ بھی واضح تھا کہ میں اگر اسے اپنی اصل حقیقت بتانا چاہوں بھی تو وہ کبھی نہیں مانے گا۔ وہ اب اپنے گھوڑے کی طرف جا رہا تھا۔ میں نے تھوڑی سی جدوجہد سے اپنے آپ کو رسیوں سے آزاد کرا لیا، لیکن ہاتھ اسی طرح ستون سے لگائے رکھے جیسے کہ وہ بندھے ہوں۔ وہ آدمی اب اپنے گھوڑے تک پہنچ گیا تھا۔ اس نے اپنے سامان سے ایک بھاری تلوار ہوا میں لہرائی اور مجھ سے مخاطب ہوا۔

"اگر تم نے مجھے ڈالی کا گی کا راز نہ بتایا تو میں تمہیں مقدس باپ کی اس تلوار سے ٹکڑے ٹکڑے کر دوں گا۔"

وہ خوفناک طریقے سے میری طرف بڑھا۔ قریب آ کر اس نے تلوار دونوں ہاتھوں میں بلند کی اور پھنکارتے ہوئے کہا۔ "بتاؤ ڈالی کا گی کا خزانہ کہاں ہے؟"

ابھی اس نے الفاظ منہ سے پوری طرح ادا نہیں کیے تھے کہ میں نے پوری قوت سے اسے دھکا دیا۔ ساتھ ہی اس زور سے چیخ ماری کہ مجھے خود بھی یقین نہ آیا کہ میں اس قدر خوفناک چیخ بھی مار سکتا ہوں۔ اجنبی تلوار سمیت چبوترے سے لڑھک کر نیچے گر پڑا اور میں گھوڑے کی طرف لپکا، اچھل کر اس پر بیٹھا اور ایڑ لگائی۔ میرا رخ اپنی گاڑی کی طرف تھا۔ میں نے پیچھے مڑ کر دیکھا وہ شخص ابھی بھی وہیں پڑا تھا۔ شاید خوف سے بے ہوش ہو گیا تھا۔

کچھ ہی دیر بعد میں اپنی گاڑی کے پاس پہنچ گیا۔ میں نے چابی گھمائی، گاڑی اسٹارٹ کی اور اگلے دس منٹ میں پیٹرول پمپ میرے سامنے تھا۔ میں نے چاروں طرف نظر دوڑائی کہ کوئی پیٹرول پمپ پر موجود تو نہیں۔ دراصل میں کوئی نئی مصیبت مول لینا نہیں چاہتا تھا۔ مجھے پہلے ہی بہت دیر ہو چکی تھی۔ فلم یونٹ مجھے غائب پا کر سخت پریشان ہو رہا ہوگا اور یقیناً کچھ لوگ میری تلاش میں نکل چکے ہوں گے۔ فیول اسٹیشن پر جب مجھے کوئی بھی نظر نہ آیا تو میں نے جلدی سے پمپ میں پیسے ڈالے اور پیٹرول گاڑی میں بھر لیا۔ لیکن گاڑی سیدھی کر کے جیسے ہی پہلا گیئر ڈالا، تیز روشنی نے میری آنکھیں چندھیا دیں۔

"ہاہاہا...... پکڑ لیا...... ہاہاہا......"

ایک دفعہ پھر وہی لوگ میرے سامنے کھڑے تھے جو مجھے کوئی بدروح سمجھ کر صلیب پر لٹکانے کے لئے ادھار

لھائے بیٹھے تھے۔ وہی لوڈر گاڑی، وہی بندوق، وہی کرخت چہرے، مگراس بار ایک بوڑھی عورت بھی ان کے ہمراہ تھی اس نے ہاتھ اوپر اٹھا کر اپنے ساتھیوں کو خاموش رہنے کا اشارہ کیا اور پھر وہ بڑے غور سے میری طرف دیکھنے لگی۔ اتنے میں ایک آدمی نے مجھے للکارا۔

''اے بدبخت روح...... باہر آجا...... ورنہ تجھے یہیں گولی ماردیں گے۔''

بندوق والے نے اپنی بندوق میری طرف سیدھی کی اور گرجدار آواز میں کہا۔ ''جانتے ہو، یہاں کیسے مروگے؟......جل کر! میری بندوق سے نکلنے والی ایک ہی گولی سے تمہاری گاڑی کی پیٹرول سے بھری ٹینکی بھک سے اڑ جائے گی اور تم اسی دنیا میں جہنم کی آگ میں جل مروگے...... ہاہاہا......''

میں دیکھ رہا تھا کہ واقعی بندوق کی لبلبی پر اس کی انگلی کا بوجھ بڑھ رہا تھا۔ ''ٹھہرو......'' میں حلق کے بل چیخا۔ بوڑھی عورت نے اسے ہاتھ کے اشارے سے بندوق چلانے سے روک دیا۔ میں جلدی سے گاڑی سے باہر آیا، ہاتھ اوپر اٹھائے بے پروائی سے بولا۔ ''تم لوگ کسی شدید قسم کی غلط فہمی کا شکار ہو۔ میں وہ نہیں جو تم سمجھ رہے ہو...... لیکن اگر تم مجھے مارنا ہی چاہتے ہو تو یہاں نہ مارو...... یہ پیٹرول پمپ ہے...... آگ پھیل گئی تو بہت برا ہوگا......''

میری بات بندوق والے کے بے رحم قہقہے میں گھٹ کر رہ گئی۔ اس نے اپنی بندوق دوبارہ میری طرف سیدھی کرتے ہوئے کہا ''مجھے معلوم تھا کہ تمہاری جیسی بدروح آگ میں مرنے سے ڈرتی ہے...... کیونکہ اس طرح تمہیں پھر زندہ ہونے کا موقع نہ مل سکے گا...... تیار ہوجاؤ......'' اس نے مزید کوئی وقت ضائع کیے بغیر فائر کردیا۔

بوڑھی عورت نے عین وقت پر ہاتھ سے بندوق کا رُخ آسمان کی طرف کردیا تھا۔ گولی ہوا کو چیرتی ہوئی اوپر نکل گئی۔ چند لمحوں بعد جب دہشت ناک آواز کی گونج ختم ہوئی تو وہ بڑھیا ٹھہری ہوئی آواز میں مجھ سے مخاطب ہوئی۔

''تم یقیناً کوئی اچھی روح ہو...... مجھے معلوم ہے کہ تم نے ان لوگوں سے سب سے پہلے پیٹرول پمپ کے متعلق پوچھا تھا......اور تم واقعی پیٹرول پمپ کی طرف آئے......ہم تمہارا پیچھا کررہے تھے...... پھر تم نے آگ پھیلنے کی بات کرکے میرا خیال درست ثابت کردیا کہ تم کوئی خبیث روح نہیں بلکہ نیک روح ہو...... سچ بولتے ہو اور انسانوں کو تباہی سے بچانے کا جذبہ رکھتے ہو، جاؤ، ہم تمہیں آزاد کرتے ہیں، لیکن اپنا حلیہ ضرور درست کرو...... یہ حلیہ کسی اچھی اور نیک روح کا نہیں ہوسکتا۔''

جونہی اس کی لمبی تقریر ختم ہوئی، میں نے شکریہ کہہ کر اپنا سر احترام سے جھکایا اور فوراً گاڑی میں بیٹھ کر اسے پوری رفتار سے دوڑا دیا۔

شکر خدا کا کہ راستے میں کوئی اور گڑبڑ نہیں ہوئی۔

جب میں شوٹنگ والی جگہ پہنچا تو مجھے وہاں سے نکلے ہوئے پورا گھنٹہ ہوچکا تھا۔ اس وقت جو منظر میرے سامنے تھا وہ دیکھ کر تو میرا خون ہی کھول اٹھا......جس مقصد کی خاطر میں نے اپنی جان کو خطرے میں ڈالا تھا، وہ بالکل ختم ہوچکا تھا...... کرین کے ذریعے ایک بھوت نما انسان کو اس دلدل سے باہر نکالا جارہا تھا جہاں آخری سین میں اسے ڈوب کر ہلاک ہونا تھا۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ انہوں نے آخری سین میرے بغیر ہی مکمل کرلیا اور میں نے جو بھاگ دوڑ کی...... اپنی زندگی خطرے میں ڈالی...... یہاں تک کہ موت کے منہ میں کئی بار گیا اور کئی بار بچ نکلا...... سب بے معنی تھا......

اچانک میرے ذہن میں ایک خوفناک سوال پیدا ہوا۔

سوال یہ تھا کہ بھوت کا کردار کرنے والا یہ شخص کون تھا......؟ میرے ذہن میں ایک ہی جواب تھا...... دراصل یہی وہ اصل بھوت ہے، جس کو وہ لوگ تلاش کرتے پھر رہے تھے اور جنہوں نے غلطی سے مجھے پکڑ لیا تھا میں حیرت سے اسے دیکھ رہا تھا۔ اس کی شکل ہو بہو مجھ سے ملتی تھی۔ واقعی ان لوگوں کی غلط فہمی بجا تھی، مگر اگلا منظر اس سے بھی زیادہ حیرت انگیز تھا۔ وہ بھوت جونہی دلدل سے نکل کر محفوظ مقام پر آیا، فلم یونٹ کے تمام لوگوں نے خوشی سے تالیاں بجائیں اور اس نا ہنجار بھوت نے اپنا میک اپ اتارنا شروع کردیا تھا۔





حسین بدروح

ایس امتیاز احمد۔کراچی

کیا یہ حقیقت ہے کہ بدروحیں شتر بے مہار پھرتی ہیں انہیں جوان خون زیادہ مرغوب ہوتا ہے، وہ اکثر چاندنی راتوں میں نکلتی ہیں اور کڑیل جوان کو لبھا کر خون چوس لیتی ہیں۔

خراماں خراماں دل کو سرور سے سرشار کرتی......ایک دلکش دلفریب اور حیران کن تحریر

حسین چاندنی راتیں ہم دونوں کو بہت بھاتی ہیں۔ہم نے کمرے کی بجلی گل کردی اور رات کی خاموشی سے لطف اندوز ہونے کے لئے برآمدے میں آن بیٹھے ایسی ہی راتوں کے حسن کا ذکر آیا تو میں نے کہا۔

''تم چاندنی کے حسن کی باتیں کررہی ہو اور میں اس کے فسوں کی۔ایک ایسے جادو کی جو دل اور دماغ کو مسحور کردیتا ہے کہ انسان کو نہ اپنی حرکات پر قابو رہتا ہے اور نہ سکنات پر۔اس رات کو بھی ویرانے میں میرے ساتھ یہی ہوا۔سننا چاہتی ہو کہ کیا ہوا تھا؟''

''ہاں......'' میری بیوی نے جواب دیا۔

''پر ساتھ ہی ایک شرط ہے۔وعدہ کرو بیچ میں نہیں بولوگی۔'' میں نے شرط لگائی۔

''وعدہ کرتی ہوں۔'' اس نے جواب دیا۔اس

کے چہرہ سے لگ رہا تھا کہ جیسے آج کی رات وہ بھی مضطرب ہے۔ ہماری شادی کو تقریباً دس سال ہورہے تھے۔ان دس برسوں میں کسی دن بھی میں نے اسے اس قدر مضطرب نہیں دیکھا تھا۔شاید وہ بھی میری طرح چاندنی رات کے اس پراسرار جادو کا شکار تھی۔میں نے پل بھر کے لئے اپنی بیوی کے حسین چہرہ کو دیکھا اور پھر ٹھنڈی سانس لی۔

''سناؤ کیا ہوا تھا اس رات کو؟'' اس نے مجھے خاموش دیکھا تو بولی۔

''اس بات کو ایک زمانہ گزر گیا۔'' میں نے سگریٹ سلگاتے ہوئے کہانی شروع کی۔

''میں اس زمانے میں حیدرآباد میں تھا اور ہمارا فوجی کیمپ ایک ویران سے علاقے کے قریب تھا۔ ایک طرف تو حسین نیلی جھیل تھی اور دوسری طرف پراسرار پہاڑیوں کا سلسلہ جس کے بارے میں مشہور تھا کہ یہ کبھی بدروحوں، بھوتوں اور چڑیلوں کا مسکن تھا۔ سندھ کی فتح کے بعد محمد بن قاسم نے ان پہاڑوں کی سب سے اونچی چوٹی پر ایک چھوٹی سی مسجد بنوائی تھی جہاں وہ اکثر عبادت کیا کرتا۔ کہتے ہیں کئی سال کے بعد اسی مسجد میں کسی بزرگ نے چلہ کھینچا تھا اور چالیس دن تک عبادت کی تھی جس کے بعد یہ علاقہ بدروحوں سے پاک ہوگیا۔ مجھے یہاں کا گنگناتا ہوا پراسرار سکوت بے حد پسند تھا۔ جب بھی فرصت ملتی میں ان پہاڑوں کی سیر کو ضرور جاتا۔ میرے اردلی شاہد کو یہ بات بالکل پسند نہیں تھی۔ وہ اکثر کہا کرتا۔''خدا کے لئے اکیلے نہ جایئے صاحب۔ یہ علاقہ جوان آدمیوں کے لئے بالکل اچھا نہیں۔''

''کیوں......؟'' ان کے لئے بطور خاص کیوں خطرہ ہے وہاں؟'' میں پوچھتا۔

''وہاں بدروحیں پھرتی رہتی ہیں صاحب انہیں جوان انسانوں کا گرم گرم خون بے حد پسند ہے۔ گردن سے چپک کر خون چوس لیتی ہیں کمبخت!'' وہ جواب دیتا۔

''میں تو صرف چاندنی راتوں میں جاتا ہوں۔'' میں اسے سمجھانے کی کوشش کرتا۔

''یہ تو اور بھی خطرناک بات ہے صاحب!'' وہ کہتا۔

''کیوں؟ کیا چاندنی راتوں میں ان کے یہاں دعوت ہوتی ہے؟'' میں شرارت سے پوچھتا۔

''جی بالکل......سنا ہے چودھویں کی رات کو ہر ماہ ان کی پیاس بہت بڑھ جاتی ہے!''

وہ مجھے ڈرانے کی کوشش کرتا۔''خصوصاً اگر وہ رات جمعرات کی ہو تو!''

میں نے شاہد کی ایسی باتوں کو کبھی اہمیت نہیں دی۔ لیکن جب ایسی ہی باتیں میں نے وہاں کے دوسرے مقامی باشندوں کی زبانی سنیں تو میری دلچسپی بڑھ گئی۔ سوچا کسی دن جا کر اس مسجد کی زیارت کرنی چاہیے۔ میں نے اس کا ذکر شاہد سے کیا تو اس نے خالص سندھی لہجے میں کہا۔''توبہ......توبہ...... وہاں تک کون جاسکتا ہے صاحب۔ راستے میں ایک فقیر کی کٹیا ہے۔ اس جھونپڑی تک جو بھی گیا، لوٹ کر کبھی نہیں آیا۔ میرے بابا کہا کرتے تھے جن کا ستارہ بھاری ہے صرف وہی جانے کی ہمت کرسکتے ہیں۔ کیونکہ بدروحیں انہیں آسانی سے ہڑپ نہیں کرسکتیں!''

اس پر مجھے شرارت سوجھی۔''میرا ستارہ بہت ہی بھاری ہے شاہد۔ تقریباً دس من!''

''پھر تو آپ جاسکتے ہیں صاحب۔ کوئی آپ کا کچھ نہیں بگاڑ سکتا۔ کم از کم اس وقت تک نہیں جب تک ہاتھ دھو کر کوئی آپ کے پیچھے نہ پڑ جائے۔ اس کے لئے بھی کم از کم دس سال لگتے ہیں۔'' اس کی یہ بات میری سمجھ میں نہیں آئی۔

''دس سال کیوں شاہد؟'' میں نے پوچھا۔

''سنا ہے ہر دسویں سال ان بدروحوں کی پیاس ابھرتی ہے۔ کسی کا ستارہ بھاری ہو تو دس سال تک وہ اسے نقصان نہیں پہنچا سکتیں۔ اگر دسواں سال گزر گیا تو پھر اور دس سال انتظار کرنا پڑتا ہے۔'' اس نے سنجیدگی سے جواب دیا۔

"یہ ساری باتیں تمہیں کیسے معلوم ہوئیں؟"
میں نے پوچھا۔
"میرے بابا نے بتائی تھیں صاحب ...... وہ بڑے عالم تھے۔ اللہ بخشے ہمیشہ ایک آدھ جن ان کے قبضے میں ضرور رہتا تھا۔ ان کے نام ہی سے بدروحیں دور بھاگتی تھیں! عاشق بدروحیں تو ایک منٹ بھی ان کے سامنے نہیں ٹک سکتی تھیں۔"

اب کے بدروحوں کے کردار کا ایک نیا پہلو میرے سامنے آیا تھا۔ "عاشق بدروحیں؟" میں نے پوچھا۔
"جی ہاں صاحب ...... آخر ان کا بھی دل ہوتا ہے۔ وہ بھی انسانوں کی طرح کسی پر عاشق ہوسکتی ہیں۔ یہ جو خون چوستی ہیں یہ کیا ہے؟ اپنے عشق کی پیاس بجھانے کی ایک ترکیب ہی تو ہے۔ اسی لئے تو وہ صرف جوانوں کا خون چوستی ہیں۔ خدا آپ کو نظر بد سے بچائے۔ آپ تو کڑیل جوان ہیں۔ آپ کو تو اس ویرانے کی طرف ہرگز نہیں جانا چاہیے!" وہ ایسی ہی احمقانہ باتیں کرتا گیا اور میں کافی کی پیالی ہاتھ میں لئے اس سے لطف اندوز ہوتا رہا۔ اس کے بعد میں کاموں میں کچھ اس قدر الجھا کہ سیر و تفریح کا موقع ہی نہیں ملا۔

اسی دوران میں شاہ لطیف بھٹائی کا یوم پیدائش آگیا۔ سارے سندھ میں تعطیل تھی۔ تمام فوجی افسر شہر چلے گئے تھے اور کیمپ میں، میں تنہا رہ گیا تھا۔ اس دن شام کو میں حسب معمول ہاتھ میں چھڑی لئے سیر کو نکلا تو یکا یک مجھے یاد آیا کہ آج جمعرات ہے آسمان کی طرف دیکھا تو بڑا حسین چاند نظر آیا جو افق سے قریب ایک گولے کی شکل میں جھانک کر دنیا والوں کا جائزہ لے رہا تھا۔ اس کے ساتھ ہی مجھے شاہد کی باتیں بھی یاد آگئیں، پل بھر کے لئے گھبراہٹ سی ہوئی۔ پھر سوچا کیا فضول باتیں ہیں یہ۔ آج کے ترقی یافتہ دور میں بدروحوں کی باتیں احمقانہ ہی تو تھیں۔ میں نے آج کی رات محمد بن قاسم کی مسجد تک جانے کا پکا ارادہ کرلیا۔ ابھی خاصی روشنی تھی۔

میں پہاڑی راستوں سے بھی اچھی طرح واقف تھا۔ میں نے دوبارہ گھر کی راہ لی اور وہاں سے ٹارچ اور پستول لے کر اس راستے پر ہولیا جو پہاڑوں کے درمیان بل کھاتا ہوا خدا جانے کہاں تک جاتا تھا۔ دن کے وقت میں نے یہاں اکثر ننگ دھڑنگ سیاہ فام دیہاتی لڑکوں کو دیکھا تھا جو بکریاں چرایا کرتے تھے۔
چاروں طرف سناٹا تھا اور دور دور تک کسی انسان یا جانور کا پتہ نہ تھا۔ خدا جانے میں کب تک چلتا رہا۔ شام کا دھندلکا چپکے سے غائب ہوگیا اور روشن چاند پہاڑی چوٹیوں میں سے ابھر کر میرے عین سامنے آگیا۔ چاروں طرف ہو کا عالم تھا۔ خوشگوار ہوائیں تو چلتی رہتی تھیں لیکن وہ بھی خدا جانے کیوں آج خاموش تھی۔ چلتے چلتے ایک ٹیلے کے پاس مڑ کر کھلے علاقے میں پہنچا تو مجھے یکا یک سامنے ایک جھونپڑی نظر آئی۔ اسے دیکھ کر میرے قدم آپ ہی آپ رک گئے۔ وہ بڑی خراب حالت میں تھی۔ دروازہ ٹوٹ کر ایک طرف لٹک گیا تھا اور چھت بھی جگہ جگہ سے بیٹھ گئی تھی۔ میں چند قدم آگے بڑھا تو یکا یک آہٹ سن کر آپ ہی آپ میرا ہاتھ پستول تک گیا لیکن میں رکا نہیں اور اسی طرح آہستہ آہستہ جھونپڑی کی طرف بڑھا۔
جھونپڑی کے قریب پہنچتے ہی اچانک کوئی اس میں سے نکلا اور تیر کی طرح میری طرف لپکا۔ میں نے چونک کر دیکھا تو وہ ایک جوان لڑکی تھی۔ وہ تیزی سے میری طرف آئی اور مجھ سے لپٹ گئی اور گھبرا کر کہا۔
"مجھے بچاؤ...... ان درندوں سے بچاؤ۔"
شاہد کی باتیں سننے کے بعد جو ردعمل ہونا تھا وہ یہ تھا کہ میں اس سے جان چھڑا کر تیزی سے الٹے پاؤں بھاگتا کیونکہ وہ یقیناً کوئی بدروح تھی۔ لیکن ایسا نہیں ہوا کیونکہ جو لڑکی میرے سینے سے لگی حفاظت کی درخواست کررہی تھی وہ گوشت پوست کی بنی ہوئی تھی اور یقیناً جوان تھی اور جدید طرز کے بلاؤز اور ساڑی میں تھی۔ جو

خوشبو اس نے استعمال کی تھی وہ بھی بھینی بھینی تھی اور مجھے مست کیے دے رہی تھی۔

مجھے اپنے ہوش اور حواس پر قابو پانے میں چند لمحے لگے۔ میں نے اس کے دونوں شانے تھام کر اسے اپنے سے علیحدہ کیا تو چاندنی میں اس کا چہرہ مجھے صاف نظر آنے لگا...... گول چہرہ بڑی بڑی آنکھیں اور جھکی جھکی پلکیں جو آنسوؤں سے تر تھیں۔ بھرے گال، خوب گورا رنگ، دلکش جاذب نظر گداز جسم اور شانوں تک کٹے ہوئے جدید طرز کے بال، جس کی ایک باغی لٹ اس کے حسین اور سوگوار چہرہ پر آ گئی تھی۔ میں نے غور سے اسے دیکھا۔ وہ بدروح کیسے ہوسکتی تھی؟ لیکن وہ کون تھی اور اس ویرانے میں کیا کررہی تھی؟ ''کیا کہہ رہی ہیں آپ؟ درندے؟ کہاں ہیں وہ؟'' میں نے پوچھا۔

''اس طرف گئے ہیں۔ انہوں نے میرے پورے کنبہ کو مار ڈالا۔'' اس نے سہمی سہمی آواز میں جواب دیا۔

یہ سنتے ہی میں نے جیب سے پستول نکال لیا۔ اس نے اشارے سے بلندیوں کی طرف اشارہ کیا تھا۔ غالباً وہ پہاڑ کی دوسری طرف چلے گئے تھے جہاں سے کچھ دور وہ سڑک تھی جو لطیف آباد کو جاتی تھی۔ شاید بدمعاش آئے بھی اسی طرف سے تھے کیونکہ اگر پہاڑی کی طرف سے آتے تو مجھ سے یا کسی دوسرے فوجی جوان سے ضرور مڈبھیڑ ہوتی۔ مجھے خاموش دیکھ کر اس نے کہا۔

''وہ تو مجھے بھی مار ڈالتے لیکن پہلے ہی حملہ پر میں چکرا کر یوں گری جیسے زخمی ہوگئی ہوں۔ پر انہوں نے میرے والد، والدہ، جوان بھائی اور بہن سب کو مار ڈالا۔ ہائے اب میں کیا کروں؟ کہاں جاؤں؟'' یہ کہتے ہوئے وہ دھیرے، دھیرے رونے لگی۔

میں نے اسے وہیں چھوڑ کر حالات کا جائزہ لینے کے لئے آگے بڑھنے کی ٹھانی۔ میں دبے پاؤں جھونپڑی کے دروازہ تک پہنچا۔ چاروں طرف سوکھے پتے بکھرے پڑے تھے اور ان پر سے گزرتے ہوئے میرے جوتے عجیب شور مچارہے تھے۔ رات کے سناٹے میں ان کا یہ شور مجھے ڈراؤنا لگا۔ میں نے دروازہ پر رک کر ٹارچ روشن کی تو میرے منہ سے چیخ نکلتے نکلتے رہ گئی۔

چاروں طرف خون ہی خون تھا۔ تازہ خون...... اور اس میں نہائی ہوئی چار لاشیں پڑی تھیں۔ دو مردوں کی اور دو عورتوں کی سب کی گردنیں کٹی ہوئی تھیں جیسے کسی نے انہیں بڑی بے دردی سے ذبح کردیا ہو۔

میں مبہوت کھڑا سب کچھ دیکھتا رہا۔ جب مجھے اس لڑکی کی آواز سنائی دی تو میں چونک گیا۔ خدا جانے کب وہ چپکے سے میرے قریب آ گئی تھی اور اس نے میرا بازو مضبوطی سے تھام لیا تھا۔

''ہائے ابا...... ہائے امی......!'' ایک بار پھر رونے لگی۔ مجھ سے وہاں ٹھہرا نہ گیا اور میں اسے سہارا دے کر باہر لے آیا، جہاں بڑی پرسکون چاندنی پھیلی ہوئی تھی۔

''آپ لوگ یہاں آئے ہی کیوں؟'' میں نے پوچھا۔ ''سیر کو آئے تھے۔ راستہ بھٹک گئے۔ شام ہوگئی تو ہم نے اس جھونپڑی میں پناہ لی۔ اب ہمیں کیا معلوم تھا کہ درندے تاک میں بیٹھے ہیں۔ نہ جانے مجھے کیوں بخش دیا۔ مجھے بھی مار ڈالتے۔ ہائے اب میں کہاں جاؤں۔ میرا تو دنیا میں کوئی نہیں۔'' اس کی سسکیوں کی آواز مجھے پاگل کیے دے رہی تھی۔ میں نے گھڑی دیکھی۔ نو بج گئے تھے۔ اس کے ساتھ یہاں ٹھہرنا خطرہ سے خالی نہیں تھا۔

میں نے اسے اپنے ساتھ کیمپ لے جانے کی ٹھانی۔ پولیس کو بھی فوراً اطلاع دینی تھی۔ میں اسے لے کر کیمپ کی طرف روانہ ہوا تو راستے میں وہ کانپنے لگی جیسے اسے سردی لگ رہی ہو۔ میں نے اپنا کوٹ اتار کر اسے دیا جسے اس نے شکریہ کے ساتھ لے لیا اور پہن لیا اور پھر وہ میرا ہاتھ تھامے چلنے لگی اور ایک بار پھر اس کی پراسرار بھینی بھینی خوشبو نے میرے دل اور دماغ پر جادو سا کردیا اور معاً مجھے یوں محسوس ہوا جیسے میں کوئی حسین

خواب دیکھ رہا ہوں...... یہ حسن، یہ صحت مند سڈول جسم، دھند میں لپٹا، یہ پراسرار ماحول...... یہ سب خوابوں ہی میں ممکن تھا۔

میں نے آج تک اس سے زیادہ حسین لڑکی نہیں دیکھی تھی۔ نہ برصغیر میں اور نہ یورپ میں جہاں جنگ عظیم کے دوران میں نے بڑی خاک چھانی تھی۔

چلتے چلتے تھک کر وہ کبھی کبھی دم لینے کے لئے رکتی اور پھر ٹھنڈی سانس لے کر میرے شانے سے سر ٹکا دیتی اور اس کے جسم کا پرکیف لطیف لمس مجھ میں بجلیاں سی بھر دیتا۔ وہ اس انجانے راستے پر عجیب طرح سے چل رہی تھی۔ جیسے پیدل چلنے کی عادی نہ ہو۔ قدم قدم پر مجھے اسے سہارا دینا پڑتا اور ہر بار یوں لگتا جیسے ضبط کا دامن مجھ سے چھوٹ جائے گا۔

خدا جانے کب تک میں اپنے خیالوں میں کھوئے کیمپ کی طرف چلتا رہا۔ زمان اور مکان کا احساس جاتا رہا تھا اور مجھے صرف یہ یاد تھا کہ ایک نہایت حسین ہم سفر میری حفاظت میں ہے۔

چلتے چلتے یکا یک وہ رک نہ جاتی اور میرے بازو پر اس کی گرفت مضبوط نہ ہو جاتی تو میں یوں ہی حسین خوابوں میں بھٹکتا رہتا۔ وہ جوں ہی رکی میں ہوش میں آ گیا۔

''ادھر دیکھئے۔'' اس نے گھبرا کر آہستہ سے کہا اور ایک اونچے پہاڑی ٹیلے کی طرف اشارہ کیا جو ہمارے دائیں طرف تھا۔ میں نے فوراً پستول نکال لیا اور غور سے دیکھا تو اس پر مجھے ایک سایہ نظر آیا۔ چونکہ چاند اس کی پشت پر تھا اس لئے مجھے اس کی شکل نظر نہیں آ رہی تھی۔

میں نے اس لڑکی کو آہستہ سے اپنے پیچھے کر لیا اور چیخ کر پوچھا۔ ''کون ہو تم اور یہاں کیا کر رہے ہو؟'' میری آواز اس ویرانے میں گونجی اور پھر تھرا کر فضا میں تحلیل ہو گئی۔ اس کے بعد ایک قہقہہ بلند ہوا۔ جیسے پہاڑی پر سے وہ شخص ہماری بے بسی کا مذاق اڑا رہا ہو۔ فوجی نقطہ نظر سے وہ ہم سے زیادہ بہتر مورچہ پر تھا اور ہم دونوں اس کی گولیوں کی زد میں تھے۔

میں نے ادھر ادھر بچاؤ کے لئے دیکھا تو مجھے اپنی بائیں طرف ایک بڑا ٹیلہ نظر آیا۔ وہاں تک کسی طرح پہنچ سکتے تو دشمن کا مقابلہ کیا جا سکتا تھا۔

''جلدی سے بھاگ چلئے۔'' لڑکی نے آہستہ سے کہا اور میرا ہاتھ پکڑ کر اپنی طرف گھسیٹا۔

''نہیں آہستہ آہستہ سرکتے ہوئے اس ٹیلے کی طرف چلو۔'' میں نے جواب دیا اور دشمن پر نظریں جمائے آہستہ آہستہ بائیں طرف ہٹنے لگا۔ لیکن اس سے پہلے کہ ہم وہاں تک پہنچ سکتے یکا یک اوپر سے گولیوں کی بوچھاڑ شروع ہو گئی۔ پہلی گولی اس لڑکی کے لگی اور وہ چیخ مار کر نیچے گری۔ مجھ پر گویا خون سوار ہو گیا اور میں نے بھی اندھا دھند گولیاں چلانی شروع کیں۔ اس کے پاس رائفل تھی اور میرے پاس پستول۔ مجھے بھی غالباً کئی گولیاں لگیں اور میں چند لمحوں کے بعد چکرا کر گرا اور مجھے یوں محسوس ہوا جیسے میں کسی گہرے سمندر میں ڈوب رہا ہوں۔ میرا بھاری جسم نیچے بہت نیچے خاموش، گہرائیوں کی طرف تیزی سے جا رہا ہے اور میں اس قدر بے بس ہوں کہ ہاتھ پاؤں مار ہی نہیں سکتا۔ اس کے بعد میں بے ہوش ہو گیا۔

جب مجھے ہوش آیا تو اس وقت بھی میں ویرانے ہی میں تھا۔ لیکن آسمان پر عین میرے سامنے چاند کی جگہ سورج جگمگا رہا تھا اور شاہد مجھے سہارا دے کر اٹھا رہا تھا۔

''ذرا احتیاط سے شاہد...... کئی گولیاں لگی ہیں!'' میں نے آہستہ سے کہا۔

''گولیاں؟ کہاں؟'' شاہد نے گھبرا کر پوچھا۔ پھر اس نے مجھے ادھر ادھر سے دیکھنے کے بعد کہا۔ ''ارے نہیں صاحب۔ آپ تو ماشاء اللہ بالکل فٹ ہیں۔ آپ کو تو خراش بھی نہیں آئی۔''

''کیا کہہ رہے ہو تم؟'' یہ کہتے ہوئے میں فوراً اٹھا اور دیکھا تو واقعی میرے ہاتھ پاؤں بالکل ٹھیک تھے۔ ''لیکن یہ کیسے ہو سکتا ہے؟ کل رات تو مجھ پر ان گنت گولیاں برسائی گئی تھیں۔'' یہ کہتے ہوئے یکا یک

مجھے اس لڑکی کا خیال آ گیا۔ ''وہ کہاں ہے......؟ وہ لڑکی؟'' میں نے پوچھا۔

''کون لڑکی......؟'' اب کے لیفٹیننٹ خالد نے پوچھا۔ ''یہاں تو دور دور تک کوئی لڑکی وڑکی نہیں ہے سر! مجھے تو شاہد نے شہر سے آ کر بتایا کہ آپ کل رات سے غائب ہیں۔ اس پر ہم سب آپ کی تلاش میں نکلے۔ گھنٹہ بھر کی تلاش کے بعد آپ ہمیں یہاں ملے۔''

''آپ تو یہاں ہاتھ کا تکیہ بنائے آرام سے سو رہے تھے!'' شاہد نے اطلاعاً کہا۔ اس کے لہجے سے لگ رہا تھا جیسے وہ خاصا پریشان ہو۔ ''آپ یہاں آئے ہی کیوں صاحب؟ کل جمعرات بھی تھی اور چاند کی چودہ تاریخ بھی!''

میں نے اس کا کوئی جواب نہیں دیا اور اٹھ کر اس پراسرار منحوس جھونپڑی کی تلاش میں گیا جہاں میں نے کل رات چار لاشیں دیکھی تھیں۔ خاصی دیر کے بعد ہمیں وہ جھونپڑی ملی لیکن وہاں نہ خون تھا اور نہ لاشیں تھیں یوں لگتا تھا جیسے برسہا برس تک یہاں سے کسی انسان کا گزر نہ ہو۔ لڑکی کا بھی کوئی پتہ نہیں تھا۔

اس دن زندگی میں پہلی بار مجھے اپنے ماتحت افسروں اور جوانوں کے سامنے خفت اٹھانی پڑی۔ ان لوگوں نے زبان سے کچھ نہیں کہا لیکن ان کی آنکھوں اور ہر ادا سے لگتا تھا جیسے انہیں یقین ہو کہ رات میں نے بہت پی لی تھی اور نشے میں دھت اس ویرانے میں نکل آیا تھا۔

اب میں انہیں کیسے بتاتا کہ واقعی میرے ساتھ کل رات بڑے عجیب واقعات پیش آئے تھے۔ اس کا ایک واضح ثبوت میرے کوٹ میں بسی ہوئی وہ عجیب سی خوشبو تھی جو اس پراسرار لڑکی نے استعمال کی تھی۔ مارے خفت کے میں نے ان سے کچھ نہیں کہا۔ میں نے کسی سے بھی کچھ نہیں کہا۔ آج اتنی مدت کے بعد پہلی بار تمہیں سنا رہا ہوں۔''

یہ کہتے ہوئے میں نے ایک اور سگریٹ سلگا کر ایک طویل کش لیا۔

''آج بھی تو چاند کی چودہ تاریخ ہے تمہیں وہ لڑکی یاد نہیں آ رہی ہے؟'' میری بیوی نے آہستہ سے پوچھا۔

''آج عرصے کے بعد واقعی یاد آ رہی ہے۔'' میں نے جواب دیا یہ کہتے ہوئے میں نے سر آرام دہ کرسی پر ٹکا دیا اور آنکھیں بند کر لیں۔ چند لمحے خاموشی چھائی رہی۔ پھر میں نے اپنی گرم پیشانی پر اپنی بیوی کا ہاتھ محسوس کیا۔ کس قدر سرد تھا اس کا ہاتھ۔ میں نے فوراً آنکھیں کھول دیں۔ روشنی اب تک گل تھی اور حسین چاندنی کی وجہ سے کمرہ میں دھندلا سا پھیل گیا تھا۔ میں نے دیکھا وہ عجیب نگاہوں سے مجھے دیکھ رہی تھی۔ ''کیا دیکھ رہی ہو؟'' میں نے آہستہ سے پوچھا۔

''دیکھ رہی ہوں تمہاری روح اس پراسرار لڑکی کے لئے کتنی بے چین ہے۔'' اس نے دھیمے لہجے میں جواب دیا۔

''شادی سے پہلے تو یقیناً تھی لیکن پھر کبھی نہیں ہوئی۔ اس واقعہ کے مہینے بھر بعد ہی تو تم ملیں اور پھر جلد ہماری شادی ہو گئی۔'' میں نے جواب دیا۔

''جھوٹ...... بالکل جھوٹ!'' وہ بولی۔ ''آج بھی تمہاری روح اس کے قرب کے لئے بے چین ہے۔ ہمیشہ یہ بے چین رہی ہے...... سچ سچ بتاؤ۔ کیا ایک بار پھر تم اسے اپنے قریب دیکھنا چاہتے ہو؟ انکار نہ کرو۔ لوگ کہتے ہیں کہ اگر لگن سچی ہو تو انسان کو وہ چیز ضرور ملتی ہے جس کی اس کو دیوانہ وار خواہش ہو۔ تم آنکھیں بند کر لو جانم...... اور صرف اس حسین، لڑکی کے بارے میں سوچو جس کے قرب نے تمہیں آج سے دس سال پہلے پاگل کر دیا تھا...... پل بھر کے بعد آنکھیں کھول کر دیکھو کہ تمہیں کیا ملتا ہے؟''

میری آنکھیں آپ ہی آپ بند ہو گئیں اور مجھے یوں لگا جیسے اس کی پراسرار آواز کہیں دور سے آ رہی ہو۔ یہ مجھے کیا ہو رہا تھا؟ میرے جذبات اور احساسات میرا ساتھ کیوں چھوڑ رہے تھے؟ یہ کیوں

محسوس ہو رہا تھا کہ میرے ہوش اور حواس کے ساتھ ساتھ میرے اعضاء بھی میرے قابو میں نہ رہے ہوں۔ جیسے میں کسی مقناطیسی قوت کے ہاتھوں بے بس ہو گیا ہوں۔

''اب آنکھیں کھولو جان من!'' میری بیوی نے سرگوشیوں میں کہا اور میں نے آنکھیں کھول دیں۔

''لیکن یہ کیا......؟ اوہ! میرے اللہ! یہ میں کیا دیکھ رہا ہوں؟

میرے سامنے مجھ سے بہت قریب جھکی ہوئی میری بیوی کی جگہ وہ پراسرار لڑکی کھڑی تھی اور بڑی پیار بھری نگاہوں سے مجھے دیکھ رہی تھی...... وہی گول چہرہ، بڑی بڑی آنکھیں اور جھکی جھکی پلکیں...... ستواں ناک، بھرے بھرے گال اور پیشانی پر وہی باغی لٹ۔

مجھے خاموش دیکھ کر وہ مسکرائی۔ ''یقین نہیں آرہا ہے؟ میں واقعی وہی لڑکی ہوں۔ صرف تمہیں حاصل کرنے کے لئے مجھے ایک اور لڑکی کے قالب میں تمہارے پاس آنا پڑا اور دس سال کی طویل جدائی برداشت کرنی پڑی۔ ہمارے رواج کی رو سے ہر دسویں سال ہم اپنی پیاس بجھا سکتے ہیں...... ہماری ملاقات کو آج پورے دس سال ہو گئے ہیں...... اب مجھے اس اجنبی قالب میں رہنے کی کوئی ضرورت باقی نہیں رہی...... اب دنیا کی کوئی طاقت مجھے تم سے دور نہیں رکھ سکتی۔ ہمارے اصلی ملاپ کی مبارک رات تو آج آئی ہے...... مجھے لپٹا لو میری جان!''

یہ کہتے ہوئے وہ جھکی اور خدا جانے کیوں میرے جسم میں کپکپاہٹ سی دوڑ گئی اور میں نے اس کی گرفت سے نکلنے کی کوشش کی تو مجھے یوں محسوس ہوا جیسے میں کسی لوہے کے شکنجے میں جکڑا ہوا ہوں۔ اس کا چہرہ آہستہ آہستہ میرے چہرے کے قریب سے قریب تر ہوتا گیا۔ لیکن جب اس کے ہونٹ میرے ہونٹوں کے بجائے میری گردن کی طرف بڑھے اور اس کے حسن کی جگہ ایک عجیب ڈراؤنے تاثر نے لے لی تو میں نے زور لگا کر آخری بار اس کی گرفت سے نکلنے کی کوشش کی لیکن بے سود اس کے بعد خدا جانے کیا ہوا کیونکہ میں غالباً دہشت سے بے ہوش ہو گیا تھا۔

جب ہوش آیا تو میں ہسپتال میں تھا اور میری گردن پر پٹیاں بندھی ہوئی تھیں۔ میں نے کروٹ لینے کی کوشش کی تو مجھے کرنل یونس نظر آئے۔ میرے عزیز دوست یونس، جو فوج میں ڈاکٹر تھے۔ مجھے ہوش میں دیکھ کر وہ میرے پاس آگئے۔ ''خدا کا شکر ہے کہ تم ہوش میں آگئے؟ کیسی طبیعت ہے؟'' انہوں نے پوچھا۔

''ٹھیک ہوں...... لیکن مجھے کیا ہوا تھا؟'' میں نے پوچھا۔

''ایک جنگلی بلی نے حملہ کیا تھا!'' جواب ملا۔

''جنگلی بلی؟'' میں نے حیرت سے پوچھا۔ ''اور حیدر آباد میں؟''

''ہاں بھئی۔ یہی تو ہم سب کو حیرت ہے۔ جب تمہارا ملازم تمہاری چیخیں سن کر وہاں پہنچا تو وہ خونخوار بلی تمہاری گردن سے لپٹی ہوئی تمہارا خون چوس رہی تھی!''

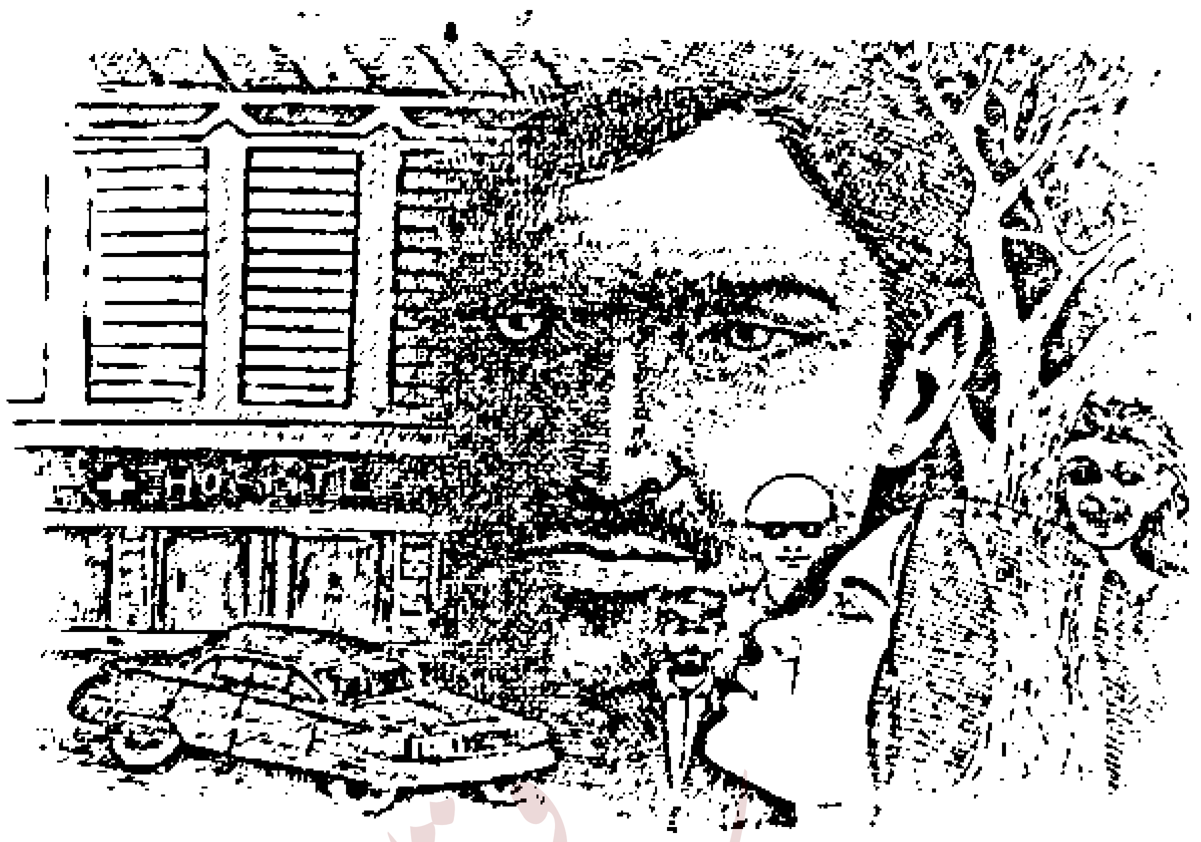
''خون چوس رہی تھی......؟ بلی؟؟؟'' میں نے یوں کہا جیسے اپنے آپ سے باتیں کر رہا ہوں۔

''ہاں بھئی...... ملازم نے اسے مار ڈالا ورنہ وہ اوروں کا بھی خون چوس لیتی...... تمہارا زخم بڑا گہرا تھا۔ پورے دس دن کے بعد ہوش میں آئے ہو!'' میرے قریب بیٹھ کر میری نبض دیکھتے ہوئے یونس نے جواب دیا۔

''وہ کہاں ہے؟ میری بیوی......؟'' میں نے آہستہ سے پوچھا۔ اس کا جواب یونس نے یہ دیا کہ ''وہ صدمہ سے بیمار ہے اور گھر پر آرام کر رہی ہے۔''

صحیح جواب تو مجھے ہفتہ بھر بعد ملا۔ میری بیوی اس رات ہی سے غائب تھی۔ پولیس اسے ڈھونڈ نکالنے میں ناکام رہی تھی۔





بھیانک رات

ایس امتیاز احمد - کراچی

اچانک اجنبی کی آواز گونجی۔ پہلے میں بیوقوفی کرتا تھا کہ ڈرا کر لوگوں کو چھوڑ دیتا تھا اور وہ دوسروں کو قصے سناتے پھرتے تھے مگر اب حکم ملا ہے کہ کسی انسان کو زندہ مت چھوڑو اور اتنا سننا تھا کہ

حوصلہ مند اور ہوش مند لوگوں کے لئے دل گرفتہ عجیب وغریب سبق آموز کہانی

وہ ایک سرد اور تاریک رات تھی۔ شام سے ہی خنکی بڑھنے لگی تھی اور ہوا میں تیزی آ گئی تھی۔ خشک پتے اڑ اڑ کر درختوں سے لپٹ رہے تھے۔ ہر چیز اندھیرے کی چادر میں لپٹی ہوئی تھی۔ ایسے میں ایک گھنے درخت کے نیچے سے ایک سایہ حرکت میں آیا۔ یہ سایہ کسی محفوظ ٹھکانے کی تلاش میں تھا۔ گھنے درختوں کے جھنڈ سے نکلتے ہی آسمان پر بجلی کڑکی اور پھر موسلا دھار بارش شروع ہو گئی تھی جس میں وہ بھیگنے لگا تھا۔ یہاں تک کہ جب وہ میدان میں آیا تو بری طرح بھیگ چکا تھا۔ سرد رات، بھیانک تاریکی، موسلا دھار بارش، سائیں سائیں کرتی ہوا، بادلوں کی گرج اور جنگل کا شور سب مل کر ماحول کو ایسے ہیبت ناک بنائے دے رہے تھے کہ انسان اپنے ہی دل کی دھڑکن سن کر ڈر جائے۔

اجنبی کی آنکھوں میں پریشانی کے سائے لہرانے لگے تھے، وہ چاروں طرف کسی ٹھکانے کی تلاش میں نظریں دوڑا رہا تھا کہ یکایک بجلی زور سے چمکی، اس نے خوفزدہ نظروں سے زمین کی طرف لپکتے ہوئے شعلے کو دیکھا اور پھر اچانک اس کی آنکھیں خوشی سے دمکنے لگیں۔ لمحہ بھر کی روشنی میں اسے دور ایک عمارت نظر آئی۔ وہ تیزی سے اس سمت دوڑنے لگا۔

تھوڑی دیر بعد اسے ایک عظیم الشان عمارت کے کھنڈر دکھائی دینے لگے۔ تاریک رات میں یہ کھنڈر کافی پراسرار نظر آ رہا تھا۔ "پراسرار حویلیوں کے بھوت، جنوں

کے ویران مسکن، پراسرار اور ویران جگہوں پر روحوں اور چڑیلوں کی موجودگی۔۔۔۔" یہ تمام خیالات اسے ڈرائے دے رہے تھے۔ کھنڈر کے پاس پہنچنے پر وہ اندر داخل ہونے کے بجائے وہیں رک کر اس کا جائزہ لینے لگا۔

یہ پرانے وقتوں کی کسی حویلی کے کھنڈر تھے جن کا بیشتر حصہ اب تباہ ہو چکا تھا۔ یہ حویلی دو منزلہ تھی جس کی نچلی منزل کے کچھ حصے تو اچھی حالت میں موجود تھے مگر اوپری منزل کی گری ہوئی دیواریں ملبے کے ڈھیر اور ان کے ساتھ لگے ہوئے ستونوں کے ٹکڑوں سے اندازہ لگانا مشکل تھا کہ یہ سب ملبے کے ڈھیر ہیں یا کوئی اصلی حالت میں بھی موجود ہے۔ حویلی کے اردگرد کبھی جنگل رہا ہوگا جس کے اب صرف آثار باقی تھے۔ اس کے اندر کچھ ٹنڈ منڈ سے ویران درخت تھے جابجا جنگلی جھاڑیاں اگی ہوئی تھیں اور زرد اور سیاہ پتے بکھرے پڑے تھے۔ درمیان میں ایک تالاب تھا جس میں اب بارش کا پانی جمع ہو رہا تھا۔ پانی پر سبز کائی کے ٹکڑے تیر رہے تھے۔ تالاب کے کناروں پر اور اردگرد بھی جگہ جگہ کائی پڑی تھی جو بارش سے پہلے یقیناً ایک دبیز تہہ کی صورت میں تالاب کے فرش پر موجود رہی ہوگی اور اب بارش سے صاف ہوتی جا رہی تھی۔ یہ تمام چیزیں ایک الف لیلوی ماحول پیدا کر رہی تھیں جن کی مناسبت سے خوفناک بلاؤں، بھوتوں اور روحوں کے ہیولے اس کے ذہن میں گردش کرنے لگے تھے اور وہ ابھی اندر جانے کی ہمت کر ہی رہا تھا کہ اسے ایک دھکا سا لگا اور وہ لڑکھڑا گیا۔

وہ تیزی سے پیچھے مڑا تو جنگل کی طرف سے آتے ہوئے تیز ہوا کے جھونکوں نے اسے ایک دفعہ پھر ہلا دیا، وہ کپکپا کر رہ گیا۔ حویلی کے اسرار میں کھو کر وہ اس بھیانک رات اور موسم کو بھول گیا تھا۔

آندھی کے آثار بہت واضح ہو چکے تھے اور اب وہ زیادہ دیر تک کھلے آسمان کے نیچے نہیں گزار سکتا تھا وہ ہمت کر کے آگے بڑھا اور حویلی میں داخل ہو گیا۔

داخلی دروازہ ٹوٹ کر گر چکا تھا۔ دو کمروں سے گزر کر وہ ایک ہال میں آ گیا، پتھروں سے بنی ہوئی چھت اور دیواریں اب سیاہ پڑ چکی تھیں۔ ہال کی مشرقی دیوار میں ایک آتش دان بنا ہوا تھا جس کے اندر اور اردگرد کافی تعداد میں سوکھی لکڑی پڑی ہوئی تھیں اور ساتھ ہی چقماق کے پتھر پڑے تھے۔ یوں لگتا تھا جیسے یہ حویلی پہلے بھی کسی کی پناہ گاہ ہو۔ اس نے اپنا بیگ جس میں کافی قیمتی سامان موجود تھا کاندھے سے اتار کر ایک کونے میں رکھا۔ لکڑیاں اور چقماق کے پتھر اٹھائے اور ہال کے وسط میں آگ روشن کر کے اس کے پاس بیٹھ گیا اور اپنے کپڑے خشک کرنے لگا۔

ابھی اسے بیٹھے ہوئے چند ہی لمحے گزرے تھے کہ دوڑتے قدموں کی آواز سنائی دی اور اس سے پہلے کہ وہ اٹھتا کمرے میں دو آدمی داخل ہوئے۔ وہ دونوں بھی اس طوفانی موسم سے پناہ تلاش کرتے ہوئے یہاں آ گئے تھے۔ اپنے سامنے دو انسانوں کو دیکھ کر اس کی جان میں جان آئی اس کے کہنے پر دونوں آدمیوں نے اپنا اپنا سامان اس کے سامان کے ساتھ ہی رکھ دیا اور آ کر اس کے ساتھ آگ کے گرد بیٹھ گئے۔ "میرا نام فرحان ہے اور میں ایک سیاح ہوں۔ ایک خوبصورت گاؤں میں شام گزارنے کے بعد وہاں سے چلا تو کر جنگل میں بھٹک گیا اور پھر اس آندھی سے بچنے کے لئے یہاں پناہ لے لی۔" اتنا کہہ کر وہ اپنے سامنے بیٹھے ہوئے آدمیوں کی طرف سوالیہ نگاہوں سے دیکھنے لگا۔

"میرا نام احسان ہے۔ میں ایک شکاری ہوں اور شکار کی تلاش میں جنگل میں گھوم رہا تھا کہ یکایک موسم خراب ہو گیا۔ میں کوئی جگہ سر چھپانے کی ڈھونڈ ہی رہا تھا کہ جنگل کے کنارے مجھے یہ شخص بھی پریشان حالت میں مل گیا اور یوں ہم دونوں بھٹکتے، بھٹکتے یہاں تک پہنچ گئے اور اس افراتفری میں ابھی تک ہمارا ایک دوسرے سے تعارف بھی نہیں ہوا" دونوں آدمیوں میں سے لمبے قد والا اتنا کہہ کر خاموش ہو گیا اور پستہ قد والے آدمی نے بولنا شروع کیا۔

"میں ایک ماہر آثار قدیمہ ہوں۔ میرا نام ذیشان ہے اور میں بہت پرانی تباہ شدہ بستی کو ڈھونڈتے ہوئے یہاں آ گیا تھا۔"

ابھی تینوں آگے کچھ کہنے کے لئے سوچ ہی رہے تھے کہ ایک کھٹکا سا ہوا۔ تینوں نے چونک کر دروازے کی طرف دیکھا وہاں ایک غیر معمولی طور پر لمبا چوڑا شخص کھڑا

تھا۔ اس کا چہرہ تمام جذبات سے عاری تھا۔ وہ بڑے
ذیشان کے ساتھ چلتا ہوا ان کے قریب آ گیا۔
"لو بھئی ایک مسافر اور آ گیا لگتا ہے آج خوب محفل
جمے گی اس ویرانے میں" احسان نے بڑی خوش دلی سے
مسکراتے ہوئے کہا فرحان اور ذیشان بھی مسکرا دیے مگر نووارد
کا چہرہ ویسا ہی سپاٹ تھا۔ وہ ان کے ساتھ ہی بیٹھ گیا۔ اپنا
بیگ کاندھے سے اتار کر اس نے اپنے پاس ہی رکھ لیا اور
الاؤ سے ہاتھ سینکنے لگا۔ اس کے خاموش رہنے پر پہلے
انہوں نے اپنا تعارف کروایا اور پھر اس کی طرف دیکھنے لگے۔
اس نے اپنی بلی جیسی چمکتی آنکھیں آگ کے الاؤ پر سے
ہٹائیں ایک طائرانہ نظر ان تینوں پر ڈالی اور بولا "میرا تعارف
کوئی اہمیت نہیں رکھتا، بلکہ یوں کہہ لیجئے کہ میری کوئی
شناخت ہی نہیں ہے۔ ایک آوارہ سا آدمی ہوں۔
اصل نام تو یاد ہی نہیں مگر لوگ مجھے "مرحوم" کہہ کر
پکارتے ہیں، اتنا کہہ کر اس نے ایک دفعہ پھر اپنی نگاہیں
آگ پر جما دیں۔
تینوں حیرت سے اسے دیکھنے لگے کتنا عجیب نام
تھا اور خود بھی کتنا عجیب تھا۔ ان سب کو وہ بہت پراسرار لگا۔
ذیشان جس کے بالکل ساتھ وہ اجنبی آ کر بیٹھ گیا
تھا اس کی ریڑھ کی ہڈی میں نجانے کیوں سنسناہٹ سی
ہونے لگی وہ کھسک کر تھوڑا دور ہو گیا۔
اسی وقت اچانک زوردار چیخ سنائی دی اور فضا میں
عجیب سی آوازیں بکھرنے لگیں۔ ہال کی کھڑکی کے دونوں
پٹ بری طرح آپس میں ٹکرائے اور ایک چمگادڑ چیختی ہوئی
کھڑکی سے باہر نکل گئی۔ وہ ایک لمحے کو کانپ سے گئے
سردی کا احساس کچھ زیادہ ہو گیا۔
"یہ آوازیں جنگلی جانوروں کی ہیں لگتا ہے آندھی
بہت زور پکڑ گئی ہے۔" احسان نے باہر کی آوازوں کو غور
سے سنتے ہوئے کہا۔
"اف توبہ کتنی بھیانک رات ہے۔" فرحان نے
ہاتھ آگ کے قریب لے جا کر مسلتے ہوئے کہا۔
"مگر آپ لوگوں کے لئے تو یہ کوئی بڑی بات نہیں
ہونی چاہئے" چوتھے مسافر کی آواز کمرے میں گونجی تو تینوں
حیرت سے اسے دیکھنے لگے۔
"میرا مطلب ہے ایک شکاری، ایک سیاح اور ایک
ماہر آثار قدیمہ، پھر آپ کی ڈھلتی ہوئی عمریں اور قیمتی سامان
وغیرہ سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ آپ لوگوں نے بہت دنیا دیکھی
ہوگی اور آپ کے ساتھ کئی دلچسپ اور خوفناک واقعات بھی
پیش آئے ہوں گے۔ خصوصاً چودہویں کی رات کے حوالے
سے جو ایسے خوفناک واقعات کے لئے مشہور بھی ہے۔
"ہاں یہ بات تو تمہاری درست ہے میری زندگی
بے شمار واقعات سے بھری پڑی ہے" ذیشان نے اس کی
بات سن کر فخر سے کہا۔
"بھئی اگر ایسی بات ہے تو پھر تو میں بھی آپ کو اسی
رات کے حوالے سے ایک ایسا خوفناک واقعہ سنا سکتا ہوں جو
یقیناً آپ لوگوں کے لئے دلچسپ ہوگا" فرحان نے کہا۔
"یہ ٹھیک رہے گا ہم سب باری باری اپنے ساتھ
پیش آیا ہوا کوئی واقعہ سناتے ہیں اس طرح وقت بھی دلچسپی
سے کٹ جائے گا اور اس بھیانک رات کا احساس بھی کم
ہوگا" فرحان کی تجویز کو سب نے سراہا اور یوں سب سے
پہلے فرحان نے بتانا شروع کیا۔
"یہ چند سال پہلے کی بات ہے یہاں سے کافی دور
ایک قصبہ ہے نوری آباد، میں چند دنوں کیلئے وہاں گیا تھا
وہاں کے لوگ اکثر ایک بہت ہی پرانے قبرستان کا ذکر
کرتے تھے جس کے ساتھ بہت سی پراسرار باتیں منسوب
تھیں۔ وہ درختوں کے ایک طویل سلسلے کی دوسری طرف تھا
مگر وہاں جانے کی کسی کی ہمت نہیں پڑتی تھی۔ لوگوں سے
سن کر مجھے تجسس ہوا اس کے بارے میں جاننے کا چنانچہ
میں نے وہاں جانے کا پروگرام بنا لیا۔ میرا ارادہ رات کے
وقت صرف باہر سے کھڑے ہو کر اس کا جائزہ لینے کا تھا۔
میں نے اپنا کیمرہ اور دوسرا سامان ساتھ رکھ لیا۔ اس رات
چودہویں کے چاند کی روشنی اچھی خاصی تھی۔
میں قبرستان کی طرف چل دیا۔ میں کافی دیر چلتا رہا
درختوں کا سلسلہ بھی ختم ہو گیا اور میدان میں جگہ جگہ جنگلی
جھاڑیاں اگی ہوئی تھیں، رنگ و روپ سے بے نیاز ٹنڈ منڈ
درخت کھڑے جھوم رہے تھے۔ ہر طرف ہو کا عالم تھا۔ فضا

میں ایک دہشت ناک سناٹا چھایا ہوا تھا۔ ہوا دھیرے دھیرے چل رہی تھی۔ درختوں کی کھوکھلی ٹہنیوں پر سے جب ہوا گزرتی تو ایک عجیب سی سنسناہٹ پیدا ہوتی جو سرسراتی ہوئی جنگلی گھاس اور جھاڑیوں کے ساتھ مل کر بڑا خوفناک تاثر دیتی اور ایسے میں کوئی الو دہشت کے عالم میں چیختا تو دل دہل جاتا۔ مجھ پر خوف طاری ہونے لگا تھا۔ میں آگے بڑھنے کا سوچ ہی رہا تھا کہ مجھ پر ایک نہایت ہی خوفناک انکشاف ہوا جس نے میرے رہے سہے ہوش بھی اڑا دیئے۔ میں جسے میدان سمجھ رہا تھا وہ دراصل قبرستان تھا۔ بہت وقت گزرنے کی وجہ سے قبریں زمین میں دھنس گئی تھیں۔ کتبے گر چکے تھے اور ان پر مٹی کی اتنی تہیں جم چکی تھیں کہ وہ مٹی کا حصہ معلوم ہوتے تھے۔ درخت بھی سب ویران ہو چکے تھے اور جنگلی گھاس اور جھاڑیوں نے زیادہ تر زمین کو چھپا رکھا تھا۔ ایسے میں سنگ مرمر کے ایک کتبے پر جس پر مٹی تو جمی ہوئی تھی مگر وہ گرا نہیں تھا بلکہ زمین میں گڑا ہوا تھا۔

نظر پڑتے ہی مجھ پر یہ انکشاف ہوا کہ میں اس وقت قبرستان کے وسط میں آدھی رات کے وقت اکیلا کھڑا ہوں۔ خوف کے مارے میں نے اندھا دھند بھاگنا شروع کر دیا مگر فوراً ہی مٹی میں چھپے ہوئے ایک کتبے سے ٹھوکر کھا کر زور سے فضا میں اچھلا تو زمین پر آ رہا۔ کچھ دیر میں یونہی پڑا رہا۔ پھر میں نے آنکھیں کھولیں تو ایک اور خوفناک انکشاف مجھ پر ہوا کہ میں اس وقت ایک قبر کے اندر گوشت پوست سے بے نیاز ہڈیوں کے ایک ڈھانچے کے اوپر لیٹا ہوا تھا۔

میرے اوسان خطا ہو گئے۔ حالت ایسی تھی کہ کاٹو تو بدن میں لہو نہیں۔ خوف اور سردی کے مارے سارا جسم برف کی طرح سرد ہو گیا اور خون رگوں میں منجمد ہوتا محسوس ہوا۔ میں نے اٹھنے کی کوشش کی تو ایک تیز چیخ میرے حلق سے نکل گئی۔ ڈھانچے کے بازو میری کمر کے گرد لپٹے ہوئے تھے ان کا حلقہ تنگ ہونے لگا اور باریک باریک انگلیاں کھال میں اترتی ہوئی محسوس ہوئیں۔ میرے جسم میں ٹیسیں اٹھنے لگیں۔ ایک تو اس روح فرسا دریافت نے مجھ پر دہشت طاری کر دی تھی اوپر سے اس نئی افتاد نے میری رہی سہی ہمت بھی ختم کر دی۔ میں نے خود کو ڈھیلا چھوڑ دیا اور بے سدھ پڑا رہا۔ اس وقت میں نے محسوس کیا قبر کے اندر آتی ہوئی چاند کی روشنی کم ہو رہی ہے۔ پتھر کی سل آہستہ آہستہ سرک رہی تھی اور قبر کا دہانہ بند ہو رہا تھا۔ میرے دماغ میں خطرے کی گھنٹیاں سی بجنے لگیں۔ یعنی میں زندہ قبر میں دفن ہو رہا تھا۔

میں نے آخری دفعہ تمام ہمت جمع کی اور پورا زور لگایا کڑ کڑ کی آواز کے ساتھ ڈھانچے کے بازو شانے کی ہڈیوں پر سے علیحدہ ہو گئے۔ میں تیزی سے کھڑا ہوا اور قبر کے اوپری حصے پر ہاتھ رکھتا ہوا اپنے پورے جسم کو باہر اچھال دیا۔ میرا جسم پتھر کی سل کے ساتھ رگڑ کھاتا ہوا باہر گر گیا۔ میرے باہر نکلتے ہی سل نے قبر کے منہ کو پوری طرح ڈھانپ لیا۔ یکا یک ہوا میں تیزی آ گئی، مٹی اور ریت اڑنے لگی میں نے قصبے کی طرف دوڑ لگا دی۔ مجھے پورا یقین تھا کہ صبح تک مٹی قبر کو چھپا دے گی اور میں دن کی روشنی میں بھی اسے دوبارہ نہیں ڈھونڈ سکوں گا۔ یہ میری زندگی کا ناقابل فراموش ترین واقعہ تھا جسے اب بھی یاد کر کے میں کانپ جاتا ہوں" فرحان نے اپنا واقعہ ختم کیا تو احسان صاحب اور ذیشان دم بخود بیٹھے تھے۔ واقعہ ختم ہونے پر اس کے خیال سے انہیں جھرجھری آ گئی۔ مگر چوتھا آدمی جس نے اپنا نام "مرحوم" بتایا تھا حیرت انگیز طور پر پرسکون تھا۔

اب ذیشان نے کہنا شروع کیا۔ "یہ ان دنوں کی بات ہے جب میں افریقہ میں تھا۔ میں ایک قدیم عمارت کے کھنڈر کی تلاش میں تھا جس میں میری معلومات کے مطابق بہت بڑا خزانہ دفن تھا مگر اب تک کوئی اسے ڈھونڈ نہیں سکا تھا۔ بہت عرصے تک مارے مارے پھرنے کے بعد ایک دن اچانک ہی ایک قبائلی آدمی نے مجھے وہاں تک کا راستہ تو بتا دیا مگر ساتھ چلنے پر رضامند نہ ہوا۔ میں اکیلا ہی روانہ ہو گیا۔ وہ عمارت بہت زیادہ گھنے درختوں کے جھنڈ میں چھپی ہوئی تھی۔ جس تک پہنچنے کا واحد راستہ ایک پتلی سی پگڈنڈی تھی جو دونوں طرف سے دلدلی زمین میں گھری ہوئی تھی۔ بڑی دقتوں کے بعد میں آخر کار اس عمارت تک پہنچنے میں کامیاب ہو گیا۔ وہ ایک چھوٹی سی عمارت تھی جو کہ اب کھنڈر میں تبدیل ہو چکی تھی اس کا درمیانہ بڑا گنبد کافی حد تک سلامت تھا۔ اس میں جگہ جگہ شگاف تھے مگر وہ ابھی

اب عمارت کی شکستہ دیواروں پر ٹکا ہوا تھا وہاں تک پہنچتے سورج تو ویسے ہی غروب ہو چکا تھا اور درختوں کے ہونے کی وجہ سے چاند بھی اسے منور کرنے میں ناکام تھا۔

میں نے قبائلی آدمی کی دی ہوئی مشعل جلائی اور صدر دروازے سے عمارت کے اندر داخل ہو گیا اور وہاں تو وہاں موجود تھا البتہ ایک خلا سا تھا۔ اندر کا ماحول بڑا وحشت ناک تھا جگہ جگہ مکڑی کے قد آدم جالے لگے ہوئے تھے۔ چھت کے ساتھ کئی چمگادڑیں الٹی لٹکی ہوئی تھیں۔ فرش پر بے شمار حشرات الارض اور چوہے ادھر ادھر رینگ رہے تھے پھر مشعل کی روشنی میں یہ عام چیزیں اور خوفناک لگ رہی تھیں اوپر سے فضا پر چھایا ہوا مہیب اعصاب شکن سناٹا میرے حواس پر طاری ہو رہا تھا مجھے وحشت سی ہونے لگی۔ ایک انجانا سا خوف محسوس ہوا میرا دل چاہا کہ واپس لوٹ جاؤں مگر اتنی مشکلوں کے بعد یہاں تک پہنچنے کے بعد یوں میں واپس نہیں جا سکتا تھا میں ہمت کر کے آگے بڑھا اور کمرے سے نکل کر ملحقہ راہداری میں آ گیا۔ راہداری کے دونوں طرف کمرے تھے۔

میں ابھی چند قدم ہی آگے بڑھا ہوں گا کہ ایک تیز گونجتی ہوئی چیخ میری سماعت سے ٹکرائی۔ میں ٹھٹھک کر رہ گیا۔ چیخ کہیں آس پاس سے ہی آئی تھی مگر راہداری بالکل خالی تھی۔ ابھی چیخ کی بازگشت بھی ختم نہ ہوئی تھی کہ ایک اور لرزہ خیز چیخ فضا میں بلند ہوئی اور پھر تو اوپر تلے چیخوں کا ایک نہ رکنے والا سلسلہ شروع ہو گیا یوں محسوس ہوتا تھا جیسے عمارت کے در و دیوار لرزنے لگے ہوں میں خود یوں کانپنے لگا جیسے میرا سارا وجود زلزلے کے جھٹکوں کی زد میں ہو، میں ہراساں ہو کر واپس بھاگنے ہی والا تھا کہ

اچانک میری نظر ایک کمرے کے اندر پڑے ہوئے لمبے چوڑے صندوق پر پڑی۔ "خزانہ" میرے دماغ میں چھناکا سا ہوا اور میں ہر چیز کو بھول کر کمرے میں داخل ہو گیا۔

صندوق کا زنگ خوردہ قفل ٹوٹ کر پہلے ہی نیچے گر چکا تھا۔ میں نے پوری طاقت صرف کر کے صندوق کا ڈھکنا اٹھایا۔ جیسے ہی صندوق کھلا ایک دم تمام شور ختم ہو گیا اور فضا پر ایک دفعہ پھر مکمل خاموشی چھا گئی۔ اندر نظر پڑتے ہی میری نظریں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں صندوق لبالب قدیم اور قیمتی جواہرات اور سونے کی اشرفیوں سے بھرا ہوا تھا۔

ابھی میں غیر یقینی کے عالم میں یہ خزانہ دیکھ ہی رہا تھا کہ وہ منظر میری نظروں نے دیکھا جو کہ اب بھی نگاہوں کے آگے آ جائے تو رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ میرے سامنے یکایک تمام ہیرے جواہرات اور اشرفیاں اوپر اٹھیں اور فضا میں بکھر گئیں اور ایک دیو ہیکل انسان صندوق میں سے اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔

اُف توبہ۔۔۔ اتنا خوفناک چہرہ میں نے کبھی نہیں دیکھا۔ اس کا رنگ توے کی طرح سیاہ تھا۔ آنکھوں سے سرخ چنگاریاں پھوٹتی محسوس ہو رہی تھیں۔ اس کی زبان سختی سے بھینچے ہوئے جبڑوں کے درمیان پھنسی ہوئی تھی۔ اس کے ہاتھ میں دو دھاری تلوار تھی اور اس کے کپڑوں پر ایک مخصوص نشان بنا ہوا تھا جو قدیم افریقی بادشاہوں کے محافظوں کے لباس پر بنا ہوتا تھا۔ وہ بڑی غضب ناک نگاہوں سے مجھے گھور رہا تھا۔ یہ منظر دیکھ کر سردی کے باوجود میں پسینے میں نہا گیا۔

پورے جسم پر جیسے چیونٹیاں سی رینگنے لگیں خون رگوں میں جمنے لگا اور چہرہ روئی کے گالے کی طرح سفید ہو گیا۔ ایک لمحے کو تو مجھے لگا کہ میرا دل دھڑکنا بھول گیا ہے پھر اچانک جیسے مجھے ہوش آ گیا اور میں الٹے پاؤں واپس بھاگا۔ مجھے نہیں معلوم کہ میں کس طرح گرتا پڑتا اپنے کیمپ تک پہنچا مگر اسی وقت میں وہاں سے اپنا خیمہ اکھڑوا دیا اور پھر شہر پہنچ کر ہی دم لیا۔ چودھویں کی وہ رات مجھے ہمیشہ یاد رہے گی۔"

ذیشان خاموش ہوا تو فرحان اور احسان احمد یوں بیٹھے ہوئے تھے جیسے ان پر سحر ہو گیا ہو مگر چوتھا مسافر اب بھی ویسا ہی نارمل تھا۔

احسان احمد نے کہنا شروع کیا۔ "آپ دونوں حضرات نے دل ہلا دینے والے واقعات سنائے ہیں ایسا کوئی واقعہ میری زندگی میں پیش نہیں آیا البتہ ایک ایسا واقعہ میرے ساتھ پیش آیا تھا جس نے کم از کم مجھے خوف زدہ کر دیا تھا اور وہ رات بھی چودھویں کی ہی تھی، میں ایک درخت کے مچان پر بیٹھا تھا، سامنے ایک درخت کے نیچے

میں نے ایک بکری باندھی تھی اور شیر کے شکار کے لئے گھات لگائے بیٹھا تھا میں بدستور بکری کی طرف دیکھ رہا تھا یکدم پلک جھپکتے ہی بکری نظروں سے اوجھل ہوگئی۔

میں نے آنکھیں مل کر دیکھا تو بکری کے بجائے شیر کھڑا تھا، میری ریڑھ کی ہڈی میں سنسناہٹ دوڑ گئی۔ میں نے اپنے جسم میں چٹکی بھی بھری اور خوب آنکھیں مل مل کر دیکھا مگر سامنے شیر ہی کھڑا تھا اور بکری غائب تھی۔ میرے جسم کے مساموں سے ٹھنڈا پسینہ پھوٹ نکلا اور سارا جسم کپکپانے لگا۔ میرے ہاتھوں میں بندوق لرزنے لگی اور یکدم پھسل کر نیچے گر گئی، میں بوکھلاہٹ میں نیچے کی طرف جھکا اور خود بھی توازن برقرار نہ رکھ سکا اور نیچے آرہا۔

شیر اپنی انگارہ سی دہکتی آنکھوں سے گھورتا ہوا میری طرف بڑھا۔ مجھے اپنا انجام نکلتا ہوا محسوس ہوا۔

میں باوجود کوشش کے جنبش بھی نہ کر سکا، شیر جیسے ہی میرے پاس پہنچا، یکا یک فضا انجانے قہقہوں سے گونج اٹھی اور شیر دیکھتے ہی دیکھتے دھوئیں میں تبدیل ہوگیا۔ تھوڑی دیر بعد ہی آوازیں تھم سی گئیں اور بکری مجھے پھر درخت سے بندھی نظر آنے لگی۔ اس کے بعد ساری رات خیر وعافیت سے گزری مگر وہ لمحات میری زندگی کے سب سے خوفناک لمحات تھے۔

میرا خیال ہے کہ وہ کوئی بدروح یا جن تھا جو مجھے پریشان کر رہا تھا۔ احسان احمد نے بات ختم کی تو تینوں چوتھے مسافر کی طرف دیکھنے لگے۔

باہر اب بارش تھم چکی تھی اور آندھی کا زور بھی کم ہوگیا تھا چوتھے مسافر نے آگ پر سے نظر ہٹائیں اور ان تینوں کی طرف دیکھتے ہوئے بولنا شروع کیا "میری زندگی میں ایسے بے شمار خوفناک واقعات ہیں اور میں اس دوران بہت سے لوگوں سے ملا ہوں مگر چونکہ اس وقت آپ تینوں یہاں پر موجود ہیں تو اس لئے آپ کے حوالے سے بات کرتا ہوں۔ دراصل اتفاقاً میں بھی ہمیشہ چودھویں کی رات کو ہی اپنی دنیا سے باہر نکلتا ہوں۔"

"اپنی دنیا کیا مطلب؟" تینوں کے منہ سے ایک ساتھ حیرت کے مارے نکلا۔

"اگر آپ لوگ خاموشی سے سنیں تو میں سناؤں؟"

اس نے شعلہ بار نگاہوں سے تینوں کو گھورا تو جیسے تینوں کی زبانوں کو تالے لگ گئے، انہیں اپنے جسم میں سنسناہٹ سی محسوس ہوئی اس نے دوبارہ کہنا شروع کیا۔ "ایسی ہی ایک چودھویں کی رات تھی جب میری ملاقات فرحان صاحب سے ہوئی تھی، جب میں ایک قبر میں ڈھانچے کی شکل میں آرام کر رہا تھا۔ ہاں شیر اور بکری کا بھیس بدلنے میں تو مجھے اتنا لطف نہیں آیا تھا مگر مردے کی صورت میں ذیشان صاحب سے ملاقات خوب کی۔ اس کے بعد میں آج آپ انسانوں کی دنیا میں آیا ہوں" یہ کہہ کر وہ ایک لمحے کے لئے رکا، مدمقابل بیٹھے ہوئے تینوں اشخاص کی حالت غیر ہو چکی تھی۔ اس کے حلیے، پراسرار انداز اور باتوں سے انہیں پہلا یقین ہو چکا تھا کہ وہ کوئی انسان نہیں ہے اس احساس سے ان کے چہرے بالکل فق ہو گئے تھے اور پورا وجود کپکپا رہا تھا مگر اپنی جگہ سے ہلنے کی ہمت نہیں ہو رہی تھی۔

اس نے اپنی بات جاری رکھتے ہوئے کہا "پہلے میں بیوقوفی کرتا تھا کہ ڈرا کر لوگوں کو چھوڑ دیتا تھا اور وہ دوسروں کو قصے سناتے پھرتے تھے مگر اب حکم ملا ہے کہ کسی انسان کو زندہ مت چھوڑو" اس نے ابھی اتنا ہی کہا تھا کہ وہ تینوں حضرات یوں اٹھے جیسے یکدم جسم میں بجلی بھر گئی ہو۔ ان کے اور سامان کے درمیان وہ پراسرار اجنبی حائل تھا اور کسی میں اتنی ہمت نہ تھی کہ سامان کی طرف بڑھتا۔

اجنبی کے کھڑے ہونے سے پہلے وہ تینوں بجلی کی رفتار سے بھاگتے ہوئے حویلی سے باہر نکل کر کافی دور جا چکے تھے۔ ان کے جانے کے بعد اجنبی کے چہرے پر ایک شیطانی مسکراہٹ پھیلنے لگی اس نے زوردار قہقہہ لگایا اور سامان کا جائزہ لیتے ہوئے بڑبڑانے لگا "واہ میاں ٹھگ چھوٹے موٹے ہاتھ دکھاتے ہوئے آج اس ویرانے میں اتنا بڑا ہاتھ مار لیا۔" اس نے تیزی سے سامان جمع کر کے ایک چادر میں باندھا۔ "اب مجھے جلدی سامان لے کر یہاں سے نکل جانا چاہئے" اس نے سوچا اور تیزی سے دروازے سے نکل کر بھاگ کھڑا ہوا۔





موت کا تعاقب

ایس امتیاز احمد-کراچی

ایک اندیکھی حیرتناک اور خوفناک قوت جو کہ اس کا تعاقب کررہی تھی پتھریلی زمین پر کسی کی پراسرار سرسراہٹ اسے صاف سنائی دے رہی تھی لیکن پھر.....

قدم قدم پرلرزاں براندام کرتی رگوں میں خون منجمد کرتی ......حیرت ناک......کہانی

عظیم سائنسدان کنارڈ کولوگ اس لئے خبطی سمجھتے تھے کہ اس نے شہر کے خوب صورت علاقے کو چھوڑ کر بھیانک جنگل میں رہنا پسند کیا تھا۔ عوام کے لئے یہ امر تعجب خیز تھا مگر کنارڈ اور اس کے نائب ڈاکٹر اس کی نرگس یہ بات اچھی طرح جانتے تھے کہ ان کے تجربات کے لئے تنہائی اور سکون کتنا اہم ہے۔ ڈاکٹر کنارڈ دراصل کیمیا بنانے کا خواب دیکھ رہا تھا اور اس کا یہ خواب اب شرمندہ تعبیر ہوا ہی چاہتا تھا اپنی زندگی کے تیس سال اس نے نت نئے فارمولے بنانے اور تجربہ کرنے میں ضائع کردیئے تھے اس کی محنت کا پھل اب ملنے والا تھا اور اس کا یہ تجربہ آخری مراحل میں تھا۔

اپنے محنتی رفیق کار ڈاکٹر اس کی نرگس کو اس نے ایک کاغذ دکھاتے ہوئے کہا۔ ''اس کی نرگس یہ ہے میری محنتوں کا پھل۔ اب دنیا کی کوئی بھی شے ٹھوس سونے میں تبدیل ہو سکتی ہے۔ اب ہمارا ملک دنیا کا امیر ترین ملک بن سکتا ہے۔''

ایک وسیع وعریض میز پر سائنسی آلات بڑی خوب صورتی کے ساتھ سجے ہوئے تھے۔ اسپرٹ لیمپ کے اوپر ایک بہت بڑا شیشے کا برتن رکھا ہوا تھا اور اس برتن میں گہرے سرخ رنگ کی کوئی رقیق شے ابل رہی تھی مختلف گیسوں کے مرتبانوں میں سے لاتعداد شیشے کی نلکیاں نکل کر اس برتن میں پہنچ رہی تھیں۔ ڈاکٹر کنارڈ نے تمام اشیاء کو بہ نظر تحسین دیکھا اور پھر بولا۔

''مجھے ایک ضروری کام یاد آگیا ہے۔ میں چاہتا

ہوں کہ تم اتنے میں اس تجربہ کی دیکھ بھال کرو میں ایک گھنٹہ بعد واپس آ کر اسے پایہ تکمیل تک پہنچاؤں گا۔"

"ہاں ..... اس کاغذ میں وہی آخری مراحل درج ہیں۔ بہتر ہے آپ جا سکتے ہیں۔" اس کی نر نے نہایت ادب سے کہا۔

ڈاکٹر کنارڈ کو گئے ہوئے کافی عرصہ ہو گیا مگر وہ واپس نہیں آیا۔ خدا جانے کے کیا بات ہوئی؟ تجربہ چونکہ آخری مراحل میں تھا اس لئے اس کی نر نے مجبور ہو کر خود ہی اسے تکمیل تک پہنچانا شروع کر دیا۔ اس کی خوش قسمتی سے ڈاکٹر کنارڈ آخری فارمولے والا کاغذ وہیں بھول گیا تھا اس لئے اس کی نر نے اس فارمولے کی مدد سے اپنا کام شروع کر دیا۔

ڈاکٹر کنارڈ کا یہ تجربہ اس کی روانگی سے تقریباً پانچ گھنٹے بعد شروع ہوا۔ اس کی نر نے اپنی بھرپور کوشش کر لی۔ وہ چاہتا تھا جو کچھ بھی ہونا ہے جلدی ہو جائے مگر تجربہ مکمل ہونے میں ابھی کئی دن درکار تھے۔ فطرتاً وہ جلدی پسند تھا اس لئے یہ طویل مدت اسے کھل رہی تھی۔ لیکن یہ کوئی معمولی تجربہ تو تھا نہیں کیمیا بنانے کا معاملہ تھا اس لئے اسے صبر کرنا ہی پڑا۔

ڈاکٹر کنارڈ کا اس نے دو دن تک انتظار کیا مگر جب وہ واپس ہی نہ آیا تو اس کی نر نے سوچ لیا کہ وہ جان بوجھ کر کہیں لاپتہ ہو گیا ہے اور شاید اس کی وجہ محض یہ ہو کہ وہ اس کی نر کے ذریعے ہی اس تجربہ کی تکمیل کا خواہشمند ہو!

بڑی بھیانک اور خوفناک رات تھی سفیدے کے لمبے لمبے درخت ڈاکٹر کنارڈ کے مکان کے باہر کفن پوش لاشوں کی طرح کھڑے ہوئے تھے۔ ہوائیں درختوں کے سوکھے پتوں پر چیختی چلاتی پھر رہی تھیں۔ زمین پر پتوں کی پراسرار سرسراہٹ سے روحوں کے چلنے کا گمان ہوتا تھا۔ ڈاکٹر اس کی نر مکان کے اندر کھڑا ہوا، کھڑکی سے باہر نظر آنے والے اس بھیانک منظر کو دیکھ رہا تھا۔ کھڑکی کے شیشوں پر ایک چمگادڑ اپنے پر پھیلائے بار بار اندر داخل ہونے کی کوشش کر رہی تھی۔ اور ارواح خبیثہ کا اس کی نر قائل نہیں تھا لیکن اندھیرے سے اسے ضرور دہشت ہوتی تھی کھڑکی سے باہر دور تک سیاہ دھند چھائی ہوئی تھی اور اس دھند میں لپٹی ہوئی اشیاء بڑی ہیبت ناک اور بھیانک نظر آ رہی تھیں۔

اس کی نر اپنی توجہ ان خیالات اور دہشت ناک ماحول سے ہٹانے کی کوشش کرتے ہوئے پھر سے کام میں مصروف ہو گیا! کسی شیشی میں سے ایک ارغوانی محلول اس نے ٹیسٹ ٹیوب میں نکالا اور پھر شیشے کے بڑے برتن کی طرف بڑھا۔

اچانک اسے یوں لگا جیسے کوئی کمرے میں ہے۔ ایک ہیبت ناک سرسراہٹ، پراسرار سرگوشی اسے صاف سنائی دے رہی تھی۔ گھبرا کر وہ پلٹا اور پھر چلایا۔

"کون ہے..... کون ہے کمرے کے اندر؟"

لیکن کمرے میں کوئی نہیں تھا۔ اس کی نر دل ہی دل میں ہنسا کہ ناحق ڈر ا جا رہا ہے۔ چونکہ وہ دن رات کام میں مصروف رہا ہے اس لئے تھکاوٹ کے باعث الٹے سیدھے خیالات اس کے دماغ میں آ رہے ہیں۔ یہ سوچ کر وہ دوبارہ کام میں مصروف ہو گیا۔ ٹیسٹ ٹیوب کا محلول برتن میں ڈالتے وقت اس کے ہاتھ کپکپا رہے تھے۔ اس کا دل کہہ رہا تھا کہ کچھ نہ کچھ ہونے والا ہے۔ اپنے پراگندہ خیالات کو اس نے ایک مرکز پر پھر سے جمع کیا اور محلول کو شیشے کی نلکی سے ہلانے لگا۔

یکایک وہی سرسراہٹ اسے پھر سنائی دی۔ اس کے کان کھڑے ہو گئے۔ قوت سامعہ تیز ہو گئی اور پھر جو کچھ اس نے دیکھا وہ اسے حواس باختہ کر دینے کے لئے کافی تھا۔ اس نے دیکھا کہ ایک سفید رنگ کا لمبا سا سانپ تجربے کی میز پر رینگتا ہوا آیا اور اپنا پھن اٹھا کر کھڑا ہو گیا۔ اس کی لمبی اور پتلی زبان بار بار شعلے کی طرح باہر لپک رہی تھی اس کی مسحور کن آنکھوں سے اس کی نر سحر زدہ ہو گیا۔ وہ ٹکٹکی باندھے اسے دیکھتا رہا۔

سانپ آہستہ آہستہ اس کی طرف آیا تھا۔ جب وہ بہت قریب آ گیا تو اس کی نر چونکا اور پھر اس نے ایک زوردار ہاتھ مار کر اسے نیچے پھینک دیا۔ اسی پر بس نہ کر کے اس نے سانپ کو اپنے لمبے بوٹ سے کچلنے کی کوشش بھی کی مگر

اچانک وہ سانپ غائب ہوگیا۔ پھر اس کی نر نے میزوں، کرسیوں اور چھوٹے بڑے سوراخوں میں ہر جگہ تلاش کر لیا۔ مگر سانپ کو نہ ملنا تھا نہ ملا۔

کچھ دیر تک وہ خاموش بیٹھ کر ان باتوں پر غور کرتا رہا۔ اس کے خیال میں یہ ایک اتفاقی بات تھی کہ سانپ اندر آ گیا تھا۔ اور اس طرح پھن اٹھا کر اس کے سامنے بیٹھ گیا تھا۔ اچانک اسے خیال آیا کہ سانپ عموماً دولت یا خزانوں کی رکھوالی کیا کرتے ہیں۔ کیا ایسا تو نہیں کہ رقیق مادہ ٹھوس سونے میں تبدیل ہونے والا ہو۔ اور سانپ کو پہلے ہی اس کی خبر لگ گئی ہو۔ اس لئے وہ دولت کی نگہبانی کرنے آ گیا ہو!

بہر حال کچھ بھی ہو۔ اب اسے کام کی رفتار تیز کر دینی چاہیے۔ یہ سوچ کر اس نے جلدی سے فارمولے کے مطابق دی ہوئی ادویات کے شیلف میں سے ایک خاص محلول نکالنا چاہا۔ لیکن جیسے ہی اس نے مناسب مقدار میں وہ محلول برتن میں ڈالنا چاہا، اچانک ایک زبردست آواز ہوئی اور برتن میں جھاگ ہی جھاگ اٹھنے لگے۔ یہ جھاگ برتن سے کئی فٹ بلند ہو گئے۔ ان جھاگوں کے باعث مادہ نیچے گرنے لگا۔

اس کی نر کی سمجھ میں کچھ نہ آیا۔ اس کے خیال کے مطابق تو ایسا نہیں ہونا چاہیے تھا۔ پھر یقیناً کہیں غلطی ہوئی تھی۔ وہ دوبارہ شیلف کے پاس جا کر ادویات کی شیشیوں کو پرکھنے لگا۔ مگر یہ کیا؟ جو محلول اسے درحقیقت برتن میں ڈالنا چاہیے تھا وہ تو شیلف میں ہی رکھا ہوا تھا اور اس نے غلطی سے دوسری شیشی اٹھائی تھی! لیکن ایسا کیوں ہوا، کیا اس کے ہاتھ غلط شیشی اٹھا سکتے تھے؟

اس نے پھر یہی سوچا کہ یقیناً یہ سب کام کی زیادتی کے باعث ہوا ہے، وہ اتنی محنت کر رہا ہے کہ اس کے حواس قابو میں نہیں رہے اور وہ غلط سلط باتیں سوچنے لگا ہے بہتر یہی ہے کہ رات کو خوب اچھی نیند لی جائے اور پھر صبح تازہ دم ہو کر کام میں جت جائے اپنا یہ خیال جب اسے بالکل درست معلوم ہوا تو وہ فوراً ہی بستر پر دراز ہو گیا احتیاطاً اس نے سب کھڑکیاں بند کر لیں اور بستر کو اچھی طرح جھاڑ جھٹک کر دیکھ لیا کہ وہ سفید سانپ تو وہاں پہلے سے نہیں آ گیا اور پھر یہ دیکھ کر اس نے اطمینان کا لمبا سانس لیا کہ ایسا نہیں ہے۔

سانپ تو کیا وہاں ایک معمولی سا کیڑا بھی نہیں آ سکتا۔ راستے بند ہیں۔ کھڑکیاں بند ہیں اور فرش بھی پکا ہے، پھر بھلا سانپ کا وہاں کیا کام؟

رات کا آخری وقت تھا جبکہ ایک پراسرار اور بھیانک سرسراہٹ سے اس کی آنکھ کھل گئی۔ شاید یہ اس کا وہم تھا یا پھر حقیقت تھی کہ اسے یوں محسوس ہو رہا تھا گویا کوئی غیر مرئی قوت اس کمرے میں موجود ہے۔ وہ اسے دیکھ تو نہیں سکتا البتہ محسوس کر سکتا ہے۔ مگر یہ کون ہے جو اس کے تجربے اور آرام میں خلل انداز ہو رہا ہے؟ تکیئے کے نیچے رکھا ہوا اپنا پستول نکال کر وہ آہستہ سے کھڑا ہوا اندھیرے میں آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھنے کی بے سود کوشش کرنے کے بعد وہ دبے دبے پاؤں رکھتا ہوا فرش پر چلنے لگا۔

کمرے میں دہشت ناک خاموشی کا تسلط تھا۔ اندھیرا ویسے بھی اسے ناپسند تھا اور پھر اس دن کا اندھیرا خدا کی پناہ...... یوں لگتا تھا جیسے تاریکی نے ہر شے کو نگل لیا ہے، اندھیرے میں اسے کچھ ہیولے چلتے پھرتے نظر آ رہے تھے۔ اس نے اپنی آنکھیں ملیں اور غور سے ان ہیولوں کو دیکھا۔ وہاں کوئی بھی نہیں تھا، اسے یقین ہو گیا کہ یہ سب اس کا وہم ہے۔ اندھیرے کا خوف چونکہ شروع ہی سے اس پر حاوی تھا۔ اس لئے اوٹ پٹانگ خیالات نے اسے پریشان کر رکھا تھا۔ پستول واپس اس نے بستر پر پھینک دیا اور پھر دوبارہ لیٹنے کا ارادہ کر ہی رہا تھا کہ وہی پراسرار سرسراہٹ پھر سنائی دی۔ اس آواز کے ساتھ ہی اچانک نارنجی رنگ کی روشنی بھی دوسرے کمرے میں پیدا ہوتی ہوئی دکھائی دی۔

اسے بڑا تعجب ہوا...... یہ روشنی کیسی ہے؟ اس نے تو کمرے کی ساری بتیاں بجھا دی تھیں...... پھر یہ روشنی وہ تیزی کے ساتھ دوڑتا ہوا اس کمرے میں پہنچا اور جو کچھ اس نے وہاں دیکھا وہ اسے حیران کر دینے کے لئے کافی تھا۔

اس نے دیکھا کہ تجربے کی بڑی میز پر بڑے

برتن کے عین نیچے سپرٹ لیمپ روشن ہے اور برتن میں پڑا ہوا رقیق مادہ گرم ہونے کے بعد ابلنے لگا ہے چونکہ اسے ایک خاص مقدار میں ہی گرمی پہنچائی جاتی تھی اس لئے اب اتنی زیادہ گرمی پاکر ایک طرح سے اس کے عظیم تجربے کا ستیاناس ہوگیا تھا جلدی سے آگے بڑھ کر اس نے اسپرٹ لیمپ کو بجھا دیا اور پھر یاد کرنے لگا کہ یہ غلطی اس کی ہے جہاں تک اسے یاد ہے سونے سے پہلے اس نے اسپرٹ لیمپ بجھا دیا تھا۔

کرسی پر وہ اپنا سر پکڑ کر بیٹھ گیا اور کافی دیر کے غور و خوض کے بعد اس نے جھنجلا کر کرسی کے دستے پر مکہ مارا اور پھر فوراً کھڑا ہوگیا اب اسے پکا یقین تھا کہ رات کے آغاز میں اس نے برنر بند کردیا تھا پھر آخر وہ کون ہے جس نے برنر دوبارہ کھول کر اس کی شب و روز کی محنت کو نقصان پہنچایا ہے! میز کے قریب جاکر اس نے غور سے دیکھا تو اس کی آنکھیں خوف کے باعث پھٹی کی پھٹی رہ گئیں میز پر جمی ہوئی خاک پر ایک سانپ کے رینگنے کے نشان صاف نظر آرہے تھے!

دہشت کی ایک تھرتھری اس کے جسم میں پیدا ہوئی اور اس نے دانت پر دانت جما کر جیسے خود سے کہا۔

''میں اب سمجھ گیا کہ یہ سب کیا ہے۔ مگر میں بالکل نہیں ڈرتا خواہ کچھ بھی ہو جائے میں اپنا تجربہ ضرور مکمل کروں گا۔''

صبح ہوتے ہی اس نے پرانے کپڑوں اور ردی کاغذوں کی مدد سے دیواروں، فرش اور چھت کا ایک ایک سوراخ بند کردیا۔ چھوٹی بڑی نالیاں۔ ہوا کے آنے جانے کے راستے اور تمام کھڑکیاں اس نے اس طرح بند کیں کہ سوئی کے برابر بھی کہیں سوراخ نہیں رہا۔ اب اسے مکمل اطمینان ہوگیا تھا اسے یقین تھا کہ وہ منحوس سانپ پھر وہاں ہرگز نہ آسکے گا۔

اس نے پرانا مادہ پھینک دیا اور تجربے کا نئے سرے سے آغاز کیا۔ رات دن اس نے خوب محنت کی فارمولے کے مطابق تجربہ کو اس مقام تک لے آیا جب کہ اس میں ایک دو دن کے کام کی کسر رہ گئی تھی۔ مسرت اور جوش کے باعث اس کا چہرہ ہر وقت تمتماتا رہتا تھا سانپ کے بارے میں اب اسے پختہ یقین ہو چکا تھا کہ دراصل وہ اس کے وہم کی ہی پیداوار ہے سانپ آیا بے شک تھا مگر اسپرٹ لیمپ وغیرہ کو اس نے ہرگز نہیں چھوا چونکہ یہ بالکل ناممکن ہے کہ سانپ برنر کی چابی کھول دے جبکہ انسانی ہاتھوں سے وہ مشکل سے کھلتی ہے تو وہ تو پھر سانپ ہے۔ غلطی درحقیقت اسی سے ہوئی تھی اور کوئی خاص بات نہیں۔

تجربہ مکمل ہونے والا تھا صرف ایک دن کی کسر رہ گئی تھی اس کی نر جب رات کو بستر پر آرام کرنے کے لئے لیٹا تو وہ بڑے عجیب منصوبے بنارہا تھا وہ سوچ رہا تھا کہ ٹھوس سونے کو بازار میں فروخت کرنے کے بعد وہ اتنی دولت پیدا کرلے گا کہ حکومت کے خزانے میں بھی نہیں ہوگی وہ دنیا کا امیر ترین انسان تھا! امیر ترین انسان کا مطلب ہے طاقتور آدمی۔ اور جب اس کے پاس طاقت ہوگی تو وہ پوری دنیا کو اپنے قدموں پر جھکا لے گا پھر وہ وقت کتنا عجیب ہوگا جبکہ دنیا اس کے تلوے چاٹے گی اور وہ اسے حقارت سے ٹھکرا دے گا۔

''مگر یہ کیا...... یہ آواز کیسی ہے؟''

گھبرا کر وہ بستر سے اٹھ بیٹھا اور پھر آنکھیں پھاڑ کر ہر سمت دیکھنے لگا اچانک ہی بھیانک قسم کی سرسراہٹ پھر سنائی دی۔ چونکہ وہ اس سرسراہٹ کا معمہ حل کر چکا تھا اس لئے تیر کی طرح اس کمرے میں پہنچا جس میں وہ برتن تھا اور جس میں پڑا ہوا رقیق مادہ کیمیا گری کے باعث سونے میں تبدیل ہونے والا تھا کمرے میں پہنچتے ہی وہ بوکھلا کر دو قدم پیچھے ہٹا۔ کوئی اور ہوتا تو دہشت کے باعث فوراً بے ہوش ہو جاتا مگر اس کی نر بڑے دل گردے والا آدمی تھا۔

وہ حیرت سے ایک جگہ ہی جم کر رہ گیا اور پھر اس سفید سانپ کو دیکھنے لگا جو اپنے منہ میں ایک چھوٹی سی زرد رنگ کی شیشی دبائے ہوئے رقیق مادے والے برتن کے قریب اس انداز میں جھوم رہا تھا کہ اس کا پھن برتن کے بالکل اوپر تھا۔ اور نیچے اس نے کنڈلی مار رکھی تھی۔

اس کی نر جیسے سحر زدہ ہوگیا اس نے آگے بڑھنے کا ارادہ کیا بھی مگر اس کے قدم وہیں جم کر رہ گئے۔ چونکا وہ اس وقت جبکہ سانپ نے زرد رنگ کا سفوف برتن میں الٹ دیا

تھا اور اس کے الٹتے ہی ایک زوردار دھماکا ہوا تھا...... اتنا زبردست دھماکا کہ برتن ٹکڑے ٹکڑے ہوکر فرش پر بکھر گیا اور کمرے کی دیواروں میں شگاف پڑ گئے۔

ارے ظالم یہ کیا کیا تو نے؟ اس کی نر بری طرح دھاڑا۔ اور پھر بیتابی کے عالم میں سانپ کو مارنے کے لئے آگے بڑھا۔ اس کا خیال تھا کہ سانپ بھی دھماکے کے ساتھ ہی ختم ہوگیا ہوگا اور یقیناً اس کے چیتھڑے اڑ گئے ہوں گے مگر یہ دیکھ کر اس کے تعجب کی انتہا نہ رہی کہ

سانپ اسی طرح کنڈلی مارے بیٹھا ہے اور اس کی نر کو لگاتار گھورے جا رہا ہے۔ اس کی نر دراصل اسے مارنے کے لئے آگے بڑھا تھا مگر جب اس نے محسوس کیا کہ سانپ اس پر حملہ کرنا چاہ رہا ہے تو وہ گھبرا کر پیچھے ہٹ گیا۔ اس کے جھکتے ہی سانپ اس کی طرف لپکا۔ اور اس کی نر کے حواس باختہ ہوگئے۔ اس نے چلا کر کہا۔

"میں جان گیا...... اچھی طرح جان گیا مردود...... مگر میں تیرے ہاتھ ہرگز نہ آؤں گا۔"

اتنا کہہ کر اس کی نر تیزی سے دروازہ کھولا اور پھر بری طرح باہر کی طرف بھاگا۔ بھاگتے ہوئے وہ دہشت زدہ آواز میں مدد کے لئے چلا رہا تھا۔ مگر اس ویرانے میں بھلا کون اس کی مدد کو آتا! وہ ہانپتا ہوا دوڑتا رہا! بھاگتے ہوئے وہ بار بار پیچھے مڑ کر دیکھتا بھی جاتا تھا۔ اسے محسوس ہوتا تھا کہ کوئی ان دیکھی قوت اس کا تعاقب کر رہی ہے۔

پتھریلی زمین پر کسی کی پراسرار سرسراہٹ اسے سنائی دے رہی تھی۔ یہ سرسراہٹ جلدی ہی قدموں کی چاپ میں تبدیل ہوگئی۔ ایک کھوکھلی آواز اسے اپنے ذہن سے ٹکراتی ہوئی محسوس ہو رہی تھی۔ کوئی غمناک لہجے میں اس سے مخاطب تھا۔ "اس کی نر...... اس کی نر بھاگ کیوں رہے ہو، رک جاؤ۔ رک جاؤ، میرا انتقام ابھی پورا نہیں ہوا......"

اس کی نر اس آواز کو سنتے ہی خوف زدہ انداز میں اپنی رفتار بڑھا رہا تھا، جلدی ہی وہ کھلی سڑک پر آ گیا۔

دور سے کسی کار کی ہیڈ لائٹس اسے اپنی طرف آتی دکھائی دے رہی تھیں۔ وہ اپنے پھیپھڑوں کا پورا زور لگا کر چیخا۔ "بچاؤ...... مجھے بچاؤ۔"

کار نزدیک آ چکی تھی اور اس کی نر اپنے دونوں ہاتھ پھیلا کر اس کی طرف بڑھا کار کے جھٹکے سے وہ نیچے گر پڑا لیکن پھر فوراً ہی اٹھ گیا۔ آنے والے لوگ پولیس کے علاوہ اور کوئی نہ تھے۔ "کیا بات ہے مسٹر، آپ بوکھلائے ہوئے ہیں؟" انسپکٹر نے دریافت کیا۔

"مجھے بچایئے انسپکٹر صاحب، خدا کے لئے مجھے بچایئے۔" اس کی نر بےتابی سے بولا۔

"کس سے بچائیں...... کون آپ کا تعاقب کر رہا ہے؟" "وہ...... وہی ظالم سانپ......"

"سانپ! کیا کہہ رہے ہیں آپ...... کہیں آپ نشہ میں تو نہیں ہیں؟"

"میں نشہ میں نہیں ہوں انسپکٹر صاحب...... میں سچ کہہ رہا ہوں وہ میرا پیچھا کر رہا ہے۔" اس کی نر نے بےتابی سے کہا۔ "کون پیچھا کر رہا ہے؟" انسپکٹر نے پھر پوچھا۔

"کنارڈ...... ڈاکٹر کنارڈ انسپکٹر صاحب...... وہ سانپ کے روپ میں میرا تعاقب کر رہا ہے خدا کے لئے مجھے بچا لیجئے۔" اس کی نر نے بھیانک لہجے میں پیچھے مڑ کر دیکھتے ہوئے کہا۔

انسپکٹر نے جب مزید تحقیقات کی تو اس راز کا انکشاف ہوا کہ اس کی نر نے ڈاکٹر کنارڈ کو اپنے ہاتھوں سے قتل کر کے جنگل کے اندر دفن کر دیا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ وہ فارمولے کی بدولت کیمیا گری میں ماہر ہو جائے گا اور اسی لئے اس نے اس بھیانک جرم کا ارتکاب کیا تھا۔ اس نے اپنے منہ سے اپنے جرم کا اعتراف کر لیا تھا اس اعتراف کے ساتھ ہی انسپکٹر نے اس کی نر کی مدد کرنے کی بجائے اس کے ہاتھوں میں ہتھکڑیاں ڈال دیں۔

اس کی نر پولیس کار میں دبکا ہوا سڑک کو دیکھ رہا تھا، جس کے کنارے سفید سانپ کنڈلی مارے بیٹھا تھا اور مستی کے عالم میں جھوم رہا تھا۔ اس کی تیز اور چمکیلی آنکھیں اس آستین کے سانپ پر مرکوز تھیں جو اب پولیس کار میں بیٹھا ہوا آہستہ آہستہ اس سے دور ہوتا جا رہا تھا۔





ڈاک بنگلہ

ایس امتیاز احمد۔ کراچی

اچانک رات کے اندھیرے میں پائل کی آواز گونجی تو نوجوان اس کی طرف بڑھنے لگا اور آواز کا تعاقب کرتا گیا وہ سمجھ نہ سکا کہ وہ کہاں ہے لیکن پھر......

خراماں خراماں......دل و دماغ کو مبہوت......کرتی اور جسم کو تھرا دینے والی......کہانی

گھنے جنگلوں، ٹیڑھے میڑھے راستوں اونچی نیچی پگڈنڈیوں اور چھوٹی چھوٹی پہاڑیوں کے دلکش سلسلے سے گزرتی ہوئی بھاری ٹرین ایک چھوٹے سے اسٹیشن پر رکی۔ روح گل! یہ ایک تاریخی شہر ہے۔ شاہ باغ اور لارڈ کلائیو کی شکست و فتح کی یادگار، ماضی کے مٹے ہوئے نقوش، پرشکوہ کھنڈرات! ایسا معلوم ہوتا تھا کہ یہ آشوب روزگار شہر بھی شہر نگاراں رہا ہوگا۔ یہ بل کھاتی ہوئی ندی، یہ لہلہاتے سبزہ زار، یہ حسین پھولوں کی وادی، یہ مہکتے گوشے، چھوٹے سے شہر میں اتنی ساری رعنائیاں۔

لیکن جو چیز مجھے سب سے زیادہ متاثر کرسکتی وہ تھی، "نیل کوٹھی" جسے عرف عام میں ڈاک بنگلہ کہتے تھے۔ ڈاک بنگلہ اس لئے مشہور ہے کہ یہ جگہ اب بھی دور سے آئے ہوئے معزز مہمانوں کو پناہ دیتی ہے۔ یہ اور

بات ہے کہ کوئی بھی یہاں سے چین سے ایک رات بسر نہیں کر سکا ہے۔ اس قسم کی بہت سی روایتیں مشہور ہیں۔ لیکن ان میں حقیقت کہاں تک ہے، یہ انتہائی مشکل ہے۔

کوٹھی کے تنہا نگہبان راسو دادا کی رائے بہت مستند مانی جاتی ہے راسو دادا اس ماحول میں رہنے والا قدیم ترین انسان ہے اس کی زندگی میں اس کوٹھی کے بہت سے مالک بدلے لیکن راسو کی جگہ وہی رہی اور آج بھی بنگال کے ایک بڑے زمیندار ہریش چندر کے لڑکے ونے چندر کی ضد پر خریدی گئی۔ یہ کوٹھی راسو کے ہی تصرف میں ہے۔ کبھی کبھی یہاں آنے والوں سے جو آمدنی ہوتی ہے اس کا تنہا حقدار راسو دادا ہے اور یہاں جو کہانیاں جنم لیتی ہیں وہ ان کا واحد راز دار راسو دادا ہے۔ یہاں کی فضا راسو دادا کے سوا کسی اور کو راس نہیں آئی۔ یہاں کوئی زیادہ وقت تک نہیں ٹھہر پاتا۔

اسٹیشن سے نکل کر مغربی سمت میں درختوں کے جھنڈ میں پر اسرار حسینہ کی طرح کھڑی یہ کوٹھی بہت ہی حسین ہے۔ اس کے قدموں میں بہتی ہوئی گنگا اس کے آنچل میں ٹکے ہوئے سرخ سفید پھول، کچھ دور پر اس کے شانہ بشانہ پھیلا ہوا پہاڑیوں کا سلسلہ دل و دماغ پر ایک خاص اثر چھوڑتا ہے۔ خصوصاً چاندنی رات میں اس کا حسن دیکھنے سے تعلق رکھتا ہے پس منظر میں سیاہ درخت اور سامنے اس کا صبیح حسن ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے کوئی پری لٹ جھٹکائے بیٹھی ہو۔ شاہ شجاع کے قلعہ کے سینے پر بنی ہوئی یہ کوٹھی نیل کی کھیتی کے تجارتی نقطۂ نظر سے بنائی گئی تھی اور اب ہندوستان کی سرزمین پر بیرونی تسلط اور طرز معاشرت کا مکمل نمونہ ہے!

سامنے سے آیئے تو جہاں پر دور تک پھیلتی ہوئی پتھروں اور سرخیوں سے بنی ہوئی سڑک مڑ جاتی ہے وہاں سے ایک نئی سڑک شروع ہوتی ہے۔ گہری سرخی سے بنی ہوئی نیل کوٹھی کے قدموں میں مچلتی ہوئی یہ سڑک ڈاک بنگلہ میں داخل ہو جاتی ہے۔ اندر جانے سے پہلے ایک بلند گیٹ ملے گا۔ جس کا ایک پایہ گردش زمانہ کی نذر ہو گیا ہے۔ سرخ سڑک کے دونوں جانب سرو کے قطار در قطار درخت ہاتھ باندھے کھڑے ہیں۔ کنارے کنارے گہرے رنگوں کے انگریزی پھول کھلے ہیں۔ عشق پیچاں کی بیلیں کانٹے دار تاروں سے والہانہ لپٹی ہوئی چھت پر چڑھ رہی ہیں۔

چند زینے طے کرنے کے بعد آپ ایک وسیع صحن میں پہنچیں گے۔ پھر ایک کشادہ سائبان ملے گا۔ جس میں ہر طرف ہوادار دریچے لگے ہیں۔ ایک بڑا سا ہال ہے جس کے اردگرد پھیلا ہوا سائبان دور تک چلا گیا ہے۔ اس کی پشت پر ایک بہت ہی کھلی ہوئی جگہ ہے جہاں سے خوشنما موسم اور لہروں کے پیچ و خم کا لطف لیا جا سکتا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے یہ جگہ خاص اسی مقصد کے لئے بنائی گئی ہو۔ جہاں بیٹھ کر دو دھڑکتے ہوئے دل راز و نیاز کی باتیں کر سکیں۔ سائبان سے متصل پرانے قلعے کا قوی ہیکل ستون ایک پہرہ دار دیو کی مانند پانی کی لہروں میں اتر کر گنگا کی مقدس روانی کو محافظ بنا کھڑا ہے۔ سائبان کا یہ خوبصورت حصہ آگے چل کر اچانک پیچھے کی طرف مڑ جاتا ہے۔ جہاں سے میلوں لمبے نیچے چٹانوں سے ٹکراتی ہوئی اُبلتی ہوئی دیوانہ وار موجیں اپنا دہانہ کھولے کسی کی منتظر ہیں۔ پاس ہی کے باغ کے احاطے میں بانہیں پھیلائے ہوئے سیاہ درخت اندھیری رات میں انتہائی خوفناک معلوم ہوتے ہیں۔ درختوں کے کنج سے بہتی ہوائیں ماحول کی سسکیاں بن جاتی ہیں!

ہمارے ساتھ چار آدمی تھے۔ اور بھی روشن خیال۔ کوئی وجہ نہ تھی کہ کسی طرح کا خوف محسوس ہو۔ اس لئے جب راسو دادا نے کہا آج آپ لوگ میری کٹیا میں ٹھہریں میں کل انتظام کر دوں گا تو ہم مسکرا پڑے۔

"نہیں دادا ہمیں یہی جگہ پسند ہے۔"

اور جب ہمارے اصرار پر اس نے ڈاک بنگلہ کھولا تو پھر کہا۔ "آپ لوگ خوب سوچ لیں، یہ ویرانہ جگہ ہے، دریا میں خوب پانی آ گیا ہے، کالے کالے بادل منڈلا رہے ہیں۔ گھپ اندھیری رات ایسے میں

یہاں رہتا اور مشکل ہو جاتا ہے پانی کم ہوتا ہے تو لوگ کشتی لے کر آتے جاتے ہیں لیکن ایسے موسم میں کسی آدمی پر نظر نہیں پڑے گی؟"

لیکن ہماری ضد کے آگے راسو دادا خاموش ہو گیا۔ برسوں سے لگا ہوا زنگ آلود قفل کھولا گیا، چھتوں پر پھیلے ہوئے مکڑی کے جالے۔ گرد سے اٹے ہوئے صوفے، شکستہ روشن دان، دیواروں میں آویزاں تصویریں، ٹوٹے ہوئے بجلی کے تار اور پنکھے اور ایک کشادہ آتشدان، راسو دادا نے جلد ہی صفائی شروع کر دی اور ایک گوشے میں ہمارا سامان قرینے سے رکھ دیا۔ اپنی کٹیا سے ایک لیمپ لا کر روشن کیا۔ کچھ لکڑیاں لا کر آتش دان میں ڈال کر گرمی پیدا کر دی۔ اور ضروری ہدایتیں دے کر بازار چلا گیا۔

شام ہی سے ہلکی ہلکی پھوار پڑنے لگی تھی۔ درخت پراسرار خاموشی میں ڈوب گئے۔ تھوڑی دیر بعد کوندتی ہوئی بجلیاں سارے ماحول کو چونکا دیتیں اور پھر ایک اداس تاریکی پھر زوروں کی بارش ہونے لگی۔ سارے درخت آنسوؤں میں نہا گئے۔ سنسناتی ہوئی ہوائیں جسم میں گدگدی پیدا کرتی ہوئی گزرنے لگیں۔ سردی بڑھ چلی تھی۔ ہم سب کمرے میں چلے گئے اور آتشدان کے پاس بیٹھے رہے ہمیں بیٹھے ہوئے کافی دیر ہو گئی کچھ دیر باتیں ہوئیں پھر بحث کا نیا موضوع نہ مل سکا کچھ تھکاوٹ اور خنکی سے پلکیں بوجھل ہو رہی تھیں۔ راسو دادا ابھی تک لاپتہ تھا بارش کا شور اور ہوا کے جھونکوں سے سائیں سائیں اب بھی صاف سنائی دے رہی تھی کچھ دیر بعد اور ہمیں بھاری قدموں کی آواز آئی۔

"ٹپ.....ٹپ.....ٹپ....."

پھر آواز قریب آ گئی۔ اور ایک لمحہ کو آواز رکی پھر دروازہ کھل گیا اور ایک تیز جھونکا کانوں کے پاس سے سنسناتا ہوا نکل گیا۔ ہمیں یاد تھا ہم نے دروازہ بند کیا تھا نہیں لیکن کنڈا کھلنے کی صاف آواز آئی۔

پھر ایک لمبا تڑنگا جوان ہمارے سامنے موجود تھا۔ ہمیں زیادہ حیرت نہ ہوئی۔ ہماری ہی طرح ایک اجنبی تھا جو شاید بارش سے بچنے کے لئے ادھر آ نکلا تھا۔ وہ بری طرح شرابور تھا۔ جیسے پانی میں ڈوب کر نکلا ہو۔ اس کے ہاتھ اس کے ہیٹ، اس کے کوٹ، اس کے جوتے سبھی سے پانی ٹپک رہا تھا۔

اس کی بے تکلفی پر ہمیں ذرا تعجب ہوا۔ لیکن خوشی بھی وہ خاموشی سے آتشدان کے ساتھ بیٹھ گیا۔ پھر باتیں ہوئیں ادھر ادھر کی زمانے کی موسم کی عنایتوں کی اور بالآخر اس مکان کی باتیں ہماری دلچسپی اور گہری ہوتی چلی گئی۔

اس نے ہمیں بتایا کہ یہ مکان ایک زمانے میں وسے چندر نامی ایک نوجوان نے خریدا تھا۔ ان دنوں وہ کالج میں پڑھتا تھا۔ اور اپنی پرکشش شخصیت کے باعث بہت مقبول تھا۔

ایک دن اس کے ساتھ ایک عجیب واقعہ پیش آیا شام کے وقت وہ ایک تاریک گلی سے گزر رہا تھا کہ ایک مترنم آواز نے اسے اپنی طرف متوجہ کر لیا۔

"آؤ.....میرے ساتھ آؤ.........!"

اور وہ غیر شعوری طور پر بڑھتا گیا۔ پائل کی آواز کا تعاقب کرتا گیا اور بہت دور ایک ویران اور عالیشان مکان میں وہ داخل ہوئی۔ اندر داخل ہو کر ایسا معلوم ہوا جیسے وہ ایک رنگ محل میں پہنچ گیا ہو۔ دلکش دلنواز چیزیں انواع و اقسام کے کھانے، پری چہرہ عورتیں، وہ سمجھ نہ سکا کہ وہ کہاں ہے۔ لڑکی اسے وہیں چھوڑ کر کہیں گم ہو گئی۔ پھر گہرے سرخ رنگوں کے لباس میں ملبوس آئی اور کہنے لگی۔ "آؤ سیر کریں۔" دیر تک وہ باتیں کرتے رہے۔

وسے گھر لوٹا تو بے حد خوش تھا۔ اب اکثر وہ چاندنی راتوں میں دریا کے کنارے اس لڑکی کے ساتھ گھومتا نظر آتا۔ اس کی سمجھ میں نہ آ سکا کہ یہ لڑکی کون ہے اور ویرانے کے اندر اتنا حسن کہاں سے سمٹ آیا؟ وہ اس پر اتنی مہربان کیوں.....؟"

ان ہی دنوں اس نے ماں سے ضد کر کے یہ مکان خرید لیا۔ راسو اس کی حفاظت کرتا۔ کچھ دن کے بعد وسے میں ایک عجیب تبدیلی ہوئی۔ اس کی شادی کو کچھ ہی دن گزرے تھے لیکن اپنی خوبصورت اور شرمیلی دلہن

سے انتہائی بے زار رہنے لگا۔ خاص طور سے اس کے سرخ لباس سے انتہائی نفرت تھی۔

آخر ایک دن اس کے سارے سرخ کپڑے جلا ڈالے، گھر کے لوگ بہت پریشان ہوئے۔ اس کے والد آزاد خیال ہوتے ہوئے بھی اب سخت ہونے لگے۔ اور ایک دن اسے ایک کمرے میں بند کر دیا گیا۔ اور اس مکان کو فروخت کرنے کی سوچ لی۔

لیکن دوسرے دن اس سے بھی حیرت ناک واقعہ ہوا۔ بند کمرے سے آواز آ رہی تھی۔

"ونے! اپنی بیوی کو نکال دو۔ یہ میری دشمن ہے۔ تم میرے ساتھ چلو۔" اور جب کمرہ کھول کر دیکھا گیا تو وہاں کوئی بھی نہ تھا۔ دوسرے دن چاندنی اپنے شباب پر تھی۔ رات گئے سے وہ اپنے کمرے سے غائب تھا۔ پھر وہی مکان وہی جگہ وہی لڑکی اپنی پائل کی آواز پر ونے کو راستہ بتاتی ہوئی چل رہی تھی۔

آج وہ اداس تھی پر اس کی سسکیاں ابھر رہی تھیں۔ "ونے ہم اس طرح نہیں مل سکیں گے۔ ہمیں ایک ہو جانا ہی چاہیے۔"

ونے بہکتے ہوئے بھی نہ سمجھ سکا۔

پھر وہ دیر تک گھومتے رہے۔ باتیں کرتے رہے۔ راسو اپنی جھونپڑی میں اونگھ رہا تھا۔ دریا میں لہریں ابھر کر نیچے چٹانوں سے ٹکرا رہی تھیں وحشت سکتہ کے عالم میں کھڑے تھے۔ قلعہ کا دیو ناستون خاموش تھا۔ لڑکی اٹھ گئی وہ چلنے لگی۔

"آؤ..... اب ہم چلیں.....!"

اور ونے چلتا رہا..... چلتا رہا..... اپنے سے بے نیاز..... ماحول سے بے خبر..... "آؤ.....!" اس نے پھر کہا۔ "ذرا آگے بڑھو!"

یہاں تک کہ ایک زوردار دھماکہ ہوا پاسوں نیف یہ چنگھاڑتی ہوئی لہروں نے اس بنگلے کو اپنی آغوش میں سمیٹ لیا!

دوسرے دن سویرے ونے کی لاش ملی.....!

یہ کہہ کر وہ خاموش ہو گیا۔

"تو کیا اب یہاں کوئی نہیں رہ پاتا؟"

ہم نے پھر سوال کیا۔

"نہیں..... رات گئے دھیمے دھیمے پائل کی اور پھر زوردار قہقہوں کی آواز گونجتی ہے۔" اس نے کہا ہم لوگ کہانی میں اتنے محو ہو چکے تھے کہ خوف سا محسوس ہونے لگا تھا۔ حالانکہ یہ محض ایک کہانی تھی۔ اور پھر ابھی کی زبانی بحث کا موضوع بدل گیا۔

لیکن ہمیں ایسا معلوم ہو رہا تھا کہ جیسے دور کہیں پائل بج رہی ہو۔ دھیمی دھیمی..... چھم چھم.....!

پھر ہم یہ کہہ کر خاموش ہو گئے۔ کچھ دیر ہم یونہی بیٹھے رہے۔ پھر میں نے کہا۔

"چھوڑیئے ان کہانیوں کو اس زمانے میں کس کو فرصت ہے ان پر غور کرے.....!!"

"ہاں یہ تو ہے لیکن....."

وہ کچھ کہنا چاہ رہا تھا کہ میں نے ٹوک کر کہا۔ "ارے یہ کیا؟ آپ اتنی دیر سے آگ کے سامنے بیٹھے ہیں، لیکن شرابور ہو رہے ہیں۔!"

"ہوں....." وہ مسکرایا۔

دور کہیں پائل چھنکی!

"جی آپ کیا کہہ رہے تھے۔" میں نے ٹوکا۔

"میں.....!" اس کی آنکھیں شعلہ بار ہو گئیں۔

"میں بھی خشک نہیں ہو سکتا میں برف ہوں اور برف پر آگ اثر نہیں کرتی برف اور آگ کا کیا مقابلہ؟"

یہ کہہ کر اس نے جلتی ہوئی لکڑیوں کے کئی شعلے اٹھا کر اپنے ہاتھ پر رکھ لئے۔ اور زور زور سے ہنسنے لگا۔

"ہاہا..... ہاہا..... ہا.....!"

تیز جھونکا آیا لیمپ بجھ گیا۔ اور دو ملے جلے قہقہے گونجنے لگے.....!

جب ہمیں ہوش آیا تو راسو دادا سرہانے کھڑا کہہ رہا تھا۔ "میں نے کہا تھا ناں کہ آپ لوگ یہاں رات بھر نہیں رہ سکیں گے!!"



شیطان

ایس امتیاز احمد۔کراچی

اچانک لڑکی کے تیور بگڑ گئے اس کی آنکھوں میں شعلے دھکنے لگے خوبصورتی کی جگہ چہرہ کرخت ہوگیا، مترنم آواز کی جگہ اس کے منہ سے بھاری آواز نکلی تو سامنے کھڑا فادر حیران رہ گیا کہ پھر اچانک......

ذہن سے برسوں محو نہ ہونے والی ایک ایسے شخص کی کہانی جو شیطان کا دوسرا روپ تھا

فادر گریگوری نے آ کر فادر جیمز سے سینٹ مائیکل گرجا گھر کا چارج لیا تھا۔ ساری کارروائی مکمل ہو چکی تھی۔ اور اب فادر جیمز قصبے کے نئے پادری کو وہاں کے لوگوں کے بارے میں جزوی طور پر بتا رہا تھا۔ رات نصف بیت چکی تھی۔ اور دونوں راہب کمرے میں بیٹھے باتیں کر رہے تھے۔

''مجھے سب سے زیادہ جس شخص کے بارے میں تشویش ہے وہ کارتھو ہے'' فادر جیمز نے کہا۔ ''یہ ایک بڑا گھمبیر اور الجھا ہوا مسئلہ ہے اس لڑکی جس کی عمر سولہ سال ہے اس کے لئے عذاب بن گئی ہے۔ اس کی ماں مر چکی ہے اور اس پر دورے پڑتے ہیں ڈاکٹروں کو دکھایا لیکن کوئی افاقہ نہیں ہوا۔ میں نے اس کے باپ پر زور دیا ہے کہ اسے کسی ماہر نفسیات کو دکھائے۔''

فادر جیمز کہتا رہا اور اس کا ذہن اس کی باتوں سے دور پرواز کرتا رہا۔ ''سولہ سالہ لڑکی پر دورے پڑتے ہیں اپنا لفظ بڑا فرسودہ اور دقیانوسی ہے۔ نوجوان لڑکیوں پر جو ہسٹریائی دورے پڑتے ہیں۔ وہ عموماً جنسی ہیجان ہوتا ہے۔ جنسی تشنگی جب نکاس کا راستہ نہیں پاتی ہے تو دوسرے رخ اختیار کر لیتی ہے......''

''اچھا اب میں چلوں'' گریگوری جیمز کی آواز سے چونکا جو اپنی جیبی گھڑی میں وقت دیکھ رہا تھا۔ ''مجھے بہت دور جانا ہے۔''

گریگوری اسے چھوڑنے دروازے تک گیا، وہ رک کر بولا ''اس کا نام سوسن ہے۔''

''کس کا؟'' گریگوری نے پوچھا۔ ''اس لڑکی کا، کارتھو کی لڑکی کا......'' جیمز نے کہا۔

''اوہ، اچھا یہ نام مجھے یاد رہے گا'' گریگوری نے سرسری طور پر کہا۔ اور اس کے روانہ ہونے پر مطالعہ گاہ میں آ کر نرم کرسی میں دھنس گیا۔ اس کا ذہن اپنے موجودہ گرجا اور سابقہ جگہ کے مابین موافقت اور مطابقت کے فاصلے ناپنے لگا۔ معاً صدر دروازے کی گھنٹی زور سے بجی اور وہ اس غیر متوقع مداخلت سے گڑبڑا گیا۔ دروازے کی طرف بڑھتے ہوئے وہ سوچ رہا تھا۔ کہ فادر جیمز اپنی کوئی چیز بھول گیا ہوگا اور اسے لینے کے لئے لوٹ آیا ہوگا۔ لیکن اس نے دروازہ کھولا تو اس کے سامنے ایک جیم شحیم شخص کھڑا تھا۔

''بے وقت زحمت دینے کی معذرت چاہتا ہوں فادر۔'' اس نے کہا ''مجبوری ہے'' اس نے خفت سے کہا۔ ''لیکن مجبوری ہے اس لڑکی کا معاملہ ہے۔''

لڑکی جو اس کے پیچھے چھپنے کی ناکام کوشش



کر رہی تھی اسکول کی طالبہ لگتی تھی اور گریگوری سے نگاہ چرا رہی تھی۔ "اگر واقعی اہم مسئلہ ہے تو کوئی بات نہیں" گریگوری نے کہا اور انہیں اندر لاکر کرسیوں پر بٹھا دیا۔

"تمہارے یہ بتانے کی ضرورت نہیں کہ تم گارتھ ہو اور یہ سوسن ہے" قادر نے دونوں کے چہرے بغور دیکھتے ہوئے کہا۔ "ہاں تو میں تم لوگوں کے لئے کیا کرسکتا ہوں؟"

"ہم آپ سے ملنے کے لئے بہت دیر سے باہر انتظار کر رہے ہیں" گارتھ نے کہا "لیکن میں چاہتا تھا کہ قادر جیمو چلے جائیں، تب اندر آؤں، انہوں نے آپ کو تو کچھ بتا دیا ہوگا؟"

"مختصر طور پر بتایا ہے" گریگوری نے کہا۔

"دیکھئے انہوں نے مجھے مشورہ دیا کہ میں اسے ڈاکٹر کو دکھاؤں کسی اسپیشلسٹ کو، میرے خیال میں انہیں اس کے ذہنی توازن پر شبہ ہے" گارتھ نے یہ کہہ کر فوراً کہا "میں انہیں الزام نہیں دے رہا ہوں، جو واقعہ پیش آیا اس کے پیش نظر انہیں یہی رائے قائم کرنی چاہئے"

"کون سا واقعہ؟" گریگوری نے پوچھا۔

"انہوں نے آپ کو نہیں بتایا؟" گارتھ نے تذبذب سے کہا۔ "انہوں نے صرف اتنا ہی بتایا کہ....."

"مسٹر گریگوری نے اپنے چہرے پر لڑکی کی تپش محسوس کی، اور کہا۔ "سوسن اگر دوسرے کمرے میں جائے تو مناسب ہوگا۔"

"نہیں قادر!" سوسن نے دھیمی، شرمیلی آواز سے کہا "میں یہیں ٹھہروں گی۔ آپ لوگ مجھ سے کچھ نہ چھپائیں۔"

اس کی جرأت مندی پر حیران ہو کر گریگوری نے کہا "بہت خوب، بہت خوب" اور گارتھ کی طرف مڑ کر کہنے لگا قادر جیمو نے مجھے اتنا ہی بتایا کہ "سوسن ذہنی طور پر بے حد پریشان ہے اس پر سخت دورے پڑتے ہیں اور انہوں نے اسے کسی ماہر ڈاکٹر کو دکھانے کا مشورہ دیا ہے"

"ماہر نفسیات کو" سوسن نے اسے ٹوکا۔ "ہاں اسی کو" گریگوری نے کہا۔

"انہوں نے بس یہی کچھ بتایا ہوگا آپ کو؟" گارتھ نے پوچھا۔ "ہاں اتنا ہی تم لڑکی کو کسی ماہر نفسیات کے پاس لے گئے تھے"

"نہیں" گارتھ کی بجائے سوسن نے جواب دیا۔

"دیکھئے نا قادر!" گارتھ جلدی سے بولا۔ "پہلی بات تو یہ کہ وہ لوگ بہت زیادہ فیس لیتے ہیں اور میں اس کا متحمل نہیں ہوسکتا دوسری وجہ یہ کہ....."

"ڈیڈی" سوسن اونچی آواز سے بولی۔

"دوسری وجہ یہ کہ یہ میری لڑکی کا ذہنی توازن بالکل ٹھیک ہے میرے یا اس کی ماں کے خاندان میں اس قسم کی بات کبھی نہیں ہوئی ہے تو لڑکی کا دماغ کیسے چل سکتا ہے اور یہ جو اس پر پڑنے والے دورے..... تو یہ کچھ اور ہی بات ہے۔ میرے ایک رشتے کے چچا تھے ان پر بھی کبھی تشنج کے دورے پڑتے تھے۔ سوسن کے ساتھ بھی یہی معاملہ ہے۔ چنانچہ میں نے اسے ایک نہیں دو ڈاکٹروں کو دکھایا انہوں نے اس کا تفصیل سے معائنہ کیا....."

"کیا کہتے ہیں"

"لیکن کوئی خاطر خواہ نتیجہ برآمد نہیں ہوا" گارتھ نے اپنی بات جاری رکھی "ٹھیک" گریگوری نے کہا۔ "انہوں نے کیا بتایا"

"کچھ نہیں" گارتھ بولا۔

"انہوں نے کہا کہ مجھے کسی ماہر نفسیات کو دکھایا جائے" سوسن بول پڑی۔ "مسٹر گارتھ" گریگوری نے کہا "میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ پیسے کی کمی راہ میں حائل ہے پیسے درختوں پر نہیں اگتے اور جیسا کہ آپ نے کہا ہے کہ نفسیات کے ماہر بھاری فیس لیتے ہیں۔ اس مسئلے کا ایک حل ہے میرا بھتیجا ایک بڑا ماہر نفسیات ہے اور....."

"نہیں یہ فضول ہے" گارتھ نے ناگواری سے سر کو جنبش دی۔ "اس میں حرج ہی کیا ہے؟" گریگوری

نے کہا ''صرف پیسے کی کمی ہی واحد رکاوٹ نہیں ہے'' گارتھ بولا ''میں اپنی لڑکی کو ایسے ڈاکٹر کے پاس کیوں بھیجوں جو ذہنی مریضوں کا علاج کرتا ہے! میری لڑکی کو تو ایسا مرض نہیں ہے۔''

''اس میں لڑکی کے ذہنی مریض ہونے یا نہ ہونے کا سوال نہیں ہے ایک ماہر نفسیات......'' گارتھ نے ہونٹ بھینچ کر اور آنکھیں بند کر کے نفی میں سر ہلایا۔ ''نہیں۔ نہیں، وہ کہنے لگا'' مجھے معلوم ہے یہ دماغ کے ڈاکٹر اپنے دفتروں میں کیا کرتے ہیں۔ یہ انسان کے دل کی ساری بات کھینچ نکالتے ہیں وہ اس سے سب کچھ اگلوا لیتے ہیں چاہتے ہیں کہ انسان ہر وہ گندا اور ذلیل خیال ان کے سامنے نکال کر رکھ دے جو اس کے ذہن میں بھی گزرا ہو۔ یقیناً میں اس عمر کی لڑکی کے ساتھ نہیں ہونے دوں گا میں ہرگز یہ نہیں کروں گا اور فادر! مجھے آپ پر حیرت ہے، کیا کلیسا ایسی باتوں کی اجازت دیتا ہے۔''

''نہیں'' گریگوری نے سادگی سے کہا۔ ''مجھے اعتراف ہے کہ کلیسا اس کی اجازت نہیں دیتا ہے۔'' لیکن اس کے بالکل خلاف بھی نہیں ہے، ایک ماہر نفسیات کے سامنے ذہن کی پراگندگی اگلنے اور ایک پادری کے سامنے اعتراف گناہ کرنے میں کیا فرق ہے مسٹر گارتھ!''

''فادر! آپ جانتے ہیں کہ میں سوسن کو اس وقت آپ کے پاس کیوں لایا ہوں؟'' گارتھ نے اچانک بات کا رخ بدلتے ہوئے کہا۔ ''کیوں؟'' گریگوری نے پوچھا۔

''آج یہ گھر سے بھاگ رہی تھی'' میں نے پکڑ لیا تو بولی کہ'' میں ماہر نفسیات کے پاس جاؤں گی کیونکہ تم مجھے اس کے پاس لے جاتے نہیں ہو''

''میں اسے یہاں لے آیا کہ آپ اسے سمجھائیں کہ میں جو کچھ کہہ رہا ہوں وہ درست ہے'' گارتھ بات ختم کر کے اطمینان سے بیٹھ گیا۔

''کیا درست کہہ رہے ہیں فادر'' سوسن نے معصومیت سے پوچھا۔ گریگوری مسکرایا۔ وہ کہنا چاہتا تھا کہ گارتھ بالکل غلط کہہ رہا ہے لیکن اس نے مصلحت سے کام لیتے ہوئے کہا ''یہ درست کہہ رہے ہیں اور ہم تینوں سر جوڑ کر بیٹھیں گے تو کوئی نہ کوئی حل نکل آئے گا''

''ڈیڈی! اگر آپ انہیں اصل بات بالکل نہیں بتانا چاہتے تو میں بتاتی ہوں'' سوسن چہک کر بولی۔ ''تم بتاؤ گی؟'' گارتھ نے حیرت سے کہا ''جس بات کو میں پچاس سال کا بوڑھا نہیں کہہ سکا تم بالشت بھر کی چھوکری کہہ دو گی......''

''میں اتنی بچی بھی نہیں ہوں، بہتر ہے آپ فادر کو بتا دیں'' سوسن نے اطمینان سے کہا۔

''ایک روز میں اسے فادر جیمز کے پاس لے آیا۔'' گارتھ نے چبا چبا کر بات شروع کی ''اسی مطالعہ گاہ میں وہ اس سے تنہائی میں باتیں کرنے لگا اور میں باہر برآمدے میں انتظار کرنے لگا۔ کچھ دیر بعد اندر سے ایک ایسی آواز آئی جیسے کوئی چیز دھم سے گر گئی ہو۔ اور پھر گھٹی گھٹی سی چیخ سنائی دی۔ یہ چیخ سوسن کی نہیں تھی اس لئے فادر جیمز کی ہی ہو سکتی ہے وہ...... رک جاؤ...... نہیں نہیں...... کہہ رہے تھے یا اسی قسم کے کچھ الفاظ تھے۔ میں ابھی فیصلہ نہ کر پایا کہ کیا کروں کہ ان کی چیخ بلند ہوئی ''بچاؤ بچاؤ'' میں دوڑ کر اندر گیا تو فادر جیمز کمرے کے وسط میں کھڑے تھے ان کا چہرہ ان کی قمیض کے کالر کی طرح سفید تھا۔ ان کے منہ سے بات نہیں نکل رہی تھی وہ گھبرائی گھبرائی نظروں سے چاروں طرف دیکھ رہے تھے۔ چند ثانیے بعد وہ مجھ سے کچھ کہے بغیر باہر نکل گئے۔ اس واقعہ کے چند روز بعد میں نے سنا کہ انہوں نے اپنا تبادلہ کرا لیا ہے''

''خیر اس واقعہ سے ان کے تبادلے کا کوئی تعلق نہیں ہے'' گریگوری نے اپنے تجسس پر قابو پاتے ہوئے کہا ''وہ یتیم خانے کا انتظام سنبھالنے کے لئے بہت دنوں سے کوشاں تھے۔ تمہیں اس واقعہ کا کوئی پس منظر کوئی تفصیل معلوم ہے؟''

"نہیں" گارتھ نے جواب دیا "البتہ جس وجہ سے میں سوسن کو فادر جیفر کے پاس لایا تھا وہ یہ تھی کہ تقریباً دو ہفتے قبل میں اور سوسن اتوار کو حسب معمول تیار ہو کر چرچ کے لئے روانہ ہوئے۔ جب ہم اس کے قریب پہنچے تو اچانک اس نے میرا ہاتھ چھڑایا اور بھاگ کھڑی ہوئی میں اس کے پیچھے دوڑا لیکن یہ ہاتھ نہ آئی گھر آ کر میں نے اسے بہت پھٹکار کی لیکن یہ خاموش رہی۔ اگلی اتوار کو اس نے پھر جانے کی کوشش کی۔ کپڑے تبدیل کئے اپنے انداز سے بال سنوارے اور خوشی خوشی میرے ساتھ چل پڑی، لیکن جوں ہی ہم چرچ کے پاس پہنچے یہ پھر بھاگ کھڑی ہوئی اس مرتبہ میں اس کے پیچھے پیچھے گھر پہنچ گیا، چرچ نہ جانے کی لاکھ وجہ پوچھی لیکن اس نے کوئی جواب نہیں دیا اس پر میں نے اسے ایک ہلکا سا چانٹا لگایا۔"

"زور سے مارا تھا" سوسن درمیان میں بول پڑی اور گریگوری مسکرا دیا۔ "یہی وجہ تھی کہ میں اسے فادر جیفر کے پاس لایا" گارتھ نے اپنی بات مکمل کرلی۔

"اچھا اب تو بہت دیر ہوگئی ہے ہم اس موضوع پر اسی ہفتے میں کسی دن بات کریں گے" گریگوری نے کہا اور باپ بیٹی کو رخصت کردیا۔

فادر جیفر کی رپورٹ پڑھ کر بشپ کونارڈ ریگنر نے ایک گہری سانس لی۔ اپنی رہبانیت کے آغاز سے اس بلند منصب تک پہنچنے کے طویل عرصہ میں وہ پہلی بار ایک راہب کے ساتھ پیش آنے والی اس لرزہ خیز صورتحال سے دوچار ہوا تھا۔ فادر جیفر نے بڑی تفصیل سے اپنے ساتھ پیش آنے والی واردات کا حال لکھا تھا۔

گارتھ کو باہر ٹھہرنے کا کہہ کر اس نے مطالعہ گاہ کا کمرہ اندر سے بند کرلیا۔ دیدہ زیب جلدوں والی ضخیم کتابوں، جدید طرز کے چمک دار فرنیچر اور نظروں کو سکون پہنچانے والے رنگوں کے دبیز پردوں سے مرصع ماحول اور فرحت بخش فضا میں وہ دونوں تنہا رہ گئے۔

"میں چرچ سے نفرت نہیں کرتی" سوسن بتانے لگی "لیکن وہاں جانے سے گھبراتی ہوں، نہ جانے کیوں؟ کوئی وجہ سمجھ میں نہیں آتی ہے۔ بس وہاں کا تصور مجھے خائف کرنے لگتا ہے۔"

اتنے میں فون کی گھنٹی بجی اور فادر جیفر ریسیور اٹھا کر ایک خاتون سے باتیں کرنے لگا۔ جو اس سے ایک مسئلہ پوچھ رہی تھی۔ جب وہ ریسیور کریڈل پر رکھ کر مڑا تو اس کا اوپر کا سانس اوپر اور نیچے کا نیچے رہ گیا سوسن مادر زاد برہنہ کھڑی تھی۔

اس نے اس سے پہلے کسی عورت کو برہنہ نہیں دیکھا تھا...... دودھیائی قمقموں میں سوسن کا کنوارا جسم پوری آب و تاب سے چمک رہا تھا جسم کی نشیب و فراز ہوش و حواس کو معطل کئے دیتے تھے جیفر کی زبان جیسے تالو سے چپک گئی۔ اور اس کی آنکھوں پر جیسے دہکتے ہوئے انگارے رکھ دیئے گئے تھے۔

"کپڑے پہن لو" اس نے بڑی مشکل سے تین الفاظ منہ سے نکالے۔ "آیئے ہم باتیں کریں" سوسن نے ایک اجنبی آواز میں کہا "مجھ سے کچھ کہیں" وہ جیفر کی طرف آہستہ آہستہ بڑھتے ہوئے کہنے لگی۔ "لیکن چرچ جانے والے کے بارے میں نہیں بلکہ وہ باتیں جو آپ حقیقت کہنا چاہتے ہیں وہی کچھ کہیں جو آپ کے دل میں ہے کہیے کہ میں کتنی خوبصورت لڑکی ہوں اور میرا جسم کتنا دلکش ہے۔ وہ ساری باتیں اگل دیجئے جو میرا شباب دیکھ کر آپ کے ذہن میں کلبلا رہی ہیں۔ آپ مرد ہیں فادر اور سارے مرد یہی محسوس کرتے ہیں......"

جیفر بے جان بت بنا کھڑا تھا وہ آگے بڑھی اور اس کی گرم گرم سانسیں جیفر کے کانوں کی لوؤں کو جھلسانے لگیں۔ وہ لذت بخش سرگوشی میں ترغیب دلانے کی ایسی ایسی باتیں کر رہی تھی جو جیفر نے اپنی ساری زندگی میں نہیں سنی تھیں پھر اس نے جھک کر جیفر کا ہاتھ پکڑ لیا اور اسے کتے کی طرح چاٹنے لگی۔ جیفر کے جسم میں ایک برقی رو دوڑ گئی اور اس نے ایک جھٹکے سے اپنا ہاتھ چھڑا لیا تو سوسن نے اس کا دوسرا ہاتھ پکڑ کر سینے پر

رکھ لیا اور دبانے لگی۔

"ن.....نہیں.....نہ......" وہ بوکھلا کر پیچھے ہٹا تو سوزن نے اسے اپنے لپٹے لیے، پتلے بازوؤں کے حصار میں لے لیا۔ اور اپنے ہونٹ اس کے ہونٹوں سے پیوست کر کے زبان اس کے منہ میں گھسیڑ دی تو جیمز نے اسے زور سے دھکا دیا تو وہ لڑکھڑا کر دو قدم پیچھے ہٹ گئی۔

"منافق" وہ پھر سے قدم فرش پر جما کر بولی "مجھے بے وقوف بنانے کی کوشش نہ کیجئے آپ کو بھی میری اتنی ہی طلب ہے جتنی مجھے آپ کی ہے اگر آپ کو تحفظ کا یقین ہو یہ یقین ہو گا کہ آپ کا بھانڈا نہیں پھوٹے گا تو آپ مجھے فوراً دبوچ لیں گے مجھے یہیں.....ٹھیک اسی جگہ گرا لیں گے" اس نے فرش پر پاؤں پٹخ کر کہا "اور وہ سب کچھ کر گزریں گے جس کے لئے آپ کا دل مچل رہا ہے، اس میں کچھ بھی نہ چھوڑیں گے اپنی پوری تسکین کر لیں گے ایک سور کی طرح اپنی تشنگی بجھائیں گے۔ سور کی طرح مجھے بھنبھوڑیں گے اور اپنے پسینے میں مجھے نہلا دیں گے، اپنا آپ میرے اندر خالی کر دیں گے، میرے جسم میں اپنی ساری غلاظت بھر دیں گے۔ دوغلے، ذلیل۔" اور وہ کہتی ہوئی جیمز پر جھپٹ پڑی اور اپنے نوکیلے ناخن اس کی گردن میں گاڑ دیئے۔

"بچاؤ! بچاؤ!" جیمز دیوانہ وار چیخا۔ جب گارتھ چیخ سن کر کمرے میں داخل ہوا، اور اس نے سوزن کے برہنہ جسم کو گھسیٹ کر جیمز سے جدا کیا تو اس کے ناخنوں کے سرے سرخ تھے۔

جیمز کی روداد پڑھ کر بشپ کونارڈ نے ایک لمحہ ضائع کئے بغیر ٹیکسی منگوائی اور سینٹ مائیکل گرجا کا رخ کیا۔ محض اس لئے نہیں کہ اس قصبہ میں ایک جنونی اور خطرناک لڑکی تھی۔ اس لئے کہ وہاں کا پادری ایک جوان عمر آدمی تھا اور فادر گریگوری ایک زمانہ میں نہ صرف کثرت شراب نوشی کے لئے بدنام تھا بلکہ اس کے رسالوں میں چھپنے والے مضامین اس کی آزاد خیالی کے پرتو تھے۔

اس کی غیر متوقع آمد نے گریگوری کی ملازمہ مسز خارلی کو سکتے میں ڈال دیا۔ پھر وہ الٹے سیدھے قدموں گریگوری کو اطلاع دینے چلی گئی وہ بھی بھاگا بھاگا آیا اور اس نے جھک کر بشپ کونارڈ کے ہاتھ تعظیماً چوم لئے۔ دونوں مطالعہ گاہ میں جا بیٹھے اور کونارڈ اس سے اس کے موجودہ ماحول اور کام کے بارے میں پوچھتا رہا۔ رسمی باتوں کے بعد اس نے جیمز کی روداد اسے پڑھنے کے لئے دی تو وہ سناٹے میں آ گیا۔ اتنے میں مسز خارلی نے آ کر آہستہ سے اسے کچھ کہا تو وہ کونارڈ سے معذرت کر کے اٹھا اور بیرونی کمرے میں چلا گیا وہاں سوزن اس کی منتظر تھی۔

"ہیلو سوزن" اس نے رسماً کہا۔

"ہیلو فادر" سوزن نے جواب دیا۔ "کیسے آنا ہوا" گریگوری نے پوچھا۔

"میں نے سوچا..... ہو سکتا ہے آپ میری کچھ مدد کر سکیں.....ہم کہیں بیٹھ کر باتیں کر سکیں.....یا آپ جس طرح کہیں" سوزن کی آواز میں لرزش تھی۔ اور گریگوری بھی لرز سا گیا۔

"تمہارے باپ کو معلوم ہے کہ تم یہاں آئی ہو" اس نے پوچھا۔ "جی ہاں!" سوزن نے جواب دیا۔ "اچھا تو سوزن تم غلط وقت پر آئی ہو اس وقت میرے پاس ایک مہمان بیٹھے ہیں......" گریگوری نے بات ختم نہیں کی تھی کہ مسز خارلی نے آ کر اسے بشپ کونارڈ کی ایک چٹ دی جس پر لکھا تھا کہ "وہ سوزن کو اس سے ملوائے"

"میرا خیال ہے کہ وقت اتنا غلط بھی نہیں ہے" اس نے چٹ جیب میں ڈالتے ہوئے سوزن سے کہا۔ "سوزن میں تمہیں ہز ایمیننس بشپ کونارڈ کر بینگر سے ملواتا ہوں تمہیں اعتراض تو نہیں ہے"

"جی نہیں" سوزن نے جواب دیا۔ "تو آؤ"

گریگوری اسے مطالعہ گاہ میں لے گیا، تعارف کے بعد کونارڈ نے اسے جانے کو کہا اور کمرے میں وہ سوزن کے

ساتھ تھا رہ گیا۔
"میرے قریب آؤ مس" کونارڈ نے کہا تو سوسن بددلی سے آگے بڑھی "تمہارا نام؟"
"سوسن مگارتھ"
"میں خدا کے فضل و کرم سے بشپ ہوں۔ کیا یہی تمہارے مجھ سے گفتگو کرنے کا انداز ہے۔"
"جی نہیں..... یور..... ایکسی لینسی۔ مجھے بتایا گیا ہے کہ تم ایک بری لڑکی ہو"
"میں ایک بری لڑکی ہوں، گندی زبان والی، گندے خباثت بھرے خیالات والی، خطرناک، شوریدہ سر، جس نے اپنے روحانی مشیر پر حملہ کیا اور جو چرچ کے دروازے سے یوں بدکتی ہے جیسے وہ جہنم کا دروازہ ہو کیا یہ سب درست ہے؟"
"درست ہے یور ایکسی لینسی۔"
"یہ بھی درست ہے کہ تم نے خدا کے نمائندے پادری کو گناہ کی ترغیب دی؟ اپنے ناپاک ہاتھوں سے اس کے جسم کے تقدس کو پامال کیا؟ اس کی ذات سے گناہ کی باتیں منسوب کیں؟"
سوسن نے اثبات میں سر ہلایا۔ "یہ ساری ہولناک باتیں درست ہیں؟ جی ہاں......"
"میری طرف دیکھ کر بات کرو" سوسن نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا۔ "سب کی سب بالکل درست ہیں۔"
کونارڈ اٹھ کھڑا ہوا اور اس سے پرے پرے ہاتھ پیچھے باندھ کر چلنے لگا۔ پھر اس سے مخاطب ہوا "تمہیں یہ ذہن نشین کر لینا چاہیے کہ میں تم سے جو باتیں کہہ رہا ہوں یہ وہ نہیں ہیں جو تم سے تمہارے باپ تمہارے اسکول کی سہیلیوں یا کسی پادری نے کہی ہیں تم اپنے بشپ کے روبرو ہو"
سوسن نے جھکا ہوا سر اثبات میں ہلا دیا۔ پھر اٹھ کھڑی ہوئی۔ کونارڈ نے حکم دیا اور وہ کھڑی ہو گئی۔ میرے قریب آؤ" وہ اس کے قریب چلی گئی۔ "میرا ہاتھ تھام لو" اس نے کونارڈ کا ہاتھ تھام لیا۔

اب کونارڈ بولا۔ "یہ دروازہ دیکھ رہی ہو وہ نہیں جو باہر جاتا ہے یہ دوسرا دروازہ جو سیدھا چرچ میں جاتا ہے تم اور میں ہاتھ میں ہاتھ دیئے اس دروازے سے چرچ میں جائیں گے"
"نہیں" سوسن نے اس سے اپنا ہاتھ چھڑانا چاہا لیکن کونارڈ نے اس کا ہاتھ نہیں چھوڑا۔ "میں بشپ کی حیثیت سے تمہیں حکم دیتا ہوں" وہ گرجا۔
"نہیں..... نہیں..... میں نہیں جاؤں گی..... نہیں جا سکتی" اس نے زور لگا کر ہاتھ چھڑایا اور بیرونی دروازے کی طرف بھاگی۔ وہ باہر سے بند تھا کیونکہ باہری کنڈی چڑھا گیا تھا سوسن نے پوری طاقت سے اسے کھولنا چاہا اور ناکام ہو کر دھیلے سے فرش پر گر پڑی۔
کونارڈ نے ایک گہرا سانس لیا۔ جس دروازے کا اس نے کہا تھا وہ جس میں جاتا تھا چرچ میں نہیں وہ پادری کی رہائش گاہ سے کافی دور تھا لیکن سوسن کو شاید یاد نہ رہا تھا۔ یا وہ دہشت زدہ ہو گئی تھی۔ کونارڈ نے جھک کر اسے اٹھایا اور ایک کرسی پر بٹھا دیا، اور خود بھی اس کے مقابل بیٹھ گیا۔
"تم ان ساری باتوں کو درست بتاتی ہو" اس نے ملائمت سے کہا "درست ہوں گی لیکن تم بری لڑکی نہیں ہو بالکل نہیں ہو۔"
"ہوں..... میں ہوں" سوسن منمنائی۔
"یہ کیسے ممکن ہے ڈیئر! تم یہ کہتے ہوئے لرز رہی ہو۔ ایک انسان متاسف نہیں ہوتا ہے تم نے ایسی باتیں کیوں کیں؟"
"میں نہیں جانتی۔"
"کیا تم بتا سکتی ہو کہ ایسی باتیں کرتے ہوئے تم نے کیا محسوس کیا"
"کچھ یوں محسوس ہوتا ہے..... جیسے میں نہیں کوئی اور ہے"
کونارڈ اپنی کرسی پر پیچھے ہٹ کر بیٹھ گیا اب اس کی سمجھ میں سب آگیا تھا "آؤ ایک کھیل کھیلیں" اچانک اس نے کہا "کھیل؟"

"ہاں کمیل" اس نے جیب میں ہاتھ ڈالتے ہوئے کہا "ہم دو سکے لیتے ہیں ایک نصف ڈالر کا اور دوسرا چوتھائی کا۔ تم اپنی آنکھیں بند کرلو اور میں یہ سکے تمہارے بازو سے لگاؤں گا۔ تم بتاتی جانا کہ نصف ڈالر کا کون سا ہے اور چوتھائی ڈالر کا کون سا، سمجھ گئیں اب اپنی آنکھیں بند کرلو۔"

سوسن نے آنکھیں بند کرلیں تو کونارڈ نے چوتھائی ڈالر کا سکہ اس کے بازو سے لگایا "میرا خیال ہے نصف ڈالر ہے" سوسن نے سوچتے ہوئے کہا کونارڈ نے نصف ڈالر اس کے بازو سے لگایا۔

"صحیح اندازہ نہیں ہورہا ہے" سوسن بولی۔

"چوتھائی ڈالر ہے یا پھر وہی نصف......" کونارڈ نے چوتھائی ڈالر کا سکہ جیب میں ڈال لیا اور نصف ڈالر اس کے بازو پر رکھنے لگا۔ وہ اسے بھی چوتھائی ڈالر بتاتی بھی نصف، دیر تک یہی تماشا رہا۔ پھر کونارڈ نے دوسرا ہاتھ جیب میں ڈال کر چاندی کی ایک چھوٹی سی صلیب نکالی اور اس کے بازو سے لگادی۔

"آپ نے مجھے جلادیا......" سوسن نے چلا کر آنکھیں کھول دیں "آپ نے کس چیز سے میرے بازو کو داغا ہے کیا تھی وہ؟" وہ دوسرا ہاتھ اس جگہ رکھ کر بلبلانے اور رونے لگی۔ کونارڈ نے اس کا ہاتھ ہٹا کر اس جگہ کو دیکھا تو وہاں صلیب کا صرف معمولی سا نشان تھا۔ کھٹ سے دروازہ کھلا تو گریگوری اندر داخل ہوا۔

"کیا بات ہے؟" اس نے تشویش سے پوچھا

"سوسن کو تکلیف پہنچی ہے" کونارڈ نے کہا "اگر ملازمہ کے پاس کوئی مرہم وغیرہ ہو تو اس کے بازو پر لگوادو" گریگوری سوسن کو اپنے ساتھ لے گیا اور چند منٹ بعد تنہا لوٹا۔ کونارڈ نے اسے سکے اور صلیب والی بات بتائی۔

"کیا آپ کو یقین ہے کہ اس کی آنکھیں بند تھیں" گریگوری نے ساری بات سن کر کہا "ہاں وہ واقعی بند تھیں" کونارڈ نے جواب دیا۔

"لیکن بند آنکھوں کے باوجود ایک گول سکے اور صلیب میں فرق کرنا چنداں مشکل نہ تھا" گریگوری نے جرح کیا "بازو کی جلد اتنی حساس نہیں ہوتی ہے" کونارڈ نے کہا تو گریگوری نے مزید اس کی تردید نہیں کی۔ "میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ لڑکی پر آسیب ہے اور ہمیں اسے دور کرنا ہے" اس وقت انہیں باہر کے کمرے سے سوسن کے قہقہوں کی آواز آئی اور باہر نکل کر انہوں نے دیکھا کہ وہ کمرے کے وسط میں کھڑی بے تحاشہ ہنسے جارہی ہے۔ سامنے دیوار پر کنواری مریم کی تصویر کا فریم جھول رہا تھا اس کا شیشہ چکنا چور ہوچکا تھا اس پر ایک موٹی کتاب پھینکی گئی تھی جو دیوار کے قریب پڑی تھی۔ انہیں دیکھ کر سوسن واہی تباہی بکنے لگی اور انہوں نے اسے گھسیٹ کر بالائی منزل پر لے جاکر خواب گاہ میں بند کردیا۔

کونارڈ نے اسے اندر بلالیا اور گریگوری نے ازراہ ہمدردی کہا کہ وہ کچھ دیر کے لئے سستا لے۔ سوسن بلاچوں وچرا اس بستر پر لیٹ گئی۔ کونارڈ نے گریگوری سے کہا کہ وہ انجیل مقدس کی وہ آیتیں پڑھے جو ابلیس کے بارے میں ہیں۔ گریگوری انجیل لے کر سوسن کے قریب کرسی پر بیٹھ گیا اور بلند آواز سے پڑھنے لگا۔ جوں جوں وہ پڑھتا جاتا تھا سوسن کا رنگ متغیر ہوتا جاتا تھا کچھ دیر بعد وہ دانت کچکچانے لگی اور پھر کچھ دیر بعد اس کے جسم میں اینٹھن ہونے لگی۔

معاً وہ ایک جھٹکے سے اٹھ بیٹھی اور اندھا دھند بھاگی وہ سیدھی ایک دیوار سے ٹکرائی اور فرش پر ڈھیر ہوگئی۔ کونارڈ دروازہ کھول کر چلایا "مسز غادری، ڈوری لاؤ"

اگلے چند لمحوں میں وہ رسیوں سے جکڑی ایک مصلوب کی طرح پلنگ پر پڑی تھی، کونارڈ نے اس کے نیچے سے بستر بھی ہٹادیا تھا اور اسپرنگ اس کے جسم میں چبھے جارہے تھے گریگوری نے کتاب وہیں سے شروع کی جہاں چھوڑی تھی سوسن کے حلق سے غراہٹ نکلنے لگی ایک درندے کی غراہٹ جس میں نفرت بھی تھی اور غراہٹ بھی اس کی آنکھیں بند تھیں۔

"بند کردو" اس کے ہونٹوں سے ایک کرخت بڑبڑاہٹ نکلی "بند کرو یہ سوانگ" گریگوری اور زور

زور سے پڑھنے لگا۔ "یہ کس کی آواز میری نسوں کو پارہ پارہ کیے دے رہی ہے!" سوسن بڑبڑائی اور گریگوری پڑھتا رہا۔

"کون مجھے اذیت پہنچا رہا ہے؟ کون یہ جرأت کر رہا ہے" گریگوری پڑھتے پڑھتے رک گیا اور سوسن نے آہستہ آہستہ آنکھیں کھولیں پھر اس نے پوری آنکھیں کھول دیں اور گریگوری کو ٹکٹکی باندھ کر دیکھنے لگی۔ ان کی آنکھوں میں بے پناہ نفرت تھی۔

"گستاخ! کمینے" وہ دانت کچکچا کر بولی۔

گریگوری اطمینان سے پڑھتا رہا "کون یہ حرکت کر رہا ہے؟ کس کی شامت آئی ہے؟ اس ذلیل کا نام کیا ہے؟"

"بات صرف تمہارا نام معلوم کرنے کی ہے؟"

گریگوری نے کہا "میرا نام......؟" سوسن کے منہ سے نکلا اور وہ فوراً سنبھل گئی "ہاں یہ جاننا تمہارا کام ہے"

"تم کون ہو!" گریگوری نے پوچھا۔ "میں؟ میں کون ہوں؟ کیوں تم تو جانتے ہو میں کون ہوں میں ایک چھوٹی سی لڑکی ہوں پیاری سی لڑکی۔ سنہرے بالوں والی ایک بچی ہاں، میں ایک بچی ہوں، ایک معصوم پاکیزہ بچی" یہ کہہ کر وہ قہقہے لگانے لگی۔

"بچی" گریگوری نے اس کی بات دہرائی، بچی

سوسن بولی "ایک معصوم بچی تم نے کہا ہے پاکیزہ بچی...... برف کی طرح صاف وشفاف، بے داغ ایک ہلکا سا دھبہ بھی نہیں۔ کیا تم وہی پاکیزہ، بے داغ بچی ہو جس نے نادر شعر پر دست درازی کی تھی۔"

"جھوٹ...... یہ سب"

"تم اسے جھوٹ بتا رہی ہو"

"ہاں...... ہاں ہر ایک لفظ جھوٹ ہے تم میری بات پر یقین کرتے ہو نا"

"اچھا تو تم سچ سچ بتادو اپنے طور پر بتاؤ"

"اپنے طور پر بتاؤں؟ تمہیں سن کر خوشی نہیں ہوگی مجھے یقین نہیں کہ تم اسے سمجھ سکو۔ کیوں نہیں؟ تمہیں ان باتوں کے بارے میں کیا معلوم! تم مرد نہیں پادری ہو"

"میں پادری ہوں اور میں مرد بھی ہوں"

"تو سنو! میرے قریب آؤ! مرد گندگی کا ایک امیر ہوتا ہے جو گندگی کے دوسرے امیر میں ضم ہوجانے کا متلاشی ہوتا ہے" وہ کھوکھلی ہنسی ہنسی اور اسے اس گندگی میں ضم ہوجانے کو وہ بہت خوبصورت نام دیتا ہے اسے محبت...... وجدان کا نام دیتا ہے لیکن...... وہ جھوٹ بولتا ہے وہ ساری غلاظت ہے"

"اور تم؟ کیا تم بھی گندی ہو؟" گریگوری نے اس کے کان کے پاس منہ لے جا کر کہا "کیوں نہیں میں بھی انسان ہوں۔ نہیں ہوں کیا؟ گندے خیالات رکھنے والی ایک چھوٹی سی لڑکی...... گندگی کا ڈھیر" گریگوری اپنی کرسی پر کسمسایا تو سوسن ہنس کر بولی "پھر کچھ پڑھ کر سنا رہے ہو"

گریگوری کتاب کھول کر پڑھنے لگا سوسن ساتھ ساتھ لقمہ دیتی جاتی تھی "آدمیت گندگی کا دوسرا نام ہے...... ہر چیز گندگی کا ڈھیر ہے گندگی کا دھندا گھر......"

گریگوری پڑھنے سے باز نہ آیا تو وہ بالآخر بولی "رک جاؤ" وہ پڑھتا رہا۔

"بند کرو" وہ پڑھتا رہا "بند کرو...... بند کرو...... بند کرو...... آخر تم چاہتے کیا ہو"

"گریگوری پڑھتے رہو" کونارڈ نے کہا مگر گریگوری نے کچھ کہنا چاہا۔

"پڑھتے رہو" کونارڈ نے حکم دیا۔ گریگوری اٹھ کر کمرے سے چلا گیا۔ کونارڈ اس کے پیچھے لپکا اور پھر دونوں ایک دوسرے کے مقابل کھڑے ہوگئے۔

"آپ اس کی حالت نہیں دیکھ رہے ہیں" گریگوری نے نظریں بدل کر کہا "اگر یہ عمل جاری رہنا ہی ہے تو آپ پڑھیں" اس نے کتاب کونارڈ کی طرف بڑھا دی۔ "ہاں...... آپ خود پڑھیں! اس کی زندگی سے کھیلنا آپ کا مقصد ہے تو ضرور پڑھیں! لیجیے تھامیے یہ کتاب! کیا آپ یہ جسارت کریں گے؟"

"جسارت" کونارڈ نے کتاب اس کے ہاتھ

سے لے کر زمین پر پٹخ دی "مجھ میں یہ جسارت ہے میں ہر وہ کام کرسکتا ہوں جو میرے اختیار میں ہے تم مجھ سے پوچھ رہے ہو کہ میں یہ جسارت کرسکتا ہوں مجھ سے میں ڈھل مل نہیں ہوں اور نہ بزدل ہوں"

معاً کمرے سے سوسن کے قہقہے لگانے کی آواز آئی۔ یقیناً وہ فاتحانہ قہقہہ تھے گریگوری نے شکست تسلیم کرتے ہوئے جھک کر کتاب اٹھائی، اسے جھاڑا اور کمرے کی طرف بڑھا کوتارا بھی پیچھے پیچھے گیا "تم کون ہو؟" گریگوری نے سوسن پر جھکتے ہوئے پوچھا۔

"تم یہ سوال پوچھ چکے ہو" جواب ملا "کون ہو تم" گریگوری نے لہجہ بدلے بغیر پوچھا "میرا نام سوسن کارتھ ہے عمر سولہ سال، سیکرڈ ہارٹ اسکول میں پڑھتی ہوں میرا گھر......"

پھر گریگوری نے پاس رکھی ہوئی صلیب اٹھا کر اس کے پاس لے جاتے ہوئے کہا "سچ سچ بتاؤ"

"سچ کیا ہوتا ہے" سوسن نے اس کا تمسخر اڑاتے ہوئے کہا "تم کون ہو، کیا ہو، کیا نام ہے؟" گریگوری نے صلیب اس کے چہرے کے سامنے کرتے ہوئے کہا۔

"بس...... بہت ہوچکا" سوسن کراہ کر بولی۔

"میں کہتا ہوں اپنا نام بتاؤ؟"

"بس...... بس...... نام...... میرا نام......؟"

سوسن نے خشک ہونٹوں پر زبان پھیری۔ پانی کو باوقار نے سرگوشی میں کہا اور مسز خارلی پانی لینے دوڑی اس دوران میں گریگوری کہتا رہا "اگر تم نے جھوٹ بولا اور سچ نہ بتایا تو میں تم پر سختی کروں گا بہت زیادہ سختی سے پیش آؤں گا"

مسز خارلی پانی کا گلاس لے کر لوٹی اور اسے سوسن کے ہونٹوں سے لگا دیا۔ اس نے لمبے لمبے گھونٹ بھرے اور پانی اس کے چہرے اور کپڑوں پر بہہ نکلا۔

"میں......" سوسن کے منہ سے اتنی نحیف آواز نکلی کہ انہیں کان اس کے منہ کے پاس لے جانا پڑا "میرے کئی نام ہیں۔ صبح کا چمکتا ستارہ روشنی کا پیامبر، بہار کا شہزادہ، دشمن آدم، خبیث، عفریت، شیطان، ابلیس"

دین کے نام پر دنیا کمانے والے ریاکاروں کو سخت تنبیہ

نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا: آخری زمانے میں کچھ ایسے مکار لوگ پیدا ہوں گے جو دین کی آڑ میں دنیا کا شکار کریں گے، وہ لوگوں پر اپنی درویشی اور مسکینی ظاہر کرنے اور ان کو متاثر کرنے کے لئے بھیڑوں کی کھال کا لباس پہنیں گے اور ان کی زبانیں شکر سے زیادہ میٹھی ہوں گی مگر ان کے سینوں میں بھیڑیوں کے سے دل ہوں گے۔

اللہ تعالیٰ کا (ان کے بارے میں) فرمان ہے: کیا یہ لوگ میرے ڈھیل دینے سے دھوکہ کھا رہے ہیں، یا مجھ سے نڈر ہوکر میرے مقابلے میں جرات کررہے ہیں؟ پس مجھے قسم ہے کہ میں ان مکاروں پر انہی میں سے ایک فتنہ کھڑا کروں گا جو ان میں سے عقل مندوں اور داناؤں کو بھی حیران بنا کر چھوڑے گا۔ (جامع ترمذی)

صدقہ کی مختلف صورتیں

دوسروں کو نقصان پہنچانے سے بچنا صدقہ ہے۔

اندھے کو راستہ بتانا صدقہ ہے۔

مدد کیلئے پکارنے والے کی دوڑ کر مدد کرنا صدقہ ہے

بھٹکے ہوئے کو راستہ بتانا صدقہ ہے۔

راستے سے تکلیف دہ چیز ہٹانا صدقہ ہے

کسی مصیبت زدہ حاجت مند کی مدد کرنا صدقہ ہے

بھوکے کو کھانا کھلانا صدقہ ہے۔

علم سیکھ کر مسلمان بھائی کو سکھانا صدقہ ہے۔

تمہارے درخت یا فصل سے جو کچھ کھائے وہ تمہارے لئے صدقہ ہے۔

نماز کیلئے چل کر جانے والا ہر قدم صدقہ ہے۔

(انیس حبیب خان۔ کراچی)

گریگوری نے کونارڈ کی طرف دیکھا۔ اس کے چہرے پر فاتحانہ مسکراہٹ تھی "اگر تم شیطان ہو تو اس لڑکی کو اذیت کیوں دے رہے ہو؟" گریگوری سوسن پر جھک کر بولا۔ "اسے اذیت تم دے رہے ہو؟" سوسن نے کہا "میری بات کا جواب دو"

"جواب ضرور ملے گا میں نے اس پر قبضہ کرلیا ہے تاکہ اسے خودکشی پر آمادہ کروں۔"

"کیوں"

"اس لئے کہ حرام موت مر کر یہ ہمیشہ کے لئے میری ہوجائے گی"۔

"یہ تا ابد میرے ساتھ جہنم کی آگ میں رہے گی جہاں وہ بھی ہوگا"

"وہ کون"

"جس نے اس کی عزت پر ہاتھ ڈالا میری؟ میرا مطلب ہے لڑکی کی" گریگوری جلدی سے بولا "یہ نہ پوچھیں تو بہتر ہے"

"تمہیں بتانا ہوگا"

"سنو تم بھی اس لذت سے آشنا ہوسکتے ہو"

"بکواس نہ کرو"

"تمہیں بے حد لطف آئے گا"

"میں کہتا ہوں وہ کون تھا؟"

"تم میرا جواب پسند نہیں کروگے تم یقین نہیں کروگے"

"اس کی تم فکر نہ کرو"

"بتاؤ وہ کون تھا؟ یسوع مسیح اور کنواری مریم کے نام پر بتاؤ"

"نادر......"

"جھوٹ ہے" کونارڈ بھیانک آواز سے پھیپھڑوں کا پورا زور لگا کر چلایا باہر بادل زور سے گرجا اور اندھیرے میں بجلی تلوار کی طرح چمکی تند و تیز ہوا کا جھونکا کھڑکیوں کے بند شیشوں سے ٹکرایا، اور دھائیں دھائیں بارش ہونے لگی۔

"یہ سفید جھوٹ ہے سراسر بہتان ہے" کمرے سے باہر نکل کر گریگوری کونارڈ سے کہہ رہا تھا "مجھے یقین ہے فادر جمیز یہ حرکت نہیں کرسکتے"

"تمہیں کس طرح یقین ہے کونارڈ" سرد لہجے میں بولا "خود آپ نے بھی تو اسے جھوٹ کہا ہے؟" گریگوری حیرانی سے بولا "وہ میں نے جوش میں آکر کہہ دیا تھا" کونارڈ نے لاپرواہی سے کہا "لیکن یہ ناممکن ہے" گریگوری نے احتجاج کیا۔

"حیرت انگیز کہو، ناقابل یقین کہو لیکن ناممکن نہیں ہے" کونارڈ بولا۔ "یور ایکسی لینسی" گریگوری نے ٹھہری ہوئی آواز میں کہا "یہ مت بھولئے کہ یہ بہتان شیطان نے لگایا ہے آپ جھوٹ کے جد امجد کی بات مان لیں گے اس کے کہنے کو سچ مان لیں گے"

"یہ ضروری نہیں ہے" کونارڈ نے جواب دیا "لیکن اس کے کہے پر یقین نہ کرنے کی کوئی وجہ نہیں ہے آؤ چل کر دوبارہ اس کہانی کا تجزیہ کرتے ہیں"

دونوں کمرے میں گئے تو سوسن آنکھیں کھولے اسی طرح پڑی تھی۔ "سوسن" گریگوری نے گہری سنجیدگی سے کہا "اس بارے میں ذرا تفصیل سے بتاؤ وقت کیا تھا، کون سی جگہ تھی"

"اچھ..... چھا" سوسن تمسخرے سے بولی "مجھے تمہاری دلچسپی کی وجہ معلوم ہے یہ راہب نہیں تلذذ بخش ہے مزے لے لے کر ہونٹ چاٹ چاٹ کر اس کی تفصیل سنو گے"

گریگوری نے زور سے اسے چانٹا لگایا

"گریگوری" کونارڈ چیخا۔ گریگوری نے دوسرا چانٹا لگایا تو سوسن بلبلا اٹھی اس کے منہ سے دبی دبی سسکیاں اور کراہیں نکلنے لگیں گریگوری نے پھر ہاتھ اٹھایا تو کونارڈ نے روک دیا۔

"کیا کررہے ہو گریگوری" کمرے سے باہر ہوا کے جھکڑ بادلوں کی گڑگڑاہٹ اور موسلا دھار بارش کا بے ہنگم شور تھا کمرے میں مکمل سکوت تھا۔ معاً صدر دروازے پر دستک ہوئی "کوئی دستک دے رہا ہے" مسز فاریل بولی۔ "دیکھنے دو" کونارڈ نے جھلا کر کہا۔

"مصلوب مسیح کے نام پر بتادو، کیا واقعی فادر جیمز نے سوزن کارتھ کی عزت پر ہاتھ ڈالا تھا" گریگوری نے گڑگڑا کر سوزن سے کہا کوئی دروازہ زور زور سے پیٹنے لگا۔

"یور ایکسی لینسی" مسز خاری نے کونارڈ کی توجہ اس طرف مبذول کرانا چاہی "کھٹکھٹانے دو" کونارڈ غرا کر بولا "میں نے فادر جیمز کا نام کب لیا" سوزن نے اطمینان سے کہا گریگوری اور کونارڈ ایک دوسرے کا منہ تکنے لگے۔

"تم ہی نے تو فادر کہا تھا" گریگوری نے گھٹنوں کے بل جھک کر کہا "کیا فادر صرف روحانی باپ کو کہتے ہیں؟" سوزن نے مصنوعی حیرت سے کہا۔ "فادر دوسرے معنوں میں بھی تو باپ کو کہتے ہیں"

"اگر وہ فادر جیمز نہیں تھا تو پھر کون تھا؟" گریگوری نے زچ آ کر کہا "وہی جو اس وقت دروازے پر دستک دے رہا ہے" سوزن نے آنکھیں بند کرتے ہوئے کہا۔ گریگوری تیزی سے دروازہ کھولنے چلا گیا۔

اس کے سامنے کارتھ کھڑا تھا سوزن کے الفاظ گریگوری کے کانوں میں گونج اٹھے اور وہ بے حس و حرکت کھڑا رہا "ہٹ جاؤ میرے راستے سے" کارتھ، گریگوری کو دھکا دے کر اندر گھس آیا۔ گریگوری نے دروازہ بند کر دیا۔

"کہاں ہے وہ؟" کارتھ گرد و پیش پر نظریں دوڑاتے ہوئے غصے سے بولا "وہ اوپر ہے اور بالکل ٹھیک ٹھاک ہے" گریگوری نے کہا "ذرا میری بات سنو"

"ہاں..... ہاں ضرور سنوں گا" کارتھ دانت کچکچا کر بولا "پہلے مجھے اپنی بیٹی کے پاس لے چلو"

"تمہاری بیٹی! تم اس کے باپ ہو" سوزن کے لئے کون سا باپ بدتر ہے روحانی یا جس کے نطفے سے اس نے جنم لیا آؤ میرے ساتھ" اس نے کارتھ سے کہا۔

"اگر کسی نے اس پر ہاتھ اٹھایا ہوگا یا اسے ذرا بھی تکلیف پہنچائی گئی ہوگی تو اچھا نہ ہوگا" کارتھ کہتا جا رہا تھا "تو تم دروازہ پیٹ رہے تھے" کونارڈ نے کارتھ کو دیکھ کر کہا۔ "ہاں میں تھا" کارتھ نے کہا اور سوزن پر نظر پڑتے ہی دوڑ کر اس کے پاس گیا "بے بی ان لوگوں نے تمہارا کیا حشر کر دیا" سوزن نے کوئی جواب نہ دیا۔ "میری بات سن رہی ہو جان میں ہوں تمہارا ڈیڈی" اس نے یہ کہتے ہوئے پلٹ کر دونوں پادریوں کو دیکھا اور غضبناک ہو کر بولا "تم نے اس کے ساتھ کیا کیا ہے؟"

"مسٹر کارتھ" گریگوری نے کہنا چاہا "اسے نشہ آور چیز پلائی ہے؟"

"اس کا یہ حال کیوں ہے؟" اس نے چلا کر کہا

"یاد رکھو کہ تم راہب کدے میں ہو اپنی زبان پر قابو رکھو" کونارڈ نے تنبیہ کی۔

"مجھے یہ دھونس مت دو۔ تمہیں یہ حساب چکانا ہوگا" کارتھ نے غصہ سے کہا "کیا تم ہمیشہ اسی طرح دستک دیتے ہو؟" کونارڈ بولا "بہت تھکے لگ رہے ہو نیچے جا کر آرام کر لو"

"نہیں میں سوزن کو گھر لے جا رہا ہوں" کارتھ نے سختی سے کہا۔ "یور ایکسی لینسی کیا آپ باہر آنے کی زحمت کریں گے؟" گریگوری نے کونارڈ سے کہا اور دونوں باہر چلے گئے۔

"اب کیا کرنا چاہئے؟" گریگوری نے کونارڈ سے کہا اور دونوں باہر چلے گئے۔

"اب کیا کرنا چاہئے؟" گریگوری نے کہا "کیا اسے بتا دیں کہ کیا کچھ ہوا ہے کیا اس نے اندازہ نہیں لگایا ہوگا؟" کونارڈ نے جواباً سوال کیا۔ "اچھا تو اب یہ مجھ پر چھوڑ دیجئے آیئے اندر چلیں۔" گریگوری نے فیصلہ کن لہجے میں کہا اور دونوں کمرے میں چلے گئے۔

"اس سے پہلے کہ تم ہم سے جواب طلبی کرو، تم اپنے بارے میں بتاؤ۔" گریگوری کارتھ سے مخاطب ہوا "اپنے اور سوزن کے بارے میں اپنے اور اپنی بیوی کے بارے میں چھ سال پہلے تمہاری بیوی مری تھی تو اس کے بعد کیا ہوا تھا؟ وہ کس طرح مری تھی؟"

"پتہ نہیں تم یہ کیا کہہ رہے ہو" کارتھ غرا کر بولا

”کیا مجھ پر کوئی مقدمہ چلایا جا رہا ہے“

”ابھی نہیں“ گریگوری نے سرد مہری سے کہا ”میں ٹھنڈے دماغ کا آدمی ہوں اور پولیس کو بلانے سے پہلے تمہاری طرف سے صفائی سننا چاہتا ہوں“

”پولیس؟ میری صفائی؟ یہ تم کیا کہہ رہے ہو؟“ گارتھ لال پیلا ہوتے ہوئے بولا۔ ”خون زیادہ دور نہیں ہے میں پولیس کو فون کرنے جا رہا ہوں“ گریگوری یہ کہہ کر دروازے کی طرف بڑھا۔

”ٹھہرو!“ پیچھے سے گارتھ نے کہا گریگوری رک گیا ”چھپانے کی کوئی بات نہیں ہے سب کو معلوم ہے۔“ گارتھ کہنے لگا۔ ”اتوار کا دن تھا میں اپنی بیوی اور سوسن کو لے کر پکنک منانے نکلا۔ سوسن اس وقت دس سال کی تھی جس جگہ ہم گئے ایک پارک سا تھا اور اس کے قریب ہی دریا بھی تھا ہم نے کھانا کھایا اور ایک کشتی کرائے پر لی۔ میں کشتی کھینچنے لگا اور ہم بہت دور نکل گئے سوسن اپنی جگہ نہ بیٹھتی تھی کبھی کھڑی ہو جاتی اور کبھی اچھلنے لگتی میں اسے بار بار منع کرتا رہا لیکن وہ مانتی نہ تھی آخر ہونی ہو کر رہی وہ توازن قائم نہ رکھ سکی اور وہ پانی میں گر گئی میں نے چپو ہاتھ سے رکھ کر اس کے پیچھے چھلانگ لگا دی لیکن میرے جسم کے بوجھ سے کشتی بھی الٹ گئی مجھے اس کا علم اس وقت ہوا جب میں نے اپنی بیوی کی چیخیں سنیں وہ پانی میں بری طرح ہاتھ پاؤں مار رہی تھی میں سخت مشکل میں تھا ایک طرف سوسن ڈوب رہی تھی اور دوسری طرف بیوی پانی کے بہاؤ پر تھی میں نے سوسن کو پکڑا تو وہ مجھ سے چمٹ گئی اور دیکھتے ہی دیکھتے بیوی.....“ گارتھ نے سر جھکایا۔

”تو تمہاری بیوی ڈوب گئی“ گریگوری کی آواز کمرے کے سکوت کو توڑتی ہوئی ابھری۔ ”میں اور سوسن بھی ڈوبنے والے ہی تھے لیکن ایک اور کشتی آ نکلی اور ہم بچا لئے گئے کشتی والوں نے میری بیوی کو بھی بچانے کی کوشش کی لیکن بے سود“

”اب بیوی کے بیمے کے بارے میں بھی بتاؤ“ کونارڈ نے کہا۔ ”کیا مطلب؟“ گارتھ نے حیرت سے پوچھا۔

”یہی کہ تم نے بیوی کی زندگی کا بیمہ کرا رکھا تھا اور اس کے مرنے پر تمہیں معقول رقم ملی“ کونارڈ نے کہا۔

”مسٹر میں اس طرح بیمے کی رقم حاصل کرنے والا دنیا کا واحد آدمی نہیں ہوں.....“ گارتھ نے کرختگی سے کہا۔

”یہ درست ہے“ کونارڈ بولا ”تم پہلے آدمی ہو نہ آخری لیکن تمہیں بھاری رقم کے ساتھ ایک اور چیز بھی ملی۔“

”وہ کیا؟“

”سوسن“

”کیا کہا.....؟“

”سوسن.....“ گریگوری نے کونارڈ کی بات کو آگے بڑھاتے ہوئے کہا ”تمہیں سوسن مل گئی گھر میں بالکل تنہا، ماں کا کانٹا نکل گیا تھا اس عمر میں بھی وہ بڑے دلکش جسم کی مالک تھی تم اسے دلار سے گھٹنوں پر بٹھاتے تھے“

”ہاں“ گارتھ نے خون کے آنسو پیتے ہوئے کہا ”ایک باپ ایسا کرتا ہے“

”لیکن تمہارے معاملے میں یہ محض ایک باپ کی بات نہیں تھی“ گریگوری نے اس کی بات کاٹی ”تمہارے جذبات اس وقت کچھ اور ہی ہوتے تھے“

”تم بکواس کر رہے ہو؟“ گارتھ گرجا۔

”جب بیوی نہ رہی تو تم نے سوسن کو اس کی جگہ دینا چاہی“ گریگوری اس کی بات سنی ان سنی کرکے کہتا رہا۔ ”اور یہی وجہ ہے کہ تم اسے ماہر نفسیات کے پاس لے جانے سے ڈرتے ہو“

”نہیں..... یہ غلط ہے......... سراسر غلط.....“ گارتھ دہاڑا۔

”سچ ہے..... بالکل سچ“ سوسن کی آواز سے سب چونک پڑے ”بیوی کو مرے ایک ہفتہ بھی نہیں گزرا تھا کہ اس نے مجھے ہوس کا نشانہ بنانا شروع کیا“

”سوسی!“ گارتھ تڑپ کر چیخا اس سے کہتا رہا۔ ”اسے اپنی ماں کی جگہ لینی چاہئے اس کی جگہ گھر کی

مالکن بننا چاہیے اسے ایک مکمل عورت بننا چاہیے......" "سوسن چپ رہو" گارتھ پھر دھاڑا۔

"اور اس کے کہنے کے مطابق ایک لڑکی بہت سے طریقوں سے اپنے باپ کے ساتھ اظہار محبت کرسکتی تھی...... تمام طریقوں سے...... چند طریقے اس نے بتائے بھی......"

"ذلیل خنزیر" گارتھ اچھل کر کھڑا ہو گیا سوسن نے قہقہہ لگایا اور گارتھ نیم جان سا دوبارہ بیٹھ گیا۔ "یہ جھوٹ ہے...... سارا کا سارا جھوٹ ہے" اس نے مری ہوئی آواز سے کہا "اس کی بات پر یقین مت کرو یہ بڑی خبیث اور گندے خیالات کی لڑکی ہے۔ اس نے خود...... خود اس نے...... مجھے غلط راستے پر ڈالنا چاہا۔"

"کیا کوئی شخص بیوی کے قاتل کی بات مان لے گا" کونارڈ نے اسے گھورتے ہوئے کہا گارتھ نے ایک ٹھنڈی سانس لی اور اداس لہجے میں کہنے لگا "ہاں میں جانتا ہوں کہ تمہارے ہاتھ یہ بات کیسے لگی یہ شروع سے ہی کہہ رہی تھی کہ "تم نے ماما کو مرنے کیوں دیا؟"

انہیں تم نے مارا ہے؟ ہاں تم نے انہیں مارا ہے تم نے، وہ زندہ تھیں تو تم ان سے اچھا سلوک نہیں کرتے تھے ان سے نفرت کرتے تھے، چاہتے تھے کہ وہ مر جائیں"

"میں مانتا ہوں کہ میں ایک اچھا شوہر نہیں تھا اور میری بیوی کا ڈوب جانا مشکوک ہو گیا اس کی واحد بیٹی شاید سوسن تھی جو کہتی ہے کہ میں نے اس کی ماں کو مار دیا ہے اچھا اب میں اسے گھر لے جا رہا ہوں"

"نہیں۔ تم اسے نہیں لے جاؤ گے" گریگوری بولا گارتھ اٹھ کھڑا ہوا "دیکھو ڈاکٹر مجھے اس بات کی پرواہ نہیں ہے کہ تمہارے پولیس کے ساتھ کیسے تعلقات ہیں میں بھی انہیں بتاؤں گا کہ تم نے میری بیٹی کو قید کر رکھا ہے۔"

"یہ اس کی مرضی ہے" گریگوری نے کہا "تو اسے باندھ کیوں رکھا ہے، اسے کھول دو یا میں خود کھول دوں" گارتھ بولا۔ "تم ابھی پولیس کے پاس جا سکتے ہو"

گریگوری نے جواب دیا "ہم چاہتے ہیں کہ تم جاؤ۔"

"کیا سمجھتے ہو کہ میں خالی ہاتھ چلا جاؤں گا میں اپنی بیٹی کو لے کر جاؤں گا" گارتھ بولا۔ "تو تمہیں ٹھہرے رہو اور جو کچھ ہم کریں اسے خاموشی سے دیکھتے رہو ہم صرف کتابیں پڑھیں گے" کونارڈ نے پرسکون لہجے میں جواب دیا۔

گارتھ دھم سے بیٹھ گیا اور گریگوری سوسن کے پاس بیٹھ کر کتاب پڑھنے لگا وہ دیر تک پڑھتا رہا اور سوسن آنکھیں بند کیے سنتی رہی گریگوری نے کتاب ختم کی اور ایک کونے میں رکھا ہوا عطر پاش اٹھا کر مقدس پانی کمرے میں چھڑکنے لگا۔

"مائی ڈیئر اب تم ٹھیک ہو؟" کونارڈ نے ملائمت سے پوچھا "جی ہاں" سوسن نے نحیف آواز میں بڑی تعظیم سے کہا "یور ایکسی لینسی اب میں، میں بالکل ٹھیک ہوں"

کونارڈ نے پلٹ کر گارتھ کی طرف دیکھا، اس کی کرسی خالی تھی گریگوری بھی اسے غائب دیکھ کر چونکا "گارتھ" وہ پکارتا ہوا کمرے سے باہر نکلا "تم کہاں ہو؟" گارتھ اس کی نظر مسز خارلی پر پڑی جو دوڑتے ہوئے ہانپتی ہوئی تیزی سے اوپر آرہی تھی اوپر پہنچی تو اس کا سانس پھولا ہوا تھا چہرہ ہلدی کی طرح سفید تھا اور آنکھوں سے وحشت ٹپک رہی تھی۔

"نہیں...... نہیں ہاتھ...... میں نے...... میں نے خود دیکھا اپنی آنکھوں سے دیکھا......" اس کے منہ سے الفاظ ٹوٹ ٹوٹ کر نکل رہے تھے "کیا دیکھا؟ مسز خارلی تم نے کیا دیکھا" گریگوری نے حیرت سے پوچھا "وہ آسمان سے نکلا اور...... اور...... اسے زمین پر گرا دیا......" مسز خارلی کے ہوش بجا نہ تھے۔

"تم ہوش میں تو ہو" گریگوری نے اسے شانوں سے پکڑ کر جھنجھوڑا "کسے گرا دیا؟"

"اسے...... ابلیس" کو مسز خارلی کی آنکھیں بند ہونے لگیں۔ "اس گارتھ کو" اور وہ بے ہوش ہو کر گریگوری کی بانہوں میں جھول گئی۔

"یاد رکھیے جو کچھ بھی آپ کہیں گے وہ آپ کے خلاف بطور شہادت استعمال ہوسکتا ہے۔" پولیس افسر لیفٹیننٹ فریک بیرارڈی نے دوسری یا تیسری مرتبہ کہا۔

"ہاں میں جانتا ہوں اور اسی لئے بغیر کچھ سوچے سمجھے نہیں کہوں گا۔" گریگوری نے نیم مسکراہٹ سے جواب دیا۔ "آپ کے خیال میں کارتھو کی موت کس طرح واقع ہوئی؟" فریک نے پوچھا "میں کچھ نہیں کہہ سکتا۔" گریگوری نے سپاٹ لہجے میں جواب دیا۔ "اور آپ فادر؟" فریک نے کونارڈ سے پوچھا۔

"کچھ کہا نہیں جاسکتا سوائے اس کے کہ اس کی موت قدرتی تھی دست غیب نے اسے ہلاک کیا" کونارڈ بولا۔

"تو آپ کے خیال میں ہر موت میں دست غیب شامل ہوتا ہے" فریک نے کہا "ہاں" کونارڈ نے جواب دیا۔ "قتل میں بھی؟" فریک نے چبھتا ہوا سوال کیا "تو تمہارے خیال میں کارتھو کو قتل کیا گیا ہے؟" کونارڈ نے الٹا اس سے سوال کیا۔

"میرا تعلق پولیس میں قتل کی تفتیش کے شعبہ سے ہے یور ایکسی لینسی البتہ قدرتی طور پر میرے ذہن میں یہ بات آرہی ہے" فریک بولا۔ "اس پر تو بجلی گری تھی میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا پاس سے" مسز خارلی بول پڑی۔

"بجلی گری ضرور تھی لیکن اس سے کچھ فاصلے پر" فریک نے بڑی تہذیب سے اس سے کہا "دور سے تمہیں یہی نظر آیا ہوگا کہ بجلی اس پر گری ہے کیا آپ نے کارتھو کا سابقہ ریکارڈ چیک کیا؟" گریگوری نے پوچھا۔

"کیا مطلب ہے آپ کا فادر؟" فریک نے بھنویں اچکا کر پوچھا "کوئی جنسی جرم؟" گریگوری نے کہا۔ "یا جب اس کی بیوی ڈوب کر مری تھی اس سلسلے میں کوئی تفتیش؟"

"اس سے آپ کیا نتیجہ نکالنا چاہتے ہیں؟"

"یہ ہوسکتا ہے کہ اسے اپنا جرم ظاہر ہوجانے کا خدشہ ہوگیا اور اس نے خودکشی کرلی ہو"

"ٹھہریئے!" مسز خارلی اچانک بول پڑی "اس طرف تو میرا خیال گیا ہی نہیں جب ہز ایکسی لینسی اور فادر چند لمحوں کے لئے لڑکی کے کمرے سے باہر گئے تھے اور کارتھو وہیں رہا تھا تو میں نے اسے جیب سے ایک چھوٹی سی شیشی نکالتے اور اس میں سے کوئی چیز نکال کر منہ میں ڈالتے ہوئے دیکھا تھا اس سے کچھ دیر بعد ہی وہ سڑک پر جاکر مر گیا"

"شیشی" فریک چونکا "ہاں اس کی جیب سے ایک شیشی برآمد تو ہوئی ہے ٹھہریئے......" اس نے بڑھ کر فون اٹھایا۔ "ڈاکٹر فوسٹر میں فریک برارڈی بول رہا ہوں کارتھو کی جیب سے جو شیشی نکلی ہے اس پر لیبل کیا لگا ہے"

"لیبل نہیں ہے؟"

"اچھا تو آپ گولیوں کا کیمیائی تجزیہ کریں اور مجھے بتائیں۔"

"خودکشی" اس نے فون بند کرکے زیر لب کہا "اس سمت میں تو میرا ذہن گیا ہی نہیں اچھا اب میں اس کی لڑکی سے سوالات کروں گا۔" لیفٹیننٹ نے کہا۔ "لڑکی ابھی تمہارے سوالوں کا جواب دینے کے قابل نہیں ہے اسے تو اب تک اس کے باپ کی موت کا بھی نہیں بتایا گیا کچھ بھی ہو میں اس سے ملوں گا" فریک نے کہا۔

"تم اس وقت اس سے نہیں مل سکتے!" گریگوری نے سختی سے کہا۔ "وہ آسیب کے زیر سایہ رہی ہے اس کی ذہنی حالت ٹھیک نہیں ہے" کونارڈ نے مداخلت کی۔

"میں پولیس والا ہوں جناب" فریک نے طنز سے کہا "ہم لوگ ہر کام روحانیت کے ذریعے نہیں کرتے ہیں"

"بہر حال تم اس سے نہیں مل سکتے" گریگوری نے عزم سے کہا اور اس کا راستہ روک کر کھڑا ہوگیا۔

"تم اس وقت راہب کدے اور بشپ کے

روبرو ہو لیفٹیننٹ۔" کونارڈ نے گمبھیر لہجے میں کہا
"میرے راستے سے ہٹ جاؤ" فریبک اس کی بات کو نظر انداز کرتے ہوئے گریگوری سے بولا "میں اپنا فرض ادا کرنے جارہا ہوں کیا یہ ممکن ہے کہ کارتھ نے خودکشی کی ہو اور اسے زہر دے کر ہلاک کیا گیا ہو۔"

معاً گریگوری کے ذہن میں ایک بجلی سی کوندی اور اس کی چمک میں اسے فادر جیمز پر سوسن کا حملہ یاد آیا۔ پھر اس کی کارتھ سے نفرت اس میں شامل ہوگئی وہ ابھی فیصلہ نہ کرپایا تھا کہ وہ فریبک کا راستہ چھوڑ دے یا اسے بخوشی اندر جانے نہ دے کہ صدر دروازے کی گھنٹی بجی۔

"گھنٹی نے آپ کو ناخوشگوار واقعہ سے بچالیا ہے فادر" فریبک زہرخند سے بولا "میرا کوئی آدمی آیا ہوگا میں ابھی آتا ہوں، اور آکر سیدھا لڑکی کے پاس جاؤں گا" وہ دھم دھم کرتا گیا اور جب لوٹا تو اس کے ساتھ فادر جیمز تھا۔

"اوہ فادر! اچھا ہوا، آپ آگئے، یہاں بڑے عجیب واقعات ہورہے ہیں" مسز فارلی اسے دیکھتے ہوئے بڑی بے تابی سے آگے بڑھی اور اس کا ہاتھ چوم لیا۔ گریگوری نے لب بھر اس سے ہاتھ ملایا۔

کونارڈ نے اس کا خیر مقدم کرتے ہوئے کہا "جیمز میرے بچے کیسے آنا ہوا؟"

"میں اعتراف کرنے آیا ہوں" جیمز نے ٹھہری ہوئی آواز میں کہا کمرے میں سکوت چھا گیا کونارڈ اور گریگوری کے منہ کھلے کے کھلے رہ گئے۔

"کارتھ ایک روز میرے سامنے اعتراف کرنے آیا تھا" جیمز کہنے لگا "جیمز" کونارڈ دھاڑا۔ "میں جانتا ہوں یور ایکسی لینسی کہ کلیسا کے مقدس قوانین سے انحراف کررہا ہوں" جیمز کہتا رہا "لیکن میں مجبور ہوں"

"تم ایک کیتھولک مسیحی کا راز فاش کرنے کا گناہ کررہے ہو، اس نے تم پر روحانی باپ کی حیثیت سے اعتماد کیا تھا" کونارڈ نے غرا کر کہا "بیان جاری رکھیے فادر" فریبک نے جیمز سے کہا۔

"وہ اپنے سینے پر کئی سالوں سے ایک بوجھ لئے پھر رہا تھا جسے وہ اعتراف گناہ کرکے ہلکا کرنا چاہتا تھا" جیمز نے بات جاری رکھی "اس نے بتایا کوئی چھ سال قبل اس نے اپنی بیوی کو دریا میں ڈبو دیا تھا تاکہ اس کی زندگی کے بیمے کی رقم دس ہزار ڈالر حاصل کرلے۔ میں نے اس سے پوچھا کہ کیا وہ تنہا اس رقم کا حقدار ہے تو اس نے بتایا کہ اس کی لڑکی اس میں برابر کی شریک ہے۔ میں نے اس سے نیک چلنی کی ضمانت طلب کی اسے باقاعدگی سے گرجا میں آتے جاتے رہنے اور اپنے گناہ کی معافی مانگتے رہنے کو کہا اور اس کا گناہ بخشے جانے کی دعائیں دے کر رخصت کیا لیکن اس کے جاتے ہی ایک انجانا سا خوف میرے ذہن کے آس پاس منڈلانے لگا وہ اس رقم کا واحد حقدار نہیں تھا اور سوسن اس کی لڑکی اس میں برابر کی حصہ دار تھی۔ تو کیا جب وہ دولت کے لئے ایک انسان کو قتل کرسکتا ہے تو دوسرے کو نہیں کرسکتا۔

یہی وسوسہ دن رات میرے ذہن پر چھایا رہا ایک قاتل میری نظروں کے سامنے تھا لیکن میں اس کا کچھ بگاڑ نہیں سکتا تھا کیونکہ کلیسا کے قوانین کے مطابق میں اس کا راز دوسروں پر افشا نہ کرسکتا تھا میں اسے آزادی سے گھومتے پھرتے دیکھتا تو میرے سینے پر سانپ لوٹ جاتے جی چاہتا کہ اس کے ٹکڑے ٹکڑے کر ڈالوں، لیکن بے بسی میرا منہ چڑا رہی تھی۔

آخر مجھ سے نہ رہا گیا تو میں اس کے گھر گیا اور اسے سمجھایا کہ وہ پولیس کے سامنے اپنے جرم کا اقرار کرلے۔ میرے سمجھانے بجھانے سے اس نے حامی تو بھرلی لیکن خود کو قانون کے حوالے کرنے میں ٹال مٹول کرتا رہا اس کے بعد میرے یہاں سے ٹرانسفر کے احکام آگئے اور میں نے خدا کا شکر ادا کیا کہ کارتھ سے چھٹکارا ملے گا لیکن اسی وقت میرے تصور کے دریچے میں سوسن آن کھڑی ہوئی اور میں لرز لرز اٹھا میں اس معصوم کو ایک بھیڑیے کے چنگل میں چھوڑ کر جارہا تھا یا

خدایا میں کیا کروں۔

اچانک قدرت کی طرف سے ایک اتفاق پیش آ گیا۔ فادر گریگوری کے آنے پر میں لوگوں سے رخصت ہونے گیا تو کیمسٹ لفٹی سے بھی ملنے گیا جب وہاں سے چلنے لگا تو اس نے پوچھا "کیا میں کارتھ کے پاس بھی جاؤں گا" میرے ہاں کہنے پر اس نے ایک شیشی دے کر کہا "میں اسے کارتھ کو دے دوں" مصروفیت کی بناء پر وہ اس کے گھر نہ جا سکے گا۔ کارتھ دل کا مریض تھا اور اس کا پرانا گاہک تھا میں نے وہ شیشی طوعاً و کرہاً کارتھ کو پہنچا دی۔

"کیا اس پر کارتھ کے نام کا لیبل لگا تھا؟" فریک نے پوچھا۔ "ہاں" جیمز نے کہا "لیکن اس کی جیب سے جو شیشی ملی ہے اس پر کوئی لیبل نہ تھا" فریک نے کونارڈ کی طرف دیکھ کر کہا تو اس نے لاپرواہی سے شانے اچکا دیئے۔

"تو اس کا یہ مطلب ہوا کہ کارتھ نے خودکشی کرلی" فریک نے جیسے خود سے کہا "حالات سے ظاہر تو یہی ہوتا ہے" گریگوری نے کہا "اسے اپنا جرم ظاہر ہونے کا خوف ہوگیا تھا"

"یہ بھی تو ہوسکتا ہے کہ اس کا ضمیر جاگ گیا ہو" فریک نے کہا۔

"تم اب بھی لڑکی سے پوچھ گچھ کرنا چاہو گے؟" گریگوری نے پوچھا۔ "ہاں لیکن اس وقت نہیں" فریک نے جواب دیا۔ "قانونی کارروائی تو بہرحال پوری کرنی ہے۔"

اس واقعہ کو مہینوں گزر گئے تھے اور سوسن فادر جیمز کی تحویل میں یتیم خانے میں رہ رہی تھی۔ کرسمس کا روز آیا ایسے میں اپنے پرائے سب ہی یاد آتے ہیں۔ گریگوری کو سوسن یاد آئی اور اس نے اسے فون کیا۔ سوسن کی آواز مسرت اور تسکین سے لبریز تھی۔ ادھر ادھر کی باتیں کرنے کے بعد اس نے کہا "فادر! اگلے سال میں اٹھارہ سال کی ہوجاؤں گی اور نابالغ ہونے کا ٹھپہ مجھ پر سے اتر جائے گا میں اپنی مرضی کی زندگی گزارنے کے لئے آزاد ہو جاؤں گی پیسے کے دس ہزار ڈالر بھی مل جائیں گے" گریگوری نے مسکرا کر کہا۔

"ہاں" سوسن نے ایک عجیب سنجیدگی سے جواب دیا "مل جائیں گے" گریگوری نے اسے پیشگی مبارکباد دی اور حوصلہ افزائی کی چند باتیں کہہ کر فون رکھ دیا۔ پھر اس نے بشپ کونارڈ کا نمبر ملایا۔ اسے کرسمس کی مبارکباد دی، اس سے دعائیں لیں اور اسے اپنی اور سوسن کی گفتگو کے بارے میں بتایا۔

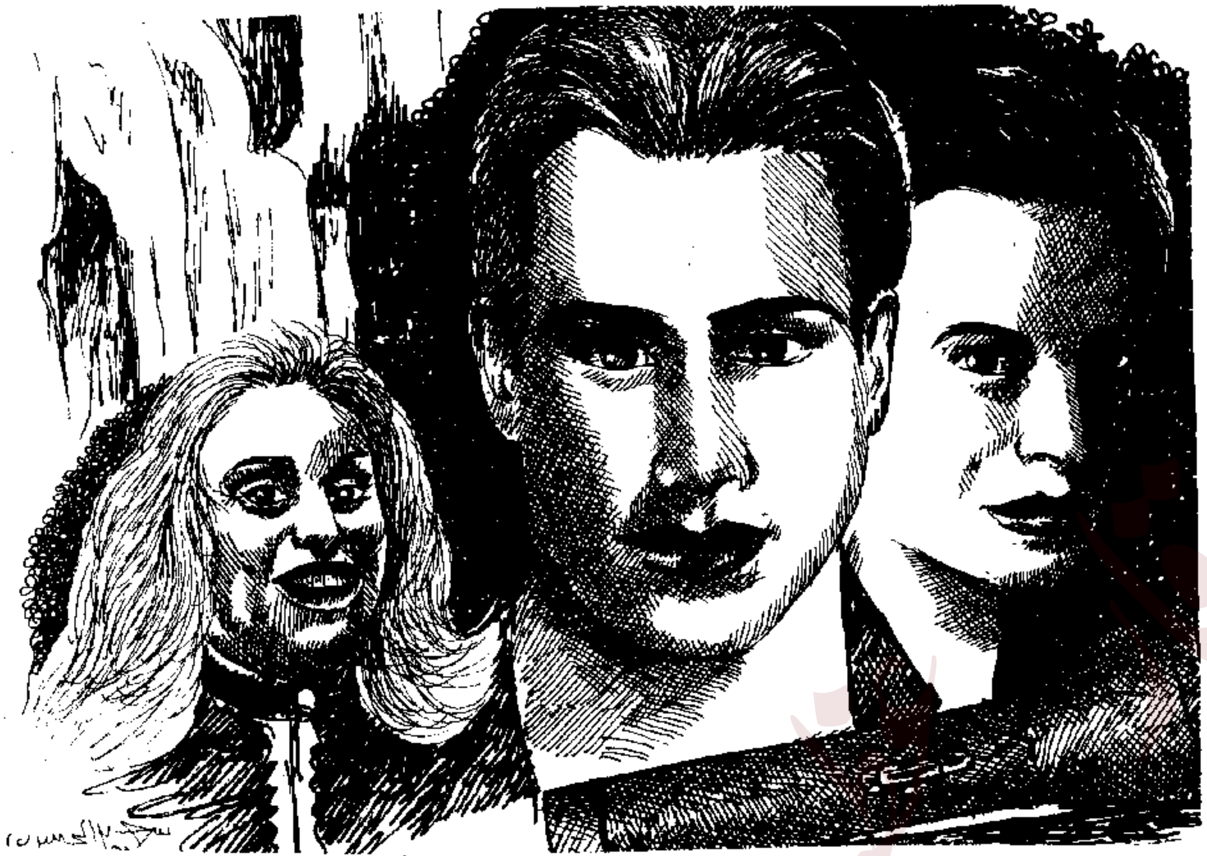
"یور ایکسی لینسی" اس نے ساری گفتگو بتا کر کہا "میرے اس رشتے کے بھائی نے جو ماہر نفسیات ہے جس نے شک شبے کا اظہار کیا تھا آج مجھے اس پر کچھ یقین سا آرہا ہے"

"اس ماہر نفسیات کا کہنا تھا کہ" کارتھ نے خودکشی نہیں کی اس کی جیب میں گولیوں کی شیشی بدل دی گئی۔ اس کی جگہ زہر کی شیشی رکھ دی گئی اب دیکھئے نا فادر جیمز کو اسے شیشی دیئے ہوئے کئی روز گزر گئے تھے اگر وہ غلط شیشی ہوتی تو وہ کب کا مر چکا ہوتا، زہر کی شیشی اس کی جیب میں اس کی موت سے ایک آدھ دن یا چند گھنٹے پہلے ڈالی گئی۔"

"لیکن یہ کون کرسکتا تھا؟"

"کیا سوسن.....؟" کونارڈ نے پوچھنا چاہا۔

"ہاں سوسن" گریگوری نے اس کا جملہ اچک لیا۔ "وہ ایک ذہین لڑکی ہے۔ ماں کی موت نے اسے باپ سے متنفر کردیا تھا اور وہ اس سے انتقام لینے کے مختلف طریقوں پر غور کرتی رہی۔ دوسری طرف اسے پیسے کی رقم کا بلا شرکت غیرے مالک بھی بننے کی ار بن گئی چنانچہ اس نے ایک طویل اور پیچیدہ منصوبہ تیار ک اور اس میں اپنا کردار بڑی کامیابی سے ادا کیا، قانو اس کا کچھ نہ بگاڑ سکتا تھا..... کچھ نہ بگاڑ سکے گا، شیطا نے اس پر قبضہ نہیں کیا تھا۔ بلکہ شیطان اس کے اند موجود تھا یعنی وہ خود شیطان تھی۔



سرد جہنم

ایس امتیاز احمد۔کراچی

اپنے وقت کا عظیم المرتبت ڈاکٹر جس کا سکہ ہر ذہن پر بیٹھ چکا تھا مگر وہ خود اپنے ہی تجربہ کی بھینٹ چڑھ گیا اور پھر اس کے آخری الفاظ دوسروں کے لئے مشعل رہ بن گئے۔

قارئین! اگر آپ اس کہانی سے لطف اندوز ہونا چاہتے ہیں تو اسے رات کی تنہائی میں پڑھیں

آپ پوچھ رہے ہیں کہ میں سرد ہوا سے کیوں ڈرتا ہوں۔ ٹھنڈے کمرے میں داخل ہوتے ہی مجھ پر دہشت کا عالم کیوں طاری ہو جاتا ہے اور بہار کے دلفریب موسم میں جب کوئی خوش گوار دن، خنک شام میں ڈھلنے لگتا ہے، تو لرز کیوں اٹھتا ہوں۔ کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ میں طبعاً سردی سے متنفر ہوں، چنانچہ مجھے کئی بار مشورہ دیا گیا کہ مستقلاً کسی گرم استوائی ملک میں رہائش اختیار کرلوں۔ بعض احباب سمجھتے ہیں کہ میں ڈرامائی کیفیت پیدا کرنے کے لئے سردی سے خوف زدہ ہونے کا مظاہرہ کرتا ہوں اور اس مظاہرے سے میرا مطلب یہ ہوتا ہے کہ سے زیادہ لوگ متوجہ ہوں اور مجھے حیرت کی نظر سے دیکھیں۔

دوسرے لفظوں میں یہ کہا جاتا ہے کہ میں نمائش پسند ہوں۔ خدا گواہ ہے یہ دونوں نظریئے غلط

ہیں۔ جو اصحاب بچپن سے جانتے ہیں انہیں اچھی طرح معلوم ہے کہ مجھے نمائش اور ظاہر پسندی سے ہمیشہ نفرت رہی ہے۔ میں الگ تھلگ اور سادہ زندگی بسر کرنے کا عادی ہوں۔ رہا دوسرا نظریہ، تو اس امر کی تصدیق کرنے والے بھی مل جائیں گے کہ کچھ عرصہ پہلے مجھے سردی سے قطعی خوف محسوس نہ ہوتا تھا۔ کڑکڑاتے جاڑوں میں معمولی کپڑے پہن کر رات گئے برف باری میں تنہا گھومنا میرا محبوب ترین مشغلہ تھا، مگر ایک خاص واقعہ نے مجھ سے یہ مشاغل چھین لئے۔ میں یہ واقعہ من وعن آپ کے سامنے بیان کرتا ہوں۔ اس طرح آپ خود اندازہ کر سکیں گے کہ میں سردی اور سرد ہوا سے خوف کھانے میں کہاں تک حق بجانب ہوں۔

جہاں تک میرے تجربات کا تعلق ہے، یہ درست نہیں کہ انسان صرف اندھیرے، سکوت اور تنہائی میں خوف زدہ ہوتا ہے، کیونکہ مجھے پہلی بار پیرس کی گنجان ترین آبادی میں واقع ایک بورڈنگ ہاؤس میں حقیقی خوف سے سابقہ پڑا، جبکہ ایک خاتون اور دو صحت مند اور توانا جوان میرے ساتھ تھے۔ نیچے سڑک پر سینکڑوں لوگ آجا رہے تھے، بسیں اور گاڑیاں چل رہی تھیں، دکانیں کھلی تھیں اور ان پر خریداروں کا ہجوم تھا۔ اس کے باوجود خوف کا سامنا ہوا، تو میری آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں، مگر ٹھہریئے، اس طرح شاید ساری بات آپ کی سمجھ میں نہیں آسکے میں شروع سے یہ سناتا ہوں۔

1993 کا ذکر ہے۔ میں ایک ماہانہ رسالے میں قلیل تنخواہ پر ملازم تھا۔ مالی حالت پتلی ہونے کی وجہ سے اکثر مقروض رہتا۔ زیادہ کرایہ ادا کرنے کی سکت نہ تھی، پھر بھی چاہتا تھا کوئی ایسی جگہ مل جائے جو زیادہ گندگی اور تکلیف دہ نہ ہو۔

تلاش بسیار کے بعد اس نتیجے پر پہنچا کہ اتنے کم پیسوں میں معقول جگہ کا ملنا ممکن نہیں، چنانچہ ایک ایسے بورڈنگ ہاؤس میں کمرہ کرائے پر لے لیا جو دوسری جگہوں سے نسبتاً اچھا تھا۔ یہاں اس بات کی سہولت بھی تھی کہ رسالے کا دفتر نزدیک تھا اور عمارت کے نچلے حصے میں روٹی، گوشت اور دودھ کی دکانیں تھیں اور آمد ورفت پر زیادہ خرچ اٹھنے کا امکان نہ تھا۔ جس عمارت کا ابھی میں نے ذکر کیا ہے، چار منزلہ اور بھورے پتھروں سے بنی ہوئی تھی۔ اندرونی دیواریں زیادہ تر چوبی تھیں اور انہیں جگہ جگہ سے دیمک تباہ کر چکی تھی۔ زینے اور برآمدوں میں کئی ایک مقامات پر سنگ مرمر کی ٹائلیں نظر آتی تھیں، لیکن اکثر جگہ سے یہ پتھر گھس کر بے رنگ ہو چکے تھے اور کئی ایک جگہوں پر تو انہیں نکال کر گارے اور چونے سے عام اینٹیں لگا دی گئی تھیں۔ کمروں میں بڑے بڑے سنگی آتش دان اور کارنس کسی زمانے میں ضرور خوبصورت ہوں گے، لیکن اب مکینوں کی عسرت وافلاس کے سبب بے ہنگم اور مصروف دکھائی دیتے تھے۔ ان آتش دانوں میں شاید کبھی آگ جلی ہو۔ دراصل پیرس جیسے مہنگے شہر میں غریب آدمی کے لئے ایندھن اور کوئلے کا خرچ برداشت کرنا بہت مشکل ہے۔

مالکہ مکان کا نام مس ہریرو تھا۔ ادھیڑ عمر کی اس ہسپانوی عورت کی ٹھوڑی پر چند بال تھے جن کی وجہ سے وہ خاصی مضحکہ خیز دکھائی دیتی تھی۔ تاہم طبیعت کی بہت نرم اور اچھی تھی۔ میں نے جلد ہی محسوس کرلیا کہ اکثر مالکان کی طرح اسے کرایہ داروں کی شکایتیں کرنے کی عادت نہیں اور نہ وہ رات گئے تک بلب جلانے یا دیر سے گھر لوٹنے پر ناک بھنوں چڑھاتی ہے۔ میرے علاوہ دوسرے کرایہ داروں کی اکثریت نچلے طبقے کے ہسپانوی مزدوروں پر مشتمل تھی۔ یہ لوگ شاذونادر ہی ایک دوسرے سے بات کرتے، اس لئے ماحول خاصا پرسکون تھا۔ نیچے سڑک پر سے گاڑیاں گزرنے کی آوازیں البتہ لکھنے میں مخل ہوتی تھیں، لیکن جلد ہی میں ان کا عادی ہوگیا۔

اس عمارت میں منتقل ہونے کے تین ہفتے بعد ایک دلچسپ واقعہ پیش آیا۔ ایک شام مجھے اچانک

احساس ہوا کہ کمرے کی چھت نم ہے اور کئی جگہوں سے ٹپک رہی ہے۔ باہر جھانکا، مطلع صاف تھا اور بارش کا دور دور تک نام ونشان نہ تھا۔ میں فوراً نیچے گیا اور مالکہ مکان مس ہریرو کو اطلاع دی۔ وہ ٹھنڈی سانس لے کر بولی۔

''اب ڈاکٹر موناز کو کون سمجھائے، اس نے اپنی لیبارٹری میں کوئی دوا گرادی ہوگی۔ بے چارہ بہت بیمار ہے، روز بروز اس کی حالت بگڑتی جارہی ہے، مگر کیا کروں، وہ کسی سے اپنا علاج کرانے پر رضا مند نہیں ہوتا۔ طویل بیماری نے اسے چڑچڑا کردیا ہے، ورنہ پہلے بہت خوش مزاج انسان تھا۔

''آخر ڈاکٹر موناز چھت پر کیا کررہا ہے؟'' میں نے سوال کیا۔

''کچھ کہہ نہیں سکتی، شاید نہارہا ہوگا۔ دن میں بیسیوں مرتبہ پانی میں عجیب عجیب خوشبو ڈال کر نہاتا ہے...... بڑی انوکھی عادتیں ہیں اس کی۔''

''کیا وہ لوگوں کا علاج معالجہ کرتا ہے؟''

''نہیں، عرصہ ہوا اس نے یہ دھندا چھوڑ دیا۔ کہتے ہیں بہت بڑا ڈاکٹر تھا۔ میرے والد کہا کرتے تھے بارسلونا میں اس کی بڑی شہرت تھی۔ حال ہی میں ہمارا ایک مستری چھت کی مرمت کرتے ہوئے چوتھی منزل سے گرپڑا تھا، ڈاکٹر موناز نے اس کا بازو جوڑ دیا، حالانکہ اسپتال والوں نے یہ بازو کاٹنے کا فیصلہ کرلیا تھا۔ ڈاکٹر موناز اپنے کمرے سے باہر نہیں نکلتا۔ میرا بھائی اسٹیاتو اسے کھانے پینے کی چیزیں، لانڈری سے دھلے ہوئے کپڑے اور دوا میں لاکر دیتا ہے۔ وہ منوں کے حساب سے امونیا منگواتا ہے، معلوم نہیں کہا استعمال کرتا ہے۔''

میں ڈاکٹر موناز کے بارے میں مزید معلومات حاصل کرنا چاہتا تھا، لیکن مس ہریرو سیڑھیاں چڑھنے لگی۔ میں کمرے میں لوٹ آیا۔ تھوڑی دیر بعد چھت سے پانی ٹپکنا بند ہوگیا۔ کان لگا کرسنا، تو کسی مشین کی گھر گھر سنائی دی۔ اس سے پہلے بھی میں یہ آواز بیسیوں دفعہ سن چکا تھا، لیکن کبھی توجہ نہ دی۔ میں ڈاکٹر موناز کے بارے میں سوچنے لگا۔ اگر وہ اتنا بڑا ڈاکٹر ہے، تو اس واحیات بورڈنگ ہاؤس میں کیوں رہتا ہے۔ نہ جانے اسے کیا مرض ہے لیکن وہ اسپتال میں کیوں نہ گیا؟ دن بھر کمرے میں بند رہنے سے اس کا مطلب کیا ہے؟ کوشش کے باوجود مجھے ان سوالوں کے جواب نہ مل سکے اور بالآخر میں نے سوچنا ترک کردیا۔

حقیقت یہ ہے کہ مجھے دل کا دورہ نہ پڑتا، تو ڈاکٹر موناز سے ملاقات ممکن نہ تھی۔ ایک سہ پہر اچانک مجھے اپنا دل ڈوبتا ہوا محسوس ہوا۔ ڈاکٹر مجھے بتا چکے تھے کہ دل کا دورہ پڑتے ہی فوراً طبی امداد حاصل کرنی چاہئے، ورنہ یہ دورہ جان لیوا ثابت ہوسکتا ہے۔ وہ دونوں ڈاکٹر جن سے میں وقتاً فوقتاً طبی مشورے لیا کرتا تھا، بورڈنگ ہاؤس سے بہت دور تھے، لہٰذا میں نے ایک ہاتھ سینے پر رکھا اور تیزی سے سیڑھیاں چڑھنے لگا۔ چوتھی منزل پر یعنی میرے کمرے کے عین اوپر ڈاکٹر موناز کا فلیٹ تھا۔ میں نے اس کے دروازے پر دستک دی۔ اندر سے کسی نے بہت ہی صاف انگریزی میں نام اور ملاقات کا مقصد پوچھا اور میرے جواب دینے پر دروازہ کھول دیا۔

مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ جون کا مہینہ تھا اور باہر اچھی خاصی گرمی تھی، لیکن کمرے میں داخل ہوتے ہی ٹھنڈی ہوا کے ایک جھونکے نے میرا خیر مقدم کیا۔ میں کانپنے لگا۔ یوں محسوس ہوا برف خانے میں آگیا ہوں۔ ڈاکٹر موناز کی نشست گاہ سامان آرائش سے پرتھی۔ خوب صورت صوفے، سیاہ مہاگنی کا بنا ہوا اعلیٰ فرنیچر، کتابوں کی منقش الماریاں حسین ودلفریب رنگوں کے پردے۔ اس غلیظ اور پرانی عمارت میں ایسا سجا سجایا کمرہ دیکھ کر بہت حیرت ہوئی۔

دائیں طرف چھوٹی سی لیبارٹری تھی۔ جس میں کسی مشین کے چلنے کی آواز صاف سنائی دے رہی تھی۔ ادھ کھلے دروازے میں سے دواؤں کی بھری

ہوئی شیشیاں، فلاسک، سپرٹ، لیمپ اور شیشے کی نلکیاں دکھائی دیں۔ غالباً یہی کمرہ میرے کمرے کے عین اوپر واقع تھا۔ دروازے کے بائیں جانب اس کی خواب گاہ تھی جس میں پرتکلف بستر، جھاڑ، فانوس اور آرائش کی دوسری چیزیں نظر آ رہی تھیں۔ خواب گاہ کے دروازے کے ساتھ ہی ایک اور دروازہ تھا جو غالباً غسل خانے کا تھا۔ رہائش سے محسوس ہوتا تھا کہ ڈاکٹر موناز اعلیٰ تعلیم یافتہ اور باذوق انسان ہے۔

اس کا قد چھوٹا اور سر باقی جسم کی مناسبت سے بڑا تھا۔ لباس انگریزی وضع کا اور نہایت عمدہ سلا ہوا، چہرے پر تفکر کا خاص انداز، گھنی پلکوں کے نیچے تیز اور ہوشیار آنکھیں، فرانسیسی وضع کی داڑھی، آنکھوں پر بغیر فریم کی عینک قدیم ہسپانیوں کی طرح اونچی ناک اور خوب صورت دہانہ جو اس کی مضبوط اور ناقابل تسخیر قوت ارادی کا پتہ دیتے تھے۔ رنگ برف کی طرح سفید۔ مجموعی طور پر کسی اعلیٰ خاندان کا فرد نظر آتا تھا۔

ان خوبیوں کے باوجود پہلی بار اس کے سرد اور ٹھنڈے کمرے میں قدم رکھتے ہی مجھے ایک ناقابل توجہ کراہت کا احساس ہوا اور میں خاصی دیر تک اپنے اس ردعمل کی وجہ تلاش نہ کر سکا۔ ہوسکتا ہے کہ یہ کراہیت پھولے ہوئے چہرے اور بے حد سرد انگلیوں کے لمس نے پیدا کی ہو یا اس کا سبب کمرے کا انتہائی سرد ماحول ہو۔

بہرحال اس سے ہاتھ ملا کر مجھے متلی سی ہونے لگی تھی۔

اس کی آواز نامانوس تھی اور وہ ٹھہر ٹھہر کر اور پراسرار لہجے میں گفتگو کرتا تھا۔ میں کمرے میں داخل ہونے سے پہلے ہی اسے اپنا مرض بتا چکا تھا، اس لئے غالباً وہ مرض کی طرف سے میری توجہ ہٹانے کے لئے اپنی سائنسی تحقیقات بیان کرنے لگا۔ میری طبیعت سنبھل گئی تھی، اس لئے یہ باتیں دلچسپ معلوم ہوئیں۔ میں صوفے پر دراز ہوگیا، وہ کہہ رہا تھا۔

"ادراک ذات اور قوت ارادی دواؤں سے کہیں زیادہ طاقتور ہیں۔ اگر مادی جسم صحیح سالم ہو تو قوت ارادی کے بل پر اپنے آپ کو زندہ رکھا جاسکتا ہے، خواہ اعضائے رئیسہ میں سے ایک آدھ ختم ہو چکا ہو۔" قدرے توقف سے وہ ہنستے ہوئے بولا۔

"کسی دن میں تمہیں دل کے بغیر زندہ رہنے کا طریقہ بھی بتاؤں گا۔" وہ بولا۔

میں خاصی دیر تک اس کے پاس بیٹھا رہا۔ معلوم ہوا وہ بعض جلدی بیماریوں میں مبتلا ہے اور یہ بیماریاں ایسی ہیں کہ ان کے لئے دوا سے زیادہ احتیاطی تدابیر اور شدید سردی کی ضرورت ہے۔ 55 درجے فارن ہائٹ سے زیادہ درجہ حرارت اس کے لئے جان لیوا ثابت ہوسکتا تھا، چنانچہ اس نے پیٹرول کے انجن اور مونیا سے مطلوبہ سردی پیدا کرنے کا بندوبست کر رکھا تھا۔ اسی انجن کی گھر گھر مجھے اپنے کمرے میں سنائی دیتی تھی۔

ڈاکٹر موناز کے علاج سے جلد ہی مجھے آرام آ گیا۔ وہاں سے لوٹا تو ہمیشہ کے لئے اس کا مداح بن چکا تھا۔ اس دن کے بعد ہفتے میں دو تین بار میں اسے ملنے جاتا۔ وہ بڑی خوش اخلاقی سے پیش آتا تھا۔ اس کے کمرے میں سردی ناقابل برداشت تھی، اس لئے وہاں جانے سے پہلے میں ایک لمبا اونی کوٹ پہن لیتا۔ وہ مجھے اپنی زندگی کے تجربات سناتا جو بالعموم الف داستانوں کی طرح محیر العقول ہوتے تھے۔ وہ قدیم اطباء کی بہت عزت کرتا تھا کیونکہ بقول اس کے یہ لوگ ایسے ایسے نسخے جانتے تھے جو موت کے بعد انسانی اعصاب کو انگیخت کر سکتے تھے۔

کئی بار اس نے مجھے بوڑھے ڈاکٹر تارس کی کہانی سنائی جو اٹھارہ سال قبل کئی طبی تجربوں میں اس کا شریک رہا تھا۔ اپنے عجیب و غریب تجربات میں اسے ایک موذی مرض نے آن لیا۔ ڈاکٹر موناز نے بڑی تندہی سے اس کا علاج کیا اور اسے افاقہ ہوگیا، مگر خود ڈاکٹر موناز اس مرض میں مبتلا ہوگیا۔ یہ وہی مرض تھا جس کے لئے موناز اپنے کمرے کو یخ بستہ رکھتا تھا۔

وقت گزرتا چلا گیا۔ رفتہ رفتہ مجھے احساس ہونے لگا کہ ڈاکٹر موناز ،مرض سے شکست کھا رہا ہے۔اس کے چہرے پر موت کی زردی چھانے لگی۔اعضاء کی حرکات میں التوا اور بے ڈھنگا پن آ گیا اور چال میں لڑکھڑاہٹ ۔قوت ارادی کمزور پڑ گئی اور یادداشت دھندلانے لگی۔نہ جانے کیوں میرا پہلے دن کا احساس کراہت لوٹ آیا۔اب پھر اسے دیکھ کر متلی سی ہونے لگتی۔جوں جوں دن گزرتے جا رہے تھے، تیز خوشبوؤں سے اس کا عشق بڑھتا جا رہا تھا۔اب وہ ہروقت کمرے میں صندل ،لوبان اور اگر بتیاں جلائے رکھتا۔ یہاں تک کہ بعض اوقات تو اس کی نشست گاہ پر اہرام مصر کے تجلیے اور بودار تہہ خانوں کا گمان ہوتا۔

اس کی حالت واقعی قابل رحم تھی۔ وہ ہمیشہ کمرے کا درجہ حرارت گرانے کی فکر میں رہتا۔میری مدد سے اس نے امونیا کے نئے پائپ فٹ کئے اور انجن کی اوور ہالنگ کی۔اب کمرے کا درجہ حرارت نقطہ انجماد سے نیچے ہی رہتا۔صرف باورچی خانے قدرے گرم ہوتا، چنانچہ میں ملاقات کی غرض سے جاتا، تو ہمیشہ باورچی خانے میں بیٹھتا تھا۔باورچی خانہ گرم رکھنے کی وجہ محض یہ تھی کہ ٹب اور برتنوں میں پانی جم نہ جائے ،وگرنہ ڈاکٹر موناز کو حرارت ہرگز پسند نہ تھی۔ اور وہ ایک منٹ سے زیادہ باورچی خانے میں نہ ٹھہر سکتا تھا۔چوتھی منزل پر اس کے علاوہ ایک ڈچ جوڑا بھی مقیم تھا۔ ان میاں بیوی نے مالکہ مکان سے شکایت کی کہ ڈاکٹر موناز نے اپنا فلیٹ اتنا سرد کر رکھا ہے کہ وہ دونوں رات بھر سو نہیں سکتے اور سردی سے ان کے دانت بجتے ہیں۔مالکہ مکان نے ڈاکٹر موناز سے ذکر کیا۔وہ بڑے خوف ناک انداز میں ہنسا اور بات کا رخ پھیر دیا۔

ان دنوں میں اکثر اسے ملنے جاتا،لیکن حقیقت یہ ہے کہ اس کی معیت تھکا دینے والی اور صبر آزما ہوتی تھی۔کئی بار جی ،میں آیا کہ اس کی دوستی ترک

''دل ٹوٹنے سے اٹیک اٹیک''

طبی ماہرین نے کہا ہے کہ ''دل توڑنا'' محاورہ ہی نہیں ہے بے وفا لوگوں کی خودغرضی، بے وفائی اور مطلب پرستی سے لوگ عارضہ قلب میں مبتلا ہو کر دنیا سے رخصت ہوجاتے ہیں اس لئے دوسروں کے دلوں میں اترنے کی کوشش کریں، اگر آپ کسی کے دل سے اتر گئے تو وہ دل ٹوٹ بھی سکتا ہے۔آسٹریلیا میں ہونے والی اس طبی تحقیق کو ہارٹ فاؤنڈیشن نے مکمل کیا، تحقیق کے مطابق پروفیسر تھامس بوکیلے نے کہا کہ جسمانی سطح پر تبدیلیوں کی وجہ سے ہی عارضہ قلب نہیں ہوتا، کسی ان دیکھی کیفیت، حالات یا صورتحال میں تبدیلی بھی دل کو خطرے سے دوچار کردیتی ہے، تحقیق میں 160 افراد کا مطالعہ کیا گیا جن میں بیوی، بچے، رشتہ دار اور بزنس پارٹنر یا پھر محبوب اور محبوبہ نے بے وفائی کی تھی اور خود غرضی کا مظاہرہ کر کے انہیں عارضہ قلب میں مبتلا کردیا۔تحقیق کے مطابق ناروا، رویوں کی وجہ سے عارضہ قلب کے امکانات 6 گنا بڑھ جاتے ہیں۔

(راجہ باسط مظہر-راولپنڈی)

کردوں، مگر وہ بڑی کامیابی سے میرا علاج کررہا تھا اوراس کی دواؤں سے مجھے فائدہ پہنچا تھا۔ علاوہ ازیں وہ مجھ سے دواؤں کی قیمت لیتا نہ معائنہ کی فیس۔ یوں بھی میں اس کا واحد ملاقاتی تھا اور مجھے اس پر رحم آنے لگا تھا۔ کسی روز نہ جاتا، تو اسے بڑی تکلیف ہوتی۔ کمرے کی صفائی اور انجن کی دیکھ بھال ایسے کام تھے کہ وہ تنہا انہیں انجام نہ دے سکتا تھا۔ سب سے بڑھ کر یہ کہ میں اسے بازار سے چیزیں لاکر دیتا تھا۔ میں پہلے بھی عرض کر چکا ہوں کہ وہ ایک سیکنڈ کے لئے بھی اپنے فلیٹ سے باہر نہ آتا تھا۔

رفتہ رفتہ مجھے اس کی بہت سی حیران کن عادتوں کا علم ہوگیا۔ مثال کے طور پر وہ نہاتے وقت پانی میں اتنی خوشبوئیں ملاتا کہ میری ناک پھٹنے لگتی۔ اس کے باوجود ایک بار میں نے اسے جانگیہ پہنے دیکھا، تو میرا سر چکرانے لگا۔ کتنا گھناؤنا مرض تھا اس کا۔ جلد کا گوشت گل سڑ کر ناقابل بیان تعفن چھوڑ رہا تھا۔ جسم کے قدرتی خطوط اور گولائیاں غائب ہوچکی تھیں۔ اور پہلی نظر میں گوشت یوں نظر آتا تھا جیسے قصائی کی دکان پر لٹکے ہوئے بکرے ہو۔

بورڈنگ ہاؤس کے مکینوں میں میرے علاوہ صرف مس ہریرو اور اس کا بھائی اسٹیانو، کبھی کبھار ڈاکٹر موناز سے ملنے جاتے تھے، لیکن بڑھتا ہوا مرض دیکھ کر انہوں نے بھی اوپر جانا بند کردیا۔

مس ہریرو تو اس کا ذکر سنتے ہی سینے پر صلیب کا نشان بناتی اور کسی انجانے خوف سے کانپ اٹھتی۔ دو ایک بار ڈاکٹر موناز نے میرے ذریعے اسٹیانو کو بلایا، مگر مس ہریرو نے سختی سے منع کردیا۔ اس طرح بے چارہ ڈاکٹر میرے رحم و کرم پر زندگی کے دن پورے کرنے لگا۔ کئی بار میں نے دبے لفظوں میں اسے مشورہ دیا کہ کسی ماہر ڈاکٹر سے رجوع کرو، مگر وہ غصے سے آگ بگولا ہوجاتا اور ایک بار تو اس نے مجھے ڈانٹ بھی پلائی۔ میں اسے مریض سمجھتا تھا، اس لئے چڑچڑاپن اور غصیلی عادات برداشت کرتا رہا۔

ایک اور تبدیلی جس نے مجھے سوچنے پر مجبور کیا، یہ تھی کہ اب وہ بستر پر لیٹنے کے لئے تیار نہ ہوتا تھا۔ جب دیکھو کچھ نہ کچھ لکھنے میں مصروف رہتا۔ ہر دوسرے تیسرے دن اپنے لکھے ہوئے کاغذ ایک لفافے میں بند کرکے ڈیسک میں رکھتا اور مجھ سے مخاطب ہوکر کہتا۔

''میرے مرنے کے بعد یہ لفافہ ڈاک میں ڈال دینا۔''

میں ان لفافوں پر ایڈریس پڑھنے کی کوشش کی۔ یہ سب یورپ کے بڑے بڑے ڈاکٹروں کے نام لکھے گئے تھے۔ نہ جانے موناز نے ان خطوط میں کیا لکھا تھا۔ روز بروز اس کی حالت بگڑتی چلی گئی۔ وہ کسی ذہنی کوشش میں ہمہ تن مصروف تھا۔ اس کی شخصیت موت سے نبرد آزما تھی۔ دوائیں چھوڑ کر وہ صرف قوت ارادی کے بل پر صحت یاب ہونے کی کوشش کررہا تھا۔

ایک روز میں اس کے کمرے میں پہنچا تو اس نے ایک طویل مسودہ دکھاتے ہوئے ایک ڈاکٹر کا نام لیا اور کہا۔ ''میرے مرنے کے بعد یہ مسودہ اسے رجسٹری کردینا۔'' یہ نام سن کر میں خوف زدہ رہ گیا۔ اتفاق سے میں اس ڈاکٹر کا نام پہلے بھی سن چکا تھا اور مجھے اچھی طرح معلوم تھا کہ کئی برس پہلے وہ انتقال کرچکا ہے۔ کچھ پوچھنے کی کوشش کی مگر ڈاکٹر موناز کے غصے سے خوف آتا تھا۔ انہی دنوں ایک ایسا واقعہ پیش آیا کہ بورڈنگ ہاؤس کے رہنے والے والوں میں ڈاکٹر موناز کے بارے میں طرح طرح کی افواہیں پھیل گئیں۔ ہوا یوں کہ ایک شام ڈاکٹر موناز نے میری معرفت بجلی ٹھیک کرنے والے کو بلوایا۔ اس شخص نے عمارت کے نچلے حصے میں دکان کھول رکھی تھی۔ وہ پہلی جنگ عظیم میں حصہ لے چکا تھا اور طبعاً باہمت اور جری تھا۔ میرے سامنے وہ اوزاروں کا تھیلا لے کر ڈاکٹر موناز کی سیڑھیاں چڑھنے لگا۔ دو تین منٹ بعد اس کی چیخ سنائی دی۔ میں بھاگم بھاگ اوپر پہنچا۔ وہ فلیٹ کے دروازے میں بے ہوش پڑا تھا۔ اوزاروں کا تھیلا وہاں نہ تھا، شاید وہ بھاگتے وقت فلیٹ کے اندر

چھوڑ آیا تھا۔ میں نے اسے جھنجوڑا اور جب وہ ہوش میں آیا، تو ایک لفظ کہے بغیر تیزی سے سیڑھیاں اترتا ہوا نیچے چلا گیا۔ میں ڈر گیا، تاہم ہمت کرکے اندر گیا۔ ڈاکٹر موناز غسل خانے میں تھا، وہیں سے غصیلی آواز میں بولا۔

''یہ تم کس گدھے کو پکڑ کر لائے تھے، کم بخت مجھ سے پوچھے بغیر غسل خانے میں آ گیا۔''

میں نے خاموشی سے اوزاروں کا تھیلا اٹھایا اور نچلی منزل میں مستری کے پاس جاکر پوچھنے کی کوشش کی، وہ مجھے کچھ نہ بتاسکا، کانپتا اور بائبل کی آیات پڑھتا رہا۔

اس دن کے بعد بورڈنگ ہاؤس کے رہنے والے ڈاکٹر موناز سے خوف کھانے لگے۔ اس کے پاس جانا تو دور، کوئی اس کا ذکر بھی پسند نہ کرتا۔ تقریباً بیس دن گزر گئے اور ایک رات وہی ہوا جس کا مجھے ہمیشہ دھڑکا لگا رہتا تھا۔ ڈاکٹر موناز نے اپنے کمرے کا فرش یعنی میرے کمرے کی چھت بجا کر مجھے بلایا۔ اوپر گیا تو معلوم ہوا کہ امونیا پمپ کا انجن خراب ہوگیا ہے اور ائیر کنڈیشنگ کا نظام معطل ہونے کی وجہ سے کمرے کا درجہ حرارت بڑھتا جارہا ہے۔ میں نے ڈاکٹر موناز سے مل کر انجن ٹھیک کرنے کی کوشش کی، مگر کامیابی نہ ہوئی۔ ڈاکٹر موناز کی حالت قابل دید تھی، وہ پمپ اور انجن بنانے والوں کو برا بھلا کہتا، اپنے بال نوچتا اور مایوسی سے مرکو دائیں بائیں پٹکتا تھا۔ میں نے اسے تسلی دی اور آدھی رات کے وقت مستری کو بلانے گیا۔ بڑی مشکل سے ایک مستری کو جگایا اور اسے ساتھ لے کر بورڈنگ ہاؤس پہنچا۔ مستری نے انجن کی دیکھ بھال کی اور مایوسی سے بولا۔

''پسٹن اور کئی اہم پرزے ناکارہ ہوچکے ہیں۔'' صبح تک کچھ نہیں کیا جاسکتا۔

ڈاکٹر موناز بولا۔

''جس طرح ہوسکے انجن کو درست کردو، منہ مانگی اجرت دوں گا۔''

''میں کہہ چکا ہوں اس وقت پرزے کہیں سے نہیں مل سکتے صبح پتہ کریں گے۔''

''اف!اف!!اف!!!'' ڈاکٹر موناز چلایا۔ نادانو! یہ میری زندگی اور موت کا سوال ہے، تمہیں کیسے سمجھاؤں انجن کا ٹھیک ہونا کس قدر ضروری ہے۔''

مستری شاید اس کی حالت دیکھ کر خوف زدہ ہوچکا تھا، اوزاروں کا تھیلا اٹھا کر چلتا بنا۔

ڈاکٹر موناز کسی جان لیوا حملے کی وجہ سے دہرا ہو رہا تھا۔ اچانک اس نے اپنے دونوں ہاتھ آنکھوں پر رکھے اور چیختا ہوا غسل خانے کی طرف بھاگا۔ میں کمرے کے وسط میں کھڑا سوچ رہا تھا کہ اب کیا کیا جائے۔ چند منٹ بعد وہ باہر آیا۔ اس کا سارا جسم بھاری کپڑوں سے ڈھکا ہوا تھا اور گردن اور سر پر اس طرح پٹیاں بندھی تھیں کہ آنکھوں کے سوا باقی چہرہ دکھائی نہ دیتا تھا۔ مجھے مخاطب کرتے ہوئے بولا۔

''بھاگو اور بازار سے جس قدر برف مل سکے، لے آؤ۔''

''لیکن اس وقت برف کی دکانیں بند ہوں گی۔''

''اُفوہ۔'' بھئی جاؤ تو سہی۔ بعض ہوٹل اور ادویہ کی دکانیں رات بھر کھلی رہتی ہیں۔ ان سے پتہ کرنا جلدی کرو، میرا دم گھٹ رہا ہے۔

میں تیزی سے سیڑھیاں اتر کر سڑک پر گیا اور ڈیڑھ گھنٹے میں جتنی برف مل سکی لاکر ڈاکٹر موناز کے بند غسل خانے کے دروازے پر ڈھیر کردی۔ ڈاکٹر موناز غالباً ٹب میں لیٹا ہوا تھا۔ ہر بار جب میں برف کی سل رکھ کر لوٹتا، اس کی غیر قدرتی، غیر انسانی آواز سنائی دیتی۔

''اور برف لاؤ...... برف......جس قدر مل سکے، خرید لو۔''

رات بھر میں بھاگ دوڑ کرتا رہا اور خدا جھوٹ نہ بلوائے، تو منوں برف جمع ہوگئی، لیکن ڈاکٹر موناز مجھے اور برف لانے کی تاکید کرتا رہا۔ صبح ہوئی تو میں نے

اسٹیانو سے مدد کی درخواست کی۔ میں چاہتا تھا وہ برف لا کر دیتا رہے اور میں نیا پسٹن ڈھونڈنے کی کوشش کروں مگر اس نے صاف انکار کردیا۔ میں نے لالچ بھی دیا، مگر وہ کسی طرح ڈاکٹر موناز کے کمرے میں داخل ہونے پر تیار نہ ہوا۔

بالآخر میں نے کسی ایسے شخص کی مدد لینے کا منصوبہ بنایا جو معاوضے پر کام کرسکے۔ بازار میں ایک آوارہ سا آدمی اس کام پر رضا مند ہوگیا۔ میں اسے برف کے لئے پیسے دے کر کسی اچھے مستری اور نئے پسٹن کی تلاش میں نکل کھڑا ہوا۔ اس بھاگ دوڑ میں کئی گھنٹے صرف ہوگئے لیکن ہر طرف سے مایوسی کا سامنا کرنا پڑا۔ مجھے کھانے کا ہوش تھا نہ آرام کی پروا ،ٹراموں ،ٹیکسیوں ،بسوں اور گھوڑا گاڑیوں پر سارے شہر میں پھرتا رہا۔ کئی جگہ ٹیلی فون کئے ،بہت سے مستریوں کے گھر پہنچا اور بالآخر دن کے دو بجے ،انجن کا پسٹن اور دوسرے مطلوبہ پرزے ملے اور نصف گھنٹے کی دوڑ دھوپ کے بعد ایک مستری کو اپنے ساتھ چلنے پر رضا مند کرسکا۔

سہ پہر کے تین بجے بورڈنگ ہاؤس پہنچا تو قسمت اپنا وار کرچکی تھی ۔اکثر کرایہ دار سہمے ہوئے باہر سڑک پر کھڑے تھے۔

ایک ہسپانوی مزدور سیڑھیوں میں بیٹھا رقت انگیز لہجے میں مناجات پڑھ رہا تھا۔ میں کسی سے بات کئے بغیر تیزی سے سیڑھیاں چڑھتا ہوا ڈاکٹر موناز کے فلیٹ کے سامنے پہنچا۔ یہاں بھی تین چار افراد ناک پر رومال رکھے سرگوشیاں کررہے تھے۔ وہیں دروازے پر ایک طرف اسٹیانو سر جھکائے کھڑا تھا۔ اس کی زبانی پتہ چلا کہ وہ آوارہ شخص جسے میں نے پیسے دے کر اس کام پر رضا مند کیا تھا کہ برف لا کر ڈاکٹر موناز کے کمرے میں ڈھیر کرتا رہا، پہلے ہی پھیرے کے بعد چیختا ہوا کمرے سے بھاگا۔ میرا خیال ہے اس نے جھانک کر غسل خانے میں لیٹے ہوئے مریض کو دیکھنے کی کوشش کی ہوگی اور ڈاکٹر موناز کی ایک جھلک نے اسے خوف زدہ کردیا۔ میرے جانے سے کوئی نصف گھنٹہ پہلے بورڈنگ ہاؤس کے رہنے والوں کو شدید بو کا احساس ہوا ،معلوم ہوتا تھا ڈاکٹر موناز کے کمرے سے آرہی ہے ۔سب لوگ وہاں پہنچے، مگر دروازہ اندر سے مقفل تھا۔ وہ لوگ اس وقت سے باہر کھڑے حیران ہورہے تھے ،بو واقعی ناقابل برداشت تھی۔ میں نے کان لگا کر سنا، کمرے میں کسی سیال شے کے قطرے ٹپکنے کی آواز کے سوا مکمل خاموشی تھی۔

کچھ سوچ کر میں نے عمارت کے سارے دروازے اور کھڑکیاں کھلوادیں، پھر دروازے توڑنے کی کوشش کرنے لگا، لیکن مس ہریرو کو یاد آگیا کہ مالکہ مکان کی حیثیت سے اس دروازے کی ایک چابی اس کے پاس بھی ہے۔ وہ نیچے گئی اور چابی لے آئی۔ جونہی میں نے دروازہ کھولا ،بدبو کے ایک بھبکے نے میرا استقبال کیا ۔میں گھبرا کر پیچھے ہٹا اور چند لمحے بعد ایک بڑا سا رومال ناک پر رکھ کر اندر داخل ہوگیا مس ہریرو، اسٹیانو اور چند اور لوگ دروازے پر آ کھڑے ہوئے۔

خدا میرے حال پر رحم کرے، زندگی بھر اس منظر کو نہ بھلا سکوں گا۔ کمرے کے وسط میں صوفے پر ڈاکٹر موناز کا اوور کوٹ کسی مائع میں لتھڑا ہوا پڑا تھا۔ غالباً یہ بو اسی مائع کی تھی۔ میں نے لپک کر کوٹ اٹھایا۔ نیچے صوفے پر سیاہ رنگ کی گاڑھی سیال کیچڑ پھیلی ہوئی تھی اور اس میں ایک ٹوٹی ہوئی کھوپڑی اور چند انسانی ہڈیاں نظر آرہی تھیں۔ کیچڑ کے قطرے نیچے فرش پر ٹپک رہے تھے۔ باہر سے میں نے یہی آواز سنی تھی۔ ڈاکٹر موناز اپنے انجام کو پہنچ چکا تھا۔ اور یہ اس کی لاش تھی، مگر اس حالت میں کہ بڑے سے بڑا جری اور بہادر انسان بھی اسے دیکھ کر خوف زدہ ہوئے بغیر نہ رہ سکتا تھا۔ مس ہریرو ،اسٹیانو اور کرایہ دار چیختے ہوئے بھاگ کھڑے ہوئے۔ صوفے کے سامنے رکھی ہوئی میز پر میرے نام ایک خط پڑا تھا۔ میں نے اسے کھول کر پڑھا اور پھر فوراً ہی جلادیا۔

اس چار منزلہ عمارت میں دن کے چار بجے مجھ

پر ایک ایسا انکشاف ہوا کہ باقی کرایہ دار اسے جان لیتے تو بے ہوش ہوکر گر پڑتے۔ نیچے ٹریفک کا شور سنائی دے رہا تھا اور میں پیرس کے گنجان ترین حصے میں ہزاروں لاکھوں زندہ انسانوں کے درمیان کھڑا تھر تھر کانپ رہا تھا۔ معلوم نہیں آپ میری بات پر اعتماد کریں گے یا نہیں۔ تاہم بہت سی چیزیں ایسی ہیں جن کے متعلق یہ جانتے ہوئے بھی کہ وہ حقیقت میں موجود ہیں، انسان اس پر یقین نہ کرنے ہی میں اپنی بہتری سمجھتا ہے، وگرنہ یہ زندگی بہت تلخ ہوجائے۔ یہ راز میرے سینے میں دفن ہے۔ آپ کے لئے صرف اتنا کہہ سکتا ہوں کہ آج بھی امونیا کی بو، سرد ہوا یا خنکی مجھ پر خوف کی ایسی شدید اور پاگل کردینے والی کیفیت طاری کردیتی ہے کہ میرے اعصاب جواب دے جاتے ہیں اور میں چیخنے اور چلانے لگتا ہوں۔

میں زیادہ تر آپ کو اندھیرے میں رکھنا نہیں چاہتا کیونکہ آپ یہ جاننے کے لئے بے تاب ہوں گے کہ ڈاکٹر موناز کی موت کس طرح ہوئی اور اس کی لاش کیچڑ اور شکستہ ہڈیوں میں کیونکر تبدیل ہوگئی۔ ڈاکٹر موناز نے اپنے خط میں لکھا تھا۔

"یہ میرا آخری وقت ہے۔ مزید برف ملنے کی کوئی امید نہیں، کیونکہ جس شخص کو تم نے اس کام پر مقرر کیا تھا، اس نے مجھے دیکھ لیا اور چیختا ہوا بھاگ نکلا۔ گرمی لحظہ بہ لحظہ بڑھتی جارہی ہے اور میرا جسم پگھل رہا ہے۔ تمہیں یاد ہوگا ایک مرتبہ میں نے کہا تھا کہ اعضائے جسمانی کام چھوڑ دیں تو انسان قوت ارادی کے بل پر جسم کو دوبارہ کام کرنے پر مجبور کرسکتا ہے۔ یہ نظریہ درست تھا، لیکن ہمیشہ کے لئے نہیں، کیونکہ مادی جسم بتدریج گلتا اور سڑتا رہتا ہے۔ مجھے اس بات کا علم نہ تھا، ورنہ میں یہ خوف ناک تجربہ نہ کرتا۔ ڈاکٹر تارس ان تجربات میں میرا ساتھی تھا۔ دراصل میں نے بستر مرگ پر اسے بلا بھیجا تھا۔ اس نے مجھ پر تجربات شروع کئے اور بالآخر کامیاب ہوا لیکن یہ علاج خاصا طویل اور اعصاب کو تھکانے والا تھا۔ نتیجہ یہ نکلا کہ وہ خود اعصابی صدمے کا شکار ہوکر اچانک مرگیا اور میں اس کے لئے کچھ نہ کرسکا۔ میری اپنی حالت یہ تھی کہ گو دل اور دماغ اپنا کام کرنے لگے تھے، لیکن گوشت پوست آہستہ آہستہ ہڈیوں کا ساتھ چھوڑ رہا تھا، چنانچہ میں نے اپنے گلتے ہوئے جسم کو ادویہ کی مدد سے اور انتہائی سردی میں محفوظ رکھا اور ابھی تک زندہ ہوں۔ یہ ایک حیرت انگیز تجربہ تھا اور میری خواہش تھی کہ میری موت کے بعد دنیا کے بڑے بڑے ڈاکٹروں تک اس تجربے کی روداد پہنچ جائے، اس لئے میں نے وہ خطوط لکھے جن میں موت کے بعد زندہ رہنے کے طریقوں پر مفصل بحث تھی، مگر اب میں نے یہ خطوط جلادیئے ہیں، کیونکہ میں نہیں چاہتا کوئی شخص ذہنی اذیت کے ان طویل مراحل سے گزرے جن سے میں گزر رہا ہوں۔ قدرت کا مقابلہ کرنے والے ہمیشہ شکست کھاتے ہیں۔ میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ خود کو زندہ رکھنے کے لئے جو زبردست جنگ کرنی پڑتی ہے، وہ انسان کے اعصاب کو توڑ مروڑ کر رکھ دیتی ہے لہٰذا بہتر یہی ہے کہ طبعی موت کو سینے سے لگالیا جائے۔ کاش! آج سے اٹھارہ برس پیشتر میں یہ تجربہ نہ کرتا اور مرتے وقت مجھے تکلیف نہ ہوتی۔ اب میری حالت یہ ہے کہ جسم کیچڑ بنتا جارہا ہے، گوشت ٹوٹ کر فرش پر گر رہا ہے، لیکن میں زندہ ہوں اور بڑی مشکل سے اپنے ہاتھ کو یہ حروف لکھنے پر مجبور کررہا ہوں۔ یہ سلسلہ کب تک جاری رہ سکتا ہے! افسوس صد افسوس اس انسان پر جو قدرت سے نبرد آزما ہونے کی بے کار کوشش کرتا ہے...... ہاتھوں کا گوشت گل کر گر پڑا ہے اور ہڈیوں کی مدد سے قلم پکڑا نہیں جاتا، اس لئے میرے دوست الوداع۔"

میں اٹھارہ سال پرانے مردے سے اپنی دوستی کی تفصیلات بھلانا چاہتا ہوں، لیکن جونہی سرد ہوا مجھ سے ٹکراتی ہے تو ساری خوف ناک یادیں تازہ ہوجاتی ہیں۔





دوسرا سایہ

ایس امتیاز احمد۔کراچی

بوڑھا گویا ہوا۔ سالوں گزر چکے ہیں، وہ ہمزاد کی طرح میرے ساتھ لگا ہوا ہے، میں اسے دیکھ سکتا ہوں لیکن کسی دوسرے کو اس کی موجودگی کا احساس نہیں ہوتا لیکن......

جسم وجاں کے رونگٹے کھڑے کرتی اوردل ودماغ کولرزا براندام کرتی......ڈراؤنی کہانی

رات کے بارہ بجنے والے تھے۔ اس وقت
ے اسٹیشن کے ویٹنگ روم میں مجھے ملاکر پانچ آدمی
ء تھے۔سب کے سب آتش دان کے گرد موجود
ر کرسیوں پر بیٹھے ہوئے تھے۔ہم میں سے دو تو
ن لڑکے تھے جو ہلکی آوازوں میں خوش گپیوں میں
ل تھے۔ تیسرا آدمی ادھیڑ عمر کا تھا، عمر میں
س پچاس سال کا لگ رہا تھا۔اس نے ایک لمبا
اوور کوٹ پہن رکھا تھا۔سر کے بال کھچڑی تھے اس کے ہونٹ پتلے پتلے اور قدرے بھینچے ہوئے تھے۔اس کے پاس بیٹھنے والے شخص کی عمر بھی کوئی تیس کے لگ بھگ ہوگی۔اس نے ایک اونی شال اوڑھ رکھی تھی۔سوائے ان دونوں نوجوانوں کے ہم میں سے ہر شخص خاموش تھا اور ٹرین کی آمد کا منتظر جو کہ ایک گھنٹہ لیٹ تھی۔

"کل رات میں نے اس میں ایک کہانی ایسی پڑھی

کہ پھر میں سو نہیں سکا۔" نوجوانوں میں سے ایک نے دوسرے کو ہاتھوں میں دبا ہوا رسالہ دکھاتے ہوئے کہا۔

میں نے کن انکھیوں سے ادھر دیکھا۔ وہ کسی ڈائجسٹ کا پراسرار کہانی نمبر تھا، سرورق پر ایک بڑی سی انسانی کھوپڑی تھی جس پر ایک خونخوار گدھ پر پھیلائے موجود تھا۔

"تو تمہیں ڈراؤنی کہانیاں پسند ہیں؟" دوسرے نے پوچھا..... "لیکن مجھے تو یہ سب بکواس معلوم ہوتی ہیں۔ آج کے جدید علوم کے دور میں جنوں اور بھوتوں کی کہانیاں محض مذاق نہیں تو پھر اور کیا کہی جاسکتی ہے۔" اس نے تبصرہ کرتے ہوئے میری جانب دیکھا۔ اور ہلکا سا مسکرا دیا۔

"تو تمہیں..... پراسرار قوتوں پر اعتقاد نہیں ہے؟" اچانک کالے اوورکوٹ میں ملبوس شخص نے پہلی بار بولتے ہوئے نوجوان کی طرف دیکھا۔

"بات تو کچھ ایسی ہی ہے۔" نوجوان نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔

"تم ابھی بچے ہو....." ادھیڑ عمر شخص نے آہستہ سے کہا..... "مجھے دیکھو میں تمہیں ایک بوڑھا شخص نظر آرہا ہوں لیکن اگر میں تم سے کہوں کہ میری عمر مشکل سے تیس سال ہوگی تو کیا تم یقین کرلو گے؟"

یہ سن کر ہم سب تعجب کے جذبے کے تحت ادھر متوجہ ہونے پر مجبور ہوگئے۔

لڑکے کی سمجھ میں نہ آیا کہ کیا جواب دے۔

"تم کیا کوئی بھی یقین نہیں کرے گا....." بوڑھے شخص نے دوبارہ کہا۔ "اور جن واقعات سے میں گزرا ہوں ان سے گزرنے کے بعد میرا زندہ رہنا بھی کسی معجزہ سے کم نہیں....." یکایک اس کا لہجہ پرتاسف ہوگیا..... "مجھ جیسا دلیر آدمی اس حال کو کیسے پہنچا۔ یہ ایک لمبی کہانی ہے..... اور میں یہ سب کچھ تمہیں اس لئے نہیں سنا رہا ہوں کہ تمہیں ڈراؤں۔ بلکہ صرف اس لئے کہہ رہا ہوں کہ تم یہ سمجھنا چھوڑ دو کہ پراسرار واقعات سے دنیا کا دامن خالی ہے۔"

یکایک وہ رک گیا اور آتش دان کو گھورنے لگا۔

مجھے اور شاید سبھی کو اس کا یوں چپ ہو جانا کچھ اچھا نہیں لگا۔ طبیعت چاہ رہی تھی کہ اس سے اس کی کہانی سنی جائے..... ویسے میں دیکھ رہا تھا کہ لڑکوں کے چہروں پر شرارت نمایاں تھی۔ حالانکہ وہ زبان سے کچھ کہنے کی جرأت نہیں کر پا رہے تھے۔

"اگر آپ مناسب سمجھیں تو ہمیں بھی بتائیں کہ وہ حالات کیا تھے جن کی طرف آپ نے ابھی اشارہ کیا ہے۔" دوسرا نوجوان جو رسالہ دبائے ہوئے تھا، نے گویا ہم سب کے دل کی بات کہہ دی۔

جواب میں اجنبی نے کلائی پر بندھی گھڑی پر نظر ڈالی پھر میری سمت دیکھتے ہوئے بولا۔ "یہ لوگ میری کہانی سننا چاہتے ہیں۔ غالباً انہیں میری بات کا یقین نہیں آیا۔"

"جی نہیں..... یہ بات نہیں ہے۔" میں نے جلدی سے کہا..... "آپ یقین کریں، سچی بات تو یہ ہے کہ آپ کے حالات سننے کا خود مجھے بھی اشتیاق ہے۔"

"مگر یہ ایک لمبی داستان ہے....." اس کے لہجے میں تذبذب نمایاں تھا۔ "اور وقت....."

"آپ فکر نہ کریں۔ ٹرین ڈیڑھ گھنٹے سے پہلے نہیں آنے سے رہی۔" اجنبی کے داہنے ہاتھ پر بیٹھے ہوئے شخص نے گفتگو میں حصہ لیتے ہوئے کہا۔

"اچھی بات ہے....." اجنبی نے رضامندی ظاہر کرتے ہوئے اثبات میں سر ہلایا۔

پھر اس نے جیب سے پائپ اور پاؤچ نکالا اور پائپ میں تمباکو بھرنے لگا۔ پائپ جلا کر اس نے ایک لمبا کش لیا اور دھوئیں کا مرغولہ منہ سے نکالتے ہوئے اس نے اپنی داستان کی ابتداء کی۔

"یہ آج سے پانچ سال پہلے کا ذکر ہے۔ جب ان پراسرار واقعات کی ابتداء ہوئی جن کے نقوش اس وقت بھی میرے چہرے پر ثبت ہیں۔ میں نیا نیا کالج سے فارغ ہوا تھا۔ ماں باپ کا سایہ بچپن ہی میں سر سے اٹھ چکا تھا۔ اور چچا کے انتقال کے بعد اب ضروری ہوگیا تھا کہ میں اپنے پیروں پر خود کھڑا ہوجاؤں۔ کچھ کوشش کے بعد مجھے ایک

ت مل گئی اور میرا تبادلہ کردیا گیا۔ نئے شہر میں پہنچ کر لے چند دن ہوٹل میں قیام کیا۔ اس عرصے میں مجھے مالی تلاش تھی۔ جلد ہی مجھے ایک مکان بھی مل گیا۔

وہ مکان شہر کے ایک سرے پر تنگ گلیوں کے ان واقع تھا۔ اس میں ایک آنگن اور صرف ایک رہ تھا۔ ایک کچن تھا۔ کمرے میں ایک الماری بھی میں جڑی ہوئی تھی۔ اس کا کرایہ بے حد کم تھا لہٰذا نے اسے دیکھتے ہی لے لیا۔ اور آپ یقین کریں ے مصائب کی ابتداء یہیں سے ہوئی......!

میں آج بھی سوچتا ہوں کاش! میں نے وہ مکان وتا۔ مگر مقدر کے لکھے کو کون ٹال سکتا ہے۔"

رک کر اس نے پائپ منہ سے لگایا۔ دو تین لمبے ں لئے۔ پھر فضا میں دھواں بکھیرتے ہوئے بولا۔

''اس مکان میں چھ سات دن نہایت آرام سے ے...... اور اس کے بعد، ایک پراسرار عجیب و ب چکر نے مجھے اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ وہ میرے ں آٹھویں رات تھی میں اس دن کوئی دس بجے گھر لوٹا تھا۔ تقریباً ایک گھنٹہ مطالعہ کے بعد میں نے ے کا دروازہ بند کردیا اور کنڈی لگادی۔ باہر کا ہ پہلے ہی سے بند تھا۔ پھر میں نے لائٹ آف کی نے کے لئے بستر پر لیٹ گیا۔

دسمبر کے دن تھے...... اور رات بے حد سرد میں لحاف میں دبکا ہوا سو رہا تھا۔ رات کے کوئی دو ں گے۔ اچانک مجھے یوں محسوس ہوا جیسے کوئی ا ہو۔

آنکھیں کھول کر دیکھا تو کمرہ اندھیرے میں ڈوبا صرف روشن دان سے چاندنی کا انعکاس ہو رہا تھا ے کمرے کی تاریکی قدرے کم ہوگئی تھی پہلی نظر کوئی خاص بات محسوس نہ ہوئی۔ ہر چیز اپنی جگہ پر توں تھی۔ لیکن دوسرے لمحے۔ غور سے دیکھنے پر ے خاص تبدیلی کا احساس ہوا کہ الماری کا ایک کھلا ہوا تھا۔ میں نے لیٹے لیٹے سوچا۔ شاید میں نے سے قبل بند کرنا بھول گیا ہوں پھر بھی میں نے کسی خیال کے تحت اٹھ کر دیکھ لینا ہی مناسب سمجھا۔

میں نے اٹھ کر لائٹ آن کی۔ ہر طرف دیکھا بھالا کمرے کے دروازے کی کنڈی اندر سے بدستور بند تھی۔

پھر میں نے بڑھ کر الماری کا کھلا ہوا پٹ بند کردیا۔ اور اس کا ہینڈل ٹھیک سے جمادیا اس سے فارغ ہو کر میں دوبارہ بستر میں گھس گیا۔ اور جلد ہی مجھے نیند آ گئی۔

صبح جب میری آنکھ کھلی......تو میں چونکے بنا نہ رہ سکا۔ الماری کا ایک پٹ، رات ہی کی مانند پھر کھلا ہوا تھا۔

آخر یہ پھر کس طرح کھل گیا......؟ میں دیر تک بستر پر گنگ بیٹھا سوچتا رہا لیکن کوئی معقول وجہ سمجھ میں نہ آسکی، تنگ آ کر میں اٹھ گیا۔ میں نے بہت زور کے ساتھ پٹ کو بند کردیا اور آفس جانے کی تیاری کرنے لگا......''

بوڑھا شخص چپ ہوگیا۔ اس نے اپنے بجھتے ہوئے پائپ کا ایک کش لیا۔ پائپ کا گل کرسی کے ہتھے پر ٹھونک کر صاف کیا اور میری جانب دیکھتے ہوئے بولا۔

''یہ کوئی ایسی حیرت انگیز بات نہ تھی کہ میں اس پر زیادہ دھیان دیتا۔ اس کی متعدد وجوہات ہوسکتی تھیں۔ ہوسکتا ہے دروازہ کچھ خراب ہوگیا ہو، یہ بھی ہوسکتا تھا کہ میں نے جلدی میں ہینڈل ٹھیک سے گھمایا ہی نہ ہو۔ بہرحال یہ بات دن کے کام کاج میں ذہن سے قطعی نکل چکی تھی۔ دن ڈھلے میں گھر لوٹا۔ معمول کے مطابق کوئی گیارہ بجے میں سونے کے لئے لیٹ گیا۔ اس بار میں نے تمام دروازے اچھی طرح بند کرلئے تھے۔ اور میں پوری طرح مطمئن تھا۔

میری نیند ابھی کچھ زیادہ گہری نہ ہوئی تھی کہ اچانک میری آنکھ کھل گئی۔ یقیناً کھٹکا خاصی زور سے ہوا تھا۔ میں نے فوراً ہی الماری کی سمت دیکھا۔ اس کا ایک پٹ کھلا ہوا تھا۔ حیرانی کا دورہ ابھی ختم بھی نہ ہوا تھا کہ ایک اور جھٹکے سے دوچار ہوجانا پڑا۔

قریب ہی کوئی سایہ سا کھڑا تھا۔ اور پھر جلد ہی مجھ پر حقیقت واضح ہوگئی تھی، اس کے ہاتھ اٹھے اور وہ اپنی ٹائی ڈھیلی کرنے لگا۔ کمرے کی تاریکی میں بھی اس کی حرکات واضح تھیں۔ اس نے فوراً ہی جھک کر جوتے کھولے اور کوٹ اتار کر الماری میں ٹانگ دیا۔ اس کام

سے فارغ ہو کر اس نے الماری میں سے کچھ کپڑے کھینچے اور انہیں پہننے لگا۔ میں کھلی آنکھوں سے کسی سحرزدہ کی مانند سب کچھ دیکھے جا رہا تھا۔

دروازہ قطعی بند تھا اور کسی کے اندر آ جانے کا سوال ہی نہ تھا۔ پھر اس سے پہلے کہ میں کچھ کر سکوں۔ اچانک وہ سایہ میرے بستر کی طرف بڑھا اس نے میرے لحاف کا ایک کونا اٹھایا اور پھرتی سے بستر میں گھس آیا۔ اس کے جسم کا گرم لمس مجھے بجلی کی مانند محسوس ہوا۔ میں تڑپ کر اچھلا اور ادھر جھپٹا جدھر لائٹ کا سوئچ تھا۔

لمحہ بھر میں سارا کمرہ بقعۂ نور بن چکا تھا۔ اور پھر مجھ پر حیرت کا ایک پہاڑ ٹوٹ پڑا۔ میرا بستر بالکل خالی پڑا تھا۔ وہاں آدمی تو کجا کسی چڑیا کے بچے تک کا نشان نہ تھا۔ آخر یہ سب کچھ کیا ہے......؟ میں نے سوچا۔ اور مجھے محسوس ہوا کہ شاید میں کچھ بیمار ہو چلا ہوں۔ اسے خواب یا واہمے کے سوا اور کیا سمجھا جا سکتا تھا۔ میں نے کمرے میں اوپر سے نیچے تک ایک ایک چیز دیکھ ڈالی۔ مگر وہاں کچھ ہوتا تو نظر آتا۔ کمرہ اندر سے بدستور بولٹ تھا۔ تھک کر میں دوبارہ بستر پر جا گرا۔ اور اپنی بزدلی پر لعنت بھیجنے لگا۔ دیر تک ساری باتیں میرے ذہن میں گونجتی رہیں۔ اور میں جس وقت سویا اس وقت لائٹ برابر جل رہی تھی۔

صبح جب میری آنکھ کھلی تو...... میں یہ دیکھ کر پھر حیرت میں ڈوب گیا کہ کمرے کا بلب بجھا ہوا تھا۔ سوئچ بھی آف تھا......!! حالانکہ میں نے سوتے وقت لائٹ جلتی چھوڑ دی تھی۔ سارے واقعات اب میرے لئے آہستہ آہستہ ایک مسئلہ بنتے جا رہے تھے۔ میں نے اس واقعے کے لئے کوئی عقلی توضیح تلاش کی۔ اور یہ سوچ کر ساری بات ذہن سے جھٹک دی کہ رات کو اپنی بوکھلاہٹ میں یقیناً میں نے خود ہی لائٹ بجھا دی ہوگی اور اب بھول چکا ہوں۔"

حسب معمول ٹھہر کر بوڑھے اجنبی نے ہمارا جائزہ لیا۔ اور مسکراہٹ لبوں پر بکھیرتے ہوئے بولا۔

"حضرات شاید آپ کو یہ واقعات کچھ ایسے زیادہ حیرت انگیز نہ لگ رہے ہوں لیکن جلد ہی آپ کو اندازہ ہو جائے گا کہ میں کتنے خطرناک حالات میں گھر اس سلسلے کی تیسری رات پہلی دو راتوں سے بھی ہولناک تھی۔ اس رات پہلی بار مجھے محسوس ہوا کہ واقعی کسی ان دیکھے وجود سے دوچار ہوں اور یہ سب میرا واہمہ نہیں ہے۔

وہ یقیناً دو یا ڈھائی بجے رات کا عمل ہوگا۔ کہ آواز نے میری نیند توڑ دی تھی۔ اور اس بار میں نے کہ کمرے کا دروازہ کھلا ہوا ہے وہاں سے باہر آنگن پھیلی ہوئی چاندنی صاف دکھائی دے رہی تھی۔ اور کوئی پرچھائیں سی دروازے میں حائل ہوئی اور تیر ہوئی الماری کے قریب جا ٹھہری۔ چلنے کا یہ انداز میرا اپنا تھا۔ پھر اس نے ٹھیک میرے ہی جیسے انداز الماری کھولی۔ اس میں سے میرا سوٹ نکالا۔ ٹائی اور لباس تبدیل کرنے لگا۔ چند ہی لمحوں میں وہ میرا سوٹ زیب تن کر چکا تھا۔ پھر وہ اطمینان سے جانب دھیان دیئے بغیر باہر نکل گیا۔ چند لمحوں بعد باہر کے دروازے کے کھلنے کی آواز سنائی دی اور تب میں سحر کے حصار سے باہر نکل آیا......

میں نے وقت ضائع کئے بغیر کونے میں رکھا ڈنڈا سنبھالا اور قفل اٹھاتا ہوا اس کے پیچھے دوڑ لیا۔ میں دروازے پر پہنچا تو میں نے دیکھا وہ کھلا ہوا وہاں سے گلی دور تک نظر آ رہی تھی۔ وہ اس وقت گلی کے موڑ پر پہنچ چکا تھا۔ میں نے تیزی سے دروازہ قفل لگایا اور جونہی وہ گلی کے موڑ پر گم ہوا میں اپنی قوت سے اس کے پیچھے دوڑ پڑا۔ یہ یقیناً کوئی چور عقلی دلیل یہی کہہ رہی تھی اور میں اسے بے خبری لینا چاہتا تھا۔ اور پھر میں جونہی موڑ پر گھوما......

مجھے یوں لگا جیسے خوف سے میرا دل اچھل کر میں آ گیا ہو کسی نے بھیانک انداز میں زور سے" نعرہ بلند کیا تھا۔ بالکل ایسے ہی جیسے شریر بچے دوسرے کو ڈراتے ہیں۔ لمحہ بھر کے لئے میں حواس باختہ میرے قدم لڑکھڑا گئے اور میں زمین پر ڈھیر ہو گیا اور میں اٹھا...... تو وہاں کوئی دوسرا شخص موجود نہ تھا......

ا میری بدحواسی کا فائدہ اٹھا کر رفو چکر ہو چکا تھا۔
تا ہوا میں گھر کی سمت لوٹ پڑا...... مجھے اپنے نیلے
کے اس طرح چلے جانے پر سخت تاسف تھا۔
میں نے گھر پہنچ کر بجلی جلائی اور الماری کھولی
یکھوں اور کیا کیا چیزیں غائب ہیں؟ اور تب ایک
مجھ پر حیرانی کا دورہ پڑ گیا۔ میرا نیلا سوٹ ہینگر میں
ا تھا۔ الماری کی دوسری ساری اشیاء بھی بدستور
ہوں پر موجود تھیں......"

رک کر اس اجنبی قصہ گو نے ہمیں دیکھا...... اور
...... "کیا آپ بتا سکتے ہیں کہ اس وقت میری کیا
ہوئی ہوگی؟...... میرا خیال ہے کہ اس واقعے کے
پ حضرات میں سے شاید ہی کوئی وہاں ٹھہرنا منظور
...... مگر میں پہلے ہی عرض کر چکا ہوں کہ میں فطرتاً
ر واقع ہوا تھا...... ہاں یہ دوسری بات ہے کہ
...... اس وقت میری حالت بہت مختلف ہے۔ میرا
بے حد کمزور ہو گیا ہے...... اور اب ہر وقت مجھ پر
بجانا خوف غالب رہنے لگا ہے۔"

میں نے محسوس کیا کہ اس کی آواز گلوگیر سی ہو گئی
چند لمحے وہ چپ چاپ آتش دان کو گھورتا رہا جیسے
ے ہوئے واقعات کی کڑیاں ملا رہا ہو۔

"چوتھی رات جو آئی...... وہ اس عجیب وغریب
ن کی سب سے زیادہ ہولناک رات تھی......!!"
نے دوبارہ لب کھولتے ہوئے کہا۔ "میں رات گئے
تا تھا۔ اور بہت تھکا ہوا تھا...... میری نیند یقیناً بے
ی رہی ہوگی...... کیونکہ باوجود کھٹکا سننے کے میں
رح بیدار نہیں ہوا تھا۔ میری آنکھوں میں نیند تیر
ں۔ بوجھل پپوٹوں کو زبردستی کھولتے ہوئے میں
یکھنے کی کوشش کی۔ کمرے کا دروازہ جسے میں
ر کے سویا تھا۔ کھلا ہوا تھا۔ تب ہی اچانک جیسے
ں کسی کا جسم حائل ہو گیا۔

پھر وہ سایہ رفتہ رفتہ دور ہونے لگا۔ چند لمحوں بعد
ہر کے دروازے کے کھلنے کی آواز سنائی دی۔ وہ
ں جا رہا تھا۔ میں نے خدا معلوم کس جذبے کے

آپ بھی پوچھئے......!

☆ شوہر اور گدھے میں کیا چیز مشترک پائی جاتی ہے؟
دونوں ہی بار برداری کیلئے استعمال ہوتے ہیں۔

☆ پیار کا لائسنس کیا ہوتا ہے؟
ایک کے لئے خوب صورت چہرہ دوسرے کے لئے نوٹوں سے بھری جیب۔

☆ اگر عورت وفا کی دیوی ہوتی ہے تو مرد کیا ہوتا ہے۔
بیچارہ ...... ! جو ساری عمر اس وفا کی دیوی کی انگلیوں پر ناچتا ہے۔

☆ زندگی میں کتنی بار محبت کرنی چاہئے؟
ایک دفعہ فیل ہو جانے پر تین مواقع تو یونیورسٹی بھی دیتی ہے......!

☆ کیا عشق کے کوچنگ سینٹرز بھی ہوتے ہیں؟
یہ سی این این، ایچ بی او، این ٹی ایم، پی ٹی وی، فلمیں اور ڈس پھر کیا ہیں!

☆ دردِ دل کو دوا چاہئے یا دعا؟
دوا...... کسی خوب صورت نرس کے ہاتھوں سے۔

☆ محبت کے میچ میں جیت کس کی ہوتی ہے؟
پیسے والے کی، غریب تو ہمیشہ زیرو پر آؤٹ ہوتا ہے۔

☆ لڑکے اپنی محبت کا ثبوت کب دیتے ہیں؟
محبوبہ کی شادی میں کرسیاں لگا کر۔

(ایس امتیاز احمد۔ کراچی)

تحت بستر سے چھلانگ لگائی، خالی ہاتھ اور ننگے پیر اس کے پیچھے دوڑ پڑا۔ دروازے پر پہنچ کر میں نے دیکھا کہ وہ انتہائی تیز رفتاری سے جا رہا ہے۔ پھر وہ گلی کے موڑ پر دکھائی دیا۔ میں نے اس بار اسے پکڑنے کی ٹھان لی تھی۔ مجھے اپنے اوپر قطعی اعتماد تھا اور مجھے یقین تھا کہ وہ کوئی جن یا بھوت ہرگز نہیں ہوسکتا۔ نیلے سوٹ کی موجودگی کا یہ مطلب قطعی نہ تھا کہ میری سوچی ہوئی ہر بات ٹھیک ہی تھی۔ ہوسکتا ہے وہ کوئی چور ہی رہا ہو اور مجھے دیکھ کر بھاگ نکلا ہو۔ دلیلوں کی روشنی میں ہر بات واضح تھی اور اس میں اس وقت میں مزید گھماؤ پھراؤ پیدا نہیں کرنا چاہتا تھا۔ میں گلی کے نکڑ پر پہنچ کر محتاط انداز میں آگے بڑھا لیکن کوئی خلاف توقع بات نہ ہوئی۔ وہ اس عرصے میں دوسری گلی کے نکڑ پر پہنچ گیا تھا......

میں نے وہیں رک کر اسے مڑتے دیکھا اور پیچھے چل پڑا۔ میرے اور اس کے درمیان کوئی ڈیڑھ سو گز کا فاصلہ موجود تھا۔ گلی کے بعد اس نے سڑک عبور کی اور اس طرح چلنے لگا کہ اس کا جسم چاندنی میں رہنے کے بجائے مکانوں کے سائے میں رہے، میں خاموشی سے اس کا تعاقب کرتا رہا۔ بظاہر وہ اس تعاقب سے قطعی بے خبر لگ رہا تھا کیونکہ اس نے عرصے میں ایک بار بھی پیچھے مڑ کر نہ دیکھا تھا، مجھے اس کے پیچھے چلتے کوئی پندرہ بیس منٹ گزر گئے۔ میں نے طے کرلیا تھا کہ آج اسے بچ کر نہ جانے دوں گا۔ اس تمام عرصے میں کوئی پولیس مین بھی مجھے نظر نہ آیا تھا کہ میں اس کا سہارا لے سکتا۔ سڑک پر سناٹا طاری تھا۔ سڑکیں پورے چاند کی چاندنی میں نہائی ہوئی تھیں۔

بے خبری میں مزید کچھ دور چلنے کے بعد پہلی بار مجھے احساس ہوا کہ میں شہر کے باہر آگیا ہوں اور اس سڑک پر چل رہا ہوں جو سیدھی قبرستان کی سمت جاتی ہے۔ وہاں سے آبادی ختم ہوگئی تھی۔

چند لمحوں کے لئے میں رک گیا تھا کہ وہ اس میدان کو عبور کرلے جو میرے اور اس کے درمیان حائل ہوگیا تھا۔ وہ سیدھے چلتا چلتا قبرستان کے گیٹ میں گھس گیا۔ میں نے وقت ضائع کئے بغیر دوڑ لگائی اور جلد ہی اسے جالیا۔ وہ پیڑوں کے درمیان سے گزرتا ہوا اونچی نیچی قبروں کو پھلانگتا جا رہا تھا۔ رات کا سناٹا یہاں کچھ عجیب ہی انداز میں پھیلا ہوا تھا۔ ہر طرف جھینگروں کی آوازیں گونج رہی تھیں۔ سردی سے میرا برا حال تھا کیونکہ مارے جوش کے یونہی بستر سے نکل آیا تھا۔

مجھے اپنے مکان کے کھلے ہونے کی فکر بھی لاحق تھی۔ اور کچھ سمجھ میں نہ آ رہا تھا کہ کیا کروں؟ وہ صرف تجسس کا جذبہ تھا جو مجھے روک رہا تھا۔ اب میں نے کچھ دیر رک جانا ہی مناسب سمجھا۔ میں ایک درخت کے سائے میں رک گیا۔ وہ کوئی سو گز کے فاصلے پر کھڑا ہوا دکھائی دے رہا تھا۔ چند لمحوں وہ ادھر ادھر دیکھتا رہا پھر وہ وہیں بیٹھ گیا...... وہ شاید کوئی قبر ہی تھی۔ اچانک وہ بڑی تندہی سے زمین کھرچنے لگا۔ یعنی کھودنے لگا...... وہ اتنی تیزی سے زمین کھرچ رہا تھا کہ میں بیان نہیں کرسکتا۔ یوں لگتا تھا جیسے اس کی انگلیاں لوہے کی ہوں۔ میں سحر زدوں کی مانند یہ منظر دیکھے جا رہا تھا۔ اس وقت مجھے نہ سردی کا احساس تھا اور نہ رات کا خیال۔ اور قبرستان کا خوف......!!

کوئی گھنٹہ بھر کی مشقت کے بعد اس نے قبر کی خاصی مٹی ایک جانب نکال پھینکی۔ اور تب مجھے یوں محسوس ہوا جیسے وہ کسی شے کو زور لگا کر کھینچنے کی کوشش کر رہا ہے۔ کچھ دیر کی جدوجہد کے بعد وہ کامیاب ہوگیا۔ میں نے چند گز اور آگے بڑھ کر ایک مناسب جگہ ٹھہرتے ہوئے دیکھا۔ وہ قبر میں سے لاش نکالنے میں کامیاب ہوگیا۔ لاش یقیناً تازہ ہی تھی۔ کیونکہ چاندنی میں کفن سفید نظر آ رہا تھا۔ اس نے چند ہی لمحوں میں لاش کو کپڑے سے بے نیاز کردیا...... اور پھر

میرے خدا! رک کر اس نے سسکی سی لی...... جھکا اور دانتوں سے لاش کو نوچنے لگا......

بوٹیاں اتار اتار کر وہ یوں انہیں چبا رہا تھا جیسے کہ گوشت کھاتے ہیں۔ یہ منظر ایسا ہی لرزہ خیز تھا کہ میں مارے خوف کے کانپنے لگا......! پھر میں کسی خوف ز

ادکی طرح وہاں سے بے تحاشہ بھاگ اٹھا۔ میرے لئے وہاں ٹھہرنا ناممکن ہو چکا تھا۔

بیس منٹ کا راستہ میں نے دس منٹ سے بھی کم نٹ میں طے کیا اور جب میں گھر پہنچا تو میرا سارا جسم نہ سے شرابور تھا۔ حالانکہ سخت ٹھنڈ پڑ رہی تھی۔ میں لے دروازے خوب اچھی طرح بند کئے...... اور اس ت میں صبح تک جاگتا رہا۔ اس عرصہ میں میں نے ملہ کرلیا تھا کہ میں اب اس مکان میں ہرگز نہ رہوں ۔ صبح ہوتے ہی میں نے مالک مکان کا حساب صاف یا اور ایک ہوٹل میں منتقل ہوگیا۔“

بوڑھے اجنبی نے رکتے ہوئے ایک لمبی سانس ۔ پھر پائپ میں تمباکو بھرنے کے لئے جیبیں ٹٹولنے ۔ ہم سب اس حیرت انگیز داستان کے تاثر میں اس رغرق تھے کہ ہمیں اس کا چپ ہوجانا کچھ ناگوار سا ے رہا تھا۔ ہر شخص سحر زدوں کی مانند اسے دیکھ رہا ...... ہمہ تن گوش!!!

پائپ جلا کر لمبا کش کھینچتے ہوئے اس نے کہا۔

”میری داستان یہیں ختم نہیں ہوتی...... ہوٹل ، چند ہفتے گزارنے کے بعد ہی مجھے احساس ہوگیا کہ ں یہاں کے کرائے کا متحمل نہیں ہوسکتا۔ مجبوراً میں نے ے اور مکان کرائے پر لے لیا۔ یہاں میں کوئی چھ یا ت دن آرام سے رہا...... لیکن آٹھویں رات ہاں ٹھویں رات۔ مجھے یوں لگا تھا جیسے کوئی وزنی چیز گری ور میری نیند ٹوٹ گئی......

اور یہ یہاں یہ بیان کرنے کی ضرورت نہیں کہ ، یہاں بھی اسی ناٹک کی ابتداء ہوتی نظر آرہی تھی ں سے میں گزر چکا تھا۔ میں نے خطرے کی پہلی ہی ست پر مکان چھوڑ دیا۔ اور ایک دوست کے ہاں پناہ یں ہوگیا۔ ان دنوں کسی کے ہاں مستقل رہنا کتنا دب سمجھا جاتا تھا۔ اس سے تو آپ واقف ہی ہوں ۔ میں نے مجبوراً پھر ایک اور مکان تلاش کیا۔ لیکن ہی مجھ پر یہ راز کھل گیا کہ میں کسی بہت برے چکر پھنس گیا ہوں۔ گنڈے تعویذ کے باوجود کوئی وجود میرے ساتھ ہمزاد کی طرح لگا ہوا تھا۔

تنہا مکانوں میں سونا اب میرے بس میں نہ تھا۔ ہوٹلوں کا خرچ میری استطاعت سے باہر تھا۔ میں مہینوں ادھر ادھر مارا مارا پھرتا رہا۔ کتنی ہی راتیں میں نے مسافر خانوں میں گزاریں۔ لیکن وہ میرے ساتھ چمٹا رہا اور پھر کچھ عرصے بعد مجھ پر ایک نئی بات کا انکشاف ہوا......

اور یہی وہ ہیبت ناک انکشاف تھا جس نے مجھے قبل از وقت بوڑھا کر دیا ہے۔ میں زندہ ہوں لیکن مردوں سے بدتر......

اس احساس کے بوجھ تلے دب کر میں اس حال کو پہنچ گیا ہوں۔ میری عمر، آپ یقین کریں کہ تیس سے زیادہ نہیں ہے...... مگر میں ساٹھ سال کا بوڑھا معلوم ہونے لگا ہوں۔ میرے حوصلے پست ہوچکے ہیں...... اور ایک پراسرار خوف ہر وقت مجھ پر طاری رہتا ہے۔ وہ کسی وقت بھی میرا پیچھا نہیں چھوڑتا۔ ہر وقت سائے کی طرح ساتھ لگا رہتا ہے۔ میں پچھلے پانچ سالوں سے اس پراسرار ہمزاد کی قیام گاہ بنا ہوا ہوں...... وہ اس وقت بھی میرے ساتھ ہے لیکن آپ لوگ اسے نہیں دیکھ سکتے...... خدا کی قسم وہ اس وقت بھی میرے ساتھ ہے۔“

بوڑھا اچانک خاموش ہوگیا اور پھر وہاں موجود ہر شخص کے ہونٹوں پر طنزیہ سی مسکراہٹ دیکھ کر جھنجھلا گیا۔ ”شاید آپ لوگوں کو میری کہانی پر یقین نہیں آیا۔“ وہ تلخ لہجے میں بولا اور پھر اٹھ کر تیزی سے چلتا ہوا دروازے کی طرف بڑھ گیا۔

میں نے اس بے تکی کہانی پر ایک ہلکا سا قہقہہ لگانا چاہا لیکن دوسرے ہی لمحے میری آواز حلق میں اٹک گئی۔ میری طرح اور سب بھی مبہوت ہو کر رہ گئے تھے...... کیونکہ......؟

جس وقت وہ اجنبی دروازے سے باہر نکل رہا تھا تو ویٹنگ روم کے فرش پر اس کا سایہ پڑ رہا تھا۔ سایہ نہیں بلکہ سائے...... دو سائے تھے...... جبکہ اجنبی کے ساتھ کوئی دوسرا شخص دکھائی نہیں دے رہا تھا۔





تجربہ

ایس امتیاز احمد۔کراچی

ایک موٹی اور کافی فربہ عورت بستر پر لیٹی تو اس کے جسم نے پسینہ اگلنا شروع کردیا اور پھر اچنبھا ہوا کہ عورت کا جسم گھٹنے لگا اور دیکھتے ہی دیکھتے وہ عورت مکھی سے مشابہ ہوگئی تو……

ایک عجیب وغریب ایجاد جس نے ڈاکٹر کو دہلا کرر کھ دیا تھا، دل دہلاتی ڈراؤنی کہانی

دراصل یہ ایک بہت پرانی کہانی ہے۔ اور جتنی پرانی ہے اتنی ہی حیرت انگیز اور تحیر خیز مگر یہ ایک ایسی کہانی ہے جس پر شاید آپ کو یقین ہی نہ آئے۔ پھر بھی مجھے اس کے بیان کرنے میں ذرا بھی جھجک اس لئے نہیں ہے کہ یہ کچھ میری اپنی لکھی ہوئی کہانی نہیں ہے نہ میرے دماغ کی اختراع ہے۔ بلکہ دوسروں کی زندگی کی عجیب وغریب اور سچی داستان ہے۔

بوڑھے ڈاکٹر گار کو کون نہیں جانتا……؟ وہ شب طعامی کی محفلوں کو روشن چراغ اور علم وثقافت کے گل ستانوں کا گل شگفتہ سمجھا جاتا ہے۔ مگر جب بھی اس قسم کی محفلوں اور ہنگاموں میں کسی اتفاق سے بیگم گار کا نام آجاتا ہے یا کوئی غلطی سے ڈاکٹر گار سے اس کی بیگم کے متعلق کچھ پوچھ بیٹھتا ہے تو ڈاکٹر گار کا چہرہ فق ہوجاتا ہے اور اس کی آنکھوں میں ایسی خوف ناک

حسرت برسنے لگتی ہے جسے دیکھ کر سوال کرنے والا ایک دفعہ ضرور چونک پڑتا ہے۔

کئی لوگوں کا خیال تھا کہ بوڑھا ڈاکٹر گار رنڈوا ہے اور کئی خواتین اسے بوڑھا کنوارا سمجھتی تھیں۔ مگر جو حیرت انگیز اور دردناک حقیقت ہے اسے شاید دنیا میں دو چار ہی دوست جانتے ہیں بالکل اتفاق سے اس خوف ناک راز سے میں واقف ہوں۔ اس وقت آپ مجھ سے کسی رنگین فسانے کی امید نہ رکھئے۔ یہ ایک خشک حقیقت ہے مگر نہایت تعجب خیز اور بے حد خوف ناک۔

جس زمانے میں یہ کہانی زندگی کا ایک واقعہ بنی تھی اس وقت میں ڈاکٹر گار کے ساتھ موجود تھی۔ بات یہ تھی کہ ڈاکٹر گار میرا خاندانی طبیب تھا۔ اس کے علاوہ بچپن میں میری دیکھ بھال بھی کرتا رہا تھا۔ اس لئے میں اس کی زندگی کے کئی حوادث سے باخبر تھی۔

اصل کہانی کی ابتدا یوں ہوتی ہے۔

موسم خزاں میں، میں ایک طویل نروس بریک ڈاؤن سے اچھی ہوئی تھی۔ مگر جذباتی انتشار کے کچھ آثار باقی رہ گئے تھے۔ مجبوری یہ تھی کہ اب ڈاکٹر گار زیادہ دن میری دیکھ بھال نہ کرسکتا تھا۔ کیونکہ اسے آنے والی طبی کانفرنس کے لئے اپنا تحقیقی مقالہ تیار کرنا تھا!اس کے اس مقالے کے لئے اطباء چشم براہ تھے اور اخباروں میں بڑی دھوم مچی ہوئی تھی کہ اس دفعہ ڈاکٹر گار اپنی ایک عجیب وغریب طبی تحقیق دنیا کے آگے پیش کرے گا۔ جس کی بنیاد آج سے شاید تین ہزار سال پہلے رکھی جاچکی ہے۔ یہ باتیں میری سمجھ میں نہ آتی تھیں البتہ میں اتنا جانتی تھی کہ بوڑھے ڈاکٹر گار کو جڑی بوٹیوں کی جانچ پڑتال اور پرانی ادویات کی تحقیق کا پرانا جنون ہے۔ یہی وجہ تھی کہ وہ مجھے تنہا چھوڑ کر ''انترویدی'' کے سنسان ساحل پر اپنی تجربہ گاہ میں جا گھسا تھا۔

اس کے جانے کے بعد مجھ پر ذہنی انتشار کے ہلکے ہلکے دورے پڑنے لگے۔ جس کی میں نے شکایت لکھ بھیجی۔ ایک دوپہر مجھے اپنے خط کا جواب ڈاکٹر گار کی طرف سے ملا جس کی عبارت مجھے لفظ بہ لفظ اس لئے یاد ہے کہ وہ میری دراز میں اب تک پڑا ہوا ہے لکھا تھا۔

''روزی پیاری۔

''میں سمجھتا ہوں کہ تمہارے اعصاب کے لئے بہترین دوا برمائڈ کی گولیاں نہیں بلکہ مسلسل مصروفیت ہے چنانچہ بجائے اس کے کہ میں تمہارے پاس آؤں۔ تم میرے پاس کچھ عرصہ کے لئے انترویدی کے ساحل پر چلی آؤ۔ میں اپنا تحقیقی مقالہ لکھ رہا ہوں اس سلسلے میں یہیں تمہارے لئے فرصت نکالوں گا۔'' میری بیوی تمہیں پیار کہتی ہے۔

چشم براہ

''گار''

چنانچہ میں 3 ستمبر کی ایک گہرے زرد رنگ کی اداس شام چھ گھنٹوں کا سمندری سفر طے کرکے انترویدی کے سنسان ساحل پر جا اتری چونکہ میں بے اطلاع پہنچی تھی اس لئے بندرگاہ پر مجھے لینے کوئی نہ آیا تھا۔ ویسے بھی ڈاکٹر گار سے آج کل اس کی امید نہ تھی۔ کیوں کہ سنا تھا وہ چوبیں گھنٹے اپنے تجربہ گاہ میں بند رہتا ہے۔

ایک پرانی وضع کی کرایہ کی گاڑی میں بیٹھ کر میں اس کے گھر پہنچی۔ سارے دروازے اور دریچے بند تھے۔ اطلاعی گھنٹی کاٹ دی گئی تھی۔ مختصر سے باغیچے میں کیلے کے درخت اپنی گہری سبز چھاؤں پھیلائے گم سم کھڑے تھے۔ سمندر کی موجیں ساحل سے سر ٹکرا رہی تھیں۔ میری سمجھ میں نہ آتا تھا کہ اپنی آمد کی اطلاع اندر کیسے اور کیوں کر پہنچاؤں۔ خوف اور مایوسی نے میری ذہنیت پر قبضہ جمانا شروع کردیا تھا۔ میں نے دستی بٹوے میں سے نمک کی شیشی نکال کر سکون اعصاب کے لئے سونگھی اور ڈاکٹر گار کو دل ہی دل میں گالیاں دینے لگی کہ اچانک باورچی خانے کا دروازہ باغ میں کھلا۔ میں جھٹ اوپر بھاگی وہاں ڈاکٹر گار کی بیوی کا ہیدہ ایک پہاڑ کی طرف کھڑی ہوئی ملیں مجھے دیکھتے ہی انہوں نے گلے لگا کر محبت سے اس زور سے بھینچا کہ میرا دل گھٹنے

گھٹتے رہ گیا۔

میں ایک گڑیاں کی طرح ان کے پہلو میں کھڑی تھی۔ حیران و ششدر کیوں کہ چھ مہینوں کے اندر اندر بیگم گار پھول کر کیا ہوگئی تھیں ان کے موٹاپے سے میں ہمیشہ سے نالاں تھی۔ مگر اس دفعہ تو ان کا دائرہ لامحدود ہو چکا تھا۔ یا الٰہی یہ عورت ہے یا پہاڑ! میں نے دل میں کہا پھر ہنسی ضبط کر کے بولی۔ "تسلیم پھوپھی کاہیدہ آپ کیسی ہیں......؟" اتنا کہہ کر میں نے ان کے سراپا کو دیکھا پھر بے اختیار میرے منہ سے نکلا۔ مگر توبہ توبہ آپ تو اور بھی پھر میں مصلحتاً چپ ہوگئی۔

وہ ایک ہتھنی کی طرح جھومتی ہوئی باورچی خانے کو چلیں۔ جاتے ہوئے شگفتگی سے بولیں۔ "آؤ آؤ بیٹی روزی معاف کرنا میرے بڑے ڈھنگ کے نہیں باورچی خانے میں آجاؤ۔ تھکی ہوئی ہوگی چائے پیوگی کہ کافی؟"

میں انہیں دیکھ کر بمشکل ہنسی روک رہی تھی۔ بولی "جو تیار ہو وہ پی لوں گی۔ جہاز سے ناریل کا میٹھا پانی پی کر آرہی ہوں مگر آپ باورچی خانہ میں کیا کر رہی ہیں؟ ملازم کہاں ہیں؟ نہ باہر مالی ہے نہ چوکی دار نہ کوئی اور نوکر......!"

یہ سن کر بیگم گار کے چہرے پر شکوہ شکایت کا ایک طوفان چلنے لگا۔ بھرائی ہوئی آواز میں بولیں۔ "روزی اب ڈاکٹر کا جنون اس تک پہنچ گیا ہے کہ انہوں نے تمام ملازمین کو چھٹی دے دی ہے کہتے ہیں کہ اس دفعہ کی طبیہ کانفرنس میں کوئی معرکتہ الآرا مقالہ پڑھ رہے ہیں۔ اس سلسلے میں دن رات تجربہ گاہ میں بیٹھے پرانی دواؤں کی تاثیرات کی تحقیق میں لگے رہتے ہیں۔ کہتے ہیں ذرا بھی شور یا ہنگامہ ہوا تو دواؤں کی مقدار اور تسلسل میں فرق پڑ جائے گا۔

"میں حیران ہو کر بولی۔" تو کیا گھر کا تمام کام ان دنوں آپ خود کرتی ہیں۔"

وہ رونے کے قریب ہو کر بولیں۔ "تو پھر اور کیا کروں؟ کھانا پکانا بستر لگانا، گھر صاف کرنا۔ سارے فرائض میرے ذمے ہیں۔ ہم مشرقی عورتیں بھلا اس قسم کے کاموں کی کب عادی ہوتی ہیں؟ ہمیں تو قدم قدم پر ملازموں کا سہارا لینے کی عادت صدیوں سے پڑتی آئی ہے۔ اور بھلا ذرا سوچو یہ بیگمات کے کرنے کے کام ہیں۔"

میں ہنسی روک کر بولی۔ "شاید ڈاکٹر گار کو امید ہوگی کام دھام کی مصروفیت سے آپ کا بدن ہلکا ہوجائے گا۔"

وہ ہانپتے ہوئے بولیں۔ "ارے نہیں بیٹی۔ ہر سانس کے ساتھ میں ایک انچ بڑھتی جاتی ہوں۔ ڈاکٹر کو اپنی طبی علیت اور اپنی قدیم دواؤں کی تاثیرات پر فخر تو بے حد ہے مگر میری فربہی کا ذرا بھی غم نہیں۔"

میں متاثر نظر آنے کی کوشش کرتے ہوئے بولی۔ "شاید ان کے پاس اس کا کوئی علاج ہی نہیں۔"

بیگم گار کو غصہ آ گیا۔ "ان کے پاس ایسی ایسی عجیب و غریب دوائیں ہیں کہ اگر انسان کھائے تو کبوتر بن جائے اور اگر کبوتر کھائے تو انسان بن جائے۔"

کیا واقعی میں انگشت بہ دنداں رہ گئی۔

بیگم گار بولیں ہش! آہستہ! کوئی سن نہ لے۔ اسی لئے تو نوکروں کو برخاست کر دیا ہے عجیب و غریب دوائیں ہاتھ لگی ہیں بیٹی کیا بتاؤں تم سن کر دنگ رہ جاؤ گی۔ یہ تو میں نے یوں ہی تم سے کہہ دیا۔

میرا اشتیاق بڑھتا ہی چلا گیا میں نے ضد کر کے کہا۔ "پھوپھی کاہیدہ میں چائے سے پہلے ڈاکٹر گار سے ملوں گی۔ بعد میں ناشتہ کریں گے۔ ابھی تو سورج بھی غروب نہیں ہوا۔"

"ڈاکٹر اپنے کمرے میں بند ہے روزی۔ چاہتی ہو تو باغ کی راہ جا کر تجربہ گاہ کی تیسری کھڑکی کھٹکھٹاؤ۔" میں دبے پاؤں کیلے کے درختوں میں سے گزر کر باغ میں تیسری کھڑکی کے نیچے چلی گئی اور اسے کھٹکھٹانے لگی۔ جب اندر سے کسی نے رسید نہ دی تو کنجی کے سوراخ میں سے ایک آنکھ بند کر کے دوسری آنکھ سے جھانک کر دیکھا تو مجھے شبہ ہوا۔ ڈاکٹر گار کو خلل دماغ ہوگیا ہے وہ مرتبانوں اور صراحیوں کے بیچوں بیچ کھڑا

کوئی رقیق سی چیز امتحانی نلکی میں سے بار بار گزار کر خوردبین سے دیکھ رہا اور مسکرائے جارہا تھا کبھی کبھی ہلکے سے ہنس پڑتا تھا۔

آستینیں چڑھی ہوئی تھیں۔ بال بکھرے ہوئے تھے۔ گریبان کھلا ہوا تھا محنت اور فاقوں کی وجہ سے سوکھ کر کانٹا ہوگیا تھا۔ اور بالکل دیوانہ لگ رہا تھا۔

میں نے آہستہ سے کھڑکی کھٹکھٹائی، اتفاق سے اس نے سن لیا۔ دو ایک دفعہ نظر اٹھا کر دیکھا پھر دروازہ کھول دیا۔ دروازے کے کھلتے ہی دواؤں کی تیز مہک نے میرا سر چکرا دیا۔

''کون؟ ارے کون؟'' ڈاکٹر گار نے آہستہ لہجے میں پوچھا۔

''تسلیم ڈاکٹر۔'' میں نے کہا۔

ڈاکٹر نے مجھے اندر کرکے دروازہ بھیڑ کر کہا۔ ''زندگی اور موت کا معاملہ ہے روزی۔ تم کو قطرے ٹپکانے کی مشق ہے۔ یا نہیں اچھا خیر رہنے دو۔ یہ کام میں خود کرلوں گا۔ تم اتنا تو کرسکتی ہو کہ جو مسودہ اس کھڑکی میں پڑا ہے اس کی لفظ بہ لفظ نقل کردو۔ عین وقت پر پہنچیں۔ زندگی اور موت کا مسئلہ!''

میں وحشت زدہ ہوکر بولی۔ ''وہ کیسے ڈاکٹر؟ زندگی اور موت کا معاملہ؟''

''اور کیا بیٹی۔'' ڈاکٹر نے سرگوشی کی۔ ''اس دوا کی مقدار میں بڑی احتیاط کی ضرورت ہے۔ رتی کا سواں حصہ بھی ایک آدمی کی جان لے سکتا ہے۔ لیکن یہی دوا انسان کے لئے اکسیر بھی ثابت ہوتی ہے بس صرف مقدار کی کمی بیشی پر سارا انحصار ہے۔''

مجھے شبہ ہوا ڈاکٹر دیوانہ ہوگیا ہے میں صراحیوں اور مرتبانوں سے بھری ہوئی میزوں کے درمیان بوکھلائی ہوئی کھڑی تھی۔ اور تیزاب کی بو سے سر پھٹا جارہا تھا میں نے ایک الماری کا سہارا لیا اور کمزور لہجے میں بولی۔

''بتاؤ بات کیا ہے؟''

ڈاکٹر گار سرگوشی میں بولا۔ ''کبھی یہ دوا پرانے عبرانیوں کے استعمال میں آئی تھی۔ وہ اس کی صحیح مقدار کو جانتے تھے لیکن میں حیران ہوکر بولی اتنی پرانی دوا...... وہ خراب نہیں ہوگئی؟''

ڈاکٹر گار بولا۔ ''بنی بنائی تھوڑا ہی ہاتھ آئی ہے؟ ایک پارہ سنگ سیاہ پر عبرانی زبان میں اس کا نسخہ اور اس کے نیچے باریک باریک تحریر میں اس کی تاثیر لکھی ہوئی دستیاب ہوئی۔'' یہ کہہ کر اس نے قہقہہ لگایا۔

میں وحشت زدہ سی ہوکر پیچھے کو ہٹی۔ پھر ذرا سنبھل کر بولی۔ ''تو گویا کلید مراد مل گئی؟''

ڈاکٹر بولا۔ ''ساری مصیبت اس کی مقدار کے متعلق ہے روزی ذرا سی کمی بیشی خوف ناک سے خوف ناک نتائج کا باعث بن سکتی ہے۔''

''آخر یہ کس مرض کی اکسیر ہاتھ آئی ہے ڈاکٹر؟'' میں مجسم اشتیاق بن کر پوچھنے لگی۔

''یہ تو اس وقت بتاؤں گا جب باقاعدہ اعلان کردوں گا۔ آئندہ ہفتے اسے میں آزمانے والا ہوں۔''

''کس پر؟'' میں نے بے ساختہ پوچھا۔

''انسان پر میں نے انتظام کرلیا ہے۔ مقامی جیل خانہ سے ایک قاتل میری تجربہ گاہ میں جمعرات کی صبح بھجوایا جائے گا۔ اس مجرم پر میں اپنی دوا آزماؤں گا۔ اور یہ قاتل مجرم وہ مبارک و مقدس آدمی ہوگا جس نے تحلیلی کو اپنے پر آزمانے دیا...... اور......''

اتنا کہہ کر وہ چونک پڑا۔ اور یک لخت چپ ہوگیا جیسے کوئی غلط لفظ منہ سے نکل گیا ہو۔

میری نظر اچانک سامنے کی الماری پر رکھے ہوئے ایک مرتبان پر پڑی۔ جس پر سفید کاغذ کا لیبل لگا ہوا تھا۔ اس پر سرخ روشنائی سے باریک حروف میں لکھا ہوا تھا۔

''تحلیلی''

اس وقت پائیں باغ میں کچھ سرسراہٹ سی سنائی دی۔

ڈاکٹر گار بوکھلا گیا۔ دریچی سے باہر جھانک کر دیکھا بولا۔ ''کون ہے باغ میں......؟''

میں بولی۔ ''کوئی بھی تو نہیں...... شام کی

ہوائیں کیلے کے پتوں کو چھیڑ رہی ہیں۔ آپ اتنے گھبرا کیوں گئے؟"

ڈاکٹر گار بولا۔" کیا بتاؤں روزی، آپ کل ہر قدم پر احتیاط کرنی پڑتی ہے۔ دیکھو نا دوائیں اکسیر بھی ہوتی ہیں۔ اور زہر قاتل بھی آج کل میں نہ کسی ملاقاتی کو آنے دیتا ہوں نہ ملازم کو رکھتا ہوں۔ بس گھر میں صرف کاہیدہ ہیں یا میں اور اب تم اچھا چلو تھوڑا سا ناشتہ کرلیں۔ آفتاب غروب ہونے والا ہے۔" یہ کہتے ہوئے اس نے تخلیلی کا مرتبان پیچھے کو سرکا دیا۔ اور مجھے باہر چلنے کو کہا۔ یوں معلوم ہوتا تھا وہ مجھے اپنی تجربہ گار سے جلد سے جلد باہر کرنا چاہتا ہے۔ ہم دونوں باہر نکل آئے اور میں نے باغ کی تازہ ہوا میں آ کر لمبی سانس لی اور شکر بجالائی کیونکہ دواؤں کی تیز بو نے مجھے حواس باختہ کردیا تھا۔ باہر باغ میں ستمبر کی ایک گہرے زرد رنگ کی شام پھیلی ہوئی تھی۔ ہلکے زرد رنگ کا آسمان دمک رہا تھا۔ اور سبز لہلہاتے ابراہوؤں میں منتشر تھے کیلے کے طویل سبز پتوں میں ابابیلیں بیٹھی ہوئی نغمہ سرائی کررہی تھیں۔ کبھی کبھی دور سے کسی کنوئیں کی چرخی کی درد انگیز آواز شام کی اداسیوں میں اور اضافہ کردیتی تھی۔

کھانے کے کمرے میں بیگم گار کسی ہاتھی کی طرح میز کے پاس کھڑی ہمارا انتظار کررہی تھیں۔ میں نے سرسری نظر ڈالی تو دیکھا کہ کھانے کی میز پر درجن بھر طشتریوں میں بھاپ نکلتا ہوا گرم گرم خوشبودار کھانا رکھا ہوا تھا۔

ڈاکٹر گار نے اعتراض کیا۔" یہ ناشتہ ہے یا دعوتی کھانا؟" بیگم گار بولیں۔" دن بھر کی محنت کے بعد مرغن کھانا انسان میں توانائی پیدا کردیتا ہے۔ اور جلد جلد ورنہ ٹھنڈا ہوجائے گا۔" یہ کہہ کر رکابی میرے ہاتھ میں تھمادی۔ اب میں بیگم گار کی غیر معمولی فربہی کا راز پہچان چکی تھی۔ وہ ایک ایک رکابی پر بے حد شوق سے جھکتی تھیں اور بے اندازہ کھانا اپنی پلیٹ میں انڈیل کر جلد جلد کھانے لگ جاتیں۔

تھوڑی دیر بعد کہنے لگیں صبح سے میں نے فاقہ کیا تھا کہ شاید اس سے میرا وزن کم ہوجائے پر اب مجھ سے رہا نہیں جاتا۔

ڈاکٹر گار کہنے لگا۔" اس پر تمہیں مجھ سے شکایت ہے کہ چراغ تلے اندھیرا۔"

" میں تمہیں دبلا ہونے کی دوا نہیں دیتا۔ جب تک مریض کی بسیار خوری کی عادت بد نہیں چھوٹتی مرض بھی اس کا پیچھا نہیں چھوڑتا۔"

بیگم گار قیمہ اور پیاز کا بھرتا اپنے منہ میں بھرتے ہوئے بولیں۔" اپنا موٹا پا دیکھ کر خوف سے کانپ جاتی ہوں کہ کسی دن کوہ آتش فشاں کی طرح پھٹ نہ پڑوں۔ خدا کے لئے میرا کوئی علاج تجویز کرو۔" یہ کہتے کہتے ان کی آنکھوں سے آنسوؤں کا چشمہ ابل پڑا۔ وہ بے حد قابل رحم معلوم ہوتی تھیں۔

میں نے اناس کا ایک سینڈوچ لیتے ہوئے کہا۔" بھوک بند کرنے کی کوئی تیز دوا دے کر آزمایئے ڈاکٹر۔"

ڈاکٹر گار کالی کافی سوچتے ہوئے بولا۔" اس سے دو دن تو بھوک بند رہتی ہے اس کے بعد بے تحاشہ کھل جاتی ہے جس سے ان کا وزن بڑھ جاتا ہے۔"

" عجیب بات ہے۔" میں نے حیران ہو کر کہا۔ تو پھر کسی قسم کا ہلکا ذہنی دھچکا لگنا چاہئے۔ تاکہ جذباتی انتشار سے بھوک بند ہو۔

ڈاکٹر کہنے لگا۔" گزشتہ مہینے شدید دھچکا لگ چکا ہے کاہیدہ کا بھائی ذیابیطس سے اچانک انتقال کرگیا۔"

بیگم گار بولیں۔" لیکن اس حادثے سے میری بھوک اور کھل گئی۔ میں دن رات کھانے لگی...... اور میرا وزن بے چاری رو پڑیں۔"

میں بولی بعض وقت مریضوں میں ذہنی پریشانی شدید بھوک کی صورت اختیار کرلیتی ہے۔ اور مریض کھا کھا کر پھول جاتا ہے ڈاکٹر گار...... کانفرنس سے واپس آتے ہی آپ کو پھوپھی کاہیدہ کے مرض کے پیچھے ہاتھ دھو کر پڑ جانا چاہئے۔

بیگم گار بیک وقت دو کباب منہ میں داخل

کرتے ہوئے بولیں۔

"اگر تم نے میری فکر نہ کی اور علاج نہ کیا تو یا تو میں خودکشی کرلوں گی یا اپنا علاج آپ کرلوں گی اب یہ پہاڑ جسم مجھ سے اٹھایا نہیں جاتا۔"

ڈاکٹر گار نے کہا۔ "میں وعدہ کرتا ہوں طبیہ کانفرنس سے واپس آتے ہی میں تمہارا علاج شروع کردوں گا۔"

آخر تیسرے دن دوپہر کے ہوائی جہاز سے ڈاکٹر گار طبیہ کانفرنس کے لئے روانہ ہوگیا۔ جانے سے پہلے اس کا چہرہ شادمانی وکامرانی سے دمک رہا تھا۔ اور وہ بڑے فخر سے اپنے مضمون پر آخری نظریں ڈال رہا تھا۔ جسے وہ کانفرنس میں پڑھنے والا تھا۔ جانے سے پہلے اس نے مجھے اور بیگم گار کو مخاطب کرکے کہا۔ "چابی احتیاط سے رکھنا اور اندر نہ جانا جب تک کوئی شدید ضرورت پیش نہ آجائے۔ خدا حافظ۔" اور وہ مسکراتا ہوا غائب ہوگیا اس وقت تک ہم پر کوئی مصیبت نہ آئی تھی۔

ڈاکٹر کے جانے کے بعد میں سکون اعصاب کے لئے ساحل پر ٹہلنے کے لئے نکل گئی اور دیر تک ساحل پر رنگین سیپیاں چنتی اور اپنے خواب کے جزیروں میں گھومتی رہی۔

غروب آفتاب کے قریب میں گھر لوٹی۔ گھر پر سناٹا سا طاری تھا۔ میں نے باورچی خانے میں جھانک کر دیکھا تو بیگم گار سامنے ایک بڑے طباق میں حلوا پکانے کا سامان لئے سر دونوں ہاتھوں میں تھامے کرسی پر یوں بیٹھی تھیں۔ جیسے کسی شدید تکلیف میں مبتلا ہوں۔ جیسے مصیبتوں کا پہاڑ ٹوٹ پڑا تھا۔ اس کے بعد ایسے حیرت ناک واقعات پیش آئے جن کا جواب نہیں۔ میں خوف زدہ ہوکر دروازے میں داخل ہوئی۔ "کیا ہوا پھوپھی کاہیدہ؟"

وہ بھرائی ہوئی آواز میں بولیں۔ "سر درد سے پھٹا جارہا ہے خیال تھا آج بادام کا حلوہ پکاؤں گی مگر ......اف خدایہ کیا ہورہا ہے۔"

بیگم گار کی پھٹی پھٹی نظریں اور سرخ چہرے کو دیکھ کر میں حواس باختہ ہوکر آگے کو بڑھی۔ اور ان کی پیشانی کو چھو کر بولی۔ "ہائے ہائے پیشانی لوہے کی طرح تپ رہی ہے۔ شدید درجہ کا بخار معلوم ہوتا ہے۔ آپ فوراً لیٹ جائیے۔"

انہوں نے سہارے کے لئے میری طرف ہاتھ بڑھایا۔ میں بدحواس ہوگئی کیسے میں ان کا بوجھ سہار سکتی تھی۔ تاہم وقت کی نزاکت کو محسوس کرکے بادل ناخواستہ میں ان کا ہاتھ تھام لیا۔ اور وہ میرے سہارے آہستہ آہستہ اپنے کمرے کی طرف چلنے لگیں۔ قدم قدم پر میری حیرت بڑھنے لگی کیوں کہ وہ مجھے اتنی بوجھل نہ لگیں جتنا کہ میرا خیال تھا۔ بلکہ یوں معلوم ہورہا تھا جیسے وہ کارک کی بنی ہوئی ہوں۔ میں نے سوچا وہ اپنا سارا بوجھ اپنی ٹانگوں پر ڈال کر چل رہی ہیں۔

یہ سوچ کر میرا اطمینان ہوگیا۔

کمرے میں پہنچ کر میں نے ان کا بستر درست کیا اور بمشکل انہیں لٹایا۔ وہ کراہ رہی تھیں اور کسی ناقابل بیان بے چینی کا شکار معلوم ہورہی تھیں۔

کچھ دیر بعد میری نظر ان کے تکیے اور پھر بستر پر گئی میں نے ہاتھ لگا کر دیکھا تو تکیہ اور بستر گیلا ہورہا تھا میں نے ان کے سر پر برف بھی نہیں رکھی تھی پھر یہ پانی کہاں سے آیا......؟ ابھی میں سوچ ہی رہی تھی کہ مجھے پانی کے قطروں کے ٹپکنے کی آواز آئی۔ جھک کر دیکھا تو بستر کے نیچے پانی ٹپک رہا تھا۔ میری کچھ سمجھ میں نہیں آیا جلدی سے غسل خانے سے ایک گیلن لاکر بستر کے نیچے رکھ دیا۔ یہ معمہ میری سمجھ میں نہ آیا۔ میں بھاگی ہوئی ٹیلی فون کے پاس گئی وہ ایک ڈاکٹر کو بلایا۔ تھوڑی دیر بعد وہ ڈاکٹر ہاتھ میں بیگ لے کر آگیا۔ میں اسے مرض کی نوعیت سمجھا نہ سکی۔ اس لئے مریضہ کے کمرے میں لے گئی۔

"ڈاکٹر نے کچھ دیر مریضہ کا معائنہ کیا۔ نبض دیکھی۔ آنکھیں دیکھیں، زبان دیکھی پھر متفکر لہجہ میں پوچھا۔ "یہ حالت کب سے ہے؟"

"ابھی چند گھنٹوں سے۔" بیگم گار نے بمشکل

لیا۔ ان کی آواز بے حد باریک ہوگئی تھی۔
"مگر ڈاکٹر صاحب! یہ پانی کہاں سے آرہا ہے
بستر گیلا ہے کئی دفعہ چادر بدل چکی ہوں۔ آسمان پر نہ بادل ہیں نہ گھٹا یہ پانی کہاں سے برسنے لگا؟"

ڈاکٹر نے مڑ کر مجھے دیکھا۔ دو منٹ بعد بولا۔
"یہ پانی نہیں ہے مریضہ کے مساموں سے پسینہ بڑی شدت سے خارج ہو رہا ہے۔"

میں متوحش ہو کر بولی۔ "آخر یہ کیا مرض ہے۔"

ڈاکٹر پریشان سا نظر آرہا تھا بولا۔ "کیا پتہ میری سمجھ میں کچھ نہیں آیا۔"

میں نے کہا۔ "ان کی آواز بھی سیٹی کی طرح باریک ہوگئی ہے۔"

ڈاکٹر کہنے لگا۔ "نہ صرف باریک بلکہ اس میں ایک کپکپی سی ہے۔"

میں پریشان ہو کر بولی۔ "آخر اس کی وجہ کیا ہے؟ گلا خراب ہے؟"

ڈاکٹر نے ان کا منہ کھول کر دیکھا پھر بولا۔ "بظاہر گلے میں کوئی خرابی نہیں ہے۔ ایسی علامات میں نے کبھی نہیں دیکھیں مسام کھل گئے ہیں پسینہ بہہ رہا ہے مگر بخار گھٹنے کی بجائے بڑھتا ہی جاتا ہے بہر حال رات تک انتظار کیجیے شاید میں کسی نتیجے پر پہنچ سکوں۔ میں نرس بھیجے دیتا ہوں۔ وہ مجھے ٹیلیفون پر رپورٹ سنا دیا کرے گی۔" یہ کہہ کر ڈاکٹر نے بیگ اٹھایا۔ اور پلٹ کر خوف ناک نظروں سے مریضہ کو دیکھتا ہوا جلدی سے باہر نکل گیا۔ معلوم ہوتا تھا کہ اس کے اوسان خطا ہوگئے ہیں۔

تھوڑی دیر کے بعد اسپتال سے نرس آگئی۔ وہ رات میری زندگی کی ایک خوف ناک رات تھی۔ میں اور نرس سرہانے بیٹھے خوف ناک نگاہوں سے مریضہ کو دیکھتے رہے۔ ان میں بتدریج عجیب وغریب تبدیلیاں آتی جاتی تھیں۔ مثلاً میں نے بخار دیکھنے کے لئے ان کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں اٹھا کر دیکھا۔ اور پھر دہشت زدہ ہو کر جلدی سے بستر پر چھوڑ دیا...... وہ بالکل ایک کاغذی ہاتھ معلوم ہو رہا تھا گوشت پوست کا بنا ہوا انسانی ہاتھ نہیں پھر نرس نے ان کا سر اٹھا کر تکیہ ٹھیک کیا اور متوحش ہو کر کہنے لگی۔ "ارے یہ سر ہے یا روئی کا گولا! اس میں تو کوئی وزن ہی نہیں۔"

مجھے خوف و دہشت کی وجہ سے سارے جسم میں ایک جھرجھری سی محسوس ہوئی میں نے بمشکل حلق سے آواز نکالتے ہوئے کہا۔ "نرس باغ کا دریچہ بند کردو۔"

یہ سن کر نرس پراسرار نظروں سے مجھے دیکھنے لگی پھر بولی۔ "کیوں؟ آپ کو ڈر ہے کہ ہوا کا جھونکا؟"

میں ذرا تامل کر کے بولی۔ "ہاں وہ بے حد ہلکی ہوگئی ہیں۔ ہوا کا جھونکا انہیں بستر سے نیچے نہ گرا دے۔"

ابھی میرا جملہ ختم نہیں ہوا تھا کہ ایک ہلکی باریک سی سیٹی کی آواز آئی۔ ہم نے غور سے سنا تو بیگم گار کہہ رہی تھیں پیاس پیاس جب میں پانی کا گلاس لے کر آئی اور نرس نے انہیں سہارا دیا تو لحہ بھر کو مجھے یوں محسوس ہوا جیسے نرس انہیں بستر پر چھوڑ کر بھاگ جانا چاہتی ہے اس لئے میں نے فوراً ہاتھ بڑھا کر بیگم گار کو تھام لیا...... اس وقت مجھے معلوم ہوا کہ نرس پر کیا گزری تھی۔ بیگم گار بالکل ایک بے وزن سی کاغذی گڑیا معلوم ہو رہی تھیں۔

رات بھر ہم بستر کی چادریں بدلتی رہیں کیوں کہ وہ ہر آدھے گھنٹے کے بعد پسینے میں شرابور ہو جاتی تھیں۔

صبح چار بجے کے قریب میں اتنی تھک گئی تھی کہ میرے لئے بیٹھنا محال ہوگیا تھا۔ اس لئے میں نرس کو مریضہ کے پاس چھوڑ کر گھنٹے دو گھنٹے آرام کے لئے اپنے کمرے میں چلی گئی۔

مجھے بستر پر لیٹے نصف گھنٹہ بھی نہیں گزرا تھا کہ نرس نے زور زور سے میرا دروازہ کھٹکھٹانا شروع کر دیا۔ میں گھبرا کر اٹھی دروازہ کھول کر دیکھا تو نرس کھڑی کانپ رہی تھی اور کہہ رہی تھی مجھے چھٹی دیجیے۔

"مریضہ کا کیا حال ہے؟"

"خود چل کر دیکھ لیجیے۔"

میں بدحواس ہوکر نرس کے ساتھ مریضہ کے کمرے کی طرف بھاگی ڈرتے ڈرتے دروازہ کھولا بستر پر نظر ڈالی اور پریشان ہوکر بولی۔ ''بیگم گار کہاں گئیں؟''

نرس لرزاں تھی۔ بولی۔ ''یہاں ہیں۔''

میں نے بستر کی چادر ہٹادی۔ حیرت واستعجاب سے میرے منہ سے چیخ نکلنے کو تھی جسے میں نے ضبط کرلیا۔ میرے سامنے بستر پر بجائے لحیم وشحیم بیگم گار کے ایک سات آٹھ سال کی بچی پڑی تھی۔ ننھے ننھے ہاتھ پیر مختصر سا نقش چھوٹا چھوٹا سا سر۔

میں خوف سے کانپتی ہوئی دروازے سے باہر نکل کر باغ کے زینے پر جاکھڑی ہوئی اور نرس کو آواز دی۔ ''نرس باہر آجاؤ مجھے یہ بتاؤ یہ حیرت انگیز تبدیلی کب اور کیسے ہوئی؟''

نرس ہکلاتے ہوئے بولی۔ ''بس مجھ سے کچھ نہ پوچھیے ایسا مرض میں نے کبھی نہ دیکھا نہ سنا۔ رات بھر میں پسینے سے ترکئی چادریں بدلتی رہی۔ اور مریضہ گھلتی رہیں گھلتی چلی گئیں میں نے ڈاکٹر کو دو تین مرتبہ حالات سنائے انہوں نے کہا کہ یہ مرض انسانی مرض نہیں معلوم ہوتا۔''

''ہائیں!'' میں نے چیخ کر کہا۔ ''تو پھر اور کیا مرض ہے۔''

''مجھے کچھ نہیں معلوم۔ مجھے جانے دیجیے......

''نرس نے جلدی جلدی کمرے میں سے اپنی چیزیں سمیٹتے ہوئے کہا۔

تھوڑی دیر بعد میں اس خوف ناک مریضہ کے ساتھ اکیلی رہ گئی۔

میں نے ڈاکٹر گار کو تاکیدی تار دے دیا کہ وہ فوراً واپس چلے آئے دوپہر کے گیارہ بجے مقامی اسپتال سے تین چار ڈاکٹر بیگم گار کو دیکھنے آئے جب چادر ہٹا کر دیکھا تو ڈاکٹروں کے چہرے فق ہوگئے ہمارے سامنے دو تین سال کی ایک ننھی سی بچی بستر پر پڑی گہری نیند سورہی تھی۔

ڈاکٹروں نے مجھ پر مختلف قسم کے سوالات کی بوچھاڑ شروع کردی۔ مگر میرے پاس اس کا ایک ہی جواب تھا کہ مجھے کچھ نہیں معلوم کہ ان کے مرض کی نوعیت کیا ہے۔ جب معالجوں کو میری طرف سے مایوسی ہوئی تو وہ بیگم گار پر پل پڑے انہیں الٹا پلٹا کر دیکھا اور چہ میگوئیاں کرنے لگے۔ وہ نہ بات کرسکتی تھیں اور ہماری کوئی بات سن سکتی تھیں۔ کیونکہ ہماری آوازیں ان کے لئے بے حد کرخت تھیں جب ہم آپس میں سرگوشیوں میں بات کرتے تو وہ اپنے ننھے ننھے ہاتھ اپنے دو ننھے کانوں پر رکھ کر کراہنے لگتی تھیں دو ایک دفعہ انہوں نے اپنی سیٹی کی سی باریک آواز میں کچھ کہنے کی کوشش کی مگر ہماری سمجھ میں کچھ نہ آیا۔ آواز بے حد مدھم اور بہت باریک تھی جیسے کوئی مکھی بھنبھنا رہی ہو۔

ڈاکٹروں نے دل بھر کے ارمان نکالے۔ معائنہ ہوئے قیاس آرائیاں ہوئیں موٹی موٹی کتابیں کھولی گئیں بحث مباحثے ہوئے آخر تھک ہار کر غروب آفتاب کے وقت واپس چلے گئے۔ سب کو ڈاکٹر گار کا انتظار تھا۔ شام پڑ گئی مگر وہ نہ آیا کیوں کہ آج طبی کانفرنس کی پہلی نشست تھی آج وہ اپنی تحقیقی مقالہ پڑھنے والا تھا۔

چند گھنٹے اور گزر گئے میری تنہائی اور بیگم گار کی بیماری بڑھتی گئی۔ اور شام گہری ہوتی چلی گئی۔

میں باغ کے زینے پر بیٹھی کبھی بیگم گار پر نظر ڈالتی اور کبھی خوف سے لرزنے لگتی۔ جب بھی میں مریضہ پر نظر ڈالتی وہ مجھے پہلے سے بھی زیادہ کمزور اور سکڑی ہوئی نظر آتیں۔ یہاں تک کہ وہ اب ایک سال کے انسانی بچے جتنی رہ گئی تھیں۔

مجھے یہ سب کچھ ایک خواب پریشان معلوم ہورہا تھا۔ لیکن افسوس...... کہ یہ خواب نہیں تھا یہ حقیقت تھی ٹھوس حقیقت لیکن کہانی سے زیادہ خوف ناک اور داستان سے زیادہ عجیب۔

اب آفتاب غروب ہوگیا تھا۔ رات کا اندھیرا باغ کے کیلے کے پودوں پر اتر آیا تھا۔ ناریل کے

درخت رات کو ہواؤں میں جھوم رہے تھے۔ اور باغ کے کنویں پر چمگادڑیں چکر کاٹ رہی تھیں میرا دل دھک دھک کر رہا تھا۔ میں نے دل میں ٹھان رکھی تھی کہ آج کی رات میں بیگم گار کو کسی اسپتال میں داخل کرا کر خود واپس چلی جاؤں گی۔

میں انہیں خیالات میں غرق تھی کہ باہر گھنٹی بجی میں نے ڈرتے ڈرتے جا کر دروازہ کھولا نہ جانے اب یہاں نئی مصیبت آئے گی مگر میری خوشی کی انتہا نہ رہی جب ڈاکٹر گار کو کھڑا ہوا پایا۔

ڈاکٹر گار کے چہرے پر ہوائیاں اڑ رہی تھیں۔ اس نے شدید تردد کے عالم میں پوچھا۔ ''کوئی خوف ناک مصیبت؟''

''بیگم گار شدید بیمار ہیں۔''

ڈاکٹر گار یہ سنتے ہی بدحواس ہو کر کمرے کی طرف بھاگا میں بھی اس کے پیچھے بھاگی۔ ہم دونوں مریضہ کے کمرے کے دروازے پر پہنچ کر دو لمحوں کے لئے خاموش کھڑے ہو گئے نہ جانے ہماری آنکھیں کیا دیکھیں۔

کمرے میں نیم تاریکی سی تھی۔ بستر پر سفید چادر پڑی تھی جس کے نیچے کسی انسانی جسم کی موجودگی پائی نہیں جاتی تھی سارا بستر پسینے سے یوں تر تھا جیسے بارش ہو رہی ہو؟

ڈاکٹر گار نے چادر ہٹا کر دیکھا اور سر پیٹ لیا۔ شاید آپ کو یقین نہ آئے مگر یہ حقیقت ہے کہ وہاں بالشت بھر کی ایک گڑیا پڑی تھی۔

مجھے پھر شبہ ہوا کہ میں خواب دیکھ رہی ہوں۔ یہ سب کچھ خواب ہے ہاں خواب مگر ڈاکٹر گار کی آواز نے مجھے پھر حقیقت کی دنیا میں پہنچا دیا کہنے لگا۔ ''اس گھر کو آگ لگ گئی گھر کے چراغ سے۔''

''کیا مطلب؟'' میں نے اشاروں میں پوچھا۔

دو لمحے چپ رہا پھر اس کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے کہنے لگا۔ ''اب یہ پسینہ اس وقت تک بند نہ ہوگا جب تک خود مریض تحلیل نہ ہو جائے۔''

''اس کا کوئی علاج۔''

ڈاکٹر گار رو پڑا۔ ''اس کا کوئی علاج نہیں۔ اس مرض کے لئے قبر کھود کر اس معالج کو جگانا پڑے گا جو آج ہزاروں سالوں سے اپنی قبر میں پڑا ابدی نیند سو رہا ہے۔''

مجھے پھر حقیقت پر خواب کا دھوکہ ہونے لگا۔ یہ ڈاکٹر گار کہہ کیا رہا ہے؟ میں دیوانی ہو گئی ہوں یا خواب دیکھ رہی ہوں۔

ڈاکٹر گار کہنے لگا۔ ''بیٹی روزی تم نے میرے تجربہ گاہ میں ایک دفعہ ایک مرتبان دیکھا تھا جس پر کاغذ کے پرزے پر ''تحلیلی'' لکھا ہوا تھا۔ یاد ہے؟''

''ہاں...... ہاں پھر......؟''

''میں اس کے متعلق اپنا مقالہ پڑھنے گیا تھا۔ یہ دوا کسی پرانے یونانی حکیم کی ایجاد ہے۔ یہ آدمی کو تحلیل کر دیتی ہے اس کی مقدار کا کسی کو علم نہیں ہے اسی سلسلے میں تجربے کر رہا تھا سوئی کی نوک پر رکھ کر رتی کا سوواں حصہ بھی کسی کو کھلایا جائے تو اس کا وزن ہلکا ہونا شروع ہو جاتا ہے یہاں تک کہ انسان ہو یا ہاتھی گھلتے گھلتے انسانی نظر سے غائب ہو جاتا ہے۔ لیکن یہی دوا اگر صحیح مقدار میں کھائی جائے تو انسان کی قوت حیات شباب زندگی عود کر آتی ہے اور قائم رہتی ہے لیکن ہائے کاہیدہ نے معلوم ہوتا ہے اپنے موٹاپے کا علاج بغیر سوچے سمجھے اس خطرناک دوا سے کیا...... اور......''

اسی وقت ایک ایسی باریک سی آواز آئی جیسے کسی ربڑ کے کھلونے کو دبانے سے آتی ہے ہم نے پلٹ کر دیکھا تو بدنصیب بیگم گار کچھ کہنے کی کوشش کر رہی تھیں اب ان کا قد ایک کیلے کے برابر رہ گیا تھا ڈاکٹر گار نے انہیں آہستہ سے اٹھا کر ایک چھوٹی سی ٹوکری میں رکھ دیا۔

جب میں رات کے نو بجے دوبارہ ڈاکٹر کے کمرے میں آئی تو ٹوکری موجود نہ تھی گھبرا کر میں نے پوچھا۔ ''اب کیا خیال ہے؟ ڈاکٹر اداس لہجے میں کہنے لگا۔ ''اب وہ اتنی ہلکی ہو گئی ہیں کہ اندیشہ تھا ہوا کا ایک جھونکا انہیں اڑا کر نہ لے جائے۔ میں نے انہیں ماچس کی ڈبیا میں رکھ کر الماری کے اوپر رکھ دیا ہے۔'' یہ کہتے

کہتے اس کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔

کچھ دیر بعد اس نے کہا۔ ''روزی تم اس ماچس کی ڈبیا کا خیال رکھنا۔ میں ذرا اپنے کتب خانے میں جاتا ہوں اس سلسلے میں ایک آخری تدبیر آزمانا چاہتا ہوں۔ دیکھئے تقدیر کیا دکھاتی ہے۔''

میں اتنے بڑے کمرے میں اداسی کے عالم میں تنہا رہ گئی۔ ڈاکٹر گار کتابوں میں غرق ہوگیا۔ تھوڑی تھوڑی دیر میں، میں ماچس کی ڈبیا کو کھول کر دیکھ لیتی تھی۔ رات بے حد اور سنسان تھی دور پرے کتوں کے بھونکنے کی آوازیں آرہی تھیں ساری کائنات پر ایک ہولناک سکوت مسلط تھا۔

رات کے گیارہ بجے ڈاکٹر گار اپنی تجربہ گاہ سے باہر نکلا اس کا چہرہ دیکھ کر میں سمجھ گئی۔ اب اس کی ساری امیدیں ختم ہوگئی ہیں۔ وہ سیدھا میز کے پاس گیا ماچس کی ڈبیا کھولی میں نے بھی ایک نگاہ ڈالی اب بیگم گار ایک لونگ کے برابر رہ گئی تھیں ڈاکٹر گار نے چھری کی نوک پر انہیں احتیاط سے اٹھایا اور غور سے دیکھنے لگا پھر انہیں ڈبیا میں بند کرتے ہوئے ایک آہ سرد بھری بولا۔ ''اب کوئی امید باقی نہیں رہی......'' یہ کہہ کر سر پکڑ کر کوچ پر بیٹھ گیا میں نے کہا۔ ''وہ پیاسی ہوں گی۔''

وہ بھرائی ہوئی آواز میں بولا۔ ''سوئی کے ناکے میں پانی کا قطرہ رکھ کر ٹپکا دو۔''

چنانچہ ہم نے یہی کیا۔ بار بار سوئی کے ناکے سے پانی کی بوندیں بیگم گار پر ڈالتے رہے۔

دریچے سے باغ کی فرحت بخش خنک ہوا کے جھونکے اندر آنے لگے۔ میں کوچ پر نیم دراز تھی۔ دو دن اور دو راتوں کی جاگی ہوئی تھی۔ اس لئے میری آنکھ لگ گئی۔ لیکن بارہ بجے ڈاکٹر گار کے دردناک لہجے نے مجھے جھنجھوڑ کر اٹھا دیا۔ وہ رو رو کر کہہ رہا تھا۔ ''ہائے کاہیدہ اب نہ جانے کہاں ہیں۔ ماچس کی ڈبیا کے اندر غور سے دیکھنے پر بھی کہیں لگی ہوئی نظر نہیں آتیں۔ تھوڑی دیر ہوئی جھینگر کی آواز سے بھی زیادہ باریک آواز نہ جانے کہاں سے آئی تھی۔ اب وہ بھی بند ہوگئی۔'' یہ کہہ کر وہ سسکیاں لے کر رونے لگا۔ پھر جب ذرا سنبھلا تو فلک شگاف آ... میں پکار کر پوچھا۔ ''کاہیدہ کہاں ہو تم؟ کہاں ہو تم؟

میں نے کمرے کی ایک ایک چیز اٹھا کر دیک... کاغذ کا ایک پرزہ میز پر رکھی ہوئی دوات قلم کی نو... ......غرض سب کو جھاڑ پھونک کر دیکھا مگر معا... ہوتا تھا۔ ''تحلیلی'' اپنا کام کر گئی تھی اور مریضہ فضا میں گم... چکی تھی۔

خوف و دہشت نے مجھے بدحواس کر دیا۔ ... صوفے پر بیٹھے بیٹھے کانپنے لگی۔ ادھر ادھر نظر ڈالی ڈاکٹر گار نظر نہ آیا۔ کمرے میں اپنے آپ کو تنہا پا کر... اور بھی ڈر گئی۔

اتنے میں باغ کی طرف سے مجھے پھاوڑ... سے زمین کھودنے کی آواز سنائی دینے لگی۔ میں... دریچہ کھول کر باغ میں جھانکا۔ ڈاکٹر گار مزدوروں... طرح پھاوڑا لے کر زمین کھود رہا تھا۔ میرے سہمے... اوسان خطا ہوگئے۔ میں باغ میں نکل آئی چیخ کر پوچھ... لگی۔ ''ڈاکٹر، ڈاکٹر کیا کر رہے ہو؟''

''قبر کھود رہا ہوں۔'' اس نے زور سے پھاوڑے کی ایک ضرب لگا کر کہا۔

''کس کے لئے؟''

مگر اس نے کوئی جواب نہیں دیا وہ بھاگتا ہو... اپنی تجربہ گاہ میں گیا وہاں سے ایک نیلے رنگ کا مرتبان... اٹھا لایا۔ جسے میں نے پہلے بھی دیکھا تھا۔ اور جس... پر لکھا تھا۔ ''تحلیلی'' میرے دیکھتے ہی دیکھتے ڈاکٹر گا... نے مرتبان اٹھا کر قبر میں انڈیل دیا اور ایک ہلکے سے جنون خیز قہقہہ کے ساتھ بولا۔ ''زمین کے خفیہ اور پراسرار دفینوں میں تین ہزار سال پرانے خزانے کا اضافہ ہوگیا۔''

اور اس نے پھاوڑا ایک طرف کو پھینک دیا۔

''مگر اب سوال یہ رہ گیا ہے کہ ڈاکٹر گار شادی شدہ ہے۔ یا رنڈوا۔''



کفن پوش
آسیبی بلی
آخری مرحلہ
بھیانک تجربہ
کمرہ نمبر20
نیک روح
حسین بدروح
بھیانک رات
موت کا تعاقب
ڈاک بنگلہ
شیطان
سرد جہنم
دوسرا سایہ
تجربہ



خونی کاوش

ایس امتیاز احمد-کراچی

اپنے دام میں خود صیاد آگیا اسی کے مصداق عقل و شعور کے مالک اور دنیا کے لوگوں کو انگشت بدنداں کرنے والے کی عجیب و غریب دل گرفتہ دل سوز اور ناقابل یقین ذہن کو جھنجھوڑتی حیرت ناک روداد

اپنے آپ کو عقل کل سمجھنے والے ایک شخص کا عبرتناک اور حیرتناک دل دہلاتا خونی واقعہ

جب ڈینا کے ہاں پلوں کا جوڑا پیدا ہوا تو اس کی زچگی کے لئے پروفیسر ڈائل بہ نفس نفیس موجود تھا۔ ڈینا ایک کتیا تھی اور اس کی دیکھ بھال کرنے والا پروفیسر ڈائل کورلی معمولی آدمی نہیں تھا بلکہ وہ تجرباتی بیالوجی میں پی ایچ ڈی تھا۔ وہ ریڈک یونیورسٹی میں کئی سال تک سربراہ شعبہ رہ چکا تھا۔ اگر وہ ڈینا پر خصوصی توجہ دے رہا تھا تو یہ کوئی حیرت کی بات نہیں تھی کیونکہ ڈینا کوئی معمولی کتیا نہیں تھی۔ وہ اور اس کا ساتھی سلیک دنیا بھر میں اپنی نوعیت کا واحد جوڑا تھے۔ ان پر انتہائی اہم نوعیت کے تجربات کئے جارہے تھے۔ وہ الاسکا میں دریائے چانک کے کنارے رہتے تھے جہاں ٹمپریچر نقطہ انجماد سے تمیں درجے کم تھا۔ پروفیسر ڈائل ان تجربات کے سلسلے میں وہاں تن تنہا رہائش پذیر تھا۔ قریب ترین انسانی آبادی ڈکن لینڈ تھی جو وہاں سے ساٹھ میل دور تھی۔ پروفیسر ڈائل

کے لئے کوئی انسانی آبادی قریب تر رہنے کا تصور بھی ناقابل برداشت تھا۔ اسے ان تجربات کے لئے مکمل سکوت اور سکون درکار تھا۔ الاسکا کا ماحول اس کے لئے بہترین تھا اور اس وقت وہ پورے انہماک سے حاملہ کتیا کی زچگی میں مدد دے رہا تھا۔

بالآخر جب پروفیسر ڈاتل اس اہم تجرباتی فرض کو سرانجام دے چکا تو اس نے باڑے کا دروازہ کھول کر سکیگ کو بھی اندر آنے کی اجازت دی۔ سکیگ بڑے کائیاں انداز میں پروفیسر کے ہاتھوں کی طرف دیکھتے ہوئے اندر آیا پھر اس کے منہ سے کچھ ایسی آوازیں نکلیں جو غراہٹ یا بھونکنے سے مختلف تھیں۔ ڈینا نے بھی اسی انداز میں اس کو جواب دیا پھر سکیگ اندر آنے کے بجائے وہیں باڑے کے دروازے پر بیٹھ گیا۔ وہ اب پروفیسر کے ہاتھوں پر نظریں جمائے ہوئے تھا۔

پروفیسر نے مسکرا کر اس کی طرف دیکھا اور کہنے لگا۔

"ڈرو نہیں سکیگ! میرے ہاتھ خالی ہیں۔ میں تمہاری اور ڈینا کی اولاد میں سے کسی کو لے کر نہیں جا رہا۔ یہ سب بعد میں ہوتا رہے گا۔ تم اور ڈینا تو میرے کامیاب تجربات کا حاصل ہو۔ مجھے امید ہے کہ تمہارے بچوں میں یہ قابلیت اور فہم و فراست تم دونوں سے بھی زیادہ اچھے طریقے پر پروان چڑھے گی۔"

اس کے بعد پروفیسر ڈاتل نے باڑے کا بیرونی دروازہ بند کر دیا اور اپنے کیبن میں چلا گیا۔ اس نے یہ رہائش گاہ موسم کی شدتوں کا مقابلہ کرنے کے لئے بڑی محنت سے بنائی تھی۔ اس کی کھڑکیوں پر مضبوط شیشے کے دوہرے پرت تھے اور فرش لکڑی کا تھا۔ زیادہ تر تعمیراتی سامان تیار شدہ حالت میں اسی کشتی کے ذریعے دریائے چانگ کے راستے یہاں تک لایا گیا تھا جس میں اس کی کتابیں اور سائنسی آلات وغیرہ آئے تھے۔

کیبن میں داخل ہو کر پروفیسر ڈاتل نے اپنا اوور کوٹ اتار دیا۔ باہر کے اور اندر کے درجہ حرارت میں خاصا فرق تھا۔ باہر سے یہ مکان جس قدر سادہ اور معمولی سا نظر آتا تھا اندر سے اسی قدر آرام دہ تھا۔ ایک مرتبہ اندر آنے کے بعد تو پروفیسر ڈاتل کو اس میں اور بریڈک یونیورسٹی کے اس بنگلے میں کوئی فرق ہی محسوس نہیں ہوتا تھا جہاں سے اس نے ہنگامی حالت میں استعفیٰ دے کر یہاں آنے اور تن تنہا رہنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ اسے معلوم تھا کہ اگر وہ از خود مستعفی نہ ہو جاتا تو یونیورسٹی کے حکام اسے برخواست کر دیتے جو زیادہ اہانت آمیز ہوتا۔

وجہ یہ تھی کہ اس روز ایک مقامی اخبار میں تجرباتی بیالوجی کے موضوع پر اس کا ایک مضمون بڑے نمایاں انداز میں شائع ہوا تھا۔ اس مضمون کی اشاعت کے بیس منٹ کے بعد ہی گڑبڑ کی ابتدا ہو گئی تھی۔ ڈسٹرکٹ اٹارنی کے دفتر کے آدمی اس کے پاس آ کر عجیب و غریب قسم کا استفسار کرنے لگے تھے۔ اب اسے اطمینان تھا کہ یہاں ان برفانی ویرانوں میں اسے کسی کے سوال جواب یا محتسب کا خدشہ نہیں تھا۔ یہاں اس کے سائنسی تجربات و تحقیقات کو غیر انسانی اور غیر اخلاقی قرار دینے کے لئے کوئی دوسرا آدمی موجود نہیں تھا اور وہ اطمینان قلب سے اپنے نظریات کے مطابق تجربات جاری رکھ سکتا ہے اور وہ یہی کر رہا تھا۔ اس کی لیبارٹری میں لاتعداد کاپیاں اس کے مشاہدات اور اخذ کردہ نتائج سے بھری پڑی تھیں اور نمونوں کے جار بھی بہت زیادہ تعداد میں موجود تھے۔ اس نے چار سالوں میں بے انتہا اہم نوعیت کے تجربات کئے تھے جو وہ کامیاب رہے تھے لیکن پروفیسر ڈاتل کو دنیا کی بے قدری کا شکوہ تھا کیونکہ دنیا والوں کو اس کے طریق کار پر اعتراض تھا۔ دنیا والے ہمیشہ ذہین لوگوں کے مخالف رہے ہیں۔

پروفیسر ڈاتل نے باتھ روم میں جا کر ہاتھ منہ دھویا۔ لباس تبدیل کیا اور پھر اطمینان سے میز پر سے اپنی کاپی اٹھا کر اس میں اپنے تازہ ترین تجربے کے بارے میں نوٹ لکھنے لگا۔ اس نے لکھا۔

"آج ڈینا کے پلے پیدا ہوئے ہیں۔ ڈینا جانتی تھی کہ میں زچگی میں اس کی مدد کر رہا ہوں، اسے نقصان نہیں پہنچا رہا، اس لئے اس کا رویہ ٹھیک رہا۔ سکیگ بھی یہ جانتا ہے۔ میں نے ان میں اتنی دماغی صلاحیت اور شعور تو پیدا کر ہی دیا ہے اس لئے وہ سوچ سکتے ہیں سکیگ نے میری

واپسی پر میرے ہاتھوں کو بہت غور سے دیکھا۔ گویا یہ تسلی کر لینا چاہتا ہو کہ میں کسی پلّے کو اٹھا کر ساتھ تو نہیں لے جارہا۔ اس لئے سلیگ کی قوت حافظہ کا اندازہ بھی ہوتا ہے مجھے یقین ہے کہ وہ یہ بات اب تک نہیں بھول سکا کہ اس سے قبل ڈینا کے ہاں جو پلّے پیدا ہوئے تھے انہیں میں نے اپنے تجربات کی نذر کر دیا تھا۔ اب سلیگ کو یقیناً یہی اندیشہ تھا کہ کہیں ان پلّوں کا بھی یہی حشر نہ ہو! بہر حال ابھی ان پلّوں پر تجربات کا وقت نہیں آیا۔ ابھی ان میں کچھ اور جسمانی قوت پیدا ہو جائے تبھی میں ان پر اپنے تجربات کروں گا۔ کیونکہ انہیں تجربات میں تکلیف برداشت کرنا ہوگا.....''

پروفیسر اپنے کیبن میں بیٹھا نوٹس لکھ رہا تھا اور ادھر باڑے میں کتیا ڈینا مامتا بھری نگاہوں سے اپنے نوزائیدہ بچوں کو دیکھ رہی تھی اور انہیں زبان سے چاٹ رہی تھی۔ سلیگ کسی چوکنے پہریدار کی طرح دروازے پر کھڑا تھا جیسے اسے کسی کے آنے اور اس کی اولاد کو نقصان پہنچانے کا خطرہ محسوس ہو رہا ہو اور وہ پوری مدافعت کرنے کا عزم رکھتا ہو۔

پروفیسر نے نوٹس لکھنے کے بعد کاپی میز پر رکھ دی اور لیبارٹری میں چلا گیا۔ آج وہاں اسے کوئی خاص کام نہیں تھا لیکن وہاں جا کر اسے عجیب سی خوشی اور طمانیت محسوس ہوتی تھی۔ وہاں ایک حصے میں بے شمار کاپیاں موجود تھیں۔ جن میں پوری تفصیل سے تمام تجربات و تحقیقات کا اعتراف بھی کیا تھا۔ خاص طور پر اس نے ان دو کتوں کے بارے میں بڑی تفصیل سے لکھا تھا۔ جو تجربات کے آخری مرحلے پر آ کر جان دے بیٹھے تھے۔ اگر وہ زندہ ہوتے تو ان کے سر بھی ڈینا اور سلیگ کی طرح غیر معمولی طور پر بڑی جسامت کے ہوتے۔

سورج غروب ہونے سے کچھ پہلے وہ ایک مرتبہ پھر باڑے میں جا پہنچا۔ جب وہ پلّوں کو دیکھ رہا تھا تو سلیگ باڑے کے دروازے پر کھڑا اس پر کڑی نظریں جمائے ہوئے تھا۔ واپسی پر پروفیسر نے اپنا ایک ہاتھ اوورکوٹ کے اندر یوں چھپا لیا جیسے کوئی چیز سلیگ سے چھپانا چاہ رہا ہو۔ سلیگ یہ دیکھتے ہی غرا کر اٹھ پڑا۔ وہ پروفیسر کے اور دروازے کے درمیان حائل ہو گیا۔

پروفیسر نے دونوں ہاتھ اس کے سامنے کرتے ہوئے کہا۔ ''لے احمق! دیکھ میں کچھ بھی لے کر نہیں جا رہا۔''

لیکن سلیگ اب بھی غیر یقینی انداز میں اسے دیکھتا رہا اور عجیب آواز میں غراتا رہا، پھر پروفیسر کو باڑے کے اندر سے ڈینا کی غراہٹ بھی سنائی دینے لگی۔ اس کے بعد سلیگ اس کے راستے سے ہٹ گیا۔ پروفیسر کے باہر نکلتے ہی سلیگ دوبارہ پہریدار کی طرح دروازے پر ڈٹ گیا۔

پروفیسر نے باڑے کے باہر تاروں کے درمیان سے اسے دیکھ کر کہا۔ ''بڑے چالاک ہو تم سلیگ! تم جانتے ہو کہ میں تمہیں ہلاک نہیں کرنا چاہتا کیونکہ تم میرے کامیاب تجربات میں شامل ہو لیکن یہ نہ سوچنا کہ تم میری حکم عدولی کر سکتے ہو یا میرے تجربات کی راہ میں حائل ہو سکتے ہو! اگر ایسا ہوا تو میں کسی اور عام کتے میں تم جیسی خصوصیات پیدا کر کے اپنا تجربہ مکمل کر لوں گا اور تمہیں ہلاک کر دوں گا۔''

کیبن میں پہنچ کر اس کا موڈ ٹھیک ہو گیا اور اس نے آج کے واقعے کے بارے میں اپنی کاپی میں تفصیل سے لکھنا شروع کر دیا۔

''ڈینا اور سلیگ آپس میں کسی طریقے سے ضرور اپنا مطلب بیان کرنے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔ واضح الفاظ کے ذریعے تو نہیں کیونکہ باقاعدہ الفاظ کی تشکیل اور قوت نطق تو ان میں آئندہ کئی نسلوں کے بعد ہی پیدا کی جا سکے گی لیکن اب بھی وہ ایک مخصوص قسم کی غراہٹ سے ایک دوسرے پر اپنا مافی الضمیر واضح کر لیتے ہیں۔ مجھے یہ اس طرح معلوم ہوا کہ آج میں نے اپنی ایک حرکت سے سلیگ کو اس شبہے میں مبتلا کر دیا کہ میں اپنے اوورکوٹ میں اس کا ایک پلّا چھپا کر باہر نکل رہا ہوں۔ وہ دروازے پر ڈٹ گیا۔ مجھے راستہ دینے پر وہ تیار ہی نہیں تھا۔ لیکن جونہی اندر سے ڈینا کی غراہٹ سنائی دی، سلیگ نے فوراً میرا راستہ چھوڑ دیا۔ گویا ڈینا نے اسے مطمئن کر دیا تھا۔

اگر مجھے عوام کے ردعمل کا ڈر نہ ہوتا اور اس میدان میں اپنے حریفوں کی احمقانہ تقلید کا خدشہ نہ ہوتا تو میں ان

کتوں کی ان مخصوص آوازوں کی تفصیلی تحقیق و مشاہدے کے لئے کسی اور سائنسدان کو اپنے معاون کے طور پر رکھ لیتا لیکن افسوس کہ یہ ممکن نہیں ہے۔ مجھے یقین ہے کہ اس ارتقائی عمل کے تجزیے سے ہمیں انسان کی قوت نطق کا پتا بھی چل سکتا ہے۔"

اس روز برف باری بہت شدید ہوئی اور طوفانی ہوائیں چلتی رہیں کیبن کے اندر بھی سردی خاصی بڑھ گئی تھی۔ پروفیسر کا اندازہ تھا کہ باہر کا ٹمپریچر نقطہ انجماد سے بھی کم از کم چالیس درجہ کم ہو چکا ہوگا۔ لیکن اس نے تھرما میٹر باہر لے جا کر اس کا ٹمپریچر دیکھنے میں اپنا وقت ضائع نہیں کیا۔ اس کے پاس اتنا وقت کہاں تھا! وہ کوئی معمولی آدمی نہیں، بہت بڑا سائنسدان تھا اور تجرباتی بیالوجی میں مہارت رکھتا تھا۔ وہ انسانوں اور جانوروں میں مصنوعی طور پر مستقل تبدیلیاں لانے کے سلسلے میں تجربات کر رہا تھا۔ کتوں میں انسانوں جیسا شعور و ادراک پیدا کرنا بھی اسی وسیع تر تجربے کا ایک حصہ تھا۔ اس سلسلے میں پروفیسر نے ایک کتاب "بیالوجی کے ممکنہ فوائد اور انسانیت" بھی تحریر کی تھی جس میں اس نے اپنے تجربات اور مفروضات تفصیل سے تحریر کئے تھے۔

پروفیسر کا خیال تھا کہ موجودہ تجربات اس کے مفروضات کو سچ ثابت کرنے میں معاون ہو کر دنیا میں انقلابی تبدیلیوں کا باعث بنیں گے۔ پروفیسر کو اس بات کا احساس تھا کہ اس کی کتاب کو سائنسدان کے وسیع حلقے میں صرف "احمقانہ مفروضات" کہہ کر ٹھکرا دیا گیا ہے۔ لیکن اسے یقین کامل تھا کہ کتوں پر تجربات کر کے اس نے جو حیرت انگیز کامیابی حاصل کی ہے اس کی خبر جب سائنسی حلقوں تک پہنچے گی تو ایک تہلکہ مچ جائے گی۔ دنیا اسے ایک عظیم سائنسدان ماننے پر مجبور ہو جائے گی۔ وہ اسی لئے ان تجربات کے معاملے میں سر دھڑ کی بازی لگائے ہوئے تھا۔

اس شدت کی برف باری میں بھی وہ روزانہ کیبن سے نکل کر کتوں کے باڑے میں جا کر انہیں خوراک دیتا اور ان کی حرکات کا بغور جائزہ لیتا تھا۔ وہ ان کے نوزائیدہ پلوں کی بتدریج بلوغت کا مشاہدہ بھی کرتا تھا اور واپسی پر اپنے تاثرات کو تفصیل کے ساتھ ڈائری میں قلمبند بھی کر لیا کرتا تھا۔

پروفیسر کے تجربات کے لئے ایک مشکل یہ تھی کہ وہ اپنے معمول کو بے ہوش کر کے آپریشن نہیں کر سکتا تھا کیونکہ اس کے تجربات کی کامیابی کا دار و مدار ہی اس بات پر تھا کہ اپنے معمول کو بے ہوش کئے بغیر اسے ہوش و حواس میں رکھ کر اس پر تجرباتی آپریشن کئے جائیں۔ وہ ان دنوں بڑی بے چینی سے پلوں میں اتنی جسمانی طاقت پیدا ہونے کا منتظر تھا کہ ان میں آپریشن تبدیلی کی تکالیف سہنے کے لئے قوت برداشت پیدا ہو جائے۔ یہ انتظار خاصا صبر آزما تھا۔ کیونکہ پروفیسر ڈائل جلد از جلد دنیا کا واحد سائنسدان بننا چاہتا تھا جس نے ایک بالکل نئے میدان میں حیرت انگیز کامیابی حاصل کی ہو۔ اس نے اپنی ڈائری میں لکھا۔

"انسان میں ذہانت کی موجودگی کی وجہ اس کی کھوپڑی کی اصل شکل برقرار رکھنے کی اہلیت ہے۔ باقی تمام جانوروں کی پیدائش سے پہلے کسی نہ کسی مرحلے پر ان کی کھوپڑی بھی انسانی کھوپڑی سے خاصی مشابہت رکھتی ہے اور اگر وہ اسی حالت میں پیدا ہوں تو وہ بھی ذہین اور دماغی صلاحیتوں کے حامل ہو سکتے ہیں۔ ان میں اور انسانوں میں شاید بہت کم فرق رہ جائے لیکن پیدائش سے پہلے کسی نامعلوم وجہ سے کسی نہ کسی مرحلے پر ان کی کھوپڑی کی حیثیت بدل جاتی ہے۔ جس سے ان کی دماغی صلاحیتیں وہیں ختم ہو جاتی ہیں۔ میں اسی لئے بالغ جانوروں پر اپنے تجربات نہیں کر سکتا کیونکہ ان کی کھوپڑی کی ہیئت انہیں بالکل ناکارہ بنا چکی ہوتی ہے۔

میں ڈینا اور سلیگ دونوں میں ان کی پیدائش سے پہلے ہی تجربات کر کے ان کی تسلی از پیدائش کھوپڑی کی ہیئت برقرار رکھنے میں کامیاب ہو گیا ہوں۔ اب یقیناً ان میں اتنی ذہانت موجود ہے جو ایک دس سالہ بچے میں ہوتی ہے اگر اب میں اسی طرح ان کے پلوں میں بھی یہ خصوصیت پیدا کر دوں تو ارتقائی عمل کے ذریعے نتائج مزید حوصلہ افزا ہونے چاہئیں۔ اس کے بعد میرا پروگرام یہ ہے کہ ان کی اس خصوصیت کو صرف عارضی حد تک محدود نہ رکھوں بلکہ کسی طرح کھوپڑی کی اس ہیئت کو موروثی

دوں تاکہ ان کی آئندہ نسلوں میں ہر کتا کم از کم ڈینا اور ملٹیک جتنی ذہانت اور سوچ بچار کی قوت کا حامل ہو۔

اس کے بعد تو شاید اسی ارتقائی عمل کو مزید بڑھانے کے بعد میں ان کی نسلوں کو ایک ایسے مرحلے تک بھی لے آنے میں کامیاب ہو جاؤں گا۔ جب شکل وصورت کو چھوڑ کر یہ کتے کسی بھی دماغی معاملے میں انسانوں سے کم تر نہیں ہوں گے۔ وہ انسانوں ہی کی طرح سوچ سکیں گے اور منصوبہ بندی کرسکیں گے......"

ہر بار چند دن کے بعد پروفیسر ڈاہل کو ایک دن معمولی قسم کے کاموں میں ضائع کرنا پڑتا تھا کیونکہ وہ بالکل اکیلا رہتا تھا اور اسے اپنے کیبن کو گرم رکھنے کے لئے ایندھن وغیرہ خود ہی اکٹھا کرنا پڑتا تھا۔ اس کے علاوہ بھی بے شمار چھوٹے موٹے کام اسے خود ہی کرنے پڑتے تھے۔

ویسے سال میں دو مرتبہ موسم گرما کی ابتدا میں اور موسم سرما شروع ہونے سے عین پہلے الاسکا کا ایک آدی ٹمن اس کے لئے تازہ ترین سائنسی جرائد اخبارات اور ڈبوں میں بند سامان خورد ونوش وغیرہ لے کر آیا کرتا تھا۔ پروفیسر اسے اپنی آئندہ ضروریات کی فہرست دے دیا کرتا تھا۔ ٹمن کے علاوہ بھی کبھار سال چھ ماہ میں کوئی راہگیر اس علاقے میں آ نکلتا تھا۔ لیکن پروفیسر ڈاہل اس سے اتنی سرد مہری سے ملا کرتا تھا کہ راہگیر جلد از جلد جان چھڑا کر جانے کی سوچنے لگتا تھا۔

دراصل پروفیسر ڈاہل کو عام لوگوں پر اپنی ذہنی برتری کا شدید احساس تھا۔ حتیٰ کہ وہ ٹمن سے بھی شاذ و نادر ہی سیدھے منہ بات کیا کرتا تھا۔ پروفیسر اسے اپنے کیبن میں ٹھہرنے بھی نہیں دیتا تھا۔ وہ بے چارہ جب بھی آتا دریا کے کنارے خیمہ تان کر رات گزارا کرتا تھا۔ پروفیسر ڈاہل محض "چھوٹے لوگوں" سے گریزاں رہنے کی خاطر لکڑیاں کاٹنے کا کام بھی خود ہی کرتا تھا۔ اسے خاصی مقدار میں لکڑی کی ضرورت ہوتی تھی کیونکہ سردی دور کرنے کے لئے اس خاص قسم کے کیبن میں بھی لکڑی کچھ کم نہیں جلا کرتی تھی۔

پروفیسر نے پلوں پر اپنے تجربات کا آغاز کرنے سے پہلے کئی دن تک لکڑی کاٹ کر اس کی کافی مقدار جمع کرلی کیونکہ اسے احساس تھا کہ ان تجربات کے دوران میں اسے بہت کم فراغت نصیب ہوگی لیکن جب وہ لکڑیاں کاٹ کر فارغ ہوگیا تو بھی اسے انتظار میں کچھ دن گزارنے پڑے کیونکہ اس وقت تک پلوں میں آپریشن ٹیبل پر سرجری کی تکلیف سہنے کی قوت پیدا نہیں ہوئی تھی۔ ناچار اسے انتظار ہی کرنا پڑا۔

پھر ایک اور طوفان آ گیا۔ اس سے پہلے بھی الاسکا کے اس مخصوص جغرافیائی خطے میں دن صرف تین گھنٹوں کا ہی رہ گیا تھا۔ باقی وقت تاریکی میں گزرتا تھا لیکن اب تو اس شدید برف باری اور تاریکی میں رات اور دن کا فرق ہی مٹ گیا۔ ہوا اس قدر تیز و تند تھی کہ باہر نکلنا عذاب سے کم نہیں تھا۔ دو دن میں وہ صرف دو مرتبہ باڑے تک جا کر کتوں کو خوراک دے سکا۔ تیسرے روز اس نے سوچا کہ اب مزید انتظار میں وقت ضائع کرنے کے بجائے ایک پلے کو لیبارٹری میں لاکر اس پر تجربات کا آغاز ہی کردینا چاہئے۔ یہ سوچ کر وہ باڑے میں گیا۔

جونہی اس نے ایک پلے پر ہاتھ ڈالا تو ڈینا نے غراہٹ سے احتجاج کیا۔ پروفیسر نے نفرت سے گھور کر کہا۔ "ڈینا! یہ پلے اور تم میری مخلوق ہو۔ میں تمہیں اس دنیا میں لایا ہوں، میں تمہارے ساتھ یا ان پلوں کے ساتھ جو سلوک چاہوں کروں گا۔ اگر تم میری راہ میں حائل ہوئیں تو......" اس نے فقرہ مکمل کرنے کے بجائے بایاں ہاتھ جیب میں ڈال کر ریوالور نکال لیا پھر دائیں ہاتھ سے دوبارہ پلے کو اٹھانے کی کوشش کی تو ڈینا نے جھپٹ کر اس کی کلائی کو دانتوں سے پکڑ لیا اور غرانے لگی تاہم اس نے کلائی کو نقصان نہیں پہنچایا۔

پروفیسر کے غصے کی کوئی انتہا نہ رہی۔ ایک اعلیٰ دماغ کا پروفیسر ایک کتیا سے دب جائے۔ اس کے خوف سے اپنا اہم ترین تجربہ کرنے کا ارادہ ترک کردے یہ ناقابل تصور تھا۔

پروفیسر نے شدید غصے کے عالم میں کتیا کو شوٹ کردینا چاہا اور بایاں ہاتھ بلند کرنا چاہا لیکن پھر کسی نے اس

کی بائیں کلائی کو بھی جکڑ لیا۔ پروفیسر نے چونک کر دیکھا۔ سلیک نہ جانے کب اس کے پیچھے پیچھے باڑے کے اندر آ گیا تھا۔ شاید اس نے ڈینا کی غراہٹ کا مطلب سمجھ لیا تھا اور اب خطرے کا احساس کرتے ہی اس نے پروفیسر کے ریوالور والے ہاتھ کو بھی بے بس کر دیا تھا۔

سلیک غیر معمولی جسامت اور سو پونڈ وزن کا کتا تھا۔ اس کے سر کی مناسبت سے اس میں طاقت بھی زیادہ تھی۔ اگر وہ چاہتا تو ایک ہی جھٹکے میں پروفیسر کی کلائی کو چیر پھاڑ دیتا لیکن اس نے صرف کلائی کو جکڑا ہوا تھا اور کسی بات کا منتظر تھا۔ اس کی خونخوار آنکھیں پروفیسر کے چہرے پر جمی ہوئی تھیں۔ ادھر ڈینا پروفیسر کی دوسری کلائی پکڑے ہوئے تھی۔ وہ دونوں غراہٹ کی مخصوص زبان میں ایک دوسرے سے کچھ کہہ رہے تھے۔ پروفیسر ڈائل کا غصہ اب حیرت اور خوف میں بدل چکا تھا۔ وہ اس وقت انسانی آبادی سے دور بہت دور صرف دو کتوں کے آگے بے بس تھا۔

”سلیک، ڈینا! میری کلائیاں چھوڑ دو!“ اس نے تندی سے کہا۔

ڈینا یوں غرائی جیسے اس نے پروفیسر کی بات سمجھ لی اور سلیک سے کچھ کہا ہو۔ سلیک نے بھی اسی انداز میں جواب دیا اور پھر اس نے جبڑوں کی ایک جنبش سے پروفیسر کے ریوالور والے ہاتھ کو جھٹکا دیا جس سے ریوالور پروفیسر کے ہاتھ سے چھوٹ کر سلیک کے پاس زمین پر گر گیا۔ پروفیسر ڈائل ریوالور چھوڑ دینے پر مجبور ہو گیا تھا۔ کیونکہ وہ سلیک کے جھٹکے کا مطلب سمجھ گیا تھا۔

اگر وہ ایسا نہ کرتا تو وہ دونوں کتے اس کے دونوں ہاتھوں کو دانتوں سے کاٹ کر بازوؤں سے جدا کر دیتے اور وہ اس حالت میں تو اس برفانی خطے میں ایک دن بھی زندہ نہیں رہ سکتا تھا۔ اسے ریوالور چھوڑتے وقت غصے، نفرت اور بے بسی کا شدید احساس ہو رہا تھا۔ اس نے خود ہی تو ان کتوں میں ذہانت اور شعور پیدا کیا تھا۔ ایک لحاظ سے وہ اسی کی تخلیق تھے لیکن تھے تو وہ جانور ہی، ان کی یہ جرأت کہ اسی کو قابو میں کر لیں! اس سے نفرت کا کھلا اظہار کریں شاید وہ پاگل ہی ہو جاتا مگر جان کے خوف نے اسے ہوش میں رکھا۔ ریوالور کے گرتے ہی سلیک نے اس کی کلائی چھوڑ دی تھی اور ریوالور کو جبڑوں میں دبا کر باڑے کے ایک طرف چلا گیا تھا۔ پھر ڈینا نے بھی اس کی کلائی چھوڑ دی گویا اسے اطمینان ہو گیا تھا کہ اب کلائی چھوڑ دینے پر بھی پروفیسر انہیں یا ان کے نوزائیدہ پلوں کو کوئی گزند نہیں پہنچا سکتا۔

پروفیسر وہاں سے تیز تیز چلتا ہوا اپنے کیبن میں واپس آ گیا۔ اس کے غیض و غضب کا یہ عالم تھا کہ ایک گھنٹے تک تو وہ اس واقعے پر سنجیدگی سے غور کرنے کے قابل ہی نہ ہو سکا پھر اس نے اپنے آئندہ لائحہ عمل کو مرتب کیا اور اپنی نوٹ بک اٹھا کر اس میں آج کے واقعے کے بارے میں یادداشت لکھنے لگا۔

”سلیک اور ڈینا اچھی طرح جانتے ہیں کہ میں نے ان دونوں کو جنسی ملاپ کی اجازت اس لئے دی تھی کہ ان کے پلوں کو اپنے تجربات کے لئے استعمال میں لاؤں انہیں یہ بھی اچھی طرح یاد ہے کہ ان کے ہاں پلوں کا جوڑا جو پہلی مرتبہ پیدا ہوا تھے اسے بھی میں نے اپنے تجربات میں استعمال کر لیا تھا اور وہ سب بھی مر گئے تھے۔ غالباً وہ اس مرتبہ اسی لئے واضح طور پر تہیہ کئے ہوئے ہیں کہ میں ان کے پلوں کو کسی صورت میں بھی استعمال نہ کر سکوں ستم ظریفی کی انتہا ہی تو ہے کہ ان میں یہ سمجھ اور فہم میری ہی وجہ سے پیدا ہوئی ہے۔ میں ہی ان کی شعوری صلاحیتوں کا خالق ہوں۔ آج ان کی یہ صلاحیتیں خود میرے ہی خلاف استعمال ہو رہی ہیں لیکن ان کی اس گستاخی اور بدتمیزی کے باوجود میں نے سوچا ہے کہ سلیک اور ڈینا کو ہلاک نہ کیا جائے اس کا سبب یہ ہے کہ میرے آئندہ تجربات کی کامیابی پر اگر کوئی پلا زندہ ہے تو ان کی نگہداشت کے لئے سلیک اور ڈینا کا وجود ضروری ہوگا۔ تاہم میں ان کے خلاف ایک قدم اٹھانے کا ارادہ تو کر ہی چکا ہوں۔

آج انہوں نے جس انداز میں مجھ سے ٹکر لی ہے اور وقتی طور پر مجھے نیچا دکھایا ہے آئندہ ایسا ہرگز نہیں ہونا چاہئے۔ اب میں ان کی خوراک میں ایک ایسی دوا ملانے والا ہوں جس سے وہ وقتی طور پر بے ہوش

ہو جائیں اور پھر میں ان پر کوئی اس طرح آپریشن کروں گا کہ آئندہ وہ کبھی بھی میرے عزائم کی راہ میں رکاوٹ نہ بن پائیں یہ آپریشن کرنے سے قبل بھی مجھے اچھی طرح سوچنا ہوگا کہ ان کا آپریشن کس نوعیت کا کیا جائے جس سے وہ مجھے نقصان پہنچانے کے قابل تو نہ رہیں مگر اپنے پلوں کی دیکھ بھال کے قابل ضرور رہیں اور تھوڑا بہت چل پھر بھی سکیں۔"

طوفان کے شور وغل میں سلیگ اور ڈینا اسی طرح غراہٹ آمیز آوازیں نکال کر آپس میں کچھ کہہ سن رہے تھے پھر سلیگ نے ریوالور کو پنجوں میں اٹھایا اور ایک جگہ سے سخت برف کھود کر اسے خوب گہرے گڑھے میں دبا کر اوپر سے برف ڈال دی۔ برف باری کے سبب فوراً ہی اس کے باڑے تک آنے جانے کے نشانات بھی معدوم ہوگئے۔ اب کوئی شخص یہ اندازہ نہیں لگا سکتا تھا کہ اس نے ریوالور کو کہاں چھپایا ہے! پھر اس نے ڈینا کے پاس پہنچ کر اسی مخصوص انداز میں غرا کر کچھ کہا۔ ڈینا بے چینی سے پہلو بدل بدل کر اپنے پلوں کو دیکھنے لگی۔ سلیگ پہلے سے تیز آواز میں غرانے لگا جیسے ڈینا کو کوئی حکم دے رہا ہو۔

آخر ڈینا نے بڑی نرمی سے اپنے ایک پلے کو دانتوں میں پکڑا اور سلیگ نے اسی طرح دوسرے پلے کو اٹھالیا۔ وہ دونوں برف باری میں باہر کی طرف چل دیئے۔ جہاں خاردار تاروں کے قریب برف کی سطح پہلے سے اونچی ہوگئی تھی۔

اگلے روز جب عارضی طور پر طوفان کی شدت کچھ کم ہوئی اور سورج کی کمزور کرنیں برفانی وسعتوں پر پھیلیں تو پروفیسر ڈائل حسب معمول ان کے لئے خوراک لے کر باڑے میں پہنچا۔ آج پروفیسر نے خوراک میں وہ دوا بھی ملائی ہوئی تھی جو ڈینا اور سلیگ کو فوری طور پر بے ہوش کرکے انہیں آپریشن کے لئے تیار کردیتی۔ لیکن اس کے بار بار پکارنے کے باوجود کوئی بھی خاردار تاروں کے جنگلے سے باہر نہ آیا۔ اس نے خوراک کا برتن وہیں رکھا اور کیبن سے اپنی رائفل لے کر واپس باڑے میں آیا۔ وہ ہر قسم کی صورت حال کا مقابلہ کرنے کے لئے تیار تھا۔ تالا کھول کر وہ اطمینان سے اس حصے کی جانب بڑھا جدھر اس کے خیال میں ڈینا اور سلیگ سردی اور طوفان سے بچ کر آرام کررہے تھے لیکن باڑہ خالی پڑا تھا۔

سلیگ اور ڈینا اپنے دونوں بچوں سمیت وہاں سے جاچکے تھے۔ پروفیسر ڈائل کو غصے کے ساتھ ساتھ شدید صدمہ بھی ہوا کیونکہ انہی کتوں پر تو اس کی زندگی بھر کے تجربات کا دارومدار تھا۔ وہ جلدی سے اپنے کیبن میں چلا گیا اور پھر مناسب لباس اور جوتے پہن کر باہر نکل آیا۔ وہ جلد از جلد کتوں کو تلاش کرلینا چاہتا تھا۔ اسے یقین تھا کہ وہ ابھی زیادہ دور نہیں گئے ہوں گے۔ اور اب تو سلیگ کو ان کے لئے خوراک کا بھی انتظام کرنا تھا۔

پروفیسر کو یقین تھا کہ وہ بہت جلد انہیں تلاش کرلے گا۔ اس نے سوچا کہ اب اگر دونوں بڑے کتوں کو ہلاک ہی کردیا جائے تو بہتر ہوگا۔ انہوں نے پروفیسر سے ٹکر لینے کی حماقت کی تھی۔ چند لمحے بعد ہی اس نے سوچا کہ نہیں انہیں ہلاک کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ انہیں زخمی کرکے پکڑ لینا ہی کافی رہے گا یا اگر وہ کسی ایسے وقت ان کی پناہ گاہ تک پہنچ جائے، جب وہ دونوں وہاں موجود نہ ہوں۔ خوراک وغیرہ کا انتظام کرنے کے لئے نکلے ہوئے ہوں تو وہ چپکے سے ان کے پلوں کو اٹھا کر اپنی لیبارٹری میں لے جائے گا۔ اس صورت میں سلیگ اور ڈینا اسے کوئی نقصان نہیں پہنچا سکیں گے کیونکہ اپنی ذہانت کی بدولت وہ اسے پلوں پر قابض دیکھ کر ان کی زندگی کی خاطر پروفیسر کے سامنے سر تسلیم خم کردیں گے۔ پروفیسر تمام دن ان کی تلاش میں ناکام پھرتا رہا۔ اس کا یہ اندازہ غلط نکلا تھا کہ وہ انہیں بہت جلد ڈھونڈ نکالے گا۔

اگلے روز وہ دوبارہ اسی مہم پر نکلا اور اس کی تلاش بے سود ثابت نہیں ہوئی۔ برف پر سلیگ کے قدموں کے نشانات نظر آئے جو بہت آگے تک جانے کے بعد ایک اور راستے سے دوبارہ واپس آرہے تھے۔

پروفیسر کو یقین ہوگیا کہ اب وہ ان کی پناہ گاہ کے قریب آپہنچا ہے۔ وہ ان نشانات کے ساتھ ساتھ چل دیا لیکن ایک دم اسے اپنے عقب میں ایک تیز غراہٹ سنائی

دی۔ اس نے مڑ کر دیکھا بہت دور اسے سلیگ نظر آ گیا لیکن سلیگ اس کے وجود سے بے خبر نظر آتا تھا۔ اور اپنی ہی دھن میں غراتا ہوا کہیں جا رہا تھا۔ پروفیسر نے ان نشانات کے سراغ میں چلنا چھوڑ دیا اور چپکے سے سلیگ کے پیچھے چل دیا۔ ان کے درمیان فاصلہ اتنا زیادہ تھا کہ سلیگ کو گولی مار کر ہلاک نہیں کیا جا سکتا تھا۔

ویسے بھی پروفیسر ڈائل اسے ہلاک کرنے کے بجائے اس کا پیچھا کر کے اس پناہ گاہ تک پہنچنا چاہتا تھا جہاں ڈینا اور پلے چھپے ہوئے تھے۔ وہ اسی لئے سلیگ کے قدموں کے تازہ نشانات پر چلنے لگا۔ سلیگ خاصی دور پہنچ چکا تھا۔ اب تو وہ نظر بھی نہیں آ رہا تھا مگر پروفیسر کو اطمینان تھا کہ وہ اس کے قدموں کے نشانات پر چلتے چلتے اس تک پہنچ ہی جائے گا۔

وہ بات جس کا پروفیسر ڈائل کو علم نہیں تھا، وہ یہ تھی کہ دراصل سلیگ اسے جُل دینے میں کامیاب ہو گیا تھا۔

ہوا یوں تھا کہ سلیگ اپنے مستقبل کے تحفظ کی خاطر یہ معلوم کرنے کے لئے اپنے آقا کے کیبن کی طرف گیا تھا کہ وہ کن سرگرمیوں میں مصروف ہے وہاں اس نے پروفیسر کو موجود نہیں پایا تھا۔ وہ پروفیسر کے قدموں کے نشانات کا پیچھا کرتا ہوا اس تک آ پہنچا تھا۔ رائفل دیکھ کر اس نے پروفیسر کے قریب آنے کی جرأت نہیں کی تھی لیکن جب اس نے دیکھا کہ پروفیسر تو اس کے اور ڈینا کے پاؤں کے نشانات پر چلتے چلتے ان کی پناہ گاہ کے بالکل قریب آ پہنچا ہے تو اس نے غرا کر اس کی توجہ اپنی طرف مبذول کرالی تھی اور اب وہ اسے پیچھے لگا لینے میں کامیاب ہو گیا تھا۔ سلیگ بار بار دوڑ کر اس کی نظروں سے اوجھل ہو جاتا تھا اور پھر پیچھے دیکھ کر اپنا اطمینان کر لیتا تھا کہ پروفیسر اسی کے پیچھے آ رہا ہے۔

پروفیسر کو ابتدا میں کتے کی اس دھوکے بازی کا علم نہ ہو سکا اور وہ بے وقوفوں کی طرح اس کا پیچھا کرنے میں لگا رہا۔ کئی میل تک چلنے کے بعد جب تاریکی پھیلنے لگی تو اسے احساس ہوا کہ سلیگ اسے جل دے گیا ہے۔ اس نے جھلاہٹ کے عالم میں اس سمت کا رخ کیا جہاں سے سلیگ نے اسے اپنی طرف متوجہ کیا تھا۔ وہاں دو ہی فرلانگ کے فاصلے پر اسے وہ جگہ بھی مل گئی جہاں انہوں نے پناہ لی تھی۔ اس جگہ کے اردگرد بے شمار پنجوں کے نشانات موجود تھے۔ یقیناً یہی ان کی پناہ گاہ تھی۔

پروفیسر ڈائل محتاط قدموں سے پناہ گاہ کی طرف بڑھا مگر اب وہ پناہ گاہ خالی پڑی تھی۔

ہوا یوں تھا کہ جب ڈینا نے سلیگ کی غراہٹ سنی تھی تو اسے خطرے کا احساس ہو گیا تھا جس دوران میں سلیگ پروفیسر کو اپنے پیچھے لگائے ہوئے تھا۔ ڈینا نے جلدی سے اپنے دونوں پلے یکے بعد دیگرے کسی اور جگہ منتقل کر دیئے تھے۔

پروفیسر کو شدید جھنجھلاہٹ ہونے لگی لیکن پھر اسے دکھائی دے گیا کہ ان کی نئی پناہ گاہ تک بھی پنجوں کے واضح نشانات موجود ہیں۔ پروفیسر نے اب ان نشانات پر چلنا شروع کر دیا۔ وہ ہر قیمت پر ان کا سراغ لگا لینا چاہتا تھا لیکن اس تگ ودو میں تاریکی زیادہ ہو گئی تھی۔ ڈائل کو سلیگ کی خوفناک غراہٹ بھی سنائی دینے لگی تھی۔ جیسے وہ اسے آگے بڑھنے پر خوفناک نتائج کی دھمکی دے رہا ہو۔ آخر پروفیسر ڈائل نے وہاں سے کیبن کی طرف واپس چلا جانا ہی مناسب سمجھا یہ کام دن کی روشنی میں ہی کرنا بہتر تھا۔ وہ محتاط انداز سے کیبن کی طرف چل دیا۔ اسے خطرہ تھا کہ اندھیرے سے فائدہ اٹھا کر کہیں سلیگ اس پر حملہ نہ کر دے، وہ بیحد چوکنا تھا۔ ایک کتے سے شکست کھانے پر وہ کسی طرح تیار نہیں تھا۔

کیبن تک پہنچنے کے بعد پروفیسر ڈائل اندر داخل نہیں ہوا بلکہ وہیں دروازے کے باہر کھڑا غور سے کان لگائے کچھ سننے کی کوشش کرنے لگا۔ اس کی چھٹی حس اسے متنبہ کر رہی تھی کہ سلیگ اس کے کیبن کی طرف ضرور آئے گا اور اس کا اندازہ ٹھیک ہی ثابت ہوا۔ بہت دیر کے بعد اس نے دور سے کسی جانور کے ہیولے کو کیبن کی طرف بڑھتے دیکھا۔ یقیناً وہ سلیگ ہی تھا۔ سلیگ بڑے کائیاں انداز میں چند قدم چل کر رک جاتا تھا پھر ادھر ادھر کا جائزہ لیتا تھا کچھ سننے کی کوشش کرتا تھا اور آگے بڑھتا تھا۔

پروفیسر ڈانل اس کے مزید قریب آنے کا منتظر تھا تاکہ سلیک رائفل کی رینج میں آجائے تو اس پر فائر کیا جائے۔ لیکن سلیک بھی بڑا کائیاں اور چوکنا ثابت ہوا۔ وہ پروفیسر کی رائفل کی رینج میں آہی نہیں رہا تھا اور پھر ایک موقع پر وہ آگے بڑھنے کے بجائے واپس چل دیا، پروفیسر نے اسے واپس جاتا دیکھ کر اس کے غیر واضح ہیولے پر ہی گولی چلادی لیکن گولی چلاتے وقت پروفیسر کے ہاتھ کانپ رہے تھے۔ وہ متحرک ہیولہ پہلی گولی کی آواز سنتے ہی چھلاوے کی طرح غائب ہو چکا تھا۔

کیبن کے اندر پہنچ کر پروفیسر نے غصے اور جھلاہٹ کے تمام خیالات کو ذہن سے جھٹک دیا اور ایک ٹھنڈے متوازن مزاج اور ہوش مند سائنس دان کی طرح اس واقعے پر خوب غور وخوض کرنے کے بعد اپنی ڈائری میں لکھا۔

"اب مجھے اس میں کوئی شک وشبہ نہیں رہا کہ سلیک اور ڈینا کی ذہانت میں روز بروز اضافہ ہو رہا ہے۔ آج چالاک کتے سلیک نے اپنے پنجوں کے نشانات کے ذریعے مجھے خوب گمراہ کیا کیونکہ وہ جانتا تھا کہ اگر مجھے اس راستے سے کسی طرح ہٹایا نہ گیا تو میں پندرہ منٹ بعد ان کی پناہ گاہ تک پہنچ جاؤں گا۔ اس کے بعد جب میں ان کی پہلی پناہ گاہ کو خالی دیکھ کر دوسری پناہ گاہ تک جانے لگا تو واضح طور پر سلیک نے مجھے اس کام سے روکا۔ اس کے تیور بتاتے تھے کہ اگر میں آگے بڑھا تو وہ مجھ پر ضرور حملہ آور ہو جائے گا۔ جب میں کیبن میں واپس آیا تو وہ احتیاط سے میرے تعاقب میں آیا تاکہ یہ یقین کر سکے کہ میں آج رات دوبارہ اس کے پلوں تک پہنچنے کا ارادہ تو نہیں رکھتا! یہاں بھی سلیک کی ذہانت کی تعریف کرنا پڑتی ہے۔ وہ کیبن کے نزدیک اس لئے نہیں آیا کہ کیبن کے اندر روشنی نہیں تھی اور اسے اس تاریکی میں کیبن سے قریب آتے ہوئے اپنے لئے خطرے کے وجود کا احساس تھا۔ اب تو میں اس پر فائر بھی کر چکا ہوں اس لئے اسے خطرے کا اور زیادہ احساس ہو چکا ہوگا۔ ممکن ہے اس کی اتنی زیادہ ذہانت آئندہ میرے لئے نقصان کا باعث بنے اس لئے اب میں نے فیصلہ کر لیا ہے کہ اگر اسے اپاہج نہ کر سکا تو ہلاک ہی کر ڈالوں گا۔

کاش! وہ پلے جلدی سے میرے ہاتھ لگ جائیں تاکہ میں اپنے تجربات کا آغاز کر سکوں۔ سلیک اور ڈینا کی ذہانت دیکھتے ہوئے مجھے ان کے پلوں پر اپنے تجربات کی کامیابی کا یقین سا ہونے لگا پھر ساری دنیا کے احمق سائنسدان میری برتری اور عظمت کا اعتراف کریں گے....."

اگلی صبح پروفیسر دوبارہ ان کی پناہ گاہ کی تلاش میں چل دیا۔ اس رات برف نہیں پڑی تھی اس لئے ان کے پنجوں کے نشانات ابھی تک برف پر موجود تھے۔ وہ ان کی تلاش کرتے ہوئے سوچ رہا تھا کہ وہ ان دونوں کو پنجروں میں بند کر کے لیبارٹری میں رکھے گا تاکہ وہ دونوں اپنے پلوں پر ہونے والے تمام تجربات کو اپنی آنکھوں سے دیکھ سکیں۔ اس کا ارادہ تھا کہ بعد میں وہ ان دونوں کو ہلاک کر ڈالے گا۔ وہ چاہتا تھا کہ ہلاکت سے پہلے وہ دونوں کم از کم یہ احساس تو کر لیں کہ آخر انسانی ذہانت وہ بھی ایک برتر انسان اور ایک عظیم سائنسدان کی ذہانت ان کی حیوانی ذہانت سے بدرجہ زیادہ اعلیٰ افضل اور برتر ہے۔ وہی ان کا آقا ہے لیکن جوں جوں وہ آگے بڑھتا گیا برف پر ان کے پنجوں کے نشانات دھندلے پڑتے گئے کیونکہ وہاں کی برف بہت نرم تھی۔ رفتہ رفتہ نشانات بالکل معدوم ہی ہو گئے۔ شام تک وہ بالکل ناکام ہو کر دوبارہ کیبن کی طرف جا رہا تھا۔

کیبن کے پاس پہنچتے ہی پروفیسر کو محسوس ہوا کہ سلیک پھر وہاں تک آیا تھا۔ کیبن کے آس پاس اس کے پنجوں کے نشانات صاف دکھائی دے رہے تھے۔ سلیک اس کی غیر حاضری کا یقین کر لینے کے بعد بڑی جرأت کے ساتھ دروازے کے ہینڈل کو دانتوں سے گھما کر کھول لینے میں کامیاب ہو گیا تھا اور اندر داخل ہو گیا تھا۔ وہاں سے وہ خشک گوشت کا ایک خاصا بڑا ٹکڑا اٹھا کر لے گیا تھا۔ کھانے پینے کی اور کئی چیزیں بھی ڈبوں میں بند وہاں موجود تھیں لیکن سلیک نے ان میں سے کوئی چیز نہیں اٹھائی

تھی کیونکہ اسے یقیناً یہ علم تھا کہ ہوا بند ڈبوں کو کھولنا اس کے لئے آسان نہیں ہوگا۔

پہلے تو پروفیسر ڈائل کو سلیگ کی اس حرکت پر غصہ آیا لیکن پھر جب پروفیسر کو اس کی بڑھتی ہوئی ذہانت کا خیال آیا تو وہ مسکرانے لگا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ کچھ بھی ہو۔ بھلا میرا اور ایک کتے کا کیا مقابلہ، وہ ایک جانور اور میں عام انسانوں سے کہیں زیادہ ذہین سائنسدان، اس نے اپنے اسٹور روم میں جا کر وہ آہنی پھندے نکالے جو ریچھ پکڑنے کے کام آتے تھے۔ اس نے انہیں صرف کر کے صبح کا انتظار شروع کر دیا اور اپنے آئندہ پروگرام کے بارے میں تفصیل سے ڈائری لکھتا رہا۔ باہر ساری رات برف باری ہوتی رہی۔

ادھر سلیگ اس برف باری میں اپنی نئی پناہ گاہ کے باہر کھڑا پہرہ دے رہا تھا شاید اسے خطرہ تھا کہ کہیں پروفیسر ڈائل رات کو بھی ان کے تعاقب میں وہاں نہ آ پہنچے! یہ پناہ گاہ ایک درخت کے کھوکھلے تنے میں تھی اور اس میں ڈینا ماما کے جذبے سے سرشار ہو کر بار بار اپنے پلوں کو چوم چاٹ رہی تھی۔ اسے تھوڑی تھوڑی دیر بعد باہر سے سلیگ کی ہلکی ہلکی غراہٹ کی صدا سنائی دے رہی تھی جسے سن کر وہ مطمئن ہو جاتی تھی کہ انہیں کوئی خطرہ لاحق نہیں ہے۔

چار دن تک برف باری اتنی شدت سے ہوتی رہی کہ پروفیسر ڈائل کیبن سے باہر ہی نہ نکل سکا۔ تاہم اس نے موسم کی اس خرابی کو بڑے صبر سے برداشت کیا کیونکہ ایک لحاظ سے وہ اسے اپنے حق میں بھی سمجھ رہا تھا۔ اس طوفانی موسم میں یقیناً کتوں کو کوئی شکل نہ مل پایا ہوگا اور پلے بھی خوراک نہ ملنے کی وجہ سے نڈھال ہو چکے ہوں گے۔ پروفیسر یہ سوچ سوچ کر خوش ہوتا رہا۔ اسے یقین تھا کہ سلیگ ان کی بھوک مٹانے کی خاطر کیبن کی طرف ضرور آئے گا اور پھر وہ اس کا شکار کر لے گا لیکن اس کا اندازہ غلط ثابت ہوا۔ سلیگ نہیں آیا۔

پانچویں دن جب برف گرنی بند ہوئی تو پروفیسر نے خاص لباس اور جوتے پہنے، رائفل اٹھائی اور کیبن سے باہر آ گیا، اسے ان کی تلاش نہ ہوتی تو بھی وہ آج کیبن سے ضرور نکلتا کیونکہ اسے امید تھی کہ آج سلیگ اس کے کیبن سے خوراک حاصل کرنے ضرور آئے گا اور ان پھندوں میں سے کسی ایک میں ضرور پھنس جائے گا۔ اس نے یہ پھندے کیبن کے دروازے کے پاس اس طرح بچھا دیئے تھے کہ اندر پاؤں رکھنے والے کی ٹانگیں فوراً ان میں پھنس جائیں۔

برف پر چلتے ہوئے پروفیسر ڈائل مسکرا مسکرا کر یہی سوچ رہا تھا۔ پروفیسر کو آج بھی یہ توقع ہرگز نہیں تھی کہ وہ ان کی پناہ گاہ تلاش کر سکے گا۔ اس لئے وہ اندھا دھند چلا جا رہا تھا۔ وہ تو صرف واپسی کے مناسب وقت کا انتظار کر رہا تھا تاکہ سلیگ اس کے بچھائے ہوئے پھندوں میں پھنس چکا ہو۔ اسے یقین تھا کہ سلیگ کے پھنسنے کے بعد ڈینا اسے چھڑانے کے لئے ضرور وہاں تک آئے گی۔ اور وہ اسے دیکھتے ہی ہوائی فائر کر دے گا اور پھر ڈینا ضرور خوفزدہ ہو کر سیدھی اپنی پناہ گاہ کی طرف بھاگے گی پھر وہ اس کا تعاقب کرے گا اور یوں پلے بھی اس کے ہاتھ آ جائیں گے۔ اس کے بعد وہ چاہے تو ڈینا کو ہلاک بھی کر سکتا ہے اور واپسی پر سلیگ تو اس کے قبضے میں ہی ہوگا۔

لیکن اچانک پروفیسر ڈائل کو ان کی دوسری پناہ گاہ نظر آ گئی۔ یہ ستم ظریفی ہی تو تھی کہ اس سے پہلے وہ پناہ گاہ کی تلاش میں سرگرداں رہا کرتا تھا اور کامیاب نہیں ہوتا تھا۔ آج وہ پناہ گاہ کی تلاش نہیں کر رہا تھا اور وہاں تک آ پہنچا تھا۔ کچھ دور اسے ایک گرے ہوئے درخت تک کتوں کے پنجوں کے بہت سے نشانات نظر آ رہے تھے۔ جس کا صاف مطلب تھا کہ وہ ضرور وہیں پناہ لئے ہوئے ہیں۔ پروفیسر نے فوراً رائفل کا سیفٹی کیچ ہٹا دیا اور آگے بڑھ کر زور زور سے آواز دی۔ ”سلیگ، ڈینا! باہر نکل آؤ۔“

اسے یقین تھا کہ وہ فوراً باہر آ جائیں گے اور اتنے دنوں کے بعد دوڑ دھوپ کا ڈراپ سین ہو جائے گا کیونکہ انسانوں کی طرح سلیگ اور ڈینا بھی رائفل چلنے کے خطرناک نتائج سے آگاہ تھے۔ اب پروفیسر اپنی فتح مندی

کے احساس سے مسکرا رہا تھا اور سوچ رہا تھا کہ ”انسان آخر انسان ہی ہے، بھلا جانور اس کا کیسے مقابلہ کر سکتا ہے! اس نے دوبارہ چلا کر کہا۔ ”باہر نکل آؤ سکیگ اور ڈینا! نہیں تو میں وہیں آ کر تمہیں شوٹ کر دوں گا۔“

کھوہ میں کچھ ہلچل سی پیدا ہوئی اور پھر ڈینا غراتے ہوئے باہر نکلی۔ وہ شعلہ بار نظروں سے اسے گھور رہی تھی لیکن یہ ظاہر تھا کہ وہ رائفل سے ڈر کر فرار ہونے کا کوئی ارادہ نہیں رکھتی تھی کیونکہ اس طرح اس کے پلے پروفیسر کے قبضے میں آ جاتے۔ بھلا وہ یہ کیسے برداشت کر سکتی تھی۔ اور پروفیسر کی طرف بڑھ بھی نہیں رہی تھی کیونکہ وہ جانتی تھی کہ اس صورت میں پروفیسر یقیناً اس پر گولی چلا دے گا۔ بس وہ وہاں کھڑی اسے گھورتی جا رہی تھی۔

”ہوں، اب بتاؤ قابو میں آئی ہو یا نہیں!“ پروفیسر نفرت سے اسے دیکھ کر کہنے لگا۔ اسے یہ علم نہ تھا کہ سکیگ یا ڈینا اس کے الفاظ سمجھنے کی کتنی اہلیت رکھتے ہیں لیکن اس سے پہلے بھی تو وہ ان سے باتیں کرتا ہی رہا تھا۔

”ڈینا اگر تم نے کوئی حرکت کی تو میں تمہیں فوراً شوٹ کر دوں گا۔ میں اب تمہارے اور سکیگ کے بچوں کو ساتھ لے کر کیبن میں جا رہا ہوں۔ اب مجھے ان میں ذہانت کے ساتھ ساتھ اطاعت کا جذبہ بھی پیدا کرنا پڑے گا تا کہ وہ تمہاری طرح بے وفا اور نافرمان نہ نکلیں سمجھیں!“

اب پروفیسر ڈائل آہستہ آہستہ ڈینا کی طرف بڑھ رہا تھا۔ اسے کسی طرف سے بھی اپنے لئے خطرے کا کوئی احساس نہ تھا۔ اسے یقین تھا کہ سکیگ تو اب تک اس کے کیبن میں جا کر پھندے میں پھنس چکا ہو گا۔ اب وہ ڈینا کی دو ٹانگیں بیکار کرنے کا ارادہ رکھتا تھا تا کہ وہ پلوں کی پرورش کے لئے زندہ رہے اس کے بعد وہ ان سب کو کیبن میں لے جانا چاہتا تھا تا کہ وہاں پہنچ کر بے بس سکیگ کے زخموں پر نمک چھڑکے اور اسے تلملانے پر مجبور کر دے۔ سکیگ کو تو وہ ہلاک ہی کر دینا چاہتا تھا تا کہ نہ رہے بانس نہ بجے بانسری۔

پروفیسر نے رائفل کی نال کا رخ ڈینا کی طرف کر دیا۔ ڈینا کے حلق سے شدید غصے اور نفرت کی غراہٹ بلند ہوئی پھر اچانک کوئی بھاری بھرکم شے پروفیسر ڈائل پر اتنے زور سے آ پڑی کہ وہ لڑکھڑا کر رہ گیا۔ سکیگ اس کے عقب سے پوری قوت کے ساتھ اس پر حملہ آور ہوا تھا اور اس کے پنجوں میں پروفیسر کے اوور کوٹ کے چیتھڑے لٹک رہے تھے۔

رائفل پروفیسر کے ہاتھ سے چھوٹ کر دور جا گری تھی۔ وہ تیزی سے اٹھا۔ اس کا خیال تھا کہ اب ڈینا بھی اس پر حملہ آور ہو گی۔ مگر پھر یہ دیکھ کر اس کا منہ حیرت سے کھل گیا کہ ڈینا اور سکیگ دونوں اسے چھوڑ کر اس کی رائفل کی طرف دوڑ پڑے تھے۔ سکیگ نے رائفل چھوڑ دی جو ڈینا کے جبڑوں میں دبی ہوئی تھی۔ سکیگ اپنی زبان میں اس سے کچھ کہہ رہا تھا۔ ڈینا اس کا مطلب سمجھ کر رائفل کو گھسیٹ کر بہت دور لے جا رہی تھی۔ اور سکیگ اب اس کھوہ کے باہر کھڑا تھا۔ جہاں سے پلوں کی آوازیں آ رہی تھیں۔ وہ اپنی سرخ آنکھوں سے پروفیسر کو گھور رہا تھا۔ اس کے تیور بے حد خطرناک تھے۔

پروفیسر نے چپ چاپ وہاں سے کھسکنا چاہا۔ اس حالت میں ان کے مقابلے کا خیال بھی حماقت سے کم نہ ہوتا۔ پروفیسر نے بھاگ نکلنا چاہا لیکن اب ڈینا رائفل کو کہیں دور چھوڑ کر واپس آ گئی تھی اور وہ سکیگ سے بھی زیادہ برہم نظر آتی تھی۔ اس کی آنکھیں انگاروں کی طرح دہک رہی تھیں۔ آخر وہ ماں تھی اور اس شخص نے اس کی اولاد پر ہاتھ ڈالنے کی جسارت کی تھی۔ اب وہ اس پر حملہ آور ہونے کے لئے لپکی۔ پروفیسر ڈائل نے خوفزدہ ہو کر چیخ ماری اور پھر اس کے حملے سے بچنے کے لئے بھاگا۔

وہ حیرت انگیز پھرتی سے ایک ٹنڈ منڈ درخت کے تنے پر چڑھ گیا۔ ڈینا غراتی ہوئی اس درخت کے ارد گرد چکر لگا رہی تھی۔ وہ درخت پر چڑھ نہیں سکتی تھی۔ ورنہ اب تک اس نے پروفیسر کی تکا بوٹی کر ڈالی ہوتی۔ اب وہ دونوں پروفیسر سے ذرہ بھر بھی خوفزدہ نہیں تھے۔ شاید انہیں معلوم تھا کہ غیر مسلح ہونے کے بعد وہ ان کے لئے کسی خطرے کا باعث نہیں بن سکتا۔

پروفیسر ڈائل کی انا کو شدید ترین ٹھیس پہنچی تھی۔ وہ

پروفیسر بی ایچ ڈاٹل بریڈک یونیورسٹی کا مانا ہوا سائنسدان ایک عظیم اور برتر انسان، جو دوسرے انسانوں سے بھی مات نہیں کھاتا تھا، آج دو حقیر کتوں نے اسے بے بس کر دیا تھا۔ کتے بھی وہ جن میں ذہانت اور شعور خود اس کی تجربات کے ذریعے پیدا ہوئی تھی لیکن وہ انتظار کے سوا کچھ نہیں کر سکتا تھا۔ انتظار اس بات کا کہ اب وہ دوبارہ کسی نئی پناہ گاہ کی تلاش میں چل دیں گے پھر وہ درخت سے اتر کر کیبن میں چلا جائے گا۔ لیکن کتوں کا ارادہ وہاں سے ٹلنے کا نہیں آتا تھا۔ بھلا اب انہیں اس جگہ پر کیا خطرہ درپیش تھا کہ وہ کسی نئی پناہ گاہ کی تلاش میں نکلیں، پروفیسر ڈاٹل تو بے بس انداز میں درخت پر چڑھا ہوا تھا۔

چنانچہ پروفیسر ان کے وہاں سے ٹلنے کا انتظار کرتا رہا۔ سردی میں بھی شدت پیدا ہوگئی اور پھر برف باری شروع ہوگئی، اسے اپنا خون جمتا ہوا محسوس ہو رہا تھا، اور چار دہکتی ہوئی آنکھیں اس پر جمی ہوئی تھیں۔

رات کا نہ جانے کون سا پہر تھا کہ پروفیسر ڈاٹل نے سلیک اور ڈینا کے درمیان غراہٹوں کا تبادلہ محسوس کیا۔ برف باری اب تھم چکی تھی۔ پروفیسر نے سوچا کہ یقیناً ان دونوں نے اسی کے بارے میں تبادلہ خیالات کیا ہے۔ اس نے دونوں کے ہیولوں پر نگاہیں گاڑ دیں۔ کچھ دیر بعد ہی وہ دونوں اسے اونگھتے نظر آئے پھر جیسے وہ اپنے گلے پر سر رکھ کر سو گئے۔

پروفیسر کے کانپتے ہوئے جسم میں زندگی کی حرارت دوڑ گئی۔ وہ بہت احتیاط اور خاموشی کے ساتھ پیڑ سے نیچے اترنے میں کامیاب ہوگیا۔ جب انسان اپنی زندگی بچانے کی جدوجہد میں مصروف ہو تو یوں بھی اس کی قوت دو چند ہو جاتی ہے۔ پروفیسر انتہائی تیز تیز قدم اٹھاتا ہوا اپنے کیبن کی طرف لوٹ رہا تھا لیکن اس کے حواس پر کتوں کا خطرہ بھی مسلط تھا۔ ابھی اس نے کچھ فاصلہ ہی طے کیا ہوگا کہ اسے احساس ہوا جیسے دبے پاؤں کوئی اس کا تعاقب کر رہا ہو۔ اس برفانی ویرانے میں اس کا تعاقب صرف سلیک یا ڈینا ہی کر سکتے تھے۔

پروفیسر کے تمام جسم میں خوف کی ایک سرد لہر دوڑ گئی۔ غالباً سلیک اور ڈینا بیدار ہوگئے تھے اور پروفیسر کو درخت پر نہ پا کر اس کی تلاش میں روانہ ہوگئے تھے۔ اب وہ پروفیسر کو ڈھونڈ چکے تھے اور کسی بھی لمحے اس پر حملہ آور ہو سکتے تھے۔

پروفیسر کے اندازے کے مطابق اب کیبن زیادہ فاصلے پر نہیں تھا۔ اسے کیبن کا ہیولہ نظر آنے لگا تھا اگر وہ اپنے جسم کی پوری قوت و طاقت صرف کر کے ایک دم دوڑ لگا دے تو ان خونخوار کتوں کے حملے سے محفوظ ہو سکتا تھا۔ کیبن میں پہنچ جانے کے بعد کتے اس کا کچھ نہیں بگاڑ سکتے تھے۔

پروفیسر ابھی یہ سوچ ہی رہا تھا کہ اسے تیز غراہٹیں سنائی دیں۔ یقیناً کتے اس پر حملہ کرنے والے تھے۔ دوسرے ہی لمحے وہ پوری قوت سے کیبن کی طرف دوڑ پڑا۔

پروفیسر بھاگتا ہوا کیبن کے دروازے میں داخل ہوا اور اسی وقت اس کے منہ سے ایک بھیانک چیخ بلند ہوئی۔ وہ منہ کے بل ٹھوکر کھا کر گرا تھا۔ پھر اس کی گردن شکنجے میں پھنس گئی تھی۔

سلیک اور ڈینا جب کیبن کے دروازے پر پہنچے پروفیسر دم توڑ چکا تھا۔ سلیک نے غرا کر ڈینا سے کچھ کہا اور دونوں ہی کی آنکھیں مسرت سے چمکنے لگیں۔ سلیک کا منصوبہ کامیاب رہا تھا۔

پروفیسر شکنجے لگاتے وقت یہ بھول گیا تھا کہ سلیک شکنجوں کو دیکھ رہا ہے اور ان کے استعمال سے بھی واقف ہے۔ جب پروفیسر ان کی تلاش میں بھٹک رہا تھا تو سلیک کیبن تک آ کر شکنجوں کو دیکھ چکا تھا اور کیبن میں داخل ہوئے بغیر واپس ہوگیا تھا۔ سلیک اور ڈینا نے دانستہ طور پر پروفیسر کو فرار کا موقع دیا تھا تا کہ پروفیسر کیبن کی طرف روانہ ہو جائے اور وہ دونوں راستے میں اسے اتنا بدحواس کر دیں کہ پروفیسر کو ان شکنجوں کا خیال ہی نہ آئے جو اس نے کیبن کے دروازے سے لگا کر رکھ دیئے تھے۔





آسیبی گھر

ایس امتیاز احمد-کراچی

رات کا نجانے کون سا پہر تھا کہ اچانک کمرے میں دل کو دہلاتا اور جسم و جان پر سکتہ طاری کرتا قہقہہ سنائی دیا تو بستر پر محوِ خواب نوجوان ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا اور پھر اپنے سامنے کا منظر دیکھ کر اس کی روح فنا ہونے لگی کیونکہ……

رگوں میں دوڑتے لہو کو منجمد کرتی برسوں دماغ سے محو نہ ہونے والی لرزیدہ لرزیدہ خونی کہانی

1980ء میں برطانیہ کی ایک ریسرچ سوسائٹی نے تحقیقات شروع کردی کہ لندن میں کس قدر مکانات ایسے ہیں جو آسیب زدہ ہیں اور وہ کون کون لوگ ہیں جنہوں نے پراسرار واقعات اپنی آنکھوں سے دیکھے ہیں۔

چنانچہ ایک سوالنامہ تحریر کیا گیا اور تقریباً سترہ ہزار شہریوں کو بھیج دیا گیا ان میں سے 5316 نے تو یہ جواب دیا کہ ”انہیں کسی ایسے حادثے سے واسطہ نہیں پڑا۔“ 1684 نے جواب دیا کہ ”انہیں اس قسم کے واقعات سے واسطہ پڑا ہے۔“ جن مکانات کے آسیب زدہ ہونے کی اطلاع ملی ان میں برکلے اسکوائر کا مکان نمبر 50 بھی تھا۔

بیان کیا جاتا ہے کہ اس مکان میں ایک ایسی چیز دیکھی جاتی تھی جو انسان تھی نہ جانور۔ بس اس وقت سے یہ بھوتوں کا مسکن مشہور ہوگیا۔ جو لوگ اس میں

رہتے تھے، خوف زدہ ہوکر بھاگ گئے اور ان کے بعد جس نے اسے کرائے پر لیا، اسے اپنی جان سے ہاتھ دھونے پڑے۔

واقعات یوں بیان کئے جاتے ہیں کہ بھوتوں کا مسکن مشہور ہونے سے پہلے یہ اس علاقے کی سب سے اچھی عمارت خیال کی جاتی تھی۔ پھر اس پر خوف کے سائے پھیلتے چلے گئے۔ اس کی ابتدا یوں ہوئی کہ اس میں رہائش رکھنے والے ایک شخص مسٹر ڈیوپری نے اپنے ایک بھائی کو جس کا دماغی توازن درست نہیں رہا تھا، اس مکان کی ایک کوٹھری میں بند کردیا۔ یہ دیوانہ شخص اس قدر مغلوب الغضب اور وحشت ناک تھا کہ کوئی بھی اس کے نزدیک جانے کی جرأت نہ کرسکتا تھا، یہاں تک کہ اس کی خوراک بھی ایک نلکی کے ذریعے اندر پہنچائی جاتی۔ یہ کہنا مشکل تھا کہ جو بھوت اس مکان میں دیکھا جاتا تھا وہ اسی پاگل آدمی کا تھا، کیونکہ اسے تو نچلی منزل میں بند کیا گیا تھا، جبکہ بھوت دوسری منزل کے بیڈروم میں نظر آتا۔

ایک مشہور رسالے ''نے خبر'' نے 1888 میں اس مکان کے متعلق لکھا تھا، برکلے اسکوائر کے مکان نمبر 50 میں کم از کم ایک کمرہ ایسا ہے کہ جسے دیکھ کر دل و دماغ پر ہیبت طاری ہوجاتی ہے اور ماننا پڑتا ہے کہ کسی مافوق الفطرت چیز کا اثر اس مکان میں ضرور ہے۔ یہ مکان مدت سے خالی پڑا ہے، البتہ ایک چوکیدار اور اس کی بیوی اس میں اب بھی رہتے ہیں مگر صورت حال یہ ہے کہ وہ دونوں بھی آسیب زدہ کمرے میں جانے کی ضرورت محسوس نہیں کرتے۔ انہوں نے اس کمرے میں تالا ڈال دیا ہے جس کی چابی ایک گمنام شخص کے پاس ہے وہ کبھی کبھی اس گھر میں آتا ہے اور پراسرار کمرہ کھول کر چند گھنٹے قیام کرتا اور پھر چلا جاتا ہے۔

آسیب کے متعلق بھی بہت سی تاویلیں کی گئیں۔ مثلاً کسی نے یہ افواہ پھیلائی کہ اصل میں اس مکان میں ایک بچے کا بھوت ہے جو سسک سسک کر روتا دکھائی دیتا ہے۔

دوسری افواہ یہ بھی تھی کہ بالائی منزل میں ایک پاگل شخص کا بھوت نظر آتا ہے جو کسی پیغام کے انتظار میں عقل و خرد سے بیگانہ ہوکر مرگیا تھا۔

ایک افواہ یہ بھی تھی کہ اس مکان میں ایک لڑکی تھی اس نے اپنے ایک عزیز کی دست درازیوں سے تنگ آکر نیچے چھلانگ لگادی اور مرگئی۔ اب اس کا بھوت مکان میں بھٹکتا پھرتا ہے۔ ان کے علاوہ کچھ اور کہانیاں بھی مشہور تھیں، لیکن حقیقت یہ ہے کہ ان میں سے ایک بھی درست نہ تھی اس کے بارے میں درست بات اگر کسی شخص نے بتائی۔ تو وہ لارڈ لٹلٹن ہے، لارڈ اور اس کے خاندان کو ایسے واقعات سے اس قدر واسطہ پڑا تھا کہ لندن والے اسے بھوتوں کا ماہر خصوصی خیال کرنے لگے۔

لارڈ نے بتایا۔ ''ایک دن میں پستول سے مسلح ہوکر اس کمرے میں سویا، ساری رات کوئی قابل ذکر واقعہ رونما نہ ہوا، لیکن صبح ہونے سے ذرا پہلے کوئی چیز اڑتی ہوئی آئی اور کمرے میں داخل ہوگئی۔ میں نے فوراً اس پر فائر کیا جس سے وہ زخمی ہوکر گری، میں اس کی طرف بڑھا، لیکن وہ فوراً ہی غائب ہوگئی۔''

لارڈ موصوف سے اس چیز کا حلیہ دریافت کیا گیا تو وہ اس کا جواب نہ دے سکا۔

انیسویں صدی عیسوی میں دو اخباروں نے اس بھوت کا حلیہ بیان کیا۔ ایک نے لکھا۔ یہ گمنام بلا اصل میں ایک بہت ہی مکروہ شکل مخلوق ہے جس کی زبان منہ سے باہر لٹکی رہتی ہے۔ دانت بہت لمبے اور چہرہ الو کی طرح گول مٹول ہے۔

دوسرا اخبار نے لکھا کہ اصل میں یہ بلا ایک عجیب جانور نما ہے جس کی آنکھیں اور کئی ٹانگیں ہیں اور وہ کوئی جہنمی مخلوق معلوم ہوتی ہے مگر حیرت یہ ہے کہ یہ بلا صرف مکان نمبر 50 میں دکھائی دیتی ہے۔

لارڈ لٹلٹن کے علاوہ دو اور اشخاص نے بھی اس مکان میں ایک ایک رات قیام کیا۔ ان میں سے سر رابرٹ علاقے کے نوجوان نواب زادہ تھے۔ ابھی انہوں

نے شادی نہ کی تھی۔ زندگی کے اوقات زیادہ تر سیر و شکار میں بسر کرتے اور اپنے طبقے میں بہت عزت کی نگاہ سے دیکھے جاتے تھے۔

ایک دن دوران گفتگو میں بھوتوں کا ذکر چھڑا تو سر رابرٹ نے سختی سے بھوتوں کے وجود کا انکار کیا اور ان لوگوں کا مذاق اڑایا جو ایسی چیزوں پر اعتقاد رکھتے ہیں۔ اس پر اچھی خاصی بحث چھڑ گئی، یہاں تک کہ ان کے دوستوں نے تہیہ کرلیا کہ وہ ثابت کردیں گے کہ بھوت کوئی خیالی مخلوق نہیں۔ یہ گفتگو جاری تھی کہ کمرے میں وہ صاحب داخل ہوئے جن کی ملکیت میں برکلے اسکوائر کا مکان نمبر 50 تھا۔ انہیں دیکھ کر سب دوست خوشی کے مارے اچھل پڑے اور سر رابرٹ سے ان کا تعارف کراتے ہوئے کہا کہ یہ صاحب اسی مکان کے مالک ہیں جس میں بھوت موجود ہے اور بھوت ایسا کہ پورے انگلستان میں اس کے مقابلے کا کوئی بھوت نہیں۔

پھر انہوں نے جنسن (مکان کا مالک) سے کہا کہ وہ اپنے تجربات سے سر رابرٹ کو آگاہ کریں، لیکن قبل اس کے کہ وہ جواب میں کچھ کہتے، ایک نوجوان چلا اٹھا۔

''سر رابرٹ! آپ ایک جرأت مند اور کھلاڑی قسم کے آدمی ہیں...... کیوں نہ آپ آسیب زدہ مکان میں ایک رات بسر کریں اور بھوت پریت کے نظریے کو غلط ثابت کردیں؟''

''مگر میں ایسی خوف ناک مہم کی بھی اجازت نہ دوں گا۔'' مسٹر جنسن نے جلدی سے کہا۔

''سر رابرٹ عاقل و بالغ شخص ہیں بھئی۔ وہ اپنا برا بھلا بخوبی سوچ سکتے ہیں۔ اگر کوئی حادثہ ہوگیا، تو اس کی تمام تر ذمہ داری خود ان پر ہوگی، ہم میں سے کوئی بھی تمہیں الزام نہ دے گا۔ کیوں سر رابرٹ، آپ کی کیا رائے ہے؟'' اسی نوجوان نے کہا۔

میں اس مہم کو سر کرنے کے لئے بالکل تیار ہوں۔'' سر رابرٹ بولے۔ بلکہ میں تو 100 گنی کی شرط لگانے کے لئے بھی تیار ہوں کہ میں اس آسیب زدہ مکان سے صحیح سلامت برآمد ہوں گا۔''

قانون

صحافیوں کی ایک ٹیم جیل کا دورہ کر رہی تھی۔ ''ایک کوٹھری میں ایک ایسے صاحب بھی بند تھے جو شکل و صورت سے ہی مسکین اور شریف نظر آرہے تھے۔''

ایک صحافی نے ان کے بارے میں جیلر سے پوچھا۔ ''ان صاحب نے کیا جرم کیا ہے۔''

جیلر نے بتایا۔

انہوں نے کوئی جرم نہیں کیا بلکہ ایک مشہور ڈاکو منگو غنڈا کو قتل کرتے ہوئے دیکھا ہے اور یہ واحد شخص ہیں جو اس واقعے کا چشم دید گواہ ہے اب انہیں حفاظت کے خیال سے جیل میں رکھا ہوا ہے۔''

صحافی نے پھر پوچھا۔ ''اب منگو غنڈا کہاں ہے۔''

''جناب وہ تو کب کا ضمانت پر رہا ہوگیا ہے۔'' جیلر نے اطمینان سے جواب دیا۔

(شرف الدین جیلانی - ٹنڈو الہ یار)

''بہت خوب، بہت خوب!'' لارڈ کالنڈی تالی بجا کر بولے۔ ''اب بتاؤ مسٹر جنسن! آپ کیا کہتے ہیں؟''

''میرے آقا! مجھے تو اب بھی اس تجویز سے اتفاق نہیں۔'' جنسن نے کہا۔ وہ خاصا خوف زدہ دکھائی دیتے تھے۔

لارڈ کالنڈی بولے۔ ''بھئی، اگر واقعی کسی طرح کا خطرہ ہے تو میں حفاظتی انتظام کرنے کو تیار ہوں۔''

سر رابرٹ مسکراتے ہوئے گویا ہوئے۔ ''اس تکلیف کی ضرورت نہیں، میں اپنی حفاظت خود کرسکتا ہوں۔''

جنسن بولے۔ ''حضرات! گو سر رابرٹ اپنی مرضی سے میرے غریب خانے کو نوازنے کا ارادہ رکھتے ہیں مگر مجھے محسوس ہو رہا ہے کہ یہ کوئی معقول بات نہیں۔

بہرحال جو مزاج یار میں آئے میں چشم براہ رہوں گا۔"

"تم پاگل تو نہیں ہو گئے" سر رابرٹ نے کہا۔

جیسن بولا۔ "جی ہاں، مگر اس شرط پر کہ ہم سب ساری رات یہاں پہرہ دیں گے۔ آپ مسلح ہو کر مکان میں داخل ہوں گے اور جب بھی کوئی خطرہ محسوس ہو گھنٹی بجا کر ہمیں اطلاع کر دیں گے۔"

"مجھے یہ شرط منظور ہے لیکن محسوس کرتا ہوں کہ گھنٹی بجانے کی نوبت آنے کی امید نہیں۔ [illegible]"

اس گفتگو کے بعد طے پایا کہ ٹھیک تین دن بعد شب کو سب دوست [illegible] 50 برکلے اسکوائر میں جمع ہوں گے [illegible] گزاریں گے۔"

مقررہ دن آن پہنچا۔ [illegible] پراسرار مکان میں پہنچ گئے اور [illegible] باتیں کرنے لگے۔

اگرچہ وہ خود کو مطمئن ظاہر کرنے کی کوشش کر رہے تھے لیکن [illegible] اس عجیب و غریب مکان سے متاثر تھے۔

تھوڑی دیر بعد سب کھانے کے کمرے میں گئے۔ کھانا بہت لذیذ اور اعلیٰ قسم کا تھا مگر سارے مہمان خاموشی سے اس طرح کھا رہے تھے جیسے محض فرض ادا کر رہے ہوں۔ وہ جلدی ہی کھانے سے فارغ ہو گئے۔ سر رابرٹ نے اپنے میزبان جیسن سے مخاطب ہو کر کہا۔

"اچھا اب مجھے اس کمرے میں چلا جانا چاہئے جس میں آج شب رہنا ہے۔"

سب مہمان اپنے میزبان کی قیادت میں دوسری منزل پر پہنچے جہاں وہ تاریخی کمرہ دکھایا گیا جسے تقریباً اسی برس کے بعد سر رابرٹ کے لئے کھولا گیا تھا۔ یہ کمرہ تاریک سا تھا اور اس کا فرنیچر پرانے زمانے کی یادگار تھا۔

کمرے کے وسط میں ایک بڑی مسہری بچھی ہوئی تھی جس پر صاف شفاف بستر لگا تھا۔ مسہری کے دائیں بائیں تپائیوں پر لیمپ رکھے تھے اور سرہانے کی طرف گھنٹی کی رسی لٹک رہی تھی۔

جیسن نے اس رسی کو ہلایا تو نیچے گھنٹی بجی۔ اس نے سر رابرٹ سے کہا۔ "کوئی خطرہ محسوس ہو تو مہربانی کر کے گھنٹی بجا دیجئے گا۔ ہم فوراً آپ کی مدد کو پہنچ جائیں گے۔"

"ٹھیک ہے۔" سر رابرٹ بولے۔ "مگر آپ کی یہ نوبت نہ آئے گی۔ [illegible] گھنٹی نہ بجے آپ میرے پاس آنے کی تکلیف نہ کریں۔"

سر رابرٹ کو کمرے میں چھوڑ کر سب نے شب بخیر کہا اور نیچے آ گئے۔ سر رابرٹ نے کوٹ اتار کر کھونٹی پر لٹکایا اور مسہری پر دراز ہو گئے۔ انہوں نے بھرا ہوا پستول دائیں طرف رکھا اور بائیں جانب گھنٹی کی رسی۔ آتش دان میں آگ خوب جل رہی تھی جس سے کمرہ گرم ہو گیا تھا۔ ان کا ارادہ بیدار رہنے کا تھا۔ [illegible] نمبر 50 برکلے اسکوائر کا [illegible]۔ ادھر ان کے دوست نیچے کی منزل میں چپ چاپ بیٹھے گھنٹی بجنے کا انتظار کر رہے تھے۔ اسی حالت میں کلاک نے رات کے بارہ بجائے اور اس کے ساتھ ہی ڈرائنگ روم میں گھنٹی کی آواز گونجنے لگی۔ سب دوست ہوشیار ہو گئے۔ پھر گھنٹی کی آواز دوسری بار اس قدر زور سے گونجی کہ معلوم ہوتا تھا ٹوٹ کر گر پڑے گی۔

"اوہ میرے خدا!" جیسن چیخ مار کر اوپر کی طرف بھاگا اور اس کے پیچھے باقی تمام دوست بھی روانہ ہو گئے۔ وہ دروازے کے نزدیک ہی پہنچے تھے کہ بند دروازے کے پیچھے سے پستول کے فائر کی آواز سنائی دی۔ جیسن نے جھپٹ کر دروازہ کھول دیا۔

آہ! کیا دردناک منظر تھا۔ بیچارے سر رابرٹ کا آدھا جسم بستر پر اور آدھا بستر سے نیچے لٹکا ہوا تھا، سیدھے ہاتھ سے چھوٹ کر پستول دور جا گرا تھا اور بائیں ہاتھ میں گھنٹی کی رسی تھی۔ سر رابرٹ کی آنکھیں خوف سے باہر نکل آئی تھیں اور منہ بھی کھلا ہوا تھا۔

یہ ایسا بھیانک منظر تھا کہ بہادر سے بہادر آدمی

کا پتہ پانی ہو جائے۔ جیسن نے آگے جھک کر نبض ٹٹولی۔
تو وہاں کیا رکھا تھا؟ برکلے اسکوائر کے بھوت نے سرروبرٹ کی جان لے لی تھی۔

جیسن پر سرروبرٹ کی موت کا اس قدر اثر ہوا کہ اس نے نمبر 50 برکلے اسکوائر کو ہمیشہ کے لئے خیرباد کہنے کا تہیہ کرلیا۔ پچیس سال تک کسی ذی روح نے اس منحوس مکان میں قدم نہ رکھا مگر جب یہ مکان اپنی ویرانی کا پچاسواں سال منانے والا تھا تو دو ملاح اس میں داخل ہو گئے۔ یہ ایک بحری جہاز پینی لوپ سے متعلق تھے جو انگلینڈ کے دورے سے ایک سال بعد پورٹ سمتھ پہنچا تھا۔ 1887ء کا دسمبر تھا۔

بندرگاہ پر پہنچتے ہی جہاز کے عملے کو چھٹی دے دی گئی تاکہ وہ اپنی خواہش کے مطابق کرسمس کی خوشیوں میں شریک ہو سکیں۔

یہ دونوں ملاح اسی جہاز سے تعلق رکھتے تھے انہوں نے لندن پہنچ کر کئی دن پینے پلانے کا شغل جاری رکھا۔ جب ذرا ہوش آیا اور حساب کتاب کیا تو معلوم ہوا کہ پیسے بالکل ختم ہو چکے ہیں اور اب گھر پہنچنا بھی محال ہے۔ دونوں کے گھر لندن سے کافی فاصلے پر تھے۔ سردی بڑھتی جارہی تھی اور رات گزارنے کا مسئلہ اہمیت پکڑتا جارہا تھا چونکہ دونوں کی جیب خالی تھی لہٰذا فیصلہ ہوا کہ گھوم پھر کر کوئی ایسا ٹھکانہ تلاش کیا جائے جہاں مفت میں رات بسر ہو جائے اور اسی تلاش میں وہ برکلے اسکوائر کے اس مکان کے سامنے پہنچ گئے۔ یک لخت ان کی نظر سڑک کے بائیں جانب اٹھ گئی۔ ایک دو منزلہ مکان پر کرائے کے لئے خالی ہے کا بورڈ لگا ہوا تھا۔ یہ نمبر 50 برکلے اسکوائر تھا۔ وہ دونوں احاطے کے باہر کھڑے ہو کر جنگلے سے اچک اچک کر اندر دیکھنے لگے اور یہ بھائیں بھائیں کرتا تاریک مکان شب باشی کے لئے انہیں بہت موزوں معلوم ہوا۔ دونوں جنگلا پھلانگ مار کر اندر داخل ہو گئے۔

مارٹن نے جیب سے ایک موم بتی نکالی اور اسے روشن کر کے مکان کا جائزہ لینا شروع کر دیا۔ بلنڈن باورچی خانے میں جا نکلا جہاں سرروبرٹ کی موت سے قبل ڈنر تیار ہوا تھا۔ وہاں برتن اور سامان اب تک بے ترتیبی سے پڑے تھے۔

مارٹن اور بلنڈن کی سمجھ میں آگیا کہ یہ مکان کافی عرصے سے ویران پڑا ہے۔ وہ اب آگے بڑھے۔ کھانے کا کمرہ اور ہال سب خالی پڑے تھے۔ ایک کونے میں ایک موٹا تازہ چوہا مٹرگشت کر رہا تھا۔

"اوہ دیکھو اس چوہے کو... کس قدر موٹا ہو رہا ہے اور اس نے تختے کو کاٹ کر کتنے سوراخ کر دیے ہیں۔" مارٹن ہنسنے لگا۔

"چلو اچھا ہی ہے... ہمیں آگ جلانے کے لئے کوئی لکڑی مل جائے گی۔" بلنڈن بولا۔

"چلو اوپر چلیں۔" مارٹن نے رائے ظاہر کی اور پھر دونوں نے اوپر چڑھنا شروع کر دیا۔ گرد و غبار سے اٹا ہوا زینہ ان دونوں کے بوجھ سے چیخ اٹھا۔ خطرہ پیدا ہوا کہ ٹوٹ نہ جائے لیکن وہ رکے نہیں اور بالآخر اوپر اس کمرے میں پہنچ گئے جہاں سرروبرٹ کی موت واقع ہوئی تھی۔

اس کمرے کو دیکھ کر انہیں حیرت ہوئی۔ یہ کمرہ نسبتاً صاف ستھرا اور فرنیچر سے مزین تھا اور تو اور بستر سے آراستہ پلنگ بھی موجود تھا۔ یہ دیکھ کر مارٹن بہت خوش ہوا اور بولا "اب رات آرام سے گزرے گی۔"

بلنڈن کسی انجانے خوف سے پریشان تھا۔ کہنے لگا۔ "نہیں میرے دوست! یہاں سے بھاگو! ہمیں یہاں نہیں ٹھہرنا چاہئے۔"

"تو کیا سردی میں ٹھٹھر کر مرو گے؟" مارٹن بولا۔

بلنڈن کہنے لگا۔ "ایسے ویران مکان میں قیام کرنا اچھا معلوم نہیں ہوتا اور دیکھو یہاں کا فرنیچر عجیب و غریب قسم کا محسوس ہوتا ہے۔ اس پلنگ ہی کو دیکھو یہ تو اس قدر بڑا ہے کہ چار آدمی اس پر آرام کر سکتے ہیں۔"

"بھائی تم تو بے تُکی سی باتیں کر رہے ہو۔ یہ پلنگ تو ہمارے لئے بہت موزوں ہے۔ آؤ اس پر آرام کریں اور ہاں آتشدان میں آگ کیوں نہ جلائی جائے؟" یہ کہہ کر مارٹن نے پہلے سے رکھی ہوئی لکڑیوں

کو اکٹھا کیا اور آگ لگادی۔ کمرہ گرم ہونے لگا۔

مارٹن بستر پر دراز ہوگیا مگر بلنڈن کرسی پر خاموشی سے بیٹھا ناچتے ہوئے شعلوں کو دیکھتا رہا، لیکن ساتھی کے سمجھانے سے وہ بھی بستر پر دراز ہوگیا۔

ابھی وہ دونوں تھوڑی ہی دیر سوئے تھے کہ یک لخت بلنڈن نے جھنجھوڑ کر مارٹن کو نیند سے اٹھادیا۔ اس نے وجہ پوچھی بلنڈن کے لب ہل کر رہ گئے کوئی آواز نہ نکلی بہت کوشش سے اس نے اپنا ہاتھ اٹھایا اور کمرے کے دروازے کی طرف اشارہ کیا، مگر مارٹن کو وہاں کوئی خاص بات نظر نہ آئی۔

کمرہ اب بھی گرم تھا۔ آتش دان میں آگ کے شعلے نظر آرہے تھے اور موم بتی کی لو بھی ٹمٹمارہی تھی۔

مارٹن نے کسی قدر نارض ہوکر پوچھا۔ ''کیا بات ہے؟ تم ڈر کیوں رہے ہو؟''

بلنڈن کی قوت گویائی لوٹ آئی۔ وہ بولا۔ ''خاموش رہو اور سنو۔''

مارٹن ہمہ تن گوش ہوگیا۔ مگر اسے کوئی آواز سنائی نہ دی، مگر تھوڑی دیر بعد ہی کسی کے قدموں کی چاپ سنائی دینے لگی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ کوئی شخص زینے پر چڑھ رہا ہے۔

''اوہ! میں اب سمجھا..... یہ یقیناً کوئی اچکا ہے۔ اس نے کمرے میں روشنی دیکھی، تو اس طرف چلا آیا۔

''ٹھہرو، میں دیکھتا ہوں ارے بھئی کون ہے؟'' مارٹن نے اونچی آواز میں کہا۔ انہوں نے سانس روک کر سننا شروع کردیا، یہاں تک کہ آنے والے نے زینہ طے کرلیا۔ اب وہ تیزی سے دروازے کی طرف بڑھ رہا تھا۔ پھر دروازہ آہستہ آہستہ کھلنا شروع ہوگیا اور جیسے ہی آدھا دروازہ کھلا کوئی چیز اندر آ گئی بلنڈن کے منہ سے چیخ نکلی۔ ان دونوں نے پلنگ سے چھلانگ لگادی اور فرش پر پڑے ہوئے پردے کے ڈنڈے اٹھانے لگے۔

ایک سایہ نظر آیا یہ سایہ کس چیز کا تھا وہ پہچان نہ سکے... انہوں نے دیکھا بہت بڑے بڑے پنجے ان کی طرف بڑھ رہے ہیں۔ یہ پنجے بلنڈن کے بالکل قریب پہنچ گئے۔ اس نے چیخ ماری اور ڈنڈا لے کر کھڑا ہوگیا۔

مارٹن چھلانگ لگا کر دروازے کے باہر جا پڑا اور پھر کئی سیڑھیاں پھلانگتا ہوا نیچے اترنے لگا وہ مدد، مدد، پکار رہا تھا اور اسے کچھ پتہ نہ تھا اس کی منزل کون سی ہے۔ ہوش اس وقت آیا جب وہ ایک پولیس مین سے جا ٹکرایا پولیس مین کو دیکھا تو وہ بے اختیار بولا۔ ''خدا کے واسطے میرے ساتھ آؤ..... میری مدد کرو۔'' وہ بمشکل اتنا ہی کہہ سکا اور بے ہوش ہوکر گر پڑا۔

پولیس مین نے جھک کر مارٹن کو اٹھانا چاہا اسی وقت اس نے مکان کی اوپر کی منزل میں کسی بہت وزنی چیز کے گرنے کی آواز سنی اور پھر خاموشی چھاگئی۔

پولیس مین نے مارٹن کو جھنجھوڑ کر کھڑا کردیا اور سختی سے دریافت کیا کہ ''وہ رات کے اس آخری حصے میں اس طرح کیوں پھر رہا ہے؟''

''خدا کے واسطے میرے ساتھ چلو فوراً۔'' ہوش میں آکر مارٹن نے پولیس والے کو مکان نمبر 50 کے احاطے کی طرف گھسیٹنا شروع کردیا۔

اس ویران اور تاریک مکان کو دیکھ کر پولیس مین کا دل بھی دھڑکنے لگا۔ وہ بولا۔ ''کیا مطلب ہے تمہارا کیا تم یہاں چھپے ہوئے تھے؟''

''جی ہاں ہم اس مکان کی بالائی منزل پر تھے کہ میرے ساتھی پر کوئی حملہ آور ہوا۔'' مارٹن نے کہا۔

''حملہ آور کون تھا؟'' یہ کہہ کر سپاہی نے اپنی ٹارچ روشن کی اور جیسے ہی ٹارچ کی روشنی پھیلی، مارٹن کو اپنے ساتھی کی لاش نظر آئی جو جنگلے پر پڑی تھی۔ بدنصیب بلنڈن کا چہرہ خوف سے مسخ ہوچکا تھا۔

کہا جاتا ہے کہ لندن کی تعمیر نو تک یہ مکان اسی طرح آسیب زدہ رہا۔ البتہ بلنڈن کے بعد کوئی اور موت نہ ہوئی شاید اس لئے کہ کسی نے اس مکان میں جانے کی جرأت ہی نہ کی۔





آدم خور

ایس امتیاز احمد-کراچی

نوجوان کی ٹانگ پر تیز دھار آری جب چلنے لگی تو نوجوان کی دلخراش چیخیں آسمان کو دہلانے لگیں اور وہاں پر موجود سارے لوگ خوشی سے نعرے لگانے لگے کہ پھر......

ایک پروفیسر کی ہولناک سرگزشت جوکہ آدم خور بونوں...... کے قبیلے میں پھنس گیا تھا

غلطی ابتداء سے ہی ہو گئی تھی، مجھے اپنی پارٹی کے ساتھ ہی بھاگ جانا چاہیے تھا، لیکن بے چارے ناٹو کی دردناک چیخوں نے میرے قدم تھام لیے تھے، سب لوگ مجھے روکتے رہے لیکن میں آواز کی سمت بھاگتا گیا تاکہ غریب لڑکے کو بچا سکوں، اور جب میں نے ان کو دیکھا تو بہت دیر ہو چکی تھی، میں خود ہی منجدھار میں چلا آیا تھا، ایک درجن برہنہ بونے قبائلی میری طرف بڑھ رہے تھے۔

میری نظروں کے سامنے سیاہ غبار سا چھا گیا تھا، سیاہ فام قبائلیوں نے مجھے کسی چڑیا کی طرح دبوچ لیا تھا اور گھسیٹتے لیے جا رہے تھے، میں بری طرح چیخ رہا تھا، دہشتناک انجام میری نظروں کے سامنے تھا۔ لیکن وہ وحشی قہقہے لگاتے ہوئے مجھے تیزی سے کھینچ رہے تھے۔ پھر انہوں نے جھٹکا دے کر مجھے کھڑا کر دیا اور پھر میری آنکھوں نے ایک دل دہلا دینے والا منظر دیکھا۔

سیاہ زمین کے بیچوں بیچ ایک گول سا مٹیالا حصہ تھا، جہاں ناٹو کھڑا ہوا تھا، اس کی آنکھیں پھٹی ہوئی اور منہ اس حد تک کھلا ہوا تھا کہ مجھے ڈر تھا کہ اب اس کی باچھیں چڑھ جائیں گی اور خون پھوٹ پڑے گا اور وہ سیاہ زمین......! وہ حرکت کر رہی تھی۔

میں نے زور سے آنکھیں ملیں اور پھر دیکھا واقعی وہ گول سا حصہ لمحہ بہ لمحہ تنگ ہوتا جا رہا تھا۔ میں نے پھر آنکھیں ملیں اور پھر دیکھا۔ اف میرے خدا! یہ تو سیاہ

چیونٹے تھے۔ سیاہ سیلاب کی شکل میں وہ بڑھتے جا رہے تھے اور پھر لڑکے کی خوفناک چیخوں نے مجھے لرزا دیا۔ سیاہ سیلاب نے اسے اپنی لپیٹ میں لے لیا تھا، وہ بے اختیار ہاتھ پاؤں مار رہا تھا۔ لیکن خونخوار چیونٹے اس کے گوشت سے بری طرح چمٹ رہے تھے اور اپنے زہریلے سوئی جیسے ڈنک گاڑ کر اس کا خون پی رہے تھے، پانچ منٹ کے اندر اندر وہاں صرف ہڈیوں کا ڈھانچہ باقی بچا تھا۔ اور چیونٹوں کا سیلاب واپس جا رہا تھا۔ مجھ سے کھڑا نہ رہا گیا اور میں دھپ سے زمین پر گر پڑا۔

تھوڑی دیر میں میرا بھی یہی حشر ہونے والا تھا۔ میرے کانوں میں ہارورڈ یونیورسٹی کے پروفیسر کی آواز گونج رہی تھی۔

"جب تک تم ماٹو گروسو کے علاقے میں ہوگے بالکل محفوظ رہوگے۔ لیکن اس سے باہر مغرب کی طرف جانے کی حماقت نہ کرنا، وہاں ایک بونا قبیلہ رہتا ہے۔ جب بھی کسی سفید فام آدمی نے انہیں دیکھا ہے وہ زندہ نہیں بچا ہے۔"

اور اب میں انہیں دیکھ رہا تھا وہ بالکل برہنہ تھے عورتوں کی ناف کے پاس ایک ڈوری سی بندھی ہوئی تھی جس سے رنگ برنگ پتھروں کی لڑیاں لٹک رہی تھیں ان کے سفید سفید دانت بالکل نوکیلے اور لمبے لمبے تھے۔

چیونٹوں کے جانے کے بعد وہ سب کے سب ڈھانچے کی طرف بڑھے، ہڈیوں کے ٹوٹنے کی آواز آئی اور تھوڑی دیر بعد ہر قبائلی ایک ایک ہڈی لئے اسے بھنبھوڑ رہا تھا، ان کی ندیدی آنکھیں میری طرف لگی ہوئی تھیں، مجھے اپنی ہڈیاں چٹختی ہوئی محسوس ہوئیں۔

اب وہ پھر میری طرف بڑھ رہے تھے، ان کے ہاتھ میں گھاس کی بنی ہوئی ایک رسی تھی، انہوں نے اس کا حلقہ سا بنایا اور ایک بونے نے اچک کر میری گردن میں ڈال دیا اور سب مل کر اسے گھسیٹنے لگے۔

اور جب وہ رکے تو سورج غروب ہو چکا تھا۔ جنگل میں گہری تاریکی پھیل چکی تھی۔ میرے حواس بالکل معطل ہو چکے تھے۔ میرے سامنے گھاس کا بنا ہوا گنبد نما جھونپڑا تھا، اس کے ایک طرف گول سا سوراخ تھا۔ انہوں نے مجھے اس سوراخ میں سے اندر دھکیل دیا۔ میں زمین پر گرتے ہی بے ہوش ہو گیا۔

☆......☆......☆

میں ہارورڈ یونیورسٹی میں نیچرل ہسٹری کا سال دوم کا طالب علم تھا اپلیسٹیر کیونکہ نہیں بلکہ خوف و دہشت سے لرزتا ہوا گوشت پوست کا ایک ڈھیر تھا، جو اس فکر میں گرفتار تھا کہ اسے کس طریقے سے ختم کیا جائے گا۔

مجھے معلوم تھا کہ یہ لوگ کون تھے، انہوں نے کبھی آگ محبت، چاقو یا رحم کے الفاظ نہیں سنے تھے، ان کا دماغ بندر اور پتھر کے زمانے کے انسان کے دماغ کی بیچ کی شکل کا تھا، وہ گوشت اور ہڈیاں کھاتے تھے اور بغیر پکائے ہوئے۔

بیرونی دنیا کی طرف سے کچھ پادریوں کو اس علاقے میں بھیجا گیا تھا کہ وہ انہیں انسان بنائیں لیکن یہ بونے ان کا گوشت کھا گئے اور ہڈیاں لے جا کر دریائے کورنڈا میں پھینک دی تھی تا کہ باہر کے لوگوں کو ان کا حشر معلوم ہو جائے۔

میں یہ سب کچھ سوچتا ہوا سو گیا۔

ایک عجیب سی آواز نے مجھے جگا دیا، میں نے آواز کی سمت کان لگا دیئے...... دھپ......سرسر۔ دھپ......سر جیسے کوئی زخمی چمگادڑ، اذیت میں اپنے پر پھڑ پھڑا رہی ہو وہ کوئی بھی شے تھی، میں نے بڑی مشکل سے اس سوراخ سے باہر جھانکا، دن نکل آیا تھا۔

یک بونے نے اپنا سر سوراخ میں ڈالا اور اپنے نیزے سے مجھے اٹھ کر باہر آنے کا اشارہ کیا، میں رینگتا ہوا سوراخ کی طرف بڑھا، میرا جسم مٹی میں لتھڑا ہوا تھا اور جوڑ جوڑ درد کر رہا تھا۔

سوراخ سے باہر نکل کر میں نے چاروں طرف دیکھا اور میرا دم رکنے لگا، ایک دیو نما کیکڑے کی طرح کی شے میرے سامنے کھڑی تھی۔ میں نے غور سے دیکھا، کبھی وہ سفید فام آدمی رہا ہوگا۔ مگر اب؟

اس کے برہنہ جسم پر بھبھوت ملا ہوا تھا، سینے اور پیٹ پر بڑے بڑے سفید بالوں کی ایک سفید چادر سی تھی۔ ایک ٹانگ ٹوٹی ہوئی تھی اور گھٹنے کے پاس سے ٹانگ کا بقیہ حصہ بائیں طرف کو اس طرح مڑ گیا تھا جیسے پہائی کی ایک ٹانگ ہو۔ چلتے وقت وہ اسے گھسیٹتا تھا۔ اسی لیے وہ حیرت انگیز آواز پیدا ہوئی تھی۔

پیشانی سے اوپر اس کے سر پر ایک گہرا زخم تھا، جیسے کھوپڑی دو ٹکڑوں میں منقسم ہو کر آپ ہی آپ جڑ گئی ہو اتنے زخموں کے بعد اور طبی امداد کے بغیر بھی وہ زندہ بچ گیا تھا، اس کی آنکھیں بالکل ویران ویران لگ رہی تھیں۔

میرے ذہن میں کچھ ہلچل سی ہو رہی تھی، جیسے کوئی چیز نیچے سے اوپر آنے کی کوشش کر رہی ہو اور پھر سکون ہو گیا، ذہن کے پردے پر میرے بچپن کا ایک منظر نظر آ رہا تھا، روز ویلٹ فیلڈ سے ایک جہاز کی پرواز کا سین۔

''ریمسے!'' میں نے احمقوں کی طرح چلا کر کہا۔ ''ڈاکٹر مارک ریمسے، ہم تو سمجھتے تھے کہ آپ مر چکے ہیں۔''

پھر ہلچل ہوئی اور نوجوان ڈاکٹر ریمسے کا چہرہ میرے سامنے آیا، کتنا ہینڈسم نوجوان تھا، سب اسے فلائنگ ڈاکٹر کہتے تھے، اس کے پاس ایک انجن والا طیارہ تھا، اور اس کا زیادہ تر وقت پرواز میں گزرتا تھا، ایک دفعہ جب وہ برازیل کے جنگلات کے اوپر پرواز کر رہا تھا کہ طیارہ کہیں ٹکرا گیا اور پھر اس کی کوئی خبر نہ ملی۔ یہ کوئی پچیس سال پہلے کی بات تھی۔

اور اب وہ میرے سامنے تھا، کاش میں اسے نہ دیکھتا۔

اس کی گردن کے گرد ایک سانپ لپٹا ہوا تھا۔

اس نے اسے نکال کر نیچے ڈال دیا اور میری طرف بڑھا، اور منہ کھولا، اس کے سارے دانت غائب تھے، پھر اس کے حلق سے ایک چیخ نما آواز نکلی جسے آواز بھی کہنا زیادتی ہے۔

''کبھی کبھی مجھے اتنی تکلیف محسوس ہوتی ہے کہ میں.....''

کچھ دیر کے لئے اس کی حالت بدل گئی اور وہ کچھ عجیب الفاظ بڑبڑانے لگا جیسے کوئی گیت گا رہا ہو، ایک یا دو منٹ کے بعد پھر وہ ہوش میں آ گیا۔

بعد میں مجھے معلوم ہوا کہ اس کی یہی حالت رہتی ہے۔ کبھی وہ بالکل پاگل سا ہو جاتا ہے، کبھی ٹھیک ہو جاتا ہے۔

''تمہارا کام ابھی شروع ہوگا۔'' اس نے شستہ انگریزی میں مجھ سے کہا۔ لیکن میں کیا سمجھتا کہ مجھے کیا کرنا ہوگا؟

''وہ تمہیں ابھی زندگی رکھیں گے۔ تم ان کے لیے بہت اہم ہو۔'' ایک بونی عورت ہمارے قریب سے گزری اس کے جسم پر کپڑے کا نام ونشان تک نہ تھا۔

ڈاکٹر نے ایک نظر اسے دیکھ کر مجھے گھورا اور جب اس نے پہلے جملوں کی وضاحت کی تو میرے رونگٹے کھڑے ہو گئے دوسرے قبیلوں سے لڑائیوں میں بونوں کا بہت جانی نقصان ہوا تھا، دوسری طرف ان کے یہاں پیدائش کی شرح بہت گر گئی تھی، اور جب بھی ایسا ہوتا تھا تو ان کے یہاں روایت تھی کہ وہ کسی سفید فام آدمی کا گوشت عورتوں کو کھلاتے تھے لیکن اس آدمی کو مار کر نہیں بلکہ روزانہ اس کے جسم سے ایک ٹکڑا علیحدہ کیا جاتا تھا۔ ایک ایک بونی ہر عورت کو دی جاتی تھی اور جب تک اس آدمی میں جان باقی رہتی یہی عمل دہرایا جاتا۔

چند روز تک تو ان کا رویہ اس طرح رہا جیسے قربانی کے بکرے کے ساتھ اس کے مالکوں کا ہوتا ہے، وہ مجھے دن میں کئی بار بہت سا کھانا دیتے جو کبھی کچے گوشت اور درختوں کی جڑوں سے بنائے گئے لیس دار آمیزے پر مشتمل ہوتا تھا۔

میرے کپڑے اتار لیے گئے۔ اور انہیں تار تار کر دیا گیا، اور اب مجھے بھی برہنہ ہو کر گھومنا پڑتا تھا۔

اس دوران میں، جادوگر ڈاکٹر سے گفتگو کرنے کے کئی مواقع ملے، جب بھی وہ ہوش میں ہوتا تو مجھے بہت سی باتیں بتاتا۔ ایک روز اس نے مجھے موت کے تعویذ کے بارے میں بتایا، جس نے ان قبائلیوں کو خدا بنا دیا تھا۔

دراصل یہ ایک پرانا اعشاریہ چار کا ریوالور تھا اس کا فیتا تو کبھی کا ٹوٹ چکا تھا۔ لیکن ڈاکٹر نے گھاس کی بنی ہوئی رسیوں کی مدد سے اسے اپنی کمر کے گرد لٹکا رکھا تھا وہ اسے تیل دیتا رہتا تھا، اسی وجہ سے وہ ابھی تک اچھی حالت میں تھا۔ وہ شیطانی انداز میں ہنستے ہوئے بتاتا۔

''اس رات کو جب میرا جہاز یہاں گرا تو وہ اسے کوئی آسمانی شے سمجھے ہوں گے، جہاز کے پروں میں آگ لگی ہوئی تھی اور انجن بے حد شور کر رہا تھا، جہاز جہاں گرا تھا، وہیں ان کے پادری کی جھونپڑی تھی۔ میں جب جہاز میں سے نکلا تو خون میں نہایا ہوا تھا۔''

اس نے برا سا منہ بنایا، واقعی اس وقت اس کی حالت بڑی دگرگوں ہوگی۔ ٹانگ ٹوٹی ہوئی اور چٹخی ہوئی۔

”یہ بدبخت میری طرف بڑھنے لگے۔ مجھ میں بس اتنی سمجھ باقی رہ گئی تھی کہ اس ریوالور سے فائدہ اٹھا سکوں۔“ اس نے ریوالور کو تھپکی دی۔

میں نے ان کے سردار کا سر اڑایا تو وہ مسحور سے ہو گئے اور مجھے اٹھا کر ایک جھونپڑی میں لے گئے۔ جہاں میں تین ہفتے تک پڑا رہا۔ عورتوں نے مجھے اپنا دودھ پلایا یہاں تک کہ میں گوشت ہضم کرنے کے قابل ہو گیا۔ اور جب میں چلنے پھرنے کے قابل ہوا تو ان کا سفید دیوتا بن چکا تھا..... ہا..... ہا“ وہ بری طرح سر ہلانے لگا۔

”لنگڑا، اور دیوانہ خدا جس کے پاس صرف دو گولیاں بچی ہیں۔“

اس کا انداز بڑا مضحکہ خیز تھا۔“ دو گولیاں اور چٹخی ہوئی کھوپڑی، اب جو نئی نسل ہے، وہ باغی ہوتی جا رہی ہے جب میں نے گولی چلائی تھی تو یہ لوگ موجود نہیں تھے، اس لیے اس کہانی پر انہیں یقین نہیں آتا۔ بہر حال میں نے اس کا علاج سوچ لیا ہے۔ پہلی گولی اس کے لیے جو سب سے پہلے میری طرف بڑھے گا اور دوسری۔“ اس نے پھر ریوالور کو تھپکا۔ اس پر پھر دورہ پڑا، وہ واقعی بہت بہادر تھا، آدھے دماغ اور ڈھانچے نما جسم کے ساتھ اس نے پچیس سال قبل تک ان قاتل قبائلیوں کا مقابلہ کیا تھا۔

میں سوچ رہا تھا کہ میری باری کب آئے گی؟

مجھے زیادہ دنوں تک انتظار نہیں کرنا پڑا، قید کے کوئی دو ہفتے بعد وہ خونی کھیل شروع ہو گیا، ایک دن صبح جب میں اٹھا تو میرا سارا جسم رسیوں سے جکڑا ہوا تھا، دن بھر میں اسی طرح پڑا انتظار کی ناقابل بیان اذیت کو برداشت کرتا رہا۔ دوپہر کو ایک عورت آ کر میرے حلق میں لیسدار شے ٹپکا گئی۔ شام ہوئی تو مجھے میدان میں لے جایا گیا، ایک گول دائرہ سا بنا ہوا تھا، جس کے چاروں طرف عورتیں بیٹھی تھیں۔

درمیان میں ایک نسبتاً اونچی جگہ پر کئی کھونٹے سے گڑے ہوئے تھے۔ قبائلی مجھے اٹھائے ہوئے گھیرے کے درمیان میں پہنچے تو عورتیں بھوکی نگاہوں سے مجھے گھورنے لگیں، اب مجھے اس اونچی جگہ پر ڈال دیا گیا تھا اور قبائلی میرے جسم کے گرد بندھی ہوئی رسیوں کو کھول کر انہیں کھونٹوں پر سے گزار کر دوبارہ باندھ رہے تھے، تاکہ میں بالکل نہ ہل سکوں۔

جب رسیاں بندھ گئیں، تو ایک بوڑھی کریہہ المنظر عورت آگے بڑھی، اس کے ہاتھ میں بہت پتلی سی ڈوری تھی میں بغیر پلک جھپکائے اسے دیکھتا رہا، وہ میرے قریب آئی اور دو زانو ہو کر بیٹھ گئی، پہلے اس نے جھک کر میری ران پر ہاتھ پھیرا اور خوش ہو کر باقی عورتوں کی طرف دیکھا، ان کی آنکھوں کی حریصانہ چمک میں اضافہ ہو گیا تھا۔

بڑھیا نے ڈوری کو دونوں ہاتھوں میں لے کر تان لیا اور میری پنڈلی پر بیٹھ کر ڈوری کو آرے کی طرح میری ران پر چلانا شروع کر دیا۔ درد کی شدت سے میری چیخیں نکلنے لگیں، اس کے ہاتھ اور تیز چلنے لگے۔ میں بے اختیار اپنی ٹانگ ہلانے کی کوشش کرتا اور وہ بڑھیا اپنا عمل تیز کر جاتی۔

خون کا فوارہ سا چھوٹا۔ میری کھال اور گوشت کٹ چکا تھا۔ بڑھیا نے ہاتھ روک کر سر جھکایا اور زخم سے خون چاٹنا شروع کر دیا، نہ جانے اس کی زبان میں کیا تھا کہ میرے زخم میں مرچیں سی لگنے لگیں اور میں بے اختیار رونے لگا، بڑھیا نے اب اس زخم سے چند انچ نیچے دوسری جگہ پھر وہی آرا چلانا شروع کیا۔ پھر وہی تکلیف شروع ہوئی جو کہ اب دو چند ہو چکی تھی۔

تھوڑی دیر بعد نئے زخم سے خون بہنے لگا اور بڑھیا نے پھر ہاتھ روک کر اسے چاٹنا شروع کر دیا، اس کے بعد کیا ہوا میں کس طرح بتاؤں، اس اذیت، اس دکھ، اس تکلیف کو بیان کرنے کے لئے الفاظ نہیں ملتے۔ بڑھیا نے پہلے والے زخم کے پاس سے گوشت اٹھایا اور اسے ادھیڑنا شروع کر دیا۔ جب تک دونوں زخموں کا درمیانی پارچہ ادھیڑ کر الگ ہو گا۔ میں بے ہوش ہو چکا تھا۔ ذرا دیر بعد ہی مجھے ہوش آ گیا، بڑھیا ہر عورت کو ایک ایک بوٹی بانٹتے ہوئے آخری عورت کے قریب پہنچ چکی تھی اور وہ سب قہقہے لگاتی ہوئی اسے مزے لے لے کر کھا رہی تھیں۔

جب گوشت کا آخری ٹکڑا بھی کھا لیا گیا تو اب انہوں نے میری طرف توجہ دی، بڑھیا پھر میرے قریب آئی، اس کے ہاتھ میں پیالہ تھا، اس میں کوئی عرق سا تھا، جو اس نے میرے زخم پر ڈال دیا۔ زخم میں سے اتنی شدید ٹیس اٹھی کہ میرا سر گھوم گیا، لیکن اس کے بعد وہ حصہ تقریباً سن سا ہو گیا۔ دوسرے دن دوسری ران کے ساتھ یہی عمل دہرایا گیا۔ تیسرے دن دائیں ہاتھ کی باری آئی، اب نیند میری

آنکھوں سے بالکل غائب ہوچکی تھی، رات بھر میں تکلیف سے تڑپتا رہتا۔ رات کو میری رسیاں کھول دی جاتی تھیں۔

چوتھے دن تو رسیاں باندھنے کی بھی تکلیف نہیں کی گئی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ جب بڑھیا نے میرے بائیں ہاتھ پر اپنا آرا چلایا تو میں کئی کئی انچ اوپر اچھلا، اور اس سے جو ناقابل بیان تکلیف مجھے ہوئی، وہ میں کبھی نہیں بھول سکتا، اب بھی جب مجھے وہ کیفیت یاد آتی ہے تو میں اسی طرح بے ساختہ اچھل پڑتا ہوں۔

اب میں دن رات عالم غنودگی میں رہنے لگا تھا، مجھے پتا بھی نہیں چلتا تھا کہ کب مجھے اٹھا کر لے جایا جاتا تھا۔ جب گوشت کاٹا جاتا تب ہوش آتا، اور پھر تکلیف کی شدت سے بے ہوش ہوجاتا۔

تب ایک دن میری آنکھ کھلی تو میں نے اپنے آپ کو دیکھا میری ٹانگوں اور ہاتھوں کا تقریباً سارا گوشت ادھڑ چکا تھا مجھے حیرت تو اس بات پر تھی کہ میں اب تک کیسے زندہ تھا۔ زخموں پر مٹی جمی ہوئی تھی اور مکھیاں بھنبھنا رہی تھیں، بخار سے میرا جسم بھن رہا تھا۔

مجھے بتایا گیا کہ چونکہ چاند آخری تاریخوں میں ہے اس لیے یہ عمل روک دیا گیا ہے۔ اب جب چاند پھر نکلے گا تو یہ عمل پھر شروع ہوگا۔ مجھے یقین تھا کہ اب کی بار میں زندہ نہیں بچوں گا۔ چھوٹے چھوٹے کنکر میرے زخموں میں بری طرح چبھ رہے تھے۔ یہ مٹی تو میرے زخموں کو سڑا دے گی اور میں مقررہ مدت سے پہلے ہی مر جاؤں گا، یہ سوچ کر میں جھونپڑی سے گھسٹتا ہوا باہر نکلا، میرا رخ دریائے کورنڈا کی طرف تھا۔

تکلیف کی وجہ سے میں انچ انچ گھسٹ رہا تھا، تھوڑی دور جانے کے بعد مجھے اپنے پیچھے کچھ آہٹ سی سنائی دی۔ نیزہ لیے ہوئے ایک بونا میرے ساتھ تھا۔ اوہو! تو میری نگرانی ہو رہی تھی۔

میں کافی دیر تک پیٹھ کے بل گھسٹنے کے بعد دریا تک پہنچ پایا، اور کنارے پر لیٹ کر ذرا سا نیچے کھسکا۔ اب میرا جسم پانی کی زد میں تھا۔ بخار میں تپتا ہوا جسم جیسے برف میں رکھ دیا گیا ہو، مجھے اتنا سکون ملا کہ میری طاقت واپس آتی ہوئی محسوس ہوئی۔ ابھی میں پانی سے نکل کر باہر آیا ہی تھا کہ مجھے دور سے جادوگر ڈاکٹر آتا نظر آیا۔ وہ بڑی تیزی سے میری طرف آرہا تھا۔ قریب آکر اس نے جب میری طرف دیکھا تو مجھے اس کی آنکھوں کا رنگ پہلی بار نظر آیا نیلی نیلی آنکھیں آج دھلی دھلی لگ رہی تھیں۔

ڈاکٹر نے ریوالور کی نال اس نگراں کی طرف گھما کر اسے دور جانے کا اشارہ کیا۔ جب وہ دور ہٹ گیا تو ڈاکٹر میرے پاس زمین پر بیٹھ گیا اور بولا۔

"میرے بچے! تمہاری کیا حالت ہوگئی ہے، مجھے تمہارے پاس پہنچنے کا موقع ہی نہیں ملا۔ تمہیں جلد سے جلد یہاں سے نکل جانا چاہیے، ورنہ دو تین روز بعد تمہارا گوشت پھر کاٹا جائے گا اور اب کے تمہارے سینے کی باری ہے، مجھے امید نہیں کہ اس کے بعد تم زندہ بچو گے اور تم ابھی جوان ہو۔"

میری سمجھ میں ایک جملہ بھی نہیں آرہا تھا۔ ڈاکٹر تو پاگل ہے، بھلا یہاں سے کون بچ سکتا ہے۔ مگر ڈاکٹر دھیرے دھیرے بولے جا رہا تھا۔

"سامنے جو گھنا سا درخت ہے، اس کے پیچھے کشتی موجود ہے۔ میری زندگی تو ختم ہوچکی ہے تم اس میں لیٹ جاؤ، دریا پار پہنچ جاؤ، یہ بونے دریا پار جانے کی ہمت نہیں کر سکتے کیونکہ وہاں انہیں دیکھتے ہی گولی ماردی جاتی ہے۔"

یہ کہہ کر ڈاکٹر نے مجھے سہارا دے کر اٹھایا اور درخت کی طرف لے جانے لگا، ادھر نگراں یہ دیکھ کر ہماری طرف آنے لگا، ڈاکٹر نے فوراً ریوالور کمر سے نکالا اور بونے کے سر کا نشانہ لیا، اس کا سر یوں غائب ہوگیا جیسے تھا ہی نہیں۔

"بھاگو بے وقوف جلدی سے! ورنہ بونے آجائیں گے۔" ڈاکٹر خرخراتی آواز میں چیخا۔

میں گھبرا کر تیزی سے ایک چھلانگ میں درخت کے پیچھے پہنچا اور ایک کشتی میں الٹ گیا، کشتی پانی پر بہنے لگی۔ کنارے پر سے گولی چلنے کی آواز آئی، آخری گولی کی آواز، اور پھر میں بے ہوش ہوگیا۔

جب میں ہوش میں آیا تو ہسپتال میں پڑا تھا زخم بھرنے اور چلنے پھرنے کی طاقت آنے میں ایک سال لگ گیا۔





آسیب

ایس امتیاز احمد - کراچی

ہر طرف دلوں کو ہولاتا سناٹا طاری تھا کہ اتنے میں ایک بھیانک اور ڈرائونی آواز سنائی دی، اس آواز کو سنتے ہی بگھی میں جتا گھوڑا بے قابو ہو کر سرپٹ بھاگا اور پھر موت سے ہمکنار ہوگیا کہ اتنے میں......

گھٹاٹوپ اندھیرے میں جنم لینے والی اپنی نوعیت کی دلخراش اور دل فگار انوکھی کہانی

وہ ایک چھوٹا سا قصبہ تھا، قصبے کی مختصر آبادی میں مائیکل ڈوئیل واحد شخص تھا جوتو ہم پرست نہیں تھا۔ وہ مضبوط قوت ارادی کا مالک تھا، لیکن اس کی بیوی سارہ نہ صرف پرلے درجے کی توہم پرست تھی بلکہ کمزور دل بھی تھی۔

اس وقت ڈاکٹر کارموڈی اندرونی کمرے میں سارہ کا معائنہ کر رہا تھا اور مائیکل باہر بیٹھا ہوا سوچ رہا تھا کہ اسے اس دائم المریض اور وہمی عورت سے کب نجات ملے گی اگر اس کا بس چلتا تو اسے کبھی کا ٹھکانے لگا چکا ہوتا، لیکن یہ کوئی ایسی آسان بات نہ تھی۔ اس چھوٹے سے قصبے میں قتل کرنے کا کوئی رواج نہیں تھا کم از کم مائیکل کے علم میں کوئی ایسا واقعہ نہیں تھا اس لئے قتل کی واردات خواہ کتنی ہی مہارت سے کیوں نہ کی جاتی پورے قصبے کو ہلا دینے کے لئے کافی تھی۔ ذرا سا بھی شبہ خطرے کا باعث بن سکتا تھا۔ سو وہ کوئی ایسی ترکیب سوچ رہا تھا جس سے سانپ بھی مرجائے اور لاٹھی بھی نہ ٹوٹے۔

''مائیکل......'' اس کے کانوں میں ڈاکٹر کی آواز آئی۔ ''اب تم اندر آسکتے ہو۔''

مائیکل چونک کر ڈاکٹر کی طرف مڑا جو دروازے میں کھڑا تھا۔

''سارہ کیسی ہے ڈاکٹر......؟'' اس نے پوچھا۔

''تمہاری بیوی کا دل بہت کمزور ہے مائیکل۔''

اندر جاتے ہوئے ڈاکٹر کارموڈی نے اسے بتایا۔

"اس کے اعصاب پر ایک نامعلوم سا خوف سوار ہے اسے مکمل آرام کی ضرورت ہے، تقریباً ایک ماہ تک اسے تنہا نہ چھوڑا جائے یہ بہت ضروری ہے۔"

"لیکن یہ کس طرح ہوسکتا ہے ڈاکٹر کہ میں ہر وقت گھر میں تو موجود نہیں رہ سکتا۔" مائیکل نے ڈاکٹر کو اپنی مجبوری بتائی۔

"تو پھر کچھ عرصے کے لئے اسے قصبے سے باہر کسی عزیز کے پاس بھیج دو۔" ڈاکٹر نے کہا۔ "میں اسے کچھ دوائیں دے رہا ہوں۔ انہیں پابندی سے استعمال کراتے رہو اور مریضہ کے آرام کا پورا خیال رکھو۔"

"کیا وہ بالکل ٹھیک ہوجائے گی؟" مائیکل نے ڈاکٹر سے اس طرح پوچھا کہ اس کی ذہنی کیفیت چہرے سے ظاہر ہوجائے۔

"امید تو ہے۔" ڈاکٹر نے مسکرا کر کہا۔ "آسیب کا خوف کوئی معنی نہیں رکھتا ہم جانتے ہیں کہ اس کا حقیقت سے کوئی تعلق نہیں ہے، میں نے تمہاری بیوی کو چیک کرلیا ہے، فکر کی ایسی کوئی بات نہیں ہے، سب ٹھیک ہوجائے گا۔ بس تمہاری بیوی کی راتیں آرام سے گزرنی چاہئیں اور اسے ایک لمحے کے لئے بھی تنہا نہ چھوڑا جائے۔ میں کل پھر اسے دیکھنے آؤں گا۔ اب تم اسے تھوڑی دیر کے لئے سونے دو۔"

ڈاکٹر کے جانے کے بعد مائیکل نے کمرے میں داخل ہوکر اپنی بیوی کو دیکھا وہ آرام سے سو رہی تھی۔ وہ واپس پہلے کمرے میں آگیا اور صبح کا اخبار از سرنو پڑھنے کی کوشش کرنے لگا لیکن وہ ایسا نہ کرسکا اس کے خیالات بدستور بھٹک رہے تھے اور وہ سارہ سے چھٹکارا پانے کی فکر میں الجھا ہوا تھا۔

کچھ عرصہ پہلے تک وہ ایک نارمل آدمی تھا اور اس کے ذہن میں کبھی ایسے مجرمانہ خیالات نے جنم نہیں لیا تھا۔ سارہ اس کے لئے ایک خدمت گزار بیوی تھی۔ سوائے اس کے کہ وہ ایک کچا عقیدہ رکھنے والی توہم پرست عورت تھی اس نے کبھی اسے کسی قسم کی تکلیف نہیں دی۔ لیکن اب کچھ عرصے سے کسی نامعلوم خوف کے زیر اثر رہنے لگی تھی۔ شاید اس کی وجہ یہ بھی تھی کہ مائیکل نے پہلے کی طرح اب اس میں دلچسپی لینی کم کردی تھی اور وہ بہت کم وقت گھر پر گزارتا تھا۔ اس کی وجہ دراصل مائیکل کے فارم میں کام کرنے والی نئی لڑکی مولی تھی۔

مولی بے حد شوخ اور دلیر لڑکی تھی اس کے اپنے قصبے کی عام عورتوں سے بے حد مختلف اور جو کہ اب مائیکل کے لئے بیوی سے چھٹکارہ پانے کی خواہش کا اصل سبب بن گئی تھی۔ اس نے مائیکل کی پیش قدمی کا جواب بڑے بھرپور طریقے سے دیا تھا۔ اس وقت بھی وہ بیوی کی بیماری کے تصور کے ساتھ مولی کی گہری سیاہ آنکھوں اور سرخ ہونٹوں کے خیالوں میں کھویا ہوا تھا۔

مولی اس قصبے میں ایک ماہ پیشتر آئی تھی۔

لیکن وہ دونوں پہلے ہی ہفتے میں ایک دوسرے کے بے حد قریب آگئے تھے۔ مولی اور سارہ میں اتنا ہی فرق تھا کہ جتنا کسی مرجھائے ہوئے پھول اور نئی کھلنے والی کلی میں ہوتا ہے۔

مائیکل مولی سے قصبے کے پل کی پشت پر ملا کرتا تھا جو ایک ویران جگہ تھی۔ اس لئے ابھی تک قصبے والوں کو ان کی ملاقاتوں کا علم نہیں ہوا تھا۔

رات کے دس بج چکے تھے لیکن مائیکل کی آنکھوں میں نیند نہیں تھی، وہ ایک کوچ پر سر جھکائے بیٹھا تھا اور مسلسل سارہ کی موت کے امکانات کے بارے میں سوچ رہا تھا ان دنوں وہ ذہنی طور پر خاصا پریشان تھا، کیونکہ ڈاکٹر نے ایک بار پھر اسے تنبیہ کی تھی کہ اگر وہ اپنی بیوی کو صحت یاب دیکھنا چاہتا ہے تو اسے نہ صرف ایک ماہ تک مکمل آرام دینا ہوگا بلکہ اس کے لئے مختلف تفریحات کا بھی خیال رکھنا ہوگا پھر اسے ڈاکٹر کا یہ مشورہ یاد آیا کہ اگر ممکن ہوسکے تو وہ اپنی بیوی کو ایک ماہ کے لئے قصبے سے باہر بھیج دے کیونکہ یہاں کا ماحول اور تنہائی اس کے لئے نقصان دہ تھے۔ "اس کا ذہن اور دل اتنے کمزور ہوچکے ہیں کہ وہ ایک معمولی سا جھٹکا یا صدمہ برداشت نہیں کرسکے گی۔" اب مائیکل کی ساری سوچ اس بات پر مرکوز ہوگئی تھی کہ وہ سارہ کو قصبے سے باہر کیسے اور کس کے پاس بھیجے۔!

ایک رات جبکہ مائیکل کی پڑوسن لٹی، سارہ کے پاس موجود تھی اور اسے کھانا کھلا رہی تھی مائیکل اپنے فارم میں کام پر جانے کے لئے نکل کھڑا ہوا۔ ان دنوں اس کی غیر موجودگی

میں اس کے پڑوسی ہی سارہ کا خیال رکھتے تھے۔ گھر سے نکلتے ہوئے بھی اس کے ذہن میں سارہ کی موت کا خیال گردش کرتا رہا تھا، وہ اپنے فارم کے بجائے سیدھا ہال کی طرف بڑھتا چلا گیا۔ جس کی پشت پر، وہ اور مولی ملا کرتے تھے اور جس سے اس نے آج بھی ملاقات کا وقت طے کر رکھا تھا۔

چاروں سو گہرا اندھیرا چھایا ہوا تھا۔ جیسے جیسے وہ ہل کے نزدیک ہوتا جا رہا تھا اس کی بے چینی بڑھ رہی تھی، اس نے ہل کی عقبی دیوار کا نکڑ عبور کیا ہی تھا کہ دو خوب صورت بانہیں اس کے گلے میں حمائل ہوگئیں۔ ایک لمحے وہ چونکا پھر بے اختیار ہنس پڑا۔ وہ مولی تھی۔

"کیا وہ مر گئی؟ اس نے اپنی گہری سیاہ آنکھوں سے اس کے چہرے کا جائزہ لیتے ہوئے کہا۔

مائیکل ایک جھٹکے کے ساتھ اس سے علیحدہ ہوگیا۔

"ایسا مت کہو!"

"کیوں؟" مولی کے سرخ ہونٹ اس کے چہرے کے نزدیک پہنچ گئے، وہ کہہ رہی تھی۔ "کیا یہ تمہارے لئے ایک اچھی خبر نہ ہوگی!"

"نہیں، ایسا نہیں ہے۔" وہ جیسے چیخ اٹھا۔

"ٹھیک ہے مائیکل۔" مولی نے ناراض ہو کر کہا۔ "اب تم مجھ سے نہیں ملو گے۔"

"پلیز مولی۔" مائیکل نے سنجیدہ ہوتے ہوئے کہا۔ "میں اس موضوع پر کوئی بات نہیں کرنا چاہتا۔ آخر سارہ میری بیوی ہے۔"

مولی نے جو اس سے دور ہوگئی تھی ایک بار پھر اپنے بازو اس کے گلے میں ڈال دیئے اور اپنے ہونٹ اس کے کانوں کے قریب لا کر سرگوشی کے انداز میں بولی۔

"سچ بتاؤ مائیکل، کیا تم اپنی بیوی کی موت کے خواہش مند نہیں ہو۔"

"یہ بات نہیں ہے مولی۔" اس نے ہکلاتے ہوئے کہا۔

مولی کے سنہرے بال اس کے چہرے پر بکھر گئے تھے۔ اور اس کی گہری سیاہ آنکھیں اندھیرے میں روشن ستاروں کی طرح جگمگا رہی تھیں۔

"مجھے یقین نہیں ہے مائیکل کہ تم سچ بول رہے ہو۔"

مولی کے بازو کسی شیطانی شکنجے کی طرح اس کے گرد کس گئے تھے، مائیکل کو یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے مولی کی سیاہ آنکھیں اس کے اندر دیکھ رہی ہوں۔ وہ مولی سے محبت کرتا تھا اس کے حسن سے متاثر تھا، لیکن اس کے باوجود وہ نہیں چاہتا تھا کہ اس کے مجرمانہ خیالات کا علم مولی کو ہو۔

اگلی صبح فارم سے واپس جاتے ہوئے اسے ڈاکٹر کار موڈی کی بگھی ملی۔ اور ڈاکٹر نے مائیکل کو اپنے ساتھ بیٹھا لیا تا کہ اسے راستے میں اس کے گھر اتار جائے۔

"تمہاری بیوی صحت یاب ہو رہی ہے۔" ڈاکٹر نے بات شروع کی۔

یہ سنتے ہی مائیکل کا دل بیٹھ گیا۔

ڈاکٹر کہہ رہا تھا۔ "اس کے باوجود اگر تم میرے مشورے پر عمل کر لیتے تو تمہیں زیادہ تکلیف نہ ہوتی۔ یہاں کے لوگ بے حد توہم پرست ہیں۔ اگر وہ کچھ عرصے کے لئے ان کے درمیان سے نکل جاتی تو بہتر تھا۔"

ڈاکٹر کارموڈی نے مائیکل کو اس کے گھر کے سامنے اتارا اور آگے بڑھ گیا، مائیکل کتنی ہی دیر اس جگہ کھڑا بگھی کے پیچھے اڑتی گرد کو دیکھتا رہا۔ اب وہ سوچ رہا تھا کہ سارہ کو صحت یاب ہونے سے کیسے روکا جا سکتا ہے، وہ مولی کو حاصل کرنے کے لئے دیوانہ ہو رہا تھا اور سارہ کی زندگی اس کے اور مولی کے درمیان حائل تھی۔ یہ سب کچھ اس کی برداشت سے باہر ہوتا جا رہا تھا۔ پھر جب وہ گھر میں داخل ہوا تو ایک فیصلہ کر چکا تھا۔

مائیکل اندر آیا تو اس نے دیکھا کہ پڑوسن للی سارہ کو سوپ پلا رہی ہے۔ تمام دن مائیکل خاصا پریشان رہا، دراصل وہ اپنے فیصلے کی تفصیلات پر غور کر رہا تھا۔ شام کو جب وہ مولی سے ملا تو اس کی پریشانی اس کی گہری اور تیز نظروں سے پوشیدہ نہ رہ سکی۔

"مجھے بتاؤ مائیکل کہ تمہاری پریشانی کی اصل وجہ کیا ہے؟"

مولی نے اپنا شاداب جسم مائیکل کے سپرد کرتے ہوئے پوچھا۔

سرے پر موجود ہوگی۔" مائیکل نے مولی کے چہرے پر نظریں جماتے ہوئے کہا۔ "جیسے ہی تمہیں گھوڑے کی ٹاپوں کی آواز سنائی دے تم قبروں کے پیچھے سے نکل کر سامنے آجانا۔ سارہ یقیناً تمہیں دیکھ لے گی، تب تم اپنے حلق سے عجیب وغریب آوازیں نکال کر چیخنا چلانا شروع کردینا۔ یقیناً وہ یہ اچانک صدمہ برداشت نہیں کرسکے گی اور......"

"واہ......" مولی نے خوشی کے اظہار کے طور پر مائیکل کو اپنے بازوؤں میں بھینچ کر اس کے ہونٹوں پر مہر لگادی۔

ایک ماہ کے درمیانی عرصے میں مولی اور مائیکل ہر رات مل کے پیچھے اپنے مخصوص مقام پر باقاعدگی سے ملتے رہے اور سارہ سے چھٹکارا پانے کے منصوبے کو پختہ کرنے اور اسے عملی شکل دینے کا پروگرام بناتے رہے۔

ایک ماہ بعد مائیکل سارہ کو لینے ڈکنن چلا گیا۔ جس روز اسے واپس لوٹنا تھا مولی نے اسی شام ہی اپنے ڈرامے کی تیاری شروع کردی۔

رات کی تاریکی میں قبروں کے درمیان ایک بھوت کی شکل اختیار کرتے ہوئے اسے بالکل خوف محسوس نہیں ہوا۔ کیونکہ وہ جانتی تھی کہ بھوت پریت محض وہمی لوگوں کے ذہن کی اختراع ہیں ورنہ درحقیقت دنیا میں ان کا کوئی وجود نہیں اور مردہ لوگ کسی کو نقصان نہیں پہنچا سکتے۔ یہ اس کا ایمان تھا۔

سڑک کے نزدیک ہی ایک اونچی قبر تھی جس کے پیچھے مولی چھپی ہوئی سارہ اور مائیکل کا انتظار کررہی تھی۔

رات کا اندھیرا بڑھتا جارہا تھا۔ ہیبت ناک سناٹے میں کیڑے مکوڑوں کے سوا اور کسی ذی روح کی آواز سنائی نہیں دے رہی تھی۔

ایسے میں دور سے گھوڑے کی ٹاپوں کی مدھم آواز نے مولی کو خبردار کردیا۔ اس نے اپنے ساتھ لائے ہوئے سامان کا جائزہ لیا۔ یہ ایک اونچا سیاہ ہیٹ تھا جو اس نے سر پر پہن کر ایک بڑا سا کالا لبادہ اوڑھ لیا۔ اب وہ رات کی تاریکی میں کسی طویل القامت ڈراؤنے بھوت کا ہیولہ معلوم ہورہی تھی۔

جیسے ہی گھوڑے کی ٹاپوں کی آواز نزدیک آئی تو مولی قبر کے پیچھے سے نکل کر اچھلتی کودتی سڑک پر آگئی، وقفے وقفے سے اس کے حلق سے وحشت ناک چیخیں بھی بلند ہورہی تھیں۔

بگھی کا گھوڑا اسے دیکھتے ہی خوف زدہ انداز میں ہنہنایا اور پھر یکایک بدک کر ایک طرف دوڑ پڑا۔

مولی نے اپنا ہولناک کھیل جاری رکھا اسے گھوڑے کی ہنہناہٹ کے ساتھ بگھی کے اندر سے کچھ آوازیں بھی سنائی دیں لیکن وہ اس ڈرامے کو کامیاب انجام سے ہمکنار کرنے کے جوش میں یہ بھی نہ دیکھ سکی کہ بگھی سڑک سے نیچے اتر گئی اور بدحواس گھوڑا اسے گہرے کھڈ کی طرف کھینچے لے جارہا تھا۔

دوسری صبح قصبے میں کہرام مچ گیا تھا۔ پورا قصبہ اس جگہ امڈ آیا تھا، لوگوں میں شامل ڈاکٹر کارموڈی بھی تھا۔

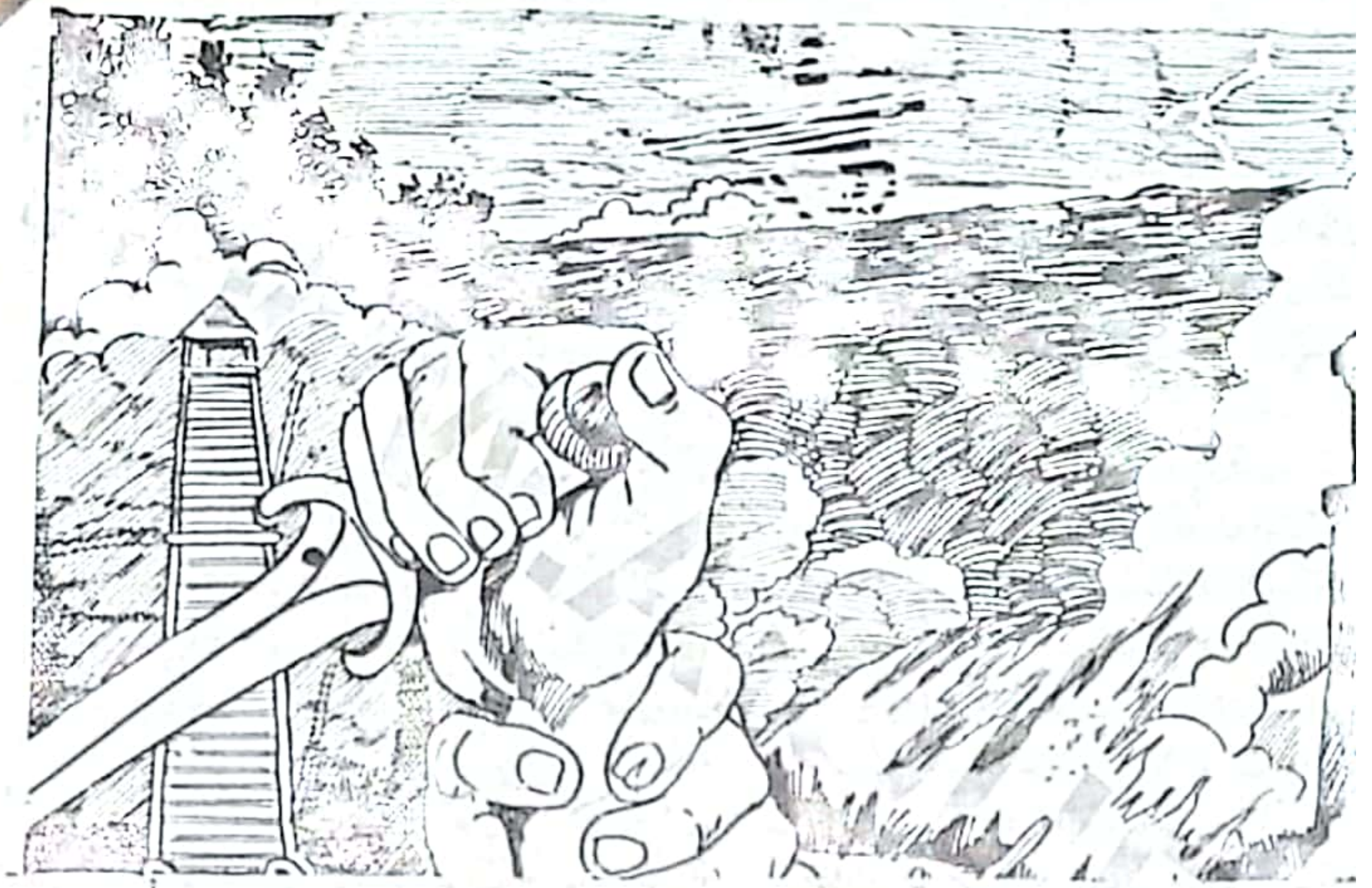
"لاش کی حالت بہت خراب ہے اور مائیکل کا چہرہ بری طرح مسخ ہوچکا ہے۔" کارموڈی نے افسوس کے ساتھ کہا۔

"میری سمجھ میں نہیں آتا کہ گھوڑا آخر مائیکل کے ہاتھوں بے قابو کیسے ہوگیا؟"

"آپ لوگ مانیں یا نہ مانیں لیکن یہ حقیقت ہے کہ ہمارے قصبے کے آسیب نے مائیکل کی جان لے لی ہے۔" سیاہ کپڑوں میں ملبوس مائیکل کی بیوہ سارہ نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔

"وہ کبھی آسیب کو نہیں مانتا تھا۔ کاش کہ مجھے ایملی نے مزید کچھ دن کے لئے اپنے گھر میں روک لیا ہوتا۔ یقیناً میں اسے آگے بڑھنے سے روک دیتی۔" سارہ اپنے آنسو پونچھنے کے لئے رکی۔ پھر کہنے لگی۔ "مجھے یقین ہے کہ وہ اسے دیکھ کر خوف زدہ نہیں ہوا ہوگا کیونکہ وہ آسیب کو نہیں مانتا تھا لیکن کیا آپ سمجھتے ہیں کہ جانور بھی اس کا ہم خیال ہوگا! یقیناً گھوڑا "آسیب" کو دیکھ کر بدک گیا ہوگا ورنہ میں جانتی ہوں کہ ٹاکی مائیکل کا پالتو گھوڑا تھا اور وہ کبھی اس کے ہاتھوں سے بے قابو نہیں ہوسکتا تھا۔





آسیبی آئی لینڈ

ایس امتیاز احمد۔ کراچی

خود اپنے دام میں صیاد آگیا اسی کے مصداق خود شکنجہ تھامے خونی شکاری آگے ہی آگے بڑھتا رہا اور جب شکار کی نظر اس پر پڑی تو وہ مبہوت ہو کر رہ گیا مگر اچانک وقت پلٹا اور شکاری خود شکار ہوگیا۔

قدم قدم پر لرزہ براندام کرتی موت کی دستک نے جسم وجاں کو ساکت کردیا، خونی کہانی

"ھاں! اس جزیرے پر کوئی بھی جہاز جا کر واپس نہیں آیا۔"

"سامنے دور دائیں طرف کہیں وہ جزیرہ ہے۔" ڈنی نے کہا۔ "جو قدیم نقشوں پر شپ ٹریپ آئی لینڈ" (جہاز پھانسنے والا جزیرہ) کے نام سے موسوم ہے۔ اس جزیرے سے ملاح عجیب قسم کا خوف کھاتے ہیں جو غالباً کسی توہم کا نتیجہ ہے۔"

رات کی گرم اور بھیگی ہوئی دبیز چادر سے جھانک کر دیکھنے کی کوشش کرتے ہوئے رینز فورڈ بولا۔

"نظر تو نہیں آرہا!"

"ہم جب چند روز میں برازیل پہنچ جائیں گے۔" ڈنی نے کہا۔ "تو روشنی کافی ہوگی اور ہم دریائے ایمیران کے اوپر والے حصے میں خوب شکار کھیلیں گے۔ شکار کیسا عظیم کھیل ہے۔"

کچھ دیر بعد رینز فورڈ کا ساتھی سونے کے لئے کشتی کے نچلے حصے میں چلا گیا مگر رینز فورڈ اپنا پائپ پینے کے لئے عرشے پر ہی ٹھہر گیا۔ جونہی اس نے کش لگایا اچانک ایک آواز نے اسے چونکا دیا۔ یہی آواز دو مرتبہ اور آئی۔ دور کہیں تاریکی میں کسی نے تین مرتبہ بندوق کے فائر کئے تھے۔

آواز کی سمت اس نے آنکھوں پر زور ڈال کر دیکھنے کی کوشش کی مگر یہ بالکل اسی طرح تھا جیسے کوئی کمبل میں سے دوسری جانب دیکھنے کی کوشش کرے چنانچہ رینز فورڈ چھلانگ لگا کر جنگلے پر چڑھنے لگا تا کہ اونچی جگہ سے وہ اس سمت دیکھ سکے جدھر سے بندوق کے فائر کی آواز آئی تھی۔ مگر اس کا پائپ رسے سے ٹکرا کر نیچے گر گیا۔ اسے پکڑنے کے لئے وہ جھپٹا تو توازن کھو بیٹھا اور نیچے گرم شرق الہند کے سمندر میں جا گرا، گہرائی سے فوراً سطح پر آ کر اس نے بہت زور سے پکارا مگر بے سود، شدید مایوسی کے عالم میں اس نے کشتی کے پیچھے بھاگتی ہوئی روشنیوں کا تعاقب شروع کر دیا۔ لیکن بدقسمتی سے وہ جلد ہی رات کی تاریک میں غائب ہو گئیں۔ بندوق کے فائر کی آواز چونکہ دائیں طرف سے آئی تھی، اس لئے رینز فورڈ نے مضبوط ارادے سے اسی سمت تیرنا شروع کر دیا جو بظاہر ایک نہ ختم ہونے والا سفر تھا مگر اسی دوران رات کی تاریکی میں اس نے کسی خوف زدہ جانور کی چیخ سنی جو پستول کے مسلسل اور کڑا کے دار فائر میں دب کر رہ گئی۔ ان آدمیوں پر نگاہ پڑنے سے پیشتر وہ چٹانوں پر پہنچ چکا تھا۔ اپنی بچی کھچی قوت سے اس نے اپنے آپ کو پانی کے گرداب سے باہر کھینچ لیا اور ہانپتے ہوئے خود کو نیچے گرا دیا۔ لیکن تھکن کی وجہ سے وہ فوراً ہی خواب کی دنیا میں پہنچ گیا۔

جب اس کی آنکھ کھلی تو جھٹپٹے کا عمل شروع ہو چکا تھا۔ اسے سمندر کے کنارے سے اوپر کی طرف جنگل میں جانے والا کوئی راستہ نظر نہ آیا۔ لہٰذا آسان یہی تھا کہ کنارے کے ساتھ ساتھ چلا جائے۔ اس سے قبل کہ آگے نکل جاتا، رینز فورڈ کو سامنے اونچی کھڑی چٹان پر ایک بڑے مکان کی روشنیاں نظر آئیں، اندھیرے نے سمندر اور جنگل کو اپنی لپیٹ میں لینا شروع کر دیا۔ اس نے مکان کی پتھر کی سیڑھیاں عبور کیں تو وردی میں ملبوس ایک ہٹے کٹے آدمی نے دروازہ کھولا جس کی سیاہ داڑھی اس کی ناک نیچے تک لٹک رہی تھی اور اس کے ایک ہاتھ میں ریوالور تھا۔

''خوف زدہ ہونے کی ضرورت نہیں۔'' رینز فورڈ نے کہا۔ ''میں ایک کشتی سے گر پڑا تھا۔ میرا نام سینگر رینز فورڈ ہے۔ اور میں نیویارک کا رہنے والا ہوں۔''

اسی دوران شام کے لباس میں ملبوس ایک دراز قد اور سفید بالوں والا آدمی وہاں آ پہنچا اور رینز فورڈ کے ساتھ مصافحہ کرتے ہوئے بولا۔ ''میرا نام جنرل زیراف ہے اور مجھے مسٹر سینگر رینز فورڈ جیسے نامی گرامی شکاری کا خیر مقدم کرتے ہوئے بہت خوشی حاصل ہو رہی ہے۔ میں نے شکار پر آپ کی وہ کتاب پڑھی ہے جس کے اندر تبت میں برفانی تیندوے کے شکار کا ذکر ہے۔''

پھر اس نے کچھ اشارہ کیا اور باوردی آدمی نے اپنا ریوالور رکھ دیا۔ ''آئی ون ناقابل یقین حد تک مضبوط آدمی ہے۔'' جنرل بولا مگر تھوڑا سا وحشی ہے۔ یہ بھی قزاق ہے اور میں بھی قزاق ہوں۔''

''لیکن چلئے ہم یہاں باتیں نہیں کریں گے۔ آپ کو کپڑوں، کھانے اور آرام کی ضرورت ہے اب براہ کرم مسٹر رینز فورڈ آپ آئی ون کے ساتھ چلیں۔''

جب وہ مکان کے پروقار ہال میں رات کے کھانے پر بیٹھے تو جنرل نے کہا۔ ''آپ یہ سن کر شاید حیران ہوں گے کہ میں نے آپ کا نام کیسے جانا۔ میں شکار کے موضوع پر تمام کتابیں پڑھتا رہتا ہوں اور میری زندگی کا واحد شوق شکار ہے۔''

دیواروں پر نظر دوڑاتے ہوئے رینز فورڈ نے کہا۔ ''آپ کے پاس یہاں جانوروں کے کچھ عمدہ سر موجود ہیں۔ وہ افریقی بھینسا بہت بڑا ہے۔ میرا ہمیشہ سے یہی خیال ہے کہ بڑے جانوروں کے شکار میں

افریقی بھینسا سب سے زیادہ خطرناک ہوتا ہے۔''
''نہیں ایسا نہیں ہے۔'' جنرل نے جواب دیا۔''یہاں میں اپنی شکارگاہ میں زیادہ خطرناک شکار مارتا ہوں۔ قدرتی طور پر یہ شکار یقیناً یہاں نہیں ہے۔ مجھے اس جزیرے پر یہ شکار جمع کرنا پڑتا ہے۔''
''جنرل آپ نے کیا درآمد کیا ہے؟''
''شیر......'' جنرل نے مسکرا کر کہا۔ ''اب شیروں میں کوئی سنسنی باقی نہیں رہی۔ یہ کوئی حقیقی خطرہ نہیں۔ میں تو خطرات کا مقابلہ کرنے کے لئے زندہ ہوں۔ مسٹر رینز فورڈ۔''
''پھر وہ کون سا شکار ہے؟''
''میں آپ کو بتاؤں گا۔ مجھے بالآخر یہ خیال آیا تھا کہ اپنے شکار کے لئے ایک نیا جانور دریافت کرنا چاہئے۔ چنانچہ میں نے اپنے آپ سے پوچھا کہ ایک مثالی شکار میں کیا وصف ہونے چاہئے۔ تو جواب ملا کہ اس میں حوصلہ، مکاری اور سب سے بڑھ کر یہ کہ استدلال کی قابلیت ہونی چاہے۔ خوش قسمتی سے ایسا ایک ہی جانور ہے جو دلائل دے سکتا ہے۔''
''لیکن آپ کا مطلب اس سے...... تو نہیں کیوں کہ جس کا آپ ذکر کررہے ہیں وہ تو قتل ہے شکار نہیں۔''
''اف، کتنا خراب لفظ آپ نے استعمال کیا ہے۔ میں تو صرف دھرتی کی میل کا شکار کرتا ہوں یعنی آوارہ گرد جہازوں کے ملاح۔ ادھر کھڑکی کی طرف آؤ۔''
جونہی اس نے ایک بٹن دبایا، سمندر میں دور تک روشنیاں چمک اٹھیں۔''یہ روشنیاں ایک ایسی رودبار کی نشاندہی کررہی ہیں۔'' جنرل بولا۔'' جہاں صرف استرے کی طرح تیز کناروں والی چٹانیں ہیں جو ایک جہاز کو اخروٹ کی طرح توڑ کر رکھ دیتی ہیں۔ یہ ایک کھیل ہے۔ آیا آپ کے دھیان میں؟ پھر میں اپنے مہمانوں میں سے کسی شکار کا جھانسہ دے کر ساتھ لے جاتا ہوں۔ میں اسے تین دن کی مہلت دیتا ہوں۔ پھر میں اعشاریہ بائیس کے پستول سے لیس ہو کر اسے تلاش کرتا ہوں۔ اگر میرا شکار مجھے پورے تین روز تک جل دینے میں کامیاب ہو جائے تو وہ جیت جاتا ہے اور اگر میں اسے ڈھونڈ نکالوں۔'' جنرل نے مسکرا کر کہا ۔''تو وہ ہار جاتا ہے۔''
''فرض کریں آپ کا شکار، شکار ہونے سے انکار کردے تو۔''
''تو پھر میں اسے آئی ون کے حوالے کردیتا ہوں۔ یہ شخص ایک سادہ لوح آدمی ہے جو وائٹ زار اعظم کا کوڑے باز بھی رہ چکا ہے۔ اور اس کے شکار کھیلنے کے اپنے طریقے ہیں۔ مگر عموماً میرے مہمان شکار بننے کو ترجیح دیا کرتے ہیں۔''
''اگر وہ جیت جائیں تو؟''
اس پر جنرل کھل کر مسکرایا اور کہنے لگا۔''آج تک تو میں نہیں ہارا۔ ہاں، البتہ ایک آدمی قریب قریب جیت گیا تھا اور آخرکار مجھے اس پر کتے چھوڑنے پڑے۔'' یہ کہہ کر وہ اسے دوسری کھڑکی کی طرف لے گیا اور کہا۔
''دیکھو۔''
کھڑکی سے نیچے رینز فورڈ کو درجن کے قریب بڑی بڑی کالی شکلیں حرکت کرتی ہوئی نظر آئیں۔
''اور اب میں آپ کو سروں کا ایک تازہ ذخیرہ دکھانا چاہتا ہوں۔ چلئے لائبریری میں چلیں، چلیں گے آپ؟''
''نہیں۔'' رینز فورڈ نے کہا۔
''ہوں میں سمجھا۔ آپ کو یقیناً رات بھر اچھی نیند لینی ہے۔ صبح آپ اپنے آپ کو بالکل تروتازہ محسوس کریں گے۔''
اگلی صبح دوپہر کے کھانے کے وقت تک جنرل زیراف نظر نہ آیا لیکن کھانے کے وقت رینز فورڈ نے دیکھا کہ اس کی تیز سیاہ آنکھیں اس پر جمی ہوئی ہیں۔
''آج رات'' جنرل نے کہا۔''ہم شکار کریں گے۔ تم اور میں۔''
''نہیں جنرل۔'' رینز فورڈ بولا۔''میں شکار نہیں کروں گا۔''

جنرل نے کندھے اچکاتے ہوئے کہا۔ ''جیسے آپ کی مرضی لیکن میں یہ ضرور کہوں گا کہ میرا شکار کھیلنے کا طریقہ آئی ون کے طریقے سے زیادہ دلچسپ ہے۔ آپ اس کھیل کو دلچسپ پائیں گے کیوں کہ آپ کی سوچ، آپ کا جنگل کا تجربہ اور آپ کا حوصلہ میری سوچ تجربے اور حوصلے سے ٹکرائیں گے اور بے حد لطف آئے گا۔''

''اور اگر میں جیت جاؤں تو۔'' ریز فورڈ بولا۔

''اگر میں آپ کو تیسرے روز آدھی رات تک نہ ڈھونڈ سکوں تو میں اپنی شکست تسلیم کرلوں گا اور میری بادبانی کشتی آپ کو اس جزیرے سے باہر خشکی پر پہنچا آئے گی۔ یہ میرا آپ سے وعدہ ہے۔''

جنرل زیراف نے کاروباری انداز میں کہا۔ ''آئی ون آپ کو شکار کا لباس، کھانا اور ایک چاقو دے دے گا۔ میں آپ کو مشورہ دوں گا کہ آپ جزیرے کے جنوب مشرقی کونے کے دلدلی حصے سے بچ کر رہیں۔ ہم اسے موت کا کنواں کہتے ہیں۔ کیوں کہ یہاں ایک خوف ناک دلدل موجود ہے۔ میں اندھیرا ہونے تک آپ کا تعاقب نہیں کروں گا۔ آپ کا اپنا کیا خیال ہے۔''

☆......☆......☆

جلد ہی ظاہر ہونے والے خطرے کے پیش نظر ریز فورڈ کوئی دو گھنٹے تک جنگل کی جھاڑیوں میں سے راستہ بناتا ہوا دوڑتا رہا۔ خوف دہراس نے اس کے لئے چبھتی ہوئی برچھیوں کا کام کیا۔ اب اس نے رک کر اپنا جائزہ لیا۔

اس نے سوچا کہ اس طرح اندھا دھند سیدھ میں میرا چلنا اسے میرے راستے پر ڈال دے گا۔ اس موقع پر اسے لومڑی کے شکار کے قصے یاد آئے کہ کس طرح لومڑی شکار میں حیلوں اور داؤ پیچ سے کام لیا کرتی ہے۔ چنانچہ اس نے بھی کئی پیچ در پیچ چکر اور زاویے بنائے اور قدموں کے نشانات کو غارت کرنے کے لئے آگے چلتا ہوا انہیں قدموں پر واپس ہوکر دوبارہ آگے چلتا رہا۔

اس نے یہ عمل کئی بار دہرایا۔ اب اندھیرا چھا گیا تھا اور وہ تھکا ماندہ پہاڑیوں کے ایک ایسے سلسلے پر پہنچ گیا جو جنگلات سے ڈھکا ہوا تھا۔ اس نے سوچا لومڑی والے حیلے تو میں کر چکا ہوں اب بلی والا عمل اختیار کرنا چاہئے۔ نزدیک ہی ایک بڑا درخت تھا جس کی موٹی موٹی شاخیں اردگرد پھیلی ہوئی تھیں اس بات کا خیال رکھتے ہوئے کہ اس کے قدموں کا کوئی نشان باقی نہ رہے وہ درخت پر چڑھ گیا اور اس کی چوڑی شاخ پر لیٹ گیا۔

اب رات آہستہ آہستہ اپنا سیاہ خیمہ پھیلا رہی تھی۔ اس نے کسی شے کو احتیاط سے آہستہ آہستہ جھاڑیوں میں سے آتے سنا۔ وہ شاخ کے ساتھ شاخ ہوکر لیٹ گیا اور گھنے پتوں کی چادر میں سے جھاڑیوں کی طرف دیکھنے لگا۔ یہ جنرل زیراف ہی تھا۔ وہ راستہ طے کرتا ہوا آرہا تھا مگر اس کی آنکھیں زمین پر لگی ہوئی تھیں چلتے چلتے وہ قریب قریب درخت کے نیچے ہی آرکا اور رکوع کی حالت میں ہوکر زمین کا جائزہ لینے لگا پھر تن کر کھڑا ہوگیا اور ایک لمبا سیاہ رنگ کا سگریٹ سلگانے لگا۔

ریز فورڈ نے جب دیکھا کہ جنرل کی آنکھیں درخت کے نیچے سے اوپر تک ایک ایک انچ کا جائزہ لے رہی ہیں تو اس نے اپنی سانس روک لی۔ مگر شکاری کی آنکھیں اس شاخ تک پہنچنے سے پہلے ہی رک گئیں جس پر شکار موجود تھا۔ دیدہ دانستہ طور پر جنرل زیراف مسکرایا اور دھوئیں کا ایک حلقہ ہوا میں چھوڑ کر بے پرواہی سے آگے چل دیا۔

ریز فورڈ نے اب اپنی رکی ہوئی سانس چھوڑی۔ اسے پہلا خیال یہ آیا کہ جنگل میں رات کے وقت جنرل صاف طور پر مشکل کھوج لگا سکتا تھا۔ یہ تو محض اتفاق ہے کہ وہ اپنے شکار کو نہ دیکھ سکا تھا۔

اس کے بعد اسے دوسرا خیال یہ آیا کہ جنرل مسکرایا کیوں تھا، اور واپس کیوں چلا گیا۔ درحقیقت جنرل اس کے ساتھ بلی چوہے والا کھیل کھیل رہا تھا، اور اسے دوسرے روز شکار کرنے کے لئے چھوڑ دیا تھا۔

ریز فورڈ کو اس خیال کے آتے ہی خوف اور دہشت کی حقیقت معلوم ہوئی۔ چنانچہ وہ درخت سے اتر پڑا اور جنگل میں روانہ ہوگیا۔

کوئی تین سو گز کے فاصلے پر وہ ایک ایسی جگہ رکا جہاں ایک بڑا سوکھا ہوا درخت ایک چھوٹے درخت پر خطرناک صورت میں جھکا ہوا تھا۔ ریز فورڈ نے نیام سے چاقو نکالا اور اپنا کام شروع کردیا۔ جب کام ختم ہوگیا تو وہ خود کوئی ایک سو فٹ دور نیچے پڑی ہوئی گیلی کے پیچھے لیٹ گیا۔ اسے زیادہ دیر انتظار نہ کرنا پڑا یہ قزاق کھوج لگانے میں اتنا منہمک تھا کہ اس چیز کے عین اوپر پہنچ کر اسے پتا چلا۔ اس کا پاؤں باہر نکلی ہوئی شاخ سے ٹکرایا جو لبلبی کا کام کرتی تھی۔ جنرل کو فوراً خطرے کا احساس ہوا۔ وہ پیچھے کودا، لیکن وقت گزر چکا تھا۔ سوکھا ہوا درخت تڑاخ کی زوردار آواز کے ساتھ نیچے گرا اور جنرل پر ایک سرسری سی ضرب پڑی۔ وہ کھڑا ہوکر اپنے زخمی کندھے کو سہلاتا رہا اور پھر اس کی مصنوعی قہقہے کی گونج جنگل میں سنائی دی۔

اس نے زور سے پکارا۔ ''ریز فورڈ، میں آپ کو مبارکباد پیش کرتا ہوں۔ ملیشیاء کے آدمی کو گرفتار کرنے والا یہ پھندا جو آپ نے میرے لئے بنایا ہے ہر آدمی کے بس کا روگ نہیں۔ مسٹر ریز فورڈ آپ بہت دلچسپ آدمی ثابت ہورہے ہیں۔ میں اب اپنے زخم پر پٹی کرنے جارہا ہوں۔ زخم معمولی سا ہے آپ فکر نہ کریں، میں واپس آؤں گا۔''

جب جنرل چلا گیا تو ریز فورڈ وہاں سے بھاگ نکلا۔ چلتے چلتے شام کا دھندلکا پھیلنے لگا اور پھر اندھیرا چھا گیا۔ اس کے پاؤں اب پہلے سے زیادہ نرم زمین پر پڑنے لگے۔ اس نے آگے قدم بڑھایا تو اس کا پاؤں کیچڑ میں دھنس گیا۔ ریز فورڈ فوراً سمجھ گیا کہ یہ دلدل موت کا کنواں ہے۔

زمین کی نرمی سے اس کے ذہن میں ایک خیال ابھرا۔ دلدل سے کوئی بارہ فٹ پیچھے ہٹ کر اس نے گڑھا کھودنا شروع کردیا۔ جب گڑھا اس کے کندھوں سے اوپر تک تیار ہوگیا تو وہ اس میں سے باہر آگیا اور سخت سخت پودے کاٹ کر ان سے تیز نوکدار میخیں تیار کرلیں جو اس نے گڑھے کے اندر اس طرح گاڑ دیں کہ ان کی نوکیں سنگینوں کی طرح اوپر کی جانب تھیں۔ پھر اس نے نرم نرم بیلوں، شاخوں اور پتوں وغیرہ سے ایک چٹائی تیار کرلی اور اس سے گڑھے کا منہ ڈھانپ دیا۔ سخت مشقت نے اسے پسینے سے شرابور کردیا مگر اس نے ہمت نہیں ہاری اور برابر کام کرتا رہا۔ یہ کام مکمل کرکے وہ رینگتا ہوا ایک درخت کے پیچھے جا چھپا۔

اتنے میں اسے نرم نرم زمین پر تھپ تھپ کی آواز سنائی دی اور وہ سمجھ گیا کہ اس کا تعاقب کرنے والا آرہا ہے۔ کچھ دیر بعد اسے چٹائی کے چٹخنے کی آواز سنائی دی اور ساتھ ہی درد سے چیخنے کی آواز آئی کیوں کہ نوکدار میخیں گرنے والے کے جسم میں داخل ہوچکی تھیں۔ اس نے دیکھا تو گڑھے سے تین فٹ کے فاصلے پر ایک آدمی ٹارچ لئے کھڑا تھا۔

جنرل نے گرج کر کہا۔ ''ریز فورڈ آپ کے بری شیر کے گڑھے نے میرے بہترین کتوں میں سے ایک کو موت کی نیند سلادیا ہے آپ نے دوبارہ میدان مار لیا ہے۔ مگر اب میں دیکھوں گا کہ آپ میرے کتوں کے پورے غول کا مقابلہ کس طرح کرتے ہیں اس دلچسپ ترین شام کے لئے بہرحال میں آپ کا شکرگزار ہوں۔''

ریز فورڈ دلدلی حصے کے قریب ہی سوگیا تھا۔ طلوع آفتاب کے وقت اسے دور کی کسی ایسی آواز نے جگادیا جو مدھم اور تھرتھراہٹ والی تھی۔ یہ آواز شکاری کتوں کے بھونکنے کی تھی۔ ان حالات میں ریز فورڈ سوچنے پر مجبور ہوگیا۔ اسے اچانک ہی یوگنڈا والی ایک چال کا خیال آیا جو اس نے سیکھ رکھی تھی۔ وہ دلدلی حصے سے ہٹ گیا اور جلد ہی اسے ایک ایسا پودا نظر آگیا جو جھکنے کے بعد اسپرنگ کی طرح واپس اپنی اصلی حالت پر جاسکتا تھا۔ اس نے اپنا شکاری چاقو پودے

میں اس طرح باندھ دیا کہ اس کے پھل کی نوک پیچھے کی طرف مڑی ہوئی تھی۔ اب اس نے اس پودے کو پیچھے جھکا کر جنگلی انگور کی بیل سے باندھ دیا اور خود بھاگ کھڑا ہوا۔

اب جب کتوں کو تازہ بو ملی تو وہ تیز آواز میں مسلسل بھونکنے لگے۔ رینز فورڈ کو معلوم تھا کہ جب کوئی جانور گھر جائے تو اسے کیا محسوس ہوتا ہے۔ شکاری کتوں کا بھونکنا ایک دم بند ہوگیا اور رینز فورڈ کا دل بھی بیٹھ گیا۔ ''ضرور وہ چاقو تک پہنچ گئے ہوں گے۔'' رینز فورڈ سوچنے لگا پھر جوش میں آکر اس نے ایک درخت پر چڑھ کر پیچھے کی طرف دیکھا۔ اس کا تعاقب کرنے والے رک گئے تھے۔ لیکن اسے یہ دیکھ کر امید پر پانی پھرتا نظر آیا کہ جنرل زیراف ہاتھ میں ریوالور تھامے اپنے پاؤں پر کھڑا ہے۔ دراصل پودے سے بندھا ہوا چاقو زیراف کی بجائے آئی ون کو لگا تھا جس نے ہاتھ میں زنجیر سے بندھے ہوئے کتے تھام رکھے تھے۔

رینز فورڈ بمشکل درخت سے اتر پایا تھا کہ شکاری کتوں کے غول نے تیز تیز اور زور زور سے بھونکنا شروع کردیا۔

عف عف کی زوردار آوازوں کے آگے آگے بھاگتے ہوئے اس کا سانس پھول گیا مگر وہ رکا نہیں۔ اچانک اسے سامنے درختوں میں سے نیلے رنگ کا ایک خلا نظر آیا۔ وہ سمندر تک پہنچ گیا اور ایک کھاڑی کے پار اسے بڑے مکان کا سلیٹی رنگ کا پتھر دکھائی دیا۔ جس مقام پر وہ تھا وہاں سے نیچے تقریباً بیس فٹ گہرائی میں سمندر کی لہریں گرج دار آواز کے ساتھ کنارے سے ٹکرا ٹکرا کر واپس ہورہی تھیں۔ رینز فورڈ قدرے ہچکچایا اور پھر فوراً سمندر میں چھلانگ لگادی۔

جب جنرل اور اس کے شکاری کتوں کا غول اس مقام پر پہنچا تو جنرل رک گیا اور کچھ دیر تک کھڑا وہ نیلے پانی کی وسعت کو غور سے دیکھتا رہا۔

اس شام رات کے کھانے پر وہ بدمزگی محسوس کرتا رہا۔ اسے دو اذیتیں کھائے جارہی تھیں ایک تو یہ کہ اس کے لئے اب آئی ون جیسا آدمی حاصل کرنا مشکل تھا اور دوسری یہ کہ اس کا شکار اس سے بچ نکلا تھا۔ ''یہ جان پر کھیلنے والا امریکن میرا شکار نہ بن سکا۔'' جنرل نے ہاتھ ملتے ہوئے کہا۔

اپنی طبیعت پر سے بوجھ دور کرنے کے لئے وہ اپنی لائبریری میں چلا گیا اور پڑھتا رہا۔ کوئی دس بجے کے قریب وہ سونے کے کمرے میں چلا گیا۔ روشنی کرنے سے پہلے وہ کھڑکی کی طرف لپکا اور نیچے صحن کو دیکھنے لگا۔ چاندنی میں کتوں کو دیکھتے ہوئے پکارا۔ ''فکر نہیں اگلی مرتبہ قسمت ہمارا ضرور ساتھ دے گی۔'' یہ کہہ کر اس نے کمرے میں روشنی کردی۔

جونہی کمرے میں روشنی ہوئی تو چھپر کھٹ کی مسہری میں سے ایک آدمی نکل کر جنرل کے سامنے آکھڑا ہوا۔

''اوہ رینز فورڈ، یہ تم ہو؟'' جنرل نے چلا کر کہا۔ ''تم یہاں کیسے آگئے؟''

''تیر کر۔'' رینز فورڈ نے کہا۔ ''جنگل میں سے چل کر آنے کی بجائے یہ طریقہ مجھے آسان لگا تھا۔''

جنرل کا سانس رک گیا اور اس نے خفت آمیز مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔ ''میں آپ کو مبارک باد دیتا ہوں۔ آپ نے یہ کھیل جیت لیا ہے۔''

رینز فورڈ بالکل نہیں مسکرایا۔ ''میں اب بھی گھرا ہوا ایک شکاری جانور ہوں، زیراف تیار ہوجاؤ۔'' رینز فورڈ نے بھاری آواز سے آہستہ لہجے میں کہا۔

جنرل کورنش بجالاتے ہوئے بولا۔ ''ٹھیک ہے یہ آپ کا بہت بڑا کارنامہ ہے، اب ہم دونوں میں سے ایک کو ان شکاری کتوں کی خوراک بننا ہے اور دوسرا اس عمدہ اور آرام دہ بستر پر سوئے گا۔'' اب ہوشیار ہوجاؤ رینز فورڈ......''

اور رینز فورڈ کے بقول وہ اس بستر سے بہتر بستر پر پہلے کبھی بھی نہیں سویا تھا۔





آسیبی آنکھیں

ایس امتیاز احمد-کراچی

نوجوان حسینہ کو نادیدہ مخلوق کی گھورتی ہوئی آنکھوں سے عجیب لگائو ہوگیا تھا اور اسی لئے وہ گھر چھوڑ کر دوسرے گھر میں نہیں جانا چاہتی تھی اور پھر وہ کچھ ہوگیا جس کا تصور نہیں تھا۔

کیا ماورائی مخلوق بھی پیار ومحبت اور چاہت کی طلبگار ہوتی ہیں ...... حقیقی کہانی

رات کے تقریباً تین بجے تھے میں گہری نیند میں تھی مجھے ایسا محسوس ہوا کہ جیسے کمرے میں کوئی بہت تکلیف سے کراہ رہا ہے، میں نے پورے کمرے کا جائزہ لیا اور کوئی نظر نہ آیا تو میں اسے اپنا وہم سمجھ کر دوبارہ لیٹ گئی پھر یکدم کوئی کھلکھلا کر ہنس پڑا تو میں نے ڈرتے ڈرتے سر کمبل سے نکال کر آواز کی جانب دیکھا تو اپنی چیخ پر قابو نہ رکھ سکی۔ میری چیخ خاموشی کو چیرتی ہوئی دور تک پھیل گئی میں نے خوف سے آنکھیں بند کرلیں مگر ان آنکھوں کو اپنے ذہن سے نہ نکال سکی جو دور اندھیرے میں چمک رہی تھیں۔

امی، بابا میری چیخ سن کر دوڑے چلے آئے، میں پسینے میں شرابور بری طرح سے کانپ رہی تھی۔ امی نے مجھے پیار کرتے ہوئے پوچھا ”بیٹا کیا ہوا ہے آپ ڈر گئی ہو“ مگر میں انہیں نہ بتا سکی کہ میں کس چیز سے ڈری ہوں۔

بابا نے بھی بہت پوچھا مگر میں کوئی جواب نہ دے سکی تو وہ دونوں مجھے نہ ڈرنے کی تاکید کرتے ہوئے پیار کرکے چلے گئے، وہ جب تک کمرے میں تھے تو وہ چمکدار آنکھیں اوجھل تھیں۔ امی بابا کے جاتے ہی وہ پھر سے روشن ہوگئیں جانے ان آنکھوں میں کیا تھا کہ خوف ودہشت زدہ ہونے کے باوجود میں نہ چاہتے ہوئے بھی ان کی جانب دیکھنے لگی۔ پھر پتہ نہیں کب نیند کی آغوش میں چلی گئی۔

صبح امی کی آواز پر آنکھ کھلی ”فوزی بیٹا اٹھو کیا کالج نہیں جاؤ گی“ میں نے گھڑی کی طرف دیکھا ساڑھے

سات بج رہے تھے، میں کسلمندی سے اٹھی نیند سے بوجھل آنکھیں لئے باتھ روم کی طرف بڑھ گئی، بال بنا رہی تھی تو ایسا لگا کہ میں کسی کی آنکھوں کے حصار میں ہوں اور ان پیار برساتی جادوئی آنکھوں کے سحر میں گرفتار ہوگئی۔ امی کی آواز پر اس سحر سے آزاد تو ہوگئی مگر دل ودماغ کو اس جادوئی سحر سے رہائی نہ دلا سکی۔ جلدی جلدی تیار ہوکر ڈائننگ ٹیبل پر آئی امی کو اپنی طرف دیکھتے ہوئے پاکر پوچھا ”خیریت ہے ایسے کیوں دیکھ رہی ہیں۔“

تو وہ بولیں ”فوزی بیٹا تم رات کو ڈر گئی تھیں کیا کوئی ڈراؤنا خواب دیکھا تھا اب بھی شکل سے ایسا لگ رہا ہے کہ تم ٹھیک سے سو نہیں سکی ہو۔“

میں نے حیرانگی سے امی کی طرف دیکھا میں خواب میں ڈر گئی تھی مجھے تو کوئی بات یاد نہیں امی کہنے لگیں ”میں اور تمہارے بابا تمہاری آواز سن کر تمہارے کمرے میں آئے تو تم بری طرح کانپ رہی تھیں۔ بیٹا ایسا کرو آج کالج نہیں جاؤ تمہاری طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔“

میں نے کہا ”امی آج تو مجھے لازمی جانا ہے ماہی سے کچھ اسائنمنٹ لینے ہیں وہ لے کے آئے گی میں نہیں گئی تو وہ پریشان ہوگی۔“

وہ آنکھیں پورا دن میرے آس پاس رہیں پھر روز ہی ایسا ہونے لگا مگر مجھے اب ان سے ڈر نہیں لگتا میں نے ایک بات محسوس کی کہ جب میں اکیلی ہوتی تو وہ آنکھیں میرے آس پاس رہتیں مجھے تکتی رہتیں ایسا لگتا کہ وہ مجھ سے کچھ کہنا چاہتی ہیں اور جب میرے پاس کوئی ہوتا تو وہ غائب ہوجاتیں اور اب تو میرا دل بھی یہی چاہتا تھا کہ میں انہیں دیکھتی رہوں۔

میں آپ کو ایک بات بتاتی چلوں، ہمیں اس گھر میں شفٹ ہوئے تقریباً چار مہینے ہوئے تھے۔ میں اپنے والدین کی اکلوتی اولاد ہوں اس لئے میرا دل چاہتا کہ میرے بہت سارے دوست ہوں اور میں ان کے ساتھ خوب ہلہ گلہ کروں خوب انجوائے کروں جب یہاں شفٹ ہو رہے تھے تو میں بہت اداس تھی کیونکہ میرے سارے دوست مجھ سے جدا ہو رہے تھے ہم لاہور سے کراچی شفٹ ہوئے تھے اس لئے ان کی جدائی میں پریشان تھی اور خوب روئی تھی اس گھر میں بھی دو مہینے تک میرا دل نہیں لگا اپنے دوستوں کو یاد کرکے روتی رہی پھر میں نے کالج میں ایڈمیشن لے لیا یہاں پر بھی بہت سارے دوست بنالئے گو کہ پرانی سہیلیوں کو بھولی نہیں تھی مگر نئے دوست مل جانے پر تھوڑا سا بہل گئی تھی۔

اس گھر کے آس پاس کوئی ایسا گھر نہیں تھا کہ میں کسی سے دوستی کرتی جب گھر میں بوریت ہوتی تو اپنے دوستوں کے گھر چلی جاتی یا وہ لوگ یہاں آجاتیں مگر اب دل چاہتا کہ نہ کہیں جاؤں نہ آؤں نہ کسی سے باتیں کروں بس اپنے کمرے میں لیٹی رہوں میری اس تبدیلی پر میری ساری دوست مجھ سے ناراض تھیں کہ یہ مجھے کیا ہوتا جا رہا ہے، امی، ابو بھی میری اس تبدیلی کو محسوس کئے بغیر نہ رہ سکے وہ میری روز بروز گرتی ہوئی صحت کی وجہ سے بہت پریشان تھے۔ میں نے ان آنکھوں کے بارے میں کسی کو نہیں بتایا تھا، میں ڈرتی تھی کہ کہیں میں ان آنکھوں کو کھو نہ دوں جو کہ اب مجھے زندگی سے زیادہ عزیز تھیں۔ امی ابو نے زبردستی ڈاکٹر سے میرا چیک اپ کرایا، ڈاکٹر نے بھی کہا میری روز بروز گرتی ہوئی صحت اور کمزوری خطرے کا سبب بھی بن سکتی ہے۔

ایک دن میں ماہی کے گھر جانے کے لئے نکلی، جانے کیوں راستے سے ہی لوٹ آئی گھر واپس آرہی تھی تو راستے میں مجھے ایک پیاری سی لڑکی ملی میرا بے ساختہ دل چاہا کہ اس سے دوستی کرلوں میں نے مسکرا کر اسے دیکھا اس نے بھی میری مسکراہٹ کا جواب مسکرا کر دیا۔ میں نے دوستی کا کہا تو وہ بھی مجھ سے دوستی پر تیار ہوگئی پھر ہم ایک دوسرے کے تعارف کے بعد اچھے دوست بن گئے، رمشہ دو بھائیوں کی اکلوتی بہن تھی اسے بھی میری طرح بہن کا شوق تھا اس لئے ہماری دوستی کے بعد ہمارا یہ شوق پورا ہوگیا۔

ایک دن میں نے رمشہ سے پوچھا ”رمشہ کیا تمہیں اس کمرے میں دو چمکتی ہوئی آنکھیں نظر آرہی ہیں“ تو وہ میری بات سن کر پریشان ہوگئی ادھر ادھر دیکھنے کے بعد وہ چپ چاپ میرے کمرے سے چلی گئی اس کے اس طرح چلے جانے پر مجھے اس پر بہت غصہ آیا، میں

بھی اس کے گھر نہیں گئی۔ چونکہ ہماری اس دوستی کی وجہ سے دونوں گھرانے ایک دوسرے کے قریب آ گئے تھے اس لئے ہماری اس حرکت کوسب نے نوٹ کیا یہاں امی ابو مجھ سے پوچھتے رہے اور وہاں رمشہ کے گھر والے کہ ہم اتنے دن سے مل کیوں نہیں رہے۔

پھر وہ اچانک آ گئی میں اپنے کمرے میں لیٹی ہوئی تھی اور ان آنکھوں کے حصار میں تھی وہ بہت غصے میں کمرے میں داخل ہوئی اور کہنے لگی ''فوزی مجھے تم سے یہ امید نہیں تھی اگر غصے اور پریشانی کی وجہ سے میں یہاں نہیں آ رہی تھی تو تمہیں تو آنا چاہئے تھا۔''

میں نے اس کی بات کو نظر انداز کرتے ہوئے کہا ''ناراض ہو کر تم گئی تھیں اپنی ناراضگی کا بتاتی تو میں اپنی غلطی مانتی اور سوری کرتی۔ تم تو میرے سوال پر اتنا بوکھلائی اور غصہ کرتی ہوئی چلی گئیں۔'' پھر وہ روتے ہوئے میرے گلے لگ گئی اور کہنے لگی ''فوزی میں تمہیں کھونا نہیں چاہتی اس لئے تم سے ایک بات کرنے اور تمہیں منانے میں اتنے دن لگا دیئے۔ میری پیاری بہن پہلے مجھ سے ایک وعدہ کرو کہ تم میری بات مان لوگی''

میں نے بھی جھٹ اس کی محبت میں آ کر وعدہ کر لیا یہ پوچھے بنا کہ وہ مجھ سے کس بات کا وعدہ لے رہی تھی وہ کہنے لگی ''میں نے انکل آنٹی سے بات کر لی ہے وہ لوگ اس گھر کو چھوڑ کر دوسرا گھر لینے کے لئے تیار ہو گئے ہیں۔ پلیز تم بغیر کسی ضد کے ان کی بات مان لینا'' اس کی بات سن کر مجھے بہت غصہ آیا، میں نے اس کی پوری بات سنے بغیر اسے اپنے کمرے سے نکال دیا اور آئندہ نہ ملنے کا کہا۔

''میں سب کچھ چھوڑ سکتی ہوں مگر یہ گھر اور یہ کمرہ چھوڑنا اب میرے بس سے باہر تھا میں اب ان آنکھوں سے جدا نہیں ہو سکتی ان کی جدائی کے خیال سے میرے جسم میں جھرجھری سی آ جاتی ہے۔''

رمشہ تو روتی ہوئی چلی گئی اس کے بعد امی ابو نے بہت زور لگایا میری ضد کے باوجود دوسرے علاقے میں کرائے کا گھر لے لیا، اس گھر کی پوری سیٹنگ میری مرضی کے مطابق کروائی مگر میں ان باتوں سے نہ بہل سکی۔ رو رو کر برا حال کر لیا اور احتجاجاً اپنے آپ کو کمرے میں بند کر لیا۔ ان آنکھوں کے بغیر میں بن پانی کی مچھلی کی طرح تڑپا کرتی مگر کسی کو میری پرواہ نہیں تھی بس امی میری جان بچ جانے پر شکرانے ادا کرتی رہتیں۔

ایک دن رمشہ کے سب گھر والے آئے ہوئے تھے اور میں روزمرہ کے مطابق اپنے کمرے میں بند ان آنکھوں کو اپنے تصور میں بسائے لیٹی ہوئی تھی کہ مجھے پیاس محسوس ہوئی میں پانی پینے کی غرض سے کچن کی طرف جا رہی تھی کہ اپنا نام سن کر رک گئی آنٹی امی سے کہہ رہی تھیں ''بہن آپ نے بہت اچھا کیا کہ گھر بدل لیا اور ہماری فوزی بیٹی کی جان بچ گئی'' وہ کہہ رہی تھیں ''اس گھر میں روح ہے اس گھر میں ایک بہت خوبصورت لڑکا رہتا تھا جس کا نام شاہد تھا، شاہد کا چچا اس سے بہت خائف تھا یہ گھر شاہد کا تھا وہ بہت رحم دل اور حساس تھا ہر کسی کی مدد کرنا اس کا شیوہ تھا شاہد کی ان باتوں کی وجہ سے اس کا چچا اس کی جان کا دشمن بنا ہوا تھا، وہ بہت لالچی اور خودغرض انسان تھا وہ شاہد کے گھر پر قبضہ کرنا چاہتا تھا وہ بہت شاطر تھا شاہد کو مارتا پیٹتا اور طرح طرح کی اذیتیں دیتا تھا۔

پھر ایک دن شاہد سیڑھیوں سے اتر رہا تھا کہ اس کا پاؤں پھسلا اور وہ لڑھکتا ہوا نیچے تک آ گیا دماغ میں شدید چوٹ کے باعث اسی وقت مر گیا اس کے چچا نے اس حادثے کو اتفاقی حادثہ کہہ کر اپنے آپ کو بچا لیا اور اپنے شاطرانہ ذہنیت کی وجہ سے اس گھر پر قابض ہو گیا مگر کچھ عرصے بعد یہ گھر بیچ کر اپنی فیملی کے ساتھ دوسرے شہر چلا گیا۔

بس اس دن سے شاہد کی روح لوگوں کو تنگ کرتی ہے اور اپنے اوپر ہونے والے مظالم کا بدلہ لیتی ہے شاید اس طرح اس کی روح کو سکون ملتا ہو۔ آپ سے پہلے یہاں کئی لوگ آئے مگر کسی نہ کسی بڑے حادثے کا شکار ہوئے گو کہ وہ حادثے بھی اتفاقاً ہوئے تھے مگر آس پاس کے لوگ اس بات کو نہیں مانتے ان کا کہنا ہے شاہد کو مارنے میں اس کے چچا کا ہاتھ ہے انہوں نے اس کی اکثر درد سے کراہتی آوازیں سنی ہیں۔

شاہد کو گھر میں چلتے پھرتے دیکھا گیا ہے اور ان آنکھوں کا بھی تذکرہ کر چکے ہیں جن کے بارے میں فوزی بٹی نے رمشہ سے کہا تھا اور رمشہ وہاں سے روتی ہوئی آئی تھی میں نے اس کے رونے کا سبب پوچھا تو اس نے مجھے پوری بات بتائی اور روتے ہوئے کہنے لگی خدا کے واسطے امی فوزی کو بچا لیں نہیں تو شاہد اس کو بھی مار دے گا۔ میں بھی یہ سن کر متفکر ہوئی پھر ہم نے آپ سے بات کی اور آپ نے اس آسیبی گھر سے نجات حاصل کرلی۔ خدا کا شکر ہے آپ کسی بڑے نقصان سے بچ گئیں۔"

امی کہنے لگیں ''مگر ہمیں تو کسی بات سے محسوس نہیں ہوا کہ اس گھر میں کوئی روح ہے'' میں ان کی باتیں سن کر سوچتے ہوئے اپنے کمرے میں آ گئی اور ایک پرچہ امی ابو کے نام لکھا۔

پیاری امی اور بہت پیارے ابو! آداب! آپ میری غیر موجودگی سے پریشان مت ہو جایئے گا میں کچھ دیر کے بعد خود لوٹ آؤں گی اور میں کہاں جا رہی ہوں یہ آپ سب اچھی طرح جانتے ہیں۔

آپ کی بیٹی، فوزیہ عرف فوزی

پرچہ تکیئے کے پاس رکھ کر میں نے کچھ سوچتے ہوئے پرانے گھر کی چابی دراز سے نکالی چابی پرس میں رکھ کر چپ چاپ گھر سے نکلی اور تھوڑا آگے سے رکشہ میں بیٹھ کر اپنے پرانے گھر کی طرف چل پڑی امی ابو وغیرہ باتوں میں مگن تھے اس لیے میری غیر موجودگی محسوس نہ کرسکے رکشے والے نے بالکل گھر کے سامنے اتارا اس کو پیسے دے کر فارغ کیا تالہ کھول کر اندر داخل ہوئی دروازہ بند کیے بغیر اپنے کمرے کی طرف بڑھی کمرے میں داخل ہوئی تو وہاں ایک بہت خوبصورت لڑکا کھڑا مسکرا رہا تھا اس کی حسین آنکھوں پر تو میں فریفتہ تھی ہی اب اس کی سحر انگیز شخصیت میں کھو سی گئی بلاشبہ وہ بہت خوبصورت تھا میں نے اس کی طرف دیکھا اور اٹکتے ہوئے کہا ''شاید تم شاہد ہونا؟'' ایک بات بتاؤ کیا میں تمہیں اچھی لگتی ہوں۔

اس کا اندازہ مجھے اس طرح ہوا کہ تم نے سب کو کسی نہ کسی طرح سے نقصان پہنچایا مگر ہمیں کچھ نہ کہا

''چاہے تو تم مجھے بھی مار سکتے تھے۔''

میری اس بات سے وہ سنجیدہ ہو گیا جیسے اسے میر بات بری لگی ہو۔ پلیز، میری بات سنو اگر تم مجھے پسند کر۔ ہو تو تم کو میری ایک بات ماننی ہوگی پہلے یہ بتاؤ تم لوگو کیوں ستاتے ہو، مانتی ہوں تمہارے چچا نے تمہار۔ ساتھ اچھا سلوک نہیں کیا اور تمہیں مار دیا مگر تم تو بہت رحم د تھے لوگوں کی مدد کیا کرتے تھے ان کے کام آتے تھے تو یہ تبدیلی کیسی مانا تمہارے ساتھ اچھا نہیں ہوا مگر تمہارا فیص اس جہاں میں نہیں میں نے اوپر کی طرف اشارہ کیا وہا ہوگا اور اللہ کے حکم سے تمہارے چچا کو بھی نہ کبھی اس کی ضرور ملے گی پلیز تم یہاں سے چلے جاؤ اور لوگوں کو پریشا کرنے کے بجائے اپنے فیصلے کا انتظار کرو بہت دیر تک ایک ٹک میری طرف دیکھتا رہا میں نے پھر کہا شاہد می تمہارے آگے ہاتھ جوڑتی ہوں تم یہاں سے چلے جاؤ۔

میں نے غور سے سنا تو ابو لوگ زور زور سے شاہد کو کہہ رہے تھے اور یہیں آ رہے تھے مجھے ان کی یہ بات ناگو گزری اور چاہا کہ یہ آواز اس سے پہلے شاہد تک پہنچے می انہیں سمجھا دوں یہ سوچتی ہوئی تیزی سے سیڑھیاں پھلانگ لگی کہ میری جلد بازی سے پاؤں مڑ گیا اور میں قلابازیا کھاتی ہوئی نیچے تک آ گئی کمزوری کی وجہ سے دماغی چوٹ برداشت نہ کرسکی اور شاہد کی طرح اس حادثے کا شکار ہو جبکہ گرتے وقت میں نے دیکھا کہ شاہد مجھے بچانے آگے بڑھا مگر نہ بچا سکا اور ایک ناکردہ گناہ کا مجرم بنا دیا گیا۔

میرے گھر والے اس حادثے کا ذمہ دار شاہد کو ٹھہ رہے تھے انہیں کیا پتہ کہ وہ ان کی بیٹی کو بچانا چاہتا تھا مگ نہ بچا سکا، وہ تو اس ظالم دنیا کو چھوڑ کر جانے پر تیار ہو گیا تھ مگر میری جلد بازی کی وجہ سے مجھے بھی اپنے ساتھ جانے پر مجبور ہو گیا، اب وہ اکیلا نہیں میں بھی سفید بادلو میں اس کے ساتھ اڑی چلی جا رہی تھی گو کہ مجھے اپ والدین سے بچھڑنے کا بہت دکھ تھا مگر میں شاہد کے ساتھ اس سفر سے بہت خوش تھی۔



آسیبی کتاب

ایس امتیاز احمد۔کراچی

آدھی رات کا اندھیرا ہر سو مسلط تھا کہ اچانک خونی چمگادڑوں نے ھلہ بول دیا، جسے دیکھ کر نوجوان حواس باختہ ہوگیا اور اس نے گولی چلادی، گولی اس چمگادڑ کو لگی جو سب سے بڑی تھی مگر پلک جھپکتے ہی وہ چمگادڑ انسانی روپ دھارگئی اور پھر……

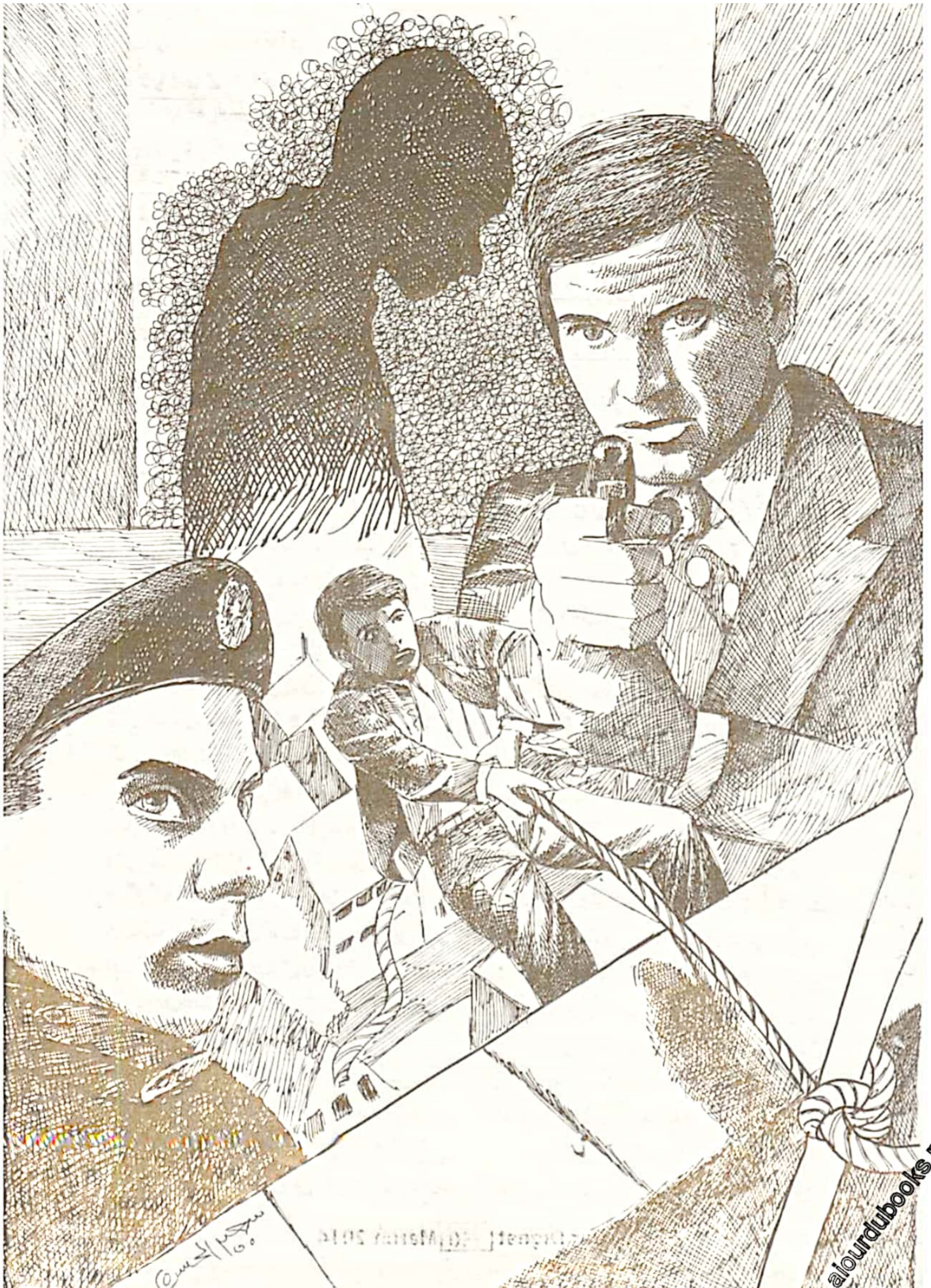
خوف واسرار کے سمندر میں غوطہ زن کہانی جو کہ پڑھنے والوں کو ورطۂ حیرت میں ڈال دے گی

میں بچپن ہی سے بہت نڈر اور مہم جو واقع ہوا ہوں۔ اپنی فطری دلیری کی وجہ سے بارہا مشکلات میں گھر چکا ہوں۔ کئی مرتبہ تو گاؤں والوں نے مجھے موت کے منہ سے بچایا ہے۔ میری ان حرکتوں کی وجہ سے تمام گھر والے پریشان ہی نہیں بلکہ نالاں تھے۔ میرے والد جو بہت ہی سخت گیر انسان تھے۔ چھڑی سے میری مرمت کرنے کے بعد مجھے کمرے میں بند کر کے باہر سے تالا لگادیا کرتے تھے تاکہ میں ان کی عدم موجودگی میں بھی گھر سے باہر قدم نہ رکھوں۔ میں اس وقت تک کمرے میں قید رکھا جاتا جب تک آئندہ کوئی حرکت نہ کرنے کا وعدہ کر لیتا۔ اس طرح چند دن تو سکون سے گزر جاتے اس کے بعد پھر کوئی نہ کوئی حرکت ایسی سرزد ہوہی جاتی جس کی وجہ میری خوب مرمت ہوجاتی۔ میرے برعکس میرا چھوٹا بھائی جیمز بہت ہی سنجیدہ واقع ہوا تھا، اسی لئے تمام گھر والے اسے چاہتے تھے۔

آپ شاید میری باتوں کا یقین نہ کریں، لیکن یہ ایک حقیقت ہے کہ دس برس کی عمر میں ایک دن میں گاؤں کے قریب ہی گھنے جنگل میں اکیلا ہی شکار کھیلنے چلا گیا۔ یہ بھی نہ سوچا کہ جنگلی درندے کس قدر خطرناک ثابت ہوسکتے ہیں جبکہ میں اپنے ہم عمر لڑکوں کی طرح نہ تو شکار کھیلنا جانتا تھا اور نہ ہی میرے پاس کوئی ہتھیار تھا شکار کی اس مہم میں میرے ہمراہ میرا پالتو کتا مارش تھا۔ اگر اس دن مارش نہ ہوتا تو میرا زندہ سلامت جنگل سے واپس آنا ممکن نہ ہوتا۔ لطف کی بات یہ ہے کہ مارش کو بھی میں نے مہم جوئی کے دوران حاصل کیا تھا۔ شکار کے اس واقعے سے تین برس پیشتر میں نے اسے دوسرے گاؤں سے چرالیا تھا جو ہمارے گاؤں سے دس میل کے فاصلے پر تھا۔

میرے والد کو کتوں سے سخت نفرت تھی اس لئے وہ مارش کو گھر میں رکھنا پسند نہیں کرتے تھے۔ میں اڑ گیا اور میری خوب پٹائی ہوئی۔ یہ تو خدا کا شکر ہے کہ انہیں چوری کی بات کا علم نہ ہوا، ورنہ وہ مجھے بھی مارش کے ساتھ ہی گھر سے نکال دیتے۔ میری ضد کو دیکھتے ہوئے آخر والدہ کو میری سفارش کرنا پڑی۔ تب کہیں جا کر والد صاحب رضامند ہوئے۔ لیکن اس کے باوجود تین ماہ تک مجھ سے بات تک نہ کی ان کی آنکھوں کا تارا تو بس جیمز ہی تھا۔

اب وہ کتا جوان ہو چکا تھا جسے مارش کے نام سے پکارتا تھا۔ مارش بھی مجھے اس قدر چاہتا تھا کہ ہر وقت میرے ساتھ سائے کی طرح رہتا۔ شکار والے دن



بھی مارش میرے ہمراہ تھا اسی کی بدولت میں اس گھنے اور خطرناک جنگل میں زندہ بچا۔

وہ جنگل لوگوں میں موت کی وادی کے نام سے مشہور تھا۔ اس میں داخل ہونے کے بعد کسی اجنبی شخص کا صحیح زندہ سلامت واپس آجانا معجزے سے کم نہ تھا۔ اول تو باہر نکلنے کا راستہ ہی نہ ملتا اور دوسرے قدم قدم پر خوفناک درندوں کا خطرہ موجود تھا۔ میں متواتر تین گھنٹوں تک اس خطرناک جنگل میں آگے بڑھتا چلا گیا۔ حتیٰ کہ تھک کر ایک پتھر کی اوٹ میں ستانے بیٹھ گیا۔ مجھے بیٹھے ہوئے کچھ زیادہ دیر نہیں ہوئی تھی کہ گولی چلنے کی آواز سنائی دی اور ساتھ ہی بھیڑیئے کی ہولناک چیخ بلند ہوئی۔ اس جنگل میں بے پناہ بھیڑیئے تھے۔ جو گردو نواح کے لوگوں کے لئے اکثر پریشانی کا باعث ہوتے۔ میں نے فوراً ہی یہاں سے نکل جانا بہتر سمجھا۔

واپسی پر مجھے اپنے راستے کے گم ہونے کا احساس ہوگیا۔ اب میرے لئے ہر طرف خطرہ ہی خطرہ اور مصیبت تھی۔ میں اندازے کے مطابق ایک طرف کو ہولیا۔ اس طرح جب مجھے جنگل میں بھٹکتے ہوئے کئی گھنٹے گزر گئے تو لمحہ بہ لمحہ پریشانی بڑھتی چلی گئی۔ دوپہر ڈھلی، درختوں کے سائے بڑھنے لگے۔ دن ڈھل گیا اور شام کے دھندلکے پھیل گئے۔

ایسے حالات اور پرخطر ماحول میں میرے بجائے کوئی دوسرا ہوتا تو وہ بھی لازماً خوفزدہ ہوجاتا۔ دھیرے دھیرے رات کی تاریکی پھیلنے لگی جس سے جنگل کا ماحول اور بھی دہشت ناک اور پراسرار ہوگیا۔ جنگلی درندے بہت ہی ڈراؤنی آوازیں نکالنے لگے اور درختوں پر بیٹھے ہوئے پرندے بھی مجھے اور مارش کو دیکھ کر شور مچانے لگے۔ پھر بدروحوں اور بھوت پریت کے خوف نے تو میرے دل ودماغ کی تمام قوتیں سلب کرلیں۔

میں نے بدروحوں کے متعلق بہت سی کہانیاں سنی تھیں۔ جن کا مسکن جنگل یا کھنڈر ہوا کرتے ہیں اور وہ رات کی تاریکی میں اپنے شکار تلاش کرتی پھرتی ہیں۔ ایسے الٹے سیدھے خیالات نے مجھے اس قدر خوفزدہ کردیا کہ چلتے وقت جب میرے پاؤں تلے کوئی سوکھی ہوئی شاخ یا ٹہنی چیخ کر ٹوٹتی تو اس کی آواز ہی سے میرے رونگٹے کھڑے ہوجاتے اور دل اس قدر زور سے دھڑکنے لگتا گویا پسلیوں کو توڑ کر باہر آنا چاہتا ہے۔ یہ صورت حال میرے لئے ناقابل برداشت تھی جس کی وجہ سے ایک بار تو میں رو پڑا، میرے رخسار آنسوؤں سے بھیگ گئے، میں نے گڑگڑا کر خدا سے دعا مانگی اور توبہ کی کہ آئندہ کبھی بھی اپنے ماں باپ کو ناراض نہیں کروں گا۔

ایک تو خوف اور تھکن سے میری حالت خراب ہورہی تھی پھر بھوک کی شدت سے نڈھال ہوچکا تھا۔ صبح سے کچھ کھایا نہیں تھا۔ شکار پر چلتے وقت دوسری بڑی حماقت جو مجھ سے سرزد ہوئی وہ یہ تھی کہ میں اپنے ساتھ کھانے پینے کی کوئی چیز لے کر نہ آیا تھا کہ شکار کا تازہ گوشت بھون کر کھاؤں گا اور میری حالت غیر ہوتی جارہی تھی۔

میں بہت دیر تک جنگل کی پراسرار تاریکی میں بھٹکتا پھرا۔ کبھی ایک سمت چل پڑتا تو کبھی دوسری سمت۔ میری حالت اس چوہے کی سی تھی جسے بلی کے ساتھ ایک ہی پنجرے میں بند کردیا جائے اور وہ بلی سے بچنے کے لئے ادھر ادھر بھاگتا ہے۔ لیکن پنجرے کی آہنی سلاخیں اسے ہر طرف سے روک دیتی ہیں اور آخر تھکن اور خوف سے نڈھال ہوکر بلی کے سامنے ہی گر پڑتا ہے۔

کہتے ہیں جب انسان ہر طرف سے مایوس اور ناامید ہوجاتا ہے اور مصائب سے نجات کی کوئی صورت نظر نہیں آتی تو ایسے مشکل اور کٹھن وقت میں خدا اپنے بندوں کی امداد کے لئے کوئی نہ کوئی راہ نکال دیتا ہے، اس صورت میں کہ جب بندہ خدا کو صدق دل سے یاد کرتا ہے، اور پھر بندے کی مشکل خود بخود ختم ہوجاتی ہے۔ اور مصائب کے بادل چھٹ جاتے ہیں۔ میرے ساتھ بھی اس رات بالکل ایسا ہی ہوا۔

چاند نکلا اور اس کی روپہلی کرنوں نے تاریکی کا پردہ چاک کردیا۔ میں نے چاروں طرف نظر دوڑائی تو

چند گز کے فاصلے پر ایک غار دکھائی دیا۔ میں نے سوچا رات اس غار میں گزار کر صبح پھر راستہ تلاش کروں گا۔ میں تاریک غار میں داخل ہوگیا۔ مارش جو اب تک میرے ساتھ تھا۔ غار کے منہ پر ہی رک کر غرانے لگا۔ میں نے مارش کو خاموش کرنے کی کوشش کی لیکن نہ تو وہ اندر آیا اور نہ ہی خاموش ہوا۔ مارش کی غراہٹ کی وجہ سے مجھے بھی خطرے کا احساس ستانے لگا۔ جلد ہی مجھے وہ خطرہ دکھائی دینے لگا جس سے مارش خوفزدہ ہورہا تھا۔ بھیڑیئے کا چھوٹا سا بچہ وہ بھی میری ہی طرح تنہا بھوکا اور سردی سے ٹھٹھر رہا تھا۔ اسے دیکھ کر پہلے تو میں گھبرایا کسی بھی وقت اس کی ماں غار میں آسکتی تھی۔ لیکن میرے خوف کو میری خواہش نے کچل ڈالا۔

بچپنے اور حماقت میں زیادہ فرق نہیں۔ جن حالات کا میں نے ذکر کیا ہے اگر کوئی دوسرا شخص ہوتا فوراً ہی غار سے نکل بھاگتا لیکن میری خواہش بھیڑیئے کے بچے کو اپنے ساتھ لے جانے کی تھی۔ میں نے بغیر سوچے سمجھے اسے اٹھایا اور بھاگ کھڑا ہوا۔

مارش بدستور غرا کر مجھے نادیدہ خطرے کا احساس دلا رہا تھا۔ لیکن میرے قدم تیزی سے آگے بڑھتے چلے گئے۔

تھکن اب نام کو نہ تھی اور نہ ہی بھوک کی شدت سے پیٹ میں بل پڑ رہے تھے۔ ہر بڑھتے ہوئے قدم کے ساتھ نئی قوت کا احساس ہورہا تھا۔ معلوم نہیں کتنی دیر تک میں اسی طرح بھیڑیے کا بچہ اٹھائے بھاگتا چلا گیا۔ کتنا فاصلہ طے کیا اور کتنے نشیب و فراز سے گزرا۔ اچانک درختوں کا سلسلہ ختم ہوگیا۔ سامنے میرے گاؤں کی ویران اور سنسان گلیاں تھیں، میں ان ویران راہوں سے ہوتا ہوا اپنے گھر کے سامنے پہنچ گیا۔

جنوری کا مہینہ تھا۔ سردی پورے شباب پر تھی مگر جب میں کمرے میں داخل ہوا تو میرا جسم پسینے میں شرابور تھا۔ مجھے پہلی بار اپنی لرزتی ہوئی ٹانگوں کا احساس ہوا۔ سب گھر والے میری وجہ سے پریشان تھے۔ اور اب تک جاگ رہے تھے۔ دوسرے دن مجھے معلوم ہوا کہ میں رات تین بجے گھر پہنچا ہوں۔

میرے لئے سب سے تعجب خیز میرے سخت گیر والد کا رویہ تھا۔ انہوں نے مجھے ایک لفظ تک نہ کہا بلکہ بڑے پیار سے اپنے پاس بیٹھایا۔ ان کی آنکھوں میں آنسو تھے۔ یہ آنسو مجھے پالینے کی خوشی کا مظہر تھے یا میری نازیبا حرکت کی وجہ سے روحانی اور ذہنی کرب کی علامت۔ میں کوئی فیصلہ نہ کرسکا۔ بہرحال یہ بات میرے لئے ناقابل برداشت تھی۔ میں اپنے کیئے پر پہلی مرتبہ نادم ہوا اور مستقبل میں ایسی بات نہ کرنے کا مصمم ارادہ کرلیا جو میرے والد کو ناگوار گزرے۔

جس طرح بعض اوقات انسان کی زندگی پر بہت گہرے اثرات چھوڑ جاتے ہیں۔ اسی طرح بچپن کی یہ حماقت میری زندگی کے دھاروں کا رخ تبدیل کرنے کا باعث ہوگئی۔ اس کے بعد میں نے پوری توجہ تعلیم پر مرکوز کردی۔ تعلیم سے فارغ ہوکر میرا فوج میں بھرتی ہونے کا ارادہ تھا۔ جو بدقسمتی سے پورا نہ ہوسکا۔ اور مجبوراً مجھے پولیس کی ملازمت اختیار کرنی پڑی۔ پولیس کی ملازمت میں فطری دلیری اور جرأت بہت فائدہ مند ثابت ہوئی اور چار برس کی مدت میں انسپکٹر کے عہدے پر ترقی مل گئی۔ انسپکٹر بنتے ہی مجھے ہندوستان بھیج دیا گیا۔

ہندوستان میں پانچ برس تک بظاہر مجھے اخباری نمائندے کا کام سپرد کیا گیا حالانکہ یہاں میرا کام سیاسی تحریکوں کے متعلق خفیہ معلومات حاصل کرکے حکومت کو پہنچانا تھا کیونکہ ان دنوں پہلی جنگ عظیم کے بادل منڈلا رہے تھے اور ساتھ ہی ہندوستان میں تحریک آزادی زور پکڑ چکی تھی۔ ترقی پاکر مجھے قدرتی طور پر بہت خوشی ہوئی۔ لیکن آج جب میں سوچتا ہوں تو مجھے بہت دکھ ہوتا ہے یہ ترقی میرے لئے تباہی کا باعث ثابت ہوئی۔ وطن سے عدم موجودگی کے باعث چھوٹا بھائی جیمز میری سرپرستی سے محروم ہوگیا جوان دنوں لندن میں تعلیم حاصل کررہا تھا۔ والدین چند برس پیشتر فوت ہوچکے تھے ان کی موت کے بعد ہم اس بھری دنیا میں تنہا رہ گئے۔

میرے ہندوستان آنے کے دو برس بعد جیمز تعلیم مکمل کر کے ایسے خطرناک راستے پر چل پڑا جہاں سے وہ لوٹ کر واپس نہ آسکا۔ مجھے ہندوستان میں آئے پانچ برس گزر چکے تھے کہ ایک دن مجھے اپنے بھائی جیمز کے لاپتہ ہونے کی اندوہناک اطلاع ملی۔ پولیس کی ہر ممکن کوشش کے باوجود اس کی تلاش ناکام رہی۔ اطلاع ملتے ہی میں نے لندن کی راہ لی تاکہ صحیح حالات سے آگاہ ہونے کے بعد گمشدہ بھائی کو تلاش کرسکوں۔ لندن پہنچنے کے بعد یہ معلوم کر کے میری حیرت کی انتہا نہ رہی کہ جیمز کا کوئی دوست نہیں تھا۔ حالانکہ اس عمر میں عموماً لڑکے ہنگامہ پرور زندگی گزارتے ہیں اور خاص طور پر لڑکیوں کے گرد تو پروانوں کی طرح چکر کاٹتے ہیں۔

جب لندن سے کوئی اہم بات معلوم نہ ہوسکی تو گاؤں کی راہ لی۔ وہاں بھی مجھے خاص کامیابی حاصل نہ ہوئی۔ حالانکہ گاؤں کی پولیس کا انچارج میرا پرانا دوست انسپکٹر مالکم تھا۔ مالکم چند ایک موٹی موٹی باتیں ہی بتاسکا کہ گمشدگی سے چند دن پیشتر جیمز کو گاؤں کی ایک دکان سے پانچ پاؤنڈ کافی، دس پاؤنڈ شکر، دو پاؤنڈ لوہے کا تار اور مچھلی کے شکار کا ایک جال خریدتے دیکھا گیا تھا۔ ان چیزوں کے خریدنے کے چار دن بعد لیم نامی ایک بوڑھے شخص کا گزر مکان کے قریب سے ہوا اس دن شدید برف باری ہورہی تھی اور یخ بستہ طوفانی ہواؤں کی وجہ سے درجۂ حرارت نقطۂ انجماد سے بہت نیچے گرا ہوا تھا، شدید سردی کی وجہ سے لوگ گھروں میں دبکے بیٹھے تھے۔ اگر کوئی شخص گھر سے نکلا بھی تو کسی اشد ضرورت کے تحت ورنہ پورے گاؤں میں ہو کا عالم تھا۔

لیم کو بھی مجبوراً بازار تک آنا پڑا کیونکہ اسے اپنی بیمار بیٹی کے لئے دوا لینی تھی۔ لیم کی عمر ستر برس سے متجاوز ہے اور گھر بھی دور جنگل کے قریب ہے۔ لیم کے گھر سے بازار تک قریب ترین راستہ ہمارے گھر کے قریب سے گزرتا ہے۔ حالانکہ ہمارا مکان بھی گاؤں کی آبادی سے کافی پرے پہاڑ کے دامن میں ہے۔ لیم جب مکان کے قریب پہنچا تو سردی کی شدت سے اس کے ہاتھ پاؤں اور جسم میں درد ہونے لگا، لہٰذا لیم نے دروازہ کھٹکھٹایا تاکہ اندر جاکر آگ سے اپنے جسم کی حرارت بحال کرسکے۔ دستک دینے کے باوجود جب چند منٹ تک کوئی جواب نہ ملا تو لیم نے دروازے کو دھکیل کر دیکھا کہ کہیں جیمز باہر تو نہیں گیا ہوا ہے لیکن دروازہ کھلا ہوا تھا۔ لیم اندر چلا گیا لیکن جیمز موجود نہ تھا اور نہ ہی انگیٹھی میں آگ جل رہی تھی۔

البتہ میز پر ایک کتاب کھلی ہوئی پڑی تھی۔ چند منٹ رکنے کے بعد لیم مکان سے نکل کر اپنی راہ پر چل دیا۔ یہی حال دوسرے دن بھی ہوا۔ سردی پورے شباب پر تھی اور لیم کو بیٹی کے لئے گھر سے دوا لینے کے لئے نکلنا پڑا۔ دوسرے دن لیم بغیر دستک دیئے ہی مکان میں داخل ہوگیا۔ وہ یہ دیکھ کر پریشان ہوگیا کہ ہر چیز جوں کی توں رکھی تھی۔ انگیٹھی آج بھی سرد ہے۔ میز پر کتاب کھلی پڑی ہے اور بستر پر کوئی شکن نہیں ہے۔ گویا یہاں رات کو کوئی نہیں سویا۔

ایک سمجھدار شخص کی طرح لیم کو حالات کی سنگینی کا احساس ہوگیا اور وہ فوراً مکان سے باہر کو چل دیا۔ اسے یہ بھی علم تھا کہ گاؤں کے لوگ جیمز سے انتہائی نفرت کرتے ہیں اور اس کے بارے میں بڑی پراسرار باتیں بھی مشہور ہیں۔

لیم نے بازار پہنچ کر دوا فروش سے اس واقعے کا ذکر کیا دوا فروش بھی بڑا جہاندیدہ آدمی ہے۔ اس نے لیم کو مشورہ دیا کہ پولیس کو اصل حالات سے آگاہ کردے۔

اطلاع ملتے ہی پولیس نے سب سے پہلے تو مکان میں جاکر دیکھا اور اس کے بعد بڑی سرگرمی سے جیمز کی تلاش شروع کردی۔

بس یہ تھی ساری معلومات۔ کوئی مفید بات مالکم سے معلوم نہ ہوسکی البتہ جب میں مالکم سے مکان کی چابیاں لے کر رخصت ہونے لگا تو اس نے بتایا کہ شدید برف باری کے باوجود جیمز یا کسی دوسرے شخص کے قدموں کے نشان بھی نہیں دیکھے گئے سوائے لیم کے

قدموں کے نشان کے۔ انسپکٹر مالکم کے کہنے کے مطابق مکان سے کافی فاصلے تک ایک ایک انچ زمین دیکھی گئی لیکن سب بیکار۔ حالانکہ ان دنوں متواتر دس دن سے ہلکی ہلکی برف باری جاری تھی۔ جس کی وجہ سے میلوں تک زمین پر برف کی کافی موٹی تہہ جم گئی تھی۔

انسپکٹر مالکم سے رخصت ہوکر میں مکان کی طرف چل دیا، میں چونکہ خود بھی پولیس کا آدمی تھا اس لئے میں سوچنے لگا۔ ''بعض اوقات مجرم بہت ہوشیاری کا ثبوت دیتے ہیں اور جرم کرنے کے بعد اپنے پیچھے بظاہر کوئی ایسی علامت نہیں چھوڑتے جس سے تفتیش کے دوران کوئی مدد مل سکے اور مجرموں کی نشاندہی ہو۔ مگر نادانستہ طور پر جلد یا بدیر وہ کوئی ایسی حرکت کر بیٹھتے ہیں یا کوئی بہت معمولی سی بات بھی انہیں کیفر کردار تک پہنچانے کا باعث بن جاتی ہے۔ ایک ایسی بات یا حرکت جس کی طرف کوئی دھیان ہی نہیں دیتا۔''

میں جب گھر پہنچا تو اس وقت دوپہر کے دو بجے تھے۔ اپنا مختصر سا سامان اندر رکھنے کے بعد لیم سے ملنے کو چل دیا۔ سوچا لیم سے خود مل لینا زیادہ بہتر ہے۔ اور ہمسایوں سے بھی بات چیت کر لینا چاہئے ممکن ہے کوئی کارآمد بات معلوم ہوجائے۔

لیم کا مکان ہمارے گھر سے کافی فاصلے پر جنگل کے قریب واقع ہے جس کا ذکر میں پہلے کر چکا ہوں۔ لیم کے مکان تک پہنچتے پہنچتے دو گھنٹے لگ گئے۔ یہ فاصلہ آدھ گھنٹے سے زیادہ کا نہ تھا۔ یعنی دو میل کا تھا۔ اس تاخیر کی وجہ راستے میں دوسرے لوگوں سے میل ملاقات تھی۔ چونکہ میری زندگی کا بیشتر حصہ ان ہی لوگوں میں گزرا ہے اس لئے سب ہی مجھ سے اچھی طرح واقف تھے، انہیں معلوم تھا کہ میں پانچ برس اپنے وطن سے باہر ہندوستان میں گزار کر آیا ہوں۔ لیکن میں یہ محسوس کئے بغیر نہ رہ سکا کہ سب ہی مجھ سے رسمی طور پر ملے۔ ملاقات میں وہ گرم جوشی نہ تھی جس سے خوشی کا اظہار ہوتا ہے۔ ممکن ہے اس کشیدگی کی وجہ جیمز ہی ہو۔ اور میں جیمز کا بھائی تھا۔

لیم سے میری ملاقات بڑے خوشگوار ماحول میں ہوئی۔ اس کی باتوں میں بزرگانہ خلوص اور شفقت تھی مگر اس کی بیوی لوسی کا رویہ اپنے خاوند کے برعکس بہت ہی تلخ اور قابل اعتراض تھا ہماری گفتگو کے دوران لوسی بار بار مداخلت کرتی رہی۔ اس کی باتوں سے نفرت کا اظہار ہوتا تھا۔ لیم نے وہ سب باتیں دہرائیں جو میں اپنے دوست انسپکٹر مالکم سے پہلے ہی سن چکا تھا۔ البتہ لیم نے دبے دبے الفاظ میں کہا۔

''جہاں تک مجھے علم ہے مسٹر ایبل آپ کے بھائی جیمز کے پاس کالے جادو کی چند نادر کتابیں تھیں۔ جن کے مطالعے کا یہ سب نتیجہ ہے۔'' ولیم نے کچھ سوچتے ہوئے بتایا۔ ''ممکن ہے جیمز عملیات کے چکر میں پڑ گیا ہو۔ یہ میرا خیال ہے۔ خدا کرے کہ غلط ہو۔''

''آپ کا خیال درست ہے۔'' میں نے لیم کی بات کی تائید اس لئے کی کہ اس سے مزید کچھ معلومات حاصل کرنے میں مدد مل سکے۔ کیونکہ مجھے یقین ہو چکا تھا کہ گاؤں کے لوگ جیمز کے بارے میں بہت کچھ جانتے ہیں اور بتانا نہیں چاہتے۔

''مسٹر ایبل میرے اس نظریے کی بنیاد وہ کتاب ہے جو میں نے کمرے میں میز پر کھلی دیکھی تھی۔ میں نے اس کو ہاتھ تک لگانا گناہ سمجھا اور صرف وہ صفحہ ہی دیکھا جو سامنے کھلا ہوا تھا۔ اس کتاب کا تعلق قدیم ہندوستان سے دکھائی دیتا ہے۔'' لیم نے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ''آپ نے بھی مسٹر ایبل وہ کتاب دیکھی ہوگی۔''

''نہیں میں نے اب تک نہیں دیکھی۔ سیدھا آپ ہی کے پاس آرہا ہوں۔'' میں نے جواب دیا۔

''یسوع مسیح آپ کو اس سے محفوظ رکھے۔'' لیم نے پھر نصیحت کرتے ہوئے کہا۔ ''ایسی کتابیں انسانوں کی تباہی کا باعث ہوا کرتی ہیں۔ آپ جب گھر جائیں تو فوراً ہی اسے اٹھا کر نذر آتش کر دیں۔''

اس کے بعد چند منٹ تک ادھر ادھر کی باتیں ہوتی رہیں۔ اور میں گھر جانے کے لئے اٹھ کھڑا ہوا۔ لیم

بھی میرے ساتھ چند قدم تک رخصت کرنے آیا۔ رخصت کرتے وقت بوڑھے لیم نے ایک صلیب میری گردن میں ڈال دی اور نصیحت کی۔ ''ہمیشہ اپنے گلے میں لٹکائے رکھوں۔ کم از کم اس وقت مجھے ایسا کرنا چاہئے جب تک میں مکان میں مقیم رہوں۔'' اس کے بعد میں رخصت ہوگیا۔

ابھی سورج غروب ہونے میں ایک گھنٹہ باقی تھا۔ لیکن دھوپ اپنی تمازت کھوچکی تھی۔ فروری کے مہینے میں ویسے بھی سردی بہت شدید ہوا کرتی ہے جس کو سرد ہوائیں ناقابل برداشت بنادیتی ہیں۔ حتیٰ کہ دوپہر کے وقت سورج پوری آب وتاب سے چمک رہا ہوتا ہے۔ تو اس وقت بھی سردی سے دانت بجنے لگتے ہیں۔ صبح اور شام کے وقت تو حالت اس سے بھی بدتر ہوجاتی ہے۔ یہی کیفیت اس وقت بھی تھی جب میں لیم کے گھر سے روانہ ہوا۔ سردی کی تیز لہر سارے بدن کو چیرتی ہوئی محسوس ہوئی۔ کپکپی لگ گئی اور میرے دانت بجنے لگے۔ اس لئے میں نے سیدھا اپنے گھر جانا ہی بہتر سمجھا۔

قدیم طرز کا یہ مکان پانچ کمروں پر مشتمل تھا۔ تین کمرے نیچے اور دو اوپر کی منزل پر تھے جن کے ساتھ ایک چھوٹا سا باورچی خانہ ملحق تھا۔ میرے بچپن کی بے پناہ یادیں اس مختصر سے مکان سے وابستہ تھیں۔ نچلی منزل کے ایک کمرے میں ہمارا بوڑھا ملازم رہا کرتا تھا۔ دوسرا کمرہ مہمانوں کے لئے تھا۔ اور تیسرا بطور گودام استعمال کیا جاتا۔ جس میں گھر کا ٹوٹا ہوا فرنیچر، کچھ پرانے صندوق اور جلانے کی لکڑی پڑی رہتی۔ اوپر کی منزل کے دو کمروں میں سے ایک ہم دونوں بھائیوں کے تصرف میں تھا اور دوسرا والد صاحب اور والدہ کے لئے مخصوص تھا۔

جب میں مکان میں داخل ہوا تو نچلی منزل کے تینوں کمرے اس طرح ویران پڑے تھے جیسے برسوں سے ان کو کسی نے کھولا نہیں ہے۔ فرش پر مٹی کی موٹی تہہ جم چکی تھی۔ دیواریں گرد سے اٹی ہوئی تھیں۔ اور لکڑیوں سے جالا بن رکھا تھا۔ گویا میں اپنے مکان کے بجائے آثار قدیمہ کے کھنڈروں میں آ گیا تھا۔ اوپر کی منزل کی حالت اس کے بالکل ہی برعکس دکھائی دیتی تھی۔ کمرے کی دیواروں پر ہلکا سبز رنگ کیا ہوا تھا اور ہر چیز صاف ستھری اور بڑے قرینے سے رکھی ہوئی تھی۔ دروازے اور کھڑکی پر ہلکے آسمانی رنگ کے پردے لٹک رہے تھے۔ پلنگ پر صاف ستھرا بستر بچھا ہوا تھا۔ جس پر اجلی سفید چادر پڑی تھی۔

مختصر یہ کہ کمرہ ہر لحاظ سے قابل تعریف تھا۔ ساتھ والا کمرہ جس میں ہم دونوں بھائی سویا کرتے تھے اس کی حالت ایسی نہ تھی۔ مگر وہ بھی ہر طرح سے صاف ستھرا تھا۔ جیمز اس کمرے کو گودام کے طور پر استعمال کررہا تھا۔ آمنے سامنے کی دیواروں کے ساتھ نیچے سے اوپر تک شیلف لگے ہوئے تھے۔ میرے اندازے کے مطابق ان شیلفوں پر کم از کم ڈیڑھ دو ہزار کے لگ بھگ نئی اور پرانی کتابیں ترتیب سے رکھی ہوئی تھیں۔ ہر کتاب پر سیریل نمبر اور نام کی پرچی چسپاں تھی تاکہ تلاش کرنے میں آسانی رہے۔

کمرے کے سامنے والی دیوار کے ساتھ والد صاحب کے زمانے کے چند لکڑی کے بنے ہوئے پرانے صندوق اوپر تلے رکھے تھے جن کا رنگ تک خراب ہوچکا تھا۔ ان صندوقوں کے ساتھ لکڑی کی پندرہ پیٹیاں پڑی تھیں جو عموماً پیکنگ کے کام آتی ہیں، ان پیٹیوں سے میں نے یہ اندازہ لگایا کہ جیمز لندن سے آتے ہوئے ان میں کتابیں بند کرکے لایا ہوگا۔ اور اب یہ خالی ہی رکھی ہوئی ہیں۔

ہر ایک کمرے کا سرسری جائزہ لینے کے بعد میں کمرے میں آ گیا۔ آگ جلائی اور کافی کے لئے کیتلی میں پانی رکھ دیا۔ آتش دان کے قریب ہی دیوار میں لگی ہوئی الماری کو کھول کر دیکھا تو اس میں ابھی تک کافی اور شکر بند پڑی تھی جو میرا گمشدہ بھائی چند دن پیشتر خرید کر لایا تھا لوہے کے تار اور مچھلی پکڑنے کا جال وہاں نہیں تھے۔ یہ دونوں چیزیں تیسرے دن گودام سے ملیں۔

کافی پینے کے بعد میں نے میز پر رکھی کتاب کو

الٹ پلٹ کر دیکھا۔ میں اس کا ایک لفظ بھی نہ پڑھ سکا۔ خدا جانے یہ کس زبان میں لکھی ہوئی تھی۔ کتاب کے صفحات اور جلد چمڑے کی تھی۔ اور تحریر بھی ہاتھ کی لکھی ہوئی تھی جس کی بنا پر میں نے کتاب کی قدامت کا اندازہ لگایا کہ یہ چھاپے جانے کی ایجاد کے پہلے زمانے کی ہے۔ کتاب کے آخری صفحہ پر جیمز کے ہاتھ سے لکھا ہوا نوٹ دیکھ کر پتہ چلا کہ یہ کتاب قدیم زمانے کی ہے۔ اسی نوٹ میں ایک دوسری کتاب کا حوالہ دیا گیا تھا۔ میں نے کتاب بند کر کے میز پر رکھ دی۔ اور خود سونے کے لئے پلنگ پر لیٹ گیا۔

دن بھر کا تھکا ماندہ تھا لیٹتے ہی نیند آ گئی۔ مجھے سوئے ہوئے تین چار گھنٹے ہی گزرے ہوں گے کہ بے پناہ شور و غل سے آنکھ کھل گئی۔ سرہانے رکھے ہوئے میز پر پڑے ٹیبل لیمپ کو جلایا۔ باہر چمگادڑوں کی آواز بہت تیز سنائی دے رہی تھی۔

میں نے اٹھ کر کھڑکی کا پردہ سرکا کر شیشے میں سے باہر دیکھا۔ چاندنی رات تھی اور ہر طرف بڑی بڑی پروں والی سیاہ چمگادڑیں موجود تھیں۔ وقفے وقفے سے وہ ہولناک شور مچا رہی تھیں۔ ان میں ایک بہت بڑی چمگادڑ بھی تھی۔ جس کی انگارے کی طرح سرخ آنکھیں تھیں۔

پہلے وہ ایک بھیانک آواز نکالتی اور اس کے بعد دوسری چمگادڑیں اپنی اپنی چونچیں کھول کر زور زور سے ہیبت ناک آوازیں نکالتیں۔ ان کی آوازوں کی گونج نچلی منزل سے ٹکرا کر عجیب بھیانک صورت اختیار کر لیتی۔ اس بلائے ناگہانی سے چھٹکارا حاصل کرنے کی کوئی صورت مجھے دکھائی نہ دی۔ مجھے یہ ڈر تھا کہ اگر میں مکان سے باہر نکلا تو ممکن ہے یہ خونی چمگادڑیں مجھ پر حملہ آور ہوں اور میرا خون پی لیں۔ شور ہر لمحہ بڑھتا گیا پریشان ہو کر میں نے اپنے کانوں میں روئی ٹھونس لی اور بستر میں گھس کر کمبل منہ پر اوڑھ کر لیٹ گیا۔ نیند تو خیر کیا آنی تھی قدرے اطمینان ہوا۔

ذرا ہی دیر گزری ہوگی کہ مجھے کمرے کا دروازہ چرچراہٹ کے ساتھ کھلنے کی آواز سنائی دی۔ میں نے کمبل میں سے جھانکا تو خوف سے لرز اٹھا۔ کمرے کے دروازے میں ایک حسین جوان لڑکی کھڑی تھی۔ اس نے لمبا سفید باریک لباس پہنا ہوا تھا جس میں سے اس کا گورا بدن صاف جھلک رہا تھا وہ میری طرف بڑھی آ رہی تھی۔

میں نے خوف اور گھبراہٹ سے چیخ ماری اور کمبل پھینک کر کھڑا ہو گیا۔ وہ اپنے ہونٹوں پر دلفریب مسکراہٹ لئے میرے قریب آ گئی اور بولی۔

"گھبراؤ نہیں! میں تمہاری دوست ہوں۔"

"لیکن تم کون ہو؟ اور یہاں کیسے آئی ہو؟"

"میں تمہارا انتظار کر رہی تھی۔ اب تم آ گئے ہو تو میرے دل کو قرار آ گیا۔" اس نے بے چینی سے کہا۔

"لیکن میں تو نہیں جانتا آخر تم کون ہو۔" میں نے حیرانگی سے پوچھا۔

"میں برسوں سے اسی گھر میں مقیم ہوں۔ یہی میرا مسکن ہے۔" اس پراسرار حسینہ نے کہا۔

میری سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا کہ وہ کون ہے اور کیا چاہتی ہے؟ وہ میرے قریب آ گئی۔ اس نے اپنے لمبے باریک لباس کا بند کھول دیا۔ لباس ہوا میں لہرانے لگا۔ اس کا شفاف جسم برہنہ ہو کر میرے سامنے آ گیا۔ اور وہ مجھ سے لپٹ گئی۔ میرے گالوں اور گردن کے بوسے لینے لگی۔ نہ جانے اس نے مجھ پر کیا سحر کیا تھا کہ میں خود کو اس سے علیحدہ نہ کر سکا۔ مجھ پر غنودگی چھاتی گئی اور میں بستر پر گر گیا۔ مدہوشی کے عالم میں مجھے اتنا یاد ہے کہ پراسرار حسینہ میرے جسم کو دیوانوں کی طرح چوم رہی تھی اور باہر چمگادڑوں کا شور مچ رہا تھا۔ پھر میں بے ہوش ہو گیا۔

جب میری آنکھ کھلی تو صبح ہو چکی تھی اور کمرے میں دھیمی دھیمی روشنی پھیلی ہوئی تھی۔ میں نے اٹھنے کی کوشش کی لیکن میرے بدن کا ہر حصہ درد کر رہا تھا۔ بمشکل میں اٹھا تو یہ دیکھ کر میری چیخ نکل گئی کہ میرے بدن پر جگہ جگہ لمبے ناخنوں اور دانتوں سے کاٹنے کے

زخم تھے جس میں سے خون رس رہا تھا۔ میری سمجھ میں یہ نہیں آرہا تھا کہ یہ زخم کیسے ہوئے؟ بمشکل اٹھا اور زخموں کی ڈریسنگ کی۔

ذرا کچھ سکون ملا تو ناشتہ کیا اور لباس تبدیل کرکے باہر نکلا تاکہ ہمسایوں سے ملاقات کرکے معلومات حاصل کروں لیکن آج سب کا رویہ کل کی نسبت بہت ہی مختلف تھا۔ کوئی شخص مجھ سے بات کرنا گوارا نہیں کرتا تھا۔ ہر طرف سے مایوس ہوکر گھر چلا آیا۔ میز پر رکھی ہوئی اسی پرانی کتاب کو دیکھنے لگا۔ پھر میں نے آگے بڑھ کر کتاب اٹھانی چاہی تو یوں لگا جیسے شائیں شائیں کرتی ہوئی ہوا چلنے لگی ہو۔ اس ہوا کے شور سے کمرہ گونج اٹھا۔ میں نے اپنے ہاتھ پیچھے کرلئے تو ہوا کا شور کم ہوگیا۔ چند لمحوں بعد بالکل خاموشی چھا گئی۔ یہ اس بات کی غماز تھی کہ کتاب کو اب ہاتھ نہیں لگا سکتا تھا۔

مجھے دوسری کتاب کا خیال آیا جس کا حوالہ جیمز نے اپنے نوٹ میں دیا تھا۔ وہ کتاب ایک اسٹور میں رکھی ہوئی تھی۔ میں فوراً ہی اسٹور کی طرف گیا۔ دروازہ کھولا تو مجھے کرنٹ سا لگا۔ اور میں دھچکے کے ساتھ پیچھے آن گرا۔

میں نے ایک خوفناک منظر دیکھا جس سے میرا دل دہل اٹھا۔ کتاب ایک بلند میز پر رکھی ہوئی تھی۔ اور کتاب کے پاس ایک ڈھانچہ کھڑا ہوا تھا، اس کے استخوانی چہرے پر دو انگارے کی طرح سرخ آنکھیں چمک رہی تھیں۔ منہ اور ناک کی جگہ سیاہ خلا تھا۔ بے حد ڈراؤنی شکل تھی۔ مجھے دیکھتے ہی اس نے ہیبت ناک چیخیں مارنی شروع کردیں۔ میرے قدم وہیں دھنس گئے۔ نہ پیچھے ہٹ سکتا تھا اور نہ آگے بڑھ سکتا تھا۔ میری آنکھوں کے آگے اندھیرا چھانے لگا۔

چند ہی لمحے بعد میں نے آنکھیں اٹھا کر دیکھا تو ڈھانچہ غائب تھا اور اسٹور میں سے ایک بہت بڑی چمگادڑ چیختی ہوئی باہر نکل گئی۔

میں ہمت پیدا کرکے اسٹور میں داخل ہوا۔ اندر کی فضا بڑی خوفناک تھی دیواروں پر مکڑی کے بڑے بڑے جالے تنے ہوئے تھے۔ دیواروں پر سے پلاسٹر ادھڑا ہوا تھا۔ فرش خاک دھول سے اٹا ہوا تھا۔ ڈرتے ڈرتے میں نے کتاب کو ہاتھ لگایا۔ کوئی ایسی بات نہیں ہوئی یہ کتاب بہت پرانی تھی۔ کاغذ کا رنگ بگڑ کر گہرا زرد ہوچکا تھا۔ اور اس قدر بھربھرا کہ ہاتھ لگتے ہی ٹوٹ جاتا تھا۔

یہ کتاب بھی میرے لئے بہت ہی عجیب و غریب تھی۔ اس کی زبان بھی میرے لئے لاطینی ہی ثابت ہوئی۔ البتہ اس میں دو کاغذ میرے بھائی کے ہاتھ کے لکھے ہوئے تھے۔ ان دو کاغذوں کو لے کر میں کمرے میں آکر پڑھنے لگا۔ جن کو پڑھ کر معلوم ہوا کہ میز پر رکھی ہوئی کتاب دو ہزار سال پرانی ہے اور اس کی صرف تین کاپیاں دنیا میں موجود ہیں۔ اس کتاب کا نام ''ابدی زندگی'' ہے اور اس کا مصنف ایک سادھو گزرا ہے جو پراسرار قوتوں کا مالک تھا۔

اس کے ساتھ ہی ایک حیرت انگیز انکشاف ہوا کہ سادھو اپنی طبعی موت مرنے کے بعد دوبارہ زندہ ہوگیا ہے اور لامحدود وقت تک زندہ رہے گا اور اس کے تین چیلے اس وقت دنیا میں موجود ہیں جن کے پاس کتاب کی ایک ایک جلد موجود ہے۔ اس کتاب کی جلد انسانی عورت کی کھال سے بنی ہیں۔ اس کتاب کی پہچان یہ ہے کہ اس کی جلد پر انسانی خون کے دائرے بنے ہوئے ہیں۔ سادھو کے پیروکار ساری دنیا میں پھیلے ہوئے ہیں جو ان تینوں چیلوں کی ماتحتی میں کام کرتے ہیں۔ اور حالات کے مطابق ہر روپ دھار سکتے ہیں۔

جیمز کی تحریر پڑھ کر مجھے اتنا شدید صدمہ ہوا کہ بیان سے باہر ہے۔ میں نے کتاب میز پر سے اٹھا کر زمین پر دے ماری۔ اس کے ساتھ ہی ایک زبردست دھماکہ ہوا اور پوری عمارت ہل گئی۔ پھر ہولناک مکروہ آوازوں کا شور بلند ہوا جیسے کئی کتے اور بھیڑیئے مل کر رو رہے ہوں۔ میں نے فوراً ہی دونوں کاغذ نذر آتش کردیئے۔ اور پھر اسی لمحے خاموشی چھا گئی۔

اب میں نے رات کو آنے والی بدروحوں سے

نبرد آزما ہونے کا مصمم ارادہ کیا۔ اپنے ارادے کو میں نے عملی جامہ پہنانے کے لئے بازار سے ایک بندوق اور گولیوں کے چار ڈبے خریدے اور اپنے ریوالور میں گولیاں بھر کر جیب میں رکھ لیا اور خونخوار چمگادڑوں کا انتظار کرنے لگا۔

سورج غروب ہوگیا۔ رات نے تاریکی کا لبادہ اوڑھ لیا۔ گہری تاریکی میں فضا بڑی خوفناک لگنے لگی۔

جوں جوں وقت گزرتا گیا میرے اضطراب میں اضافہ ہوتا گیا۔ میں کبھی میز کے پاس پڑی کرسی پر بیٹھتا اور کبھی اٹھ کر ٹہلنے لگتا۔ سگریٹ پر سگریٹ پھونک رہا تھا۔ کئی بار کھڑکی پر لٹکے ہوئے پردے کو سرکا کر باہر دیکھا وہاں کچھ نہ تھا۔ فضا پراسرار لگ رہی تھی۔ رات کے دس بج گئے۔ چاند نے دور پہاڑیوں کی اوٹ سے اپنا زرد چہرہ نکالا تاریکی کم ہوگئی۔ چاند کی زرد روشنی پھیل گئی۔ آدھی رات گزر گئی۔ ہر طرف خاموشی اور پر ہول سکوت تھا جیسے کسی بڑے طوفان کی آمد سے پیشتر ہوا کرتا ہے۔

حالات کا غلط اندازہ لگا کر میں نے لباس تبدیل کیا اور سونے کی تیاری کرنے لگا۔ پلنگ پر دراز ہو کر ڈبیہ سے آخری سگریٹ نکال کر سلگایا۔ میں صبح شام سے اب تک تین پیکٹ سگریٹ پی چکا تھا۔ حالانکہ میں عام طور پر چوبیس گھنٹوں میں ایک پیکٹ سے زیادہ سگریٹ نہیں پیتا تھا۔ لیکن گزشتہ رات کے بھیانک واقعہ نے میرے دماغی سکون کو تہس نہس کر کے رکھ دیا تھا۔ میرے اعصاب پر وحشت سی طاری ہو چکی تھی اس لئے آتے وقت بازار سے سگریٹوں کے دس پیکٹ اٹھا لایا تھا۔

ابھی میں نے پلنگ پر لیٹے لیٹے آدھا سگریٹ ہی پیا ہوگا کہ زینے پر کسی کے آنے کی آہٹ سنائی دی۔ میں چوکنا ہو کر بیٹھ گیا۔

چند لمحوں بعد وہی پراسرار حسینہ میرے سامنے جلوہ گر تھی۔ آج اس نے سیاہ لباس پہنا ہوا تھا اس کا تمام بدن چھپا ہوا تھا۔ وہ میرے قریب آ کر مجھ سے باتیں کرنے لگی۔ میں نے اس سے نام معلوم کیا اور اس کے گھر کا پتہ دریافت کیا۔ مگر وہ میری ان باتوں کا جواب گول کر گئی۔ اور مجھ سے لپٹ کر اظہار عشق کرنے لگی۔ دوسرے ہی لمحے پراسرار حسینہ اپنا لباس اتار چکی تھی۔ اس کا گورا بدن چمک رہا تھا۔ پراسرار حسینہ کا بدن کسا کسا تھا۔ جسم کا ہر حصہ نظارۂ دعوت دے رہا تھا۔ حسینہ کے لبوں پر ہوس انگیز مسکراہٹ نمودار ہوئی۔ وہ اپنا جسم میرے جسم سے رگڑنے لگی۔ مجھ پر مدہوشی چھانے لگی۔ میں گہرائی میں ڈوبنے لگا۔

اچانک ایک مکروہ چیخ بلند ہوئی اس کے ساتھ ہی بھیڑیوں کے رونے کی مکروہ آوازیں سنائی دیں۔ پراسرار حسینہ مجھ سے علیحدہ ہوگئی۔ باہر چمگادڑیں چیخ رہی تھیں۔

میں پہلے جیسی حالت میں آ گیا۔ میں اٹھا اور کھڑکی سے جھک کر دیکھا۔ لاتعداد چمگادڑیں فضا میں چیختی ہوئی اڑ رہی تھیں۔ اور قطاروں میں سینکڑوں چمگادڑیں اڑتی چلی آرہی تھیں۔ پراسرار حسینہ مجھ سے لپٹ گئی۔ وہ بہت خوفزدہ نظر آرہی تھی۔

میں نے کھڑکی کو ذرا سا کھول کر دو تین ہوائی فائر کئے تو ایک لمحہ کے لئے آوازیں بند ہوگئیں۔ ان کو پرسکون دیکھ کر مجھے بہت غصہ آیا اور سب کو اپنی گولیوں کا نشانہ بنانے کا فیصلہ کر لیا۔

ان میں سے ایک بہت بڑی چمگادڑ اتر کر کھڑکی کے بالکل سامنے بیٹھ گئی۔ وہ جسامت اور قد و قامت میں اپنی ساتھیوں سے بڑی تھی۔ وہ اپنی گول گول بڑی بھیانک آنکھوں سے مجھے گھور رہی تھی۔ پھر اس نے بھیانک آواز نکالی۔ اس کے ساتھ ہی دوسری چمگادڑیں بھی بھیانک آوازیں نکالنے لگیں۔ اسی کے ساتھ بھیڑیوں نے ڈراؤنی آوازیں نکالنی شروع کردیں۔ میں نے اندازہ لگایا کہ یہی ان سب کی سردار چمگادڑ تھی۔ اگر اسے ماردیا جائے تو یقیناً باقی سب چمگادڑیں خوف سے اڑ جائیں گی۔ میں نے بغور دیکھا وہ بڑی چمگادڑ مجھے اب بھی گھور رہی تھی۔ قریب ہونے کی وجہ سے نشانہ بنانا بھی آسان تھا۔

میں نے گولی چلادی جو اس کی گردن کو توڑتی ہوئی نکل گئی اسی لمحے ایک دلدوز انسانی چیخ گونجی جسے سن کر میرے ہاتھ کانپ گئے۔ اور دوسری گولی چل گئی۔ اتفاق سے دونوں گولیاں یکے بعد دیگرے ایک ہی جگہ لگیں۔ دوسری بار پھر دلخراش انسانی چیخ بلند ہوئی جس سے میرے رونگٹے کھڑے ہوگئے۔ دوسری چمگادڑیں فضا میں اڑ رہی تھیں۔ اور پہلے کی نسبت کہیں زیادہ بلند اور بھیانک آوازیں نکال رہی تھیں۔ بھیڑیوں نے بھی عجیب آوازیں نکالنا شروع کردی تھیں۔

پھر ایک دلدوز حیوانی چیخ سنائی دی۔ مگر کہاں سے؟

مجھے یوں سنائی دیا جیسے یہ آواز مکان کے اندر سے آئی ہو۔ اس آواز کے بعد باہر چمگادڑوں نے پھر شور مچانا شروع کردیا۔ پھر وہی ہنگامہ بپا ہوگیا۔ کان پڑی آواز سنائی نہ دیتی تھی۔ لیکن اس مرتبہ ان آوازوں میں تبدیلی محسوس ہوئی جیسے سب مل کر رو رہے ہوں۔

میں نے دیوار سے کان لگا کر سنا، گودام سے ہلکی ہلکی کراہنے کی آواز آرہی تھی۔ وہاں کون ہوسکتا ہے؟ کیا کوئی شخص چمگادڑوں کے خوف سے وہاں آچھپا ہے۔ یا ان خون آشام چمگادڑوں نے کسی کو زخمی کردیا ہے اور وہ یہاں پناہ لئے ہوئے ہے۔ میں ابھی یہ سوچ ہی رہا تھا کہ پھر ایک مکروہ آواز گودام سے بلند ہوئی جس کی تائید میں باہر اڑتی ہوئی چمگادڑوں نے شور مچا کر آسمان سر پر اٹھالیا۔ تھوڑے تھوڑے وقفے سے گودام سے آوازیں بلند ہوتیں۔ اور ہلکے ہلکے درد سے کراہنے کی آواز آنے لگتی۔ کبھی کبھی دلدوز انسانی چیخیں بھی ابھرتی تھیں۔

میں نے یہ فیصلہ کیا کہ گودام میں جاکر دیکھا جائے۔ میں دبے پاؤں نیچے اترا اور ٹارچ روشن کرکے آہستہ سے گودام کے دروازے پر ہاتھ رکھا۔ دروازہ زوردار چرچراہٹ کے ساتھ کھلا اور خوف سے میں اچھل پڑا۔

سامنے بھیانک شکل کا ایک انسان جس نے کالا لبادہ پہنا ہوا تھا، اسی حسینہ کو بھنبھوڑ رہا تھا۔ اس آدمی کی شکل اس قدر خوفناک تھی کہ اس کی طرف دیکھتے ہوئے لرزہ طاری ہوتا تھا۔ چہرے کی جلد سکڑی ہوئی تھی۔ آنکھیں خون کی طرح سرخ تھیں۔ وہ اپنے لمبے لمبے ناخنوں سے دوشیزہ کے سینے کا گوشت نوچ رہا تھا۔

میں خوف سے دوڑتا ہوا کمرے میں گیا۔ وہاں سے جلتی ہوئی موم بتی اٹھالی۔ اور اس خوفناک انسان کی طرف بڑھا۔ روشنی دیکھتے ہی اس خوفناک انسان نے بھیانک آوازیں نکالنی شروع کردیں۔

دیکھتے ہی دیکھتے گودام میں دھواں پھیل گیا۔ یہ دھواں میری ناک میں داخل ہوا۔ مجھے اپنا دماغ ماؤف ہوتا محسوس ہوا۔ اعصاب جواب دے گئے۔ اور میں ذہنی کرب سے بیہوش ہوکر فرش پر گر پڑا۔

میں جب ہوش میں آیا تو صبح ہوچکی تھی۔ سورج کی روشنی بکھری ہوئی تھی۔ گرنے سے میرے سر میں سخت چوٹیں آئیں۔ درد کی شدت سے سر پھٹا جارہا تھا۔ گزرے ہوئے واقعات ایک ایک کرکے یاد آنے لگے۔ سارے کمرے کا جائزہ لیا۔ ہر چیز اپنی جگہ پر موجود تھی۔ کوئی خلاف معمول بات دکھائی نہ دی۔ ناشتہ کیا اور لباس تبدیل کرکے کرسی پر بیٹھ کر سگریٹ پینے لگا۔ اور رات کے واقعات کے بارے میں سوچنے لگا کہ اس مصیبت سے کیوں کر نجات پائی جاسکتی ہے۔

سوچتے سوچتے اچانک خیال آیا کہ جیمز کی جمع کی ہوئی کتابوں ہی میں اس کا حل موجود ہوگا۔ مجھے کتاب ''ابدی زندگی'' یاد آ گئی۔

میں نے کمرے میں چاروں طرف نظر دوڑائی۔ کتاب کمرے میں موجود نہ تھی۔ مجھے اچھی طرح یاد تھا کہ پلنگ پر لیٹنے سے پیشتر میں نے کتاب اٹھا کر میز پر رکھی تھی اب وہ وہاں موجود نہ تھی۔ کمرے کا کونہ کونہ چھان مارا مگر بے سود کتاب ہوتی تو ملتی۔ پھر مجھے اپنی جیب میں رکھے ہوئے ریوالور اور بندوق کا خیال ستانے لگا۔ فوراً کوٹ کی جیب دیکھی ریوالور موجود تھا اور گولیاں پوری بھری ہوئی تھیں۔ پھر مجھے

گودام میں کرانہنے والے کا خیال آیا۔ میں اٹھا اور گودام کے دروازے پر پہنچا۔ گودام میں داخل ہوتے وقت میری کیفیت اس بزدل شخص سے مختلف نہ تھی جو اپنے سائے سے بھی خوف کھانے لگا۔ قدم اٹھاتے وقت میری ٹانگیں آپس میں ٹکرانے لگیں اور دل زور زور سے یوں دھڑکنے لگا جیسے سینے کو توڑتا ہوا اچھل کر باہر آن گرے گا۔

گودام خالی تھا۔ دھڑکتے دل سے صندوق اور پیٹیوں کے پیچھے دیکھا وہاں بھی کوئی موجود نہ تھا۔ قدرے اطمینان ہوا۔ آگے بڑھا تو دیوار کے وسط میں کھڑکی کے سامنے کرسی دکھائی دی۔ کرسی اس طرح رکھی ہوئی تھی کہ کمرے میں کھڑے ہوئے کسی بھی شخص کو نظر نہ آتی تاوقتیکہ وہ پیٹیوں کے پیچھے آکے نہ دیکھتا۔

جب میں کرسی کے قریب پہنچا تو میری آنکھیں حیرت سے کھلی کی کھلی رہ گئیں۔ اس پر میرے بھائی جیمز کے کپڑے اس طرح ڈھیر کی صورت میں پڑے تھے جیسے وہ یہاں بیٹھا ہوا اور بیٹھے بیٹھے ہی اس کا جسم فضا میں تحلیل ہوگیا ہو۔ قیمص پر کالر کے پاس تازہ خون کا گہرا دھبہ تھا۔ میرے لئے یہ منظر ناقابل برداشت تھا۔ باوجود کھڑکی بند ہونے اور انتہائی سردی کے میرا جسم پسینے سے نہا گیا۔ یہ سب کیا ہے اور اصل حقیقت کیا ہے؟ میرے حواس معطل ہوگئے۔

اپنے لڑکھڑاتے قدموں سے میں پیچھے پلٹا اور شیلفوں میں لگی ہوئی کتابیں دیکھنے لگا۔ گمشدہ کتاب ''ابدی زندگی'' سیریل نمبر پر رکھی ہوئی تھی۔ کتاب کو وہاں دیکھ کر اپنی یادداشت پر بھی شک ہونے لگا۔ کہیں میں کتاب کو یہاں رکھ کر بھول تو نہیں گیا۔ میں نے بہت سوچا مگر کسی نتیجے پر نہ پہنچ سکا۔ میں کتاب کو وہاں سے اٹھالایا۔ اور کمرے میں رکھی ہوئی میز کی دراز میں رکھ کر تالا لگادیا تاکہ میری عدم موجودگی میں کوئی شخص لے نہ جائے۔

یہ سب واقعات میرا دماغی توازن خراب کرنے کے لئے کافی تھے۔ ان واقعات نے میرے تمام

مومن کی پہچان

اپنے دل کو حسد اور غرور سے پاک رکھے۔

اپنی زبان کو جھوٹ اور غیبت سے دور رکھے۔

اپنے پیٹ کو مشتبہ اور حرام غذا سے بچائے۔

(شہریار خان۔کھپرو)

نظریات متزلزل کردیئے تھے اور مجھے شیطانی قوتوں کا یقین ہونے لگا۔ یقیناً ان بدروحوں نے میرے بھائی جیمز پر قابو پالیا تھا اور میں اپنے بھائی کو ان سے نجات دلاؤں گا۔ چاہے مجھے اپنی جان سے ہی ہاتھ کیوں نہ دھونے پڑیں۔

ان بدروحوں کی تعداد بہت زیادہ تھی۔ اور بندوق یا چھوٹے سے ریوالور سے انہیں ختم کرنا انہیں ممکن نہ تھا۔ اس لئے میں نے سوچا کہ ڈائنا مائٹ استعمال کروں۔ مکان کے چاروں طرف ڈائنا مائٹ بچھا کر انہیں ختم کیا جاسکتا ہے۔ اور اگر کوئی مکان کے اندر داخل ہونے کی کوشش کرے گا تو اسے گولیاں کا نشانہ بنادوں گا۔

اپنی اسکیم کو عملی جامہ پہنانے کے لئے بارود، بجلی کے تار اور بیٹری خریدنے بازار گیا لیکن افسوس کہ گاؤں کی چھوٹی سی دکان پر یہ چیزیں دستیاب نہ ہوسکیں۔ میرے لئے ان چیزوں کو لندن سے لانے کے سوا کوئی چارہ نہ تھا۔ لندن گویا زیادہ دور نہ تھا مگر وہاں تک جاکر مطلوبہ اشیا لے کر جب میں گاؤں پہنچا تو ساڑھے نو بج چکے تھے۔ آدھ گھنٹے کی مزید تاخیر نے میری پریشانی کو کچھ اور بھی بڑھادیا تھا۔

گھر میں داخل ہوتے وقت مجھے ایک انجانا سا خوف محسوس ہورہا تھا۔ جسے رات کی گھٹاٹوپ تاریکی نے اور بھی بڑھادیا تھا۔

آپ یقین کریں یا نہ کریں لیکن حقیقت یہ ہے کہ میں نے کمرے میں جاکر ڈرتے ہوئے اندر سے

قفل لگالیا تھا۔

ایک دو مرتبہ گاؤں میں کتوں کے بھونکنے کی آواز سن کر ہی میرے پسینے چھوٹ گئے۔ حالانکہ یہ کوئی غیر معمولی بات نہ تھی اضطراب اس قدر بڑھا کہ میں بار بار کلائی پر بندھی ہوئی گھڑی دیکھتا تھا۔ مجھے ایسا محسوس ہورہا تھا جیسے وقت کی رفتار تھم گئی ہے۔ گھڑی کی سوئیاں بہت ہی آہستہ رینگ رہی تھیں۔ رات طویل تر ہوچکی تھی۔

چاند نکلا، تاریکی چھٹ گئی۔ پرہول خاموشی کو پرندوں کے شور نے توڑ دیا۔ میں کھڑکی کا پردہ سرکا کر باہر کی طرف دیکھا ہر طرف چمگادڑیں ہی دکھائی دیں۔ سب کی نظریں مکان کی طرف لگی ہوئی تھیں گویا مکان پر حملہ کرنے کے لئے مستعد ہوں اور صرف بڑی چمگادڑ کے حکم کا انتظار ہو۔ ان خبیث روحوں کا سردار کون ہے؟ میں نے غور سے دیکھا۔ یہ سب ایک سی تھیں۔ ان کے بیچوں بیچ ایک جگہ خالی تھی۔ کھڑکی کے بالکل سامنے والی جگہ جہاں میں نے کل رات سب سے بڑی جسامت والی بلا کو گولی مار کر ہلاک کردیا تھا۔ اس جگہ کو دیکھ کر میں یہ سوچے بغیر نہ رہ سکا کہ یہ سب اس کی منتظر تھیں ان کی خاموشی نے میرے خیال کی تائید کی۔ مجھے اطمینان ہوا کہ رات سکون سے گزرے گی اور کل رات ڈائنامائٹ سے انہیں بھون کر رکھ دوں گا۔

ایک گھنٹہ بڑے سکون سے گزرا۔ چاند آسمان پر پوری طرح بلند ہوچکا تھا۔ اتنے میں ایک فلک شگاف چیخ گونجی۔ کسی انسان کی دلدوز چیخ۔ پھر دوسری چیخ بلند ہوئی۔ کوئی شخص گودام میں موجود تھا۔ اس وقت گودام میں کون ہوسکتا ہے؟ کہیں کسی راہگزر پر ان چمگادڑوں نے حملہ کرکے اسے زخمی تو نہیں کردیا۔ اور اس نے جان بچانے کے لئے مکان میں پناہ لی ہو۔ مگر وہ گودام میں داخل کس راستے ہوا۔

میں ابھی سوچ ہی رہا تھا کہ باہر بیٹھی ہوئی چمگادڑوں نے بھیانک اور دردناک آوازوں سے آسمان سر پر اٹھالیا۔ آج ان کی پرہول آوازوں میں سوز و کرب کی کیفیت تھی جیسے وہ رو رہی ہوں، ماتم کناں ہوں، آہ و بکا کا نہ ختم ہونے والا سلسلہ شروع ہوچکا تھا۔

مجھے کھڑکی سے باہر جھانکتے دیکھ کر ان کے شور و غل میں اور اضافہ ہوگیا۔ دو چمگادڑیں مجھ پر حملہ کرنے کو جھپٹیں۔ مگر جوں ہی کھڑکی کے قریب پہنچیں چیختے ہوئے واپس پلٹیں۔ میں حیران تھا کہ آخر انہیں مجھ پر حملہ آور ہونے میں کون سی چیز مانع تھی۔ میں نے فوراً ہی کھڑکی بند کرلی اور خدا کا شکر ادا کیا کہ کھڑکی میں لگی ہوئی لوہے کی سلاخوں کی وجہ سے میری جان بچ گئی تھی۔ اس حملے سے میری رہی سہی قوت بھی جواب دے گئی۔ اس وقت مجھ میں کھڑا رہنے کی سکت بھی نہ تھی اور قریب پڑی ہوئی کرسی پر بیٹھ گیا۔

جیب سے سگریٹ نکال کر سلگاتے وقت میری انگلیاں کانپ رہی تھیں۔ میری حالت مُردوں کی سی تھی۔ کاٹو تو بدن میں لہو نہیں۔ میرے دل کی دھڑکنیں تیز ہوگئیں اور انسانی چیخ سن کر تو میں غیر ارادی طور پر کھڑا ہوگیا۔ اس طرح گھبراہٹ میں کرسی سے اٹھا کہ کرسی اوندھی ہوکر فرش پر گر پڑی۔

گودام میں چھپے ہوئے شخص کی مدد کو پہنچنا میرا اخلاقی فرض تھا جبکہ میرے پاس ریوالور اور بندوق بھی موجود تھی۔ میں بڑی تیزی سے قدم اٹھاتا ہوا گودام کے دروازے تک پہنچا۔ میرے دائیں ہاتھ میں ریوالور اور بائیں ہاتھ میں چھوٹی سی ٹارچ تھی۔ دروازہ کھولا۔ اندر مکمل تاریکی اور پراسرار خاموشی تھی۔ تھوڑی دیر تک میں دروازے پر کھڑا چاروں طرف گھورتا رہا میری آنکھیں تاریکی سے مانوس ہوچکی تھیں۔ مگر وہاں کچھ دکھائی نہ دیا۔ نہ کوئی آہٹ اور نہ ہی کپڑوں کی سرسراہٹ۔ ٹارچ روشن کی، کوئی نہ تھا۔ دبے پاؤں اندر داخل ہوکر میں نے پیٹیوں کے پیچھے دیکھنا چاہا تاکہ بعد میں پریشانی کا امکان نہ رہے۔

ابھی میں پیٹیوں کے قریب ہی پہنچا تھا کہ کھڑکی

کے کھلنے کی دھیمی سی چرچراہٹ سنائی دی۔ جیسے کوئی شخص بڑی احتیاط سے کھڑکی کھول رہا ہو۔

میرے دماغ میں طرح طرح کے خیالات گشت کرنے لگے۔ اور میں جلدی سے آگے بڑھا تاکہ کھڑکی کے راستے سے جو شخص بھی باہر نکلنا چاہتا ہو اسے پکڑ لوں۔ ریوالور میرے ہاتھ میں تھا۔ اور میں نے تہیہ کرلیا کہ ہر صورت حال کا مقابلہ کروں گا اور چھ کے چھ راؤنڈ چلادوں گا۔ چاہے کوئی مرے یا زندہ رہے۔ مجھے اس سے غرض نہیں۔

لیکن آپ یقین کریں کہ میں ایک گولی بھی نہ چلاسکا۔ گولی کس پر چلاتا۔ میرے سامنے میرا بھائی جیمز کھڑا تھا، میرا بھائی جیمز جسے میں تلاش کرتا پھر رہا تھا۔ اسی کی خاطر میں اپنی جان کی بازی لگائے ان کالی بلاؤں کی ہولناک آوازیں گزشتہ دو راتوں سے سن رہا تھا۔ میں نے پکارا۔ ''جیمز''

وہ کھڑکی سے باہر کودتے ہوئے رکا۔ پلٹا اور میری جانب لپکا۔ اس کے ہاتھ میرے گلے کی طرف بڑھے۔ اس کی آنکھوں سے وحشت ٹپک رہی تھی۔ اور چہرے سے نفرت کا اظہار ہو رہا تھا۔ میں ڈر کے ایک قدم پیچھے ہٹا۔ وہ آگے بڑھتا گیا لیکن میرے قریب پہنچتے ہی، ایک فلک شگاف چیخ مارتا ہوا پیچھے بھاگا۔ وہ کھڑکی سے باہر کود چکا تھا۔

کاش میں جیمز کو نہ دیکھتا۔ وہ منظر یاد کرکے آج بھی میرے رونگٹے کھڑے ہوجاتے ہیں۔ اس کی ٹھوڑی کے نیچے گردن میں گہرا سوراخ تھا۔ شہ رگ میں سے قطرہ قطرہ خون ٹپک رہا تھا جس کی وجہ سے اس کا سر ایک طرف کو لٹک گیا تھا۔

خوف کے مارے میری آواز گلے میں اٹک کر رہ گئی۔ میں بھاگ کر گودام سے نکلا اور کمرے میں داخل ہو کر اندر سے دروازہ مقفل کرلیا۔ میرا سانس پھولا ہوا تھا اور میں یوں ہانپ رہا تھا جیسے کئی میل کی دوڑ لگائی۔

تھوڑی دیر بعد میرے اوسان بحال ہوئے لیکن میں اب تک ایک بات سمجھ نہ پایا تھا کہ پہلے حملہ کرتے وقت یہ کالے پرندے جب میرے قریب پہنچے تھے تو چیختے ہوئے واپس کیوں ہوگئے تھے؟ مگر اب جیمز بھی مجھے جان سے مار ڈالتا مگر وہ بھی اس طرح چیختا ہوا کیوں بھاگ کھڑا ہوا؟

میں بہت دیر تک سوچنے کے بعد اس نتیجے پر پہنچا کہ ان بدروحوں کو صلیب سے ڈر لگتا ہے اور اسی لئے وہ مجھے اب تک کسی قسم کا گزند نہیں پہنچا سکیں۔ ورنہ وہ مجھے کبھی اس مکان میں نہ رہنے دیتیں۔

اس خیال سے میری ہمت بندھی کہ بوڑھے لیم کی دی ہوئی صلیب مجھے ان آفات سے بچائے ہوئے ہے اور کوئی شیطانی طاقت میرا بال بھی بیکا نہیں کرسکتی۔ میں نے کانپتے ہاتھوں سے کھڑکی کا پردہ سرکا کر باہر دیکھا۔ یہ بلائیں اب تک شور مچا رہی تھیں۔ ان کی ہیبت ناک آوازوں میں نمایاں تبدیلی ہوچکی تھی۔ اور اب ان میں سے کرب کا نہیں بلکہ شدید غصے اور نفرت کا اظہار ہو رہا تھا۔ اور سب سے عجیب بات یہ تھی کہ تھوڑی دیر کے لئے جو جگہ خالی تھی وہاں اب ان کا سردار بیٹھا تھا۔ وہی بلند قامت والی چمگادڑ جسے گزشتہ رات میں نے گولیاں ماری تھیں، اس کی گردن میں اب تک گہرا نشان موجود تھا جو اس کی بڑی سی مکروہ چونچ کے عین نیچے گولی لگنے کا تھا۔ اس کی گردن اب بھی ایک طرف کو لٹکی ہوئی تھی۔

میرے لئے یہ منظر انتہائی تکلیف دہ ثابت ہوا۔ یہ میرا جیمز ہی تھا اور وہی بدروحوں کا سردار تھا۔ دل کو دہلا دینے والی آوازیں بدستور جاری تھیں۔ یہ سلسلہ تمام رات جاری رہا اور میں ایک پل کے لئے بھی نہ سو سکا۔

مجھے اس مکان سے اب ڈر لگنے لگا تھا۔ کیونکہ یہ بدروحوں کا مسکن تھا، اسی لئے گاؤں والے خوفزدہ اور متنفر تھے۔ ان کی نفرت جائز تھی مگر اس کا حل کیا ہے؟ میں سوچتا رہا۔

مجھے خیال آیا کہ اس شیطانی کتاب کو جلا دینا چاہئے۔ یہی کتاب اس تمام ہنگامے کا باعث ہے۔ میں نے جیب سے چابی نکال کر میز کی دراز کھولی، وہ خالی

تھی، کتاب ایک بار پھر غائب ہوچکی تھی۔

ایسے حالات میں میرے لئے گودام میں جاکر کتاب تلاش کرنا ممکن ہی نہ تھا۔ میں باہر نکلتے ہوئے ڈر رہا تھا۔ اس لئے صبح تک اسی کمرے میں بند رہنا ہی بہتر سمجھا۔ میرے لئے یہ کمرہ ہی بہترین پناہ گاہ تھی۔ وقت کی رفتار سست ثابت ہوئی۔ کمرے کی پرہول تنہائی میں بھیانک آوازیں میرے لئے عذاب بن گئیں۔ سگریٹ پر سگریٹ پھونکے جارہا تھا۔ خدا خدا کرکے صبح ہوئی اور ان بدروحوں سے نجات ملی۔

صبح تڑکے ہی میں نے مکان کے چاروں طرف دس دس گز تک ڈائنا مائٹ کا گھنا جال بچھادیا۔ اور تاروں کا کنکشن بیٹری سے ملاکر پہاڑ تک لے گیا۔ جہاں ایک بڑے پتھر کے پیچھے چار پانچ آدمیوں کے بیٹھنے کی جگہ محفوظ تھی۔

سورج نکلنے سے پیشتر ہی میں سب کام سے فارغ ہوکر سیدھا اپنے دوست انسپکٹر مالکم سے ملنے کو چل دیا۔ اسے تمام حالات و واقعات سے آگاہ کیا۔ انسپکٹر مالکم نے پوری بات سننے کے بعد میرے خیال کی تائید کی اور بتایا کہ وہ پہلے ہی اس مکان کے بارے میں فیصلہ کرچکا ہے۔ لیکن میری اجازت کے بغیر ایسا کرنے سے باز رہا۔

پولیس اسٹیشن سے ہم دونوں مکان کی طرف چل دیئے کیونکہ دوبارہ اس مکان میں داخل ہوتے ہوئے مجھے ڈر لگ رہا تھا ہم نے مل کر مکان کی از سر نو تلاشی لی۔ لیکن ایسی کوئی علامت ظاہر نہ ہوئی۔ جس سے پتہ چل سکتا کہ یہ مکان بدروحوں کا مسکن ہے۔

میں نے لکڑی کے چاروں صندوق اور اپنا سامان نکالا تاکہ والدین کی نشانیاں اپنے ساتھ لے جاؤں اور باقی سارا سامان اور کتابیں وہیں کی وہیں رکھی رہنے دوں جن کا تعلق جیمز سے ہوسکتا تھا۔ سارا سامان ہم دونوں نے پولیس اسٹیشن پہنچادیا اور یہ سب کام اتنی خاموشی کے ساتھ کیا کہ کسی کو علم نہ ہوسکا۔ ایسا اس لئے کیا گیا کہ گاؤں کے لوگوں میں بہت سی افواہیں پھیلی ہوئی تھیں۔

سارے کام سے فارغ ہونے کے بعد میں نے صبح کے دس بجے سے رات کے دس بجے تک سارا دن انسپکٹر مالکم کے ساتھ گزارا۔ جونہی رات ہوئی میں اور انسپکٹر مالکم مکان کے پچھواڑے کی اوٹ میں جاکر بیٹھ گئے۔

چلتے وقت مالکم نے بھی ایک صلیب اپنے گلے میں لٹکالی تاکہ اگر حالات قابو سے باہر ہوجائیں تو جان بچی رہے۔ اس کے ساتھ ہی ایک اسٹین گن بھی مالکم نے اپنے ساتھ رکھ لی تھی۔ اس طرح ہم دونوں نے اپنے طور پر بچاؤ کی ہر ممکن تدابیر کرلی تھیں۔

ہم دونوں اسی طرح چپ ساڑھے تقریباً ایک گھنٹہ تک بیٹھے رہے۔ سردی بڑھتی جارہی تھی۔ اور یخ بستہ ہوائیں چلنے سے ہم دونوں کانپنے لگے تھے۔ اس صورتحال سے بچنے کے لئے میں نے اپنے ساتھ ایک کمبل رکھ لیا تھا کیونکہ مجھے علم تھا کہ چمگادڑیں اپنی منحوس شکلوں کے ساتھ اس وقت آتی ہیں جب چاند نکل چکا ہو۔ چاند کے نکلنے میں ابھی کم از کم دو گھنٹے باقی تھے یعنی گیارہ بجے کے قریب ہی چاند نکلتا تھا۔

جوں جوں وقت گزرتا جارہا تھا میری بے چینی بڑھتی جارہی تھی لیکن مالکم کے سامنے میں اپنی بے چینی اور بزدلی کا اظہار نہیں کرنا چاہتا تھا۔ یہی کیفیت انسپکٹر مالکم کی بھی تھی۔ اور اس کے بعد جنگل کی سمت سے چمگادڑوں کے جھنڈ کے جھنڈ نمودار ہوئے جنہوں نے حسب معمول سارے مکان کا محاصرہ کرلیا۔

مالکم پھٹی پھٹی نظروں سے یہ سب دیکھ کر حیران ہورہا تھا لیکن میرے لئے یہ کوئی نئی بات نہ تھی۔ میں تو گزشتہ تین راتوں سے ان مکروہ منحوس اور خوفناک بدروحوں کو دیکھ رہا تھا۔ پھر وہی سلسلہ شروع ہوگیا۔

پہلے مکان کے اندر سے بڑی ہولناک انسانی چیخ سنائی دی۔ یہ جیمز کی آواز تھی جسے سن کر مالکم کانپ

اٹھا اور اسٹین گن پر اس کے ہاتھ کی گرفت مضبوط ہوگئی۔ اس چیخ کو سن کر مالکم کا ڈرنا اور خوفزدہ ہونا تو یقینی بات تھی۔ حقیقت میں میرے بھی اوسان خطا ہوگئے تھے حالانکہ میں اس سے پیشتر بھی بہت ہی دل دہلا دینے والی فلک شگاف چیخیں سن چکا تھا۔

ہر طرف شور سنائی دینے لگا۔ وہی ہولناک اور مکروہ آوازیں، میرا دماغ پھٹنے لگا۔ مالکم سے یہ برداشت نہ ہوسکا اور اس نے اندھا دھند اسٹین گن سے آگ برسانا شروع کردی۔ لیکن ان بدروحوں پر برستی ہوئی آگ کا کوئی اثر نہ ہوا۔ مالکم یہ دیکھ کر گھبرا گیا۔ اس کے ہاتھ کانپنے لگے اور مجھے بھی اپنی ہمت جواب دیتی محسوس ہونے لگی۔

میں نے مالکم سے کہا۔ ''وہ اسٹین گن سنبھالے یہیں بیٹھا رہے اور اگر حالات خطرناک ہوں تو بے دریغ گولیاں چلادے یا پھر موقع محل کے مطابق اپنی جان بچانے کے لئے یہاں سے بھاگ جائے۔'' مالکم نے مجھے مکان کے پاس جانے سے روکنے کے لئے بہت کوشش کی لیکن میں نے اس کی ہر بات سنی ان سنی کردی۔ اور بھاگتا ہوا مکان کی طرف بڑھا، جونہی میں بدروحوں کے پاس پہنچا تو وہ گھبرا کر ایک طرف کو ہٹ گئیں۔ لیکن میں نے احتیاط کے طور پر آگے بڑھنا مناسب نہ سمجھا اور وہیں سے بھاگتے ہوئے ایک صلیب مکان کی چھت پر پھینک دی۔

صلیب کو چھت پر پھینکنے کے بعد میں نے مڑ کر نہیں دیکھا اور اسی تیز رفتاری سے بھاگتا ہوا واپس مالکم کے پاس جا پہنچا۔ تھوڑا سا فاصلہ طے کرنے کے بعد میری حالت شدید تھی۔ گھبراہٹ، خوف اور جوش کی وجہ سے میرا سارا جسم پسینے میں نہا گیا۔ صلیب پھینکنے کے بعد کئی طرف سے چمگادڑیں میرے تعاقب میں آئیں لیکن وہ میرا کچھ نہ بگاڑ سکیں۔ اب تو اس قدر ہنگامہ بپا ہوا کہ خدا کی پناہ!

اتنے میں ہماری نظر پولیس کے سپاہیوں پر پڑی۔ جو گولیوں کی آواز سن کر بھاگے چلے آرہے تھے۔ سپاہیوں کو مکان کی طرف آتا دیکھ کر مجھے خطرے کا احساس ہوا۔ کہیں یہ شیطانی قوتیں ان بیچاروں پر نہ ٹوٹ پڑیں۔

میں نے ایک لمحہ رکے بغیر بیٹری کا ہینڈل پوری قوت سے دبادیا۔ دھماکہ ہوا۔ ایک۔ دو اور پھر لگاتار بہت سے دھماکے ہونے لگے۔ زمین یوں لرز رہی تھی جیسے زلزلہ آگیا ہو۔ پوری عمارت کے پرخچے اڑ گئے۔ مکان کی طرف سے بھیانک آوازیں ختم ہوچکی تھیں۔ اور بے شمار انسانوں کی چیخ و پکار اور رونے کی دلدوز آوازیں آنے لگی تھیں۔

سپاہی سڑک کے کنارے ہی لیٹ کر یہ بھیانک منظر دیکھ رہے تھے۔ یہ سلسلہ تقریباً پون گھنٹہ تک جاری رہا۔ پھر ہر طرف گھمبیر خاموشی طاری ہوگئی۔ میں اور مالکم اپنی جائے پناہ سے نکل کر سپاہیوں کے پاس پہنچے۔ اتنے میں گاؤں کے لوگ بھی پہنچ چکے تھے۔ تقریباً ہر شخص اپنے ہاتھ میں لالٹین یا ٹارچ لئے ہوئے تھا۔ مالکم اور میں نے مکان کا چپہ چپہ چھان مارا لیکن وہاں نہ تو کسی چمگادڑ کی لاش ملی اور نہ ہی کوئی ایسی علامت دکھائی دی جس سے ان کا وجود ظاہر ہوتا۔

دوسرے دن جب میں لندن روانہ ہونے لگا۔ وہاں کے سب لوگ مجھے الوداع کہنے مالکم کے گھر آئے۔ وہ سب خوش تھے لیکن میری آنکھوں میں آنسو تھے۔ معلوم نہیں اب میرے بھائی کی سکونت کہاں ہے؟

یہ ہے وہ حقیقت جس پر شاید آپ لوگوں کو یقین نہ آئے۔ میں اپنی اس آپ بیتی کے بارے میں صرف اتنا کہہ سکتا ہوں کہ جس شخص کو میری بات پر یقین نہ ہو، وہ لندن کے پولیس ہیڈ کوارٹر جاکر نہ صرف اس واقعے کے متعلق معلوم کرسکتا ہے بلکہ پولیس ریکارڈ میں بھی دیکھ سکتا ہے۔



موت کی آواز

ایس امتیاز احمد۔ کراچی

یخ بستہ ٹھٹھرتی ہوئی رات تھی سردی کی وجہ سے اپنے دانت بھینچے ہوئے وہ شخص منزل کی طرف رواں دواں تھا کہ سسکیوں کے ساتھ ھی دور سے جسم و جاں کو تھرا دینے والی خوفناک آواز سنائی دی تو.....

وہ مخصوص رات ہوتی تھی جبکہ موت کی چنگھاڑ سنائی دیتی تھی، خوفناک ڈراؤنی کہانی

نئے! سال کی تاریک اور ٹھٹھرتی ہوئی رات تھی۔ چاند تک بادلوں کی پناہ میں چھپنے کی کوشش کر رہا تھا۔ بادلوں کے ٹکڑے کھلے آسمان میں اڑتے ہوئے کسی نامعلوم سمت کی طرف رواں دواں تھے۔ گوٹھ سارن شاہ میں دبیز خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ کسی بھیانک دلدل کی طرح ساکن اور پراسرار ہوا کے جھونکے درختوں سے سرگوشیاں کرتے گزر رہے تھے۔ کھیتوں کے درمیان پگڈنڈی پر آگے بڑھتے ہوئے مہرداد نے اچھی طرح سے شال اپنے بدن کے گرد لپیٹ رکھی تھی۔ پھر بھی وہ اس خزاں رسیدہ پتے کی طرح کانپ رہا تھا، جس کو شاخ سے جدا ہونے کا خوف ہو۔

سردی تو اسے لگ رہی تھی مگر اس وقت اس کا کانپنا خوف کی وجہ سے تھا اور یہ خوف ہر گزرتے لمحے کے ساتھ بڑھتا جا رہا تھا...... اندیشے اور وسوسے اس کے دل و دماغ کو جکڑ رہے تھے۔

وہ جلد از جلد اپنے گھر پہنچنا چاہتا تھا جہاں اس کی بیوی تھی اور ایک بیٹا تھا۔ اسے اپنی بھی فکر تھی اور ان کی بھی۔ چلتے چلتے اس نے شال کے کونے سے ماتھے پر آنے والا پسینہ پونچھا اور بولا۔ ''خدایا...... رحم کرنا......''

ہوا کے ایک تند جھونکے پر پگڈنڈی کے کنارے لگے ایک درخت کا سایہ جھوما اور اسے ایسے لگا جیسے اس کی اونچی شاخ سے کوئی سایہ کودا ہو...... وہ ٹھٹک کر رک گیا۔ اس کے قدموں کے پاس سے دھول کا ایک مرغولہ سا اٹھا۔ نم دار مٹی کی ٹھنڈی ٹھنڈی کنکریاں اس کے پیروں پر گریں۔

''کک...... کوئی ہے وہاں؟'' یہ آواز دل سے وسوسہ بن کر چیخ کی صورت میں اس کے حلق سے بلند ہوئی تھی۔

اس نے اپنے سر کو جھٹکا...... واقعی کوئی تھا یا اس کی نظروں کو دھوکا ہوا تھا؟ چند لمحے یونہی مبہوت رہنے کے بعد جب اس نے سوچا تو اسے خود پر یقین نہ آیا۔

''شاید میں بہت زیادہ ڈرنے لگا ہوں...... جب ہی مجھے ہر شے کسی عفریت کی مانند محسوس ہو رہی ہے۔''
اس نے اطمینان کا سانس لیتے ہوئے سوچا۔ مگر وہ جانتا تھا کہ وہ اپنے آپ کو طفل تسلی دے رہا ہے۔ خوف کے نادیدہ ہاتھ سختی سے اس کے دل بھینچے ہوئے تھے اور وہ اپنے ذہن کو ادھر ادھر کر کے آنے والے خوفناک خیالات کو بھٹکانے میں لگا ہوا تھا۔

وہ آگے بڑھ گیا۔ اوہام چپکے سے اس کے دماغ سے نکل آئے تھے اور اتنے بڑے ہو گئے تھے کہ اس کے



گرد پھیل کر سائے بن گئے تھے۔ جہاں تک اس کی نگاہ جاتی تھی موت کا سایہ نظر آتا تھا جو اس کے دیکھنے پر درختوں کی لہراتی شاخوں کے عقب میں، تیار فصلوں کے اندر یا رات کے اڑتے پرندوں کے سایوں میں تحلیل ہوجاتا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ موت تعاقب میں ہے.....مگر کس کے......؟ یہی وہ سوچ رہا تھا۔ خوف اسے یہ تھا کہ شکار وہ بھی ہوسکتا ہے، اس کی بیوی بھی اور اس کا اکلوتا بیٹا عمرداد بھی۔

آج رات گاؤں کے تمام لوگ اپنے اپنے گھروں میں بند تھے۔ مہرداد جانتا تھا کہ خوف کے آسیب نے ان سب کی آنکھوں کی نیند چرالی ہوگی، کالے چور کی طرح جس کے متعلق سب جانتے ہیں کہ وہ چیزیں چراتا ہے مگر آج تک نظر نہیں آیا کہ چور ہے کون؟ ان کے اندر یا ان کے درمیان......؟

نئے سال کے شروع کی رات ایسی بھیانک تھی کہ سب گاؤں والوں کو اپنی جانوں کے لالے پڑے ہوئے تھے۔ ہر کوئی اس رات سونے سے بھی ڈرتا تھا کہ کہیں بے خبری میں موت نہ آجائے۔ مگر دہشت کی فضا مین پل پل مار ڈالنے والے اندیشے لوگوں کے ذہنوں میں برابر نقب لگاتے رہتے تھے۔

مہرداد اس وقت شہر سے اپنے گھر لوٹ رہا تھا۔ وہ مہینے بھر فیکٹری میں کام کرتا تھا۔ مہینہ بعد دو تین دن کی چھٹیاں لے کر اپنے گاؤں آتا تھا۔ آج لوکل بس کچے راستے پر چلتی ہوئی کسی کھڈے میں جا اتری تھی۔ جھٹکوں سے لوگوں کی چوٹیں تو بہت آئی تھیں مگر جانیں بچ گئی تھیں۔ لوگوں نے پہلے تو اللہ کا شکر ادا کیا، پھر جب ان کے حواس بحال ہوئے تو ڈرائیور اور کنڈیکٹر کو برا بھلا کہنا شروع کردیا۔ اس وقت شام ہوگئی تھی۔

مہرداد کافی دیر تک دوسری بس کے انتظار میں کھڑا رہا۔ جب کوئی بس نہ آئی تو اس نے پیدل ہی سفر کرنا شروع کردیا۔ اسے چلتے ہوئے چار گھنٹے ہونے والے تھے اور اب وہ اپنے گاؤں میں داخل ہو رہا تھا۔ تھکن سے اس کا جوڑ جوڑ دکھ رہا تھا۔ مگر وہ دو گھڑی بھی آرام کی غرض سے بیٹھنا نہیں چاہ رہا تھا۔

اچانک اس نے کھیت میں سرسراہٹ کی آواز سنی......پھر بھی وہ آگے چل پڑا......آواز بہت قریب سے آئی تھی اور یہ ہوا کی گستاخی ہرگز نہ تھی۔ اس نے وحشت زدہ نظروں سے دیکھا......کچھ نہ تھا......صرف تاریکی تھی......مگر......مگر تاریکی میں دو چمکتی آنکھیں اسے گھور رہی تھیں۔

کیا...... وہ موت سے نگاہیں ملائے کھڑا ہے؟
اس کے ذہن میں جھکڑ چلے......خیالوں کے......

لیکن وہ کھیتوں کا رکھوالا کتا تھا...... وہ معاً اپنی مکروہ آواز میں اس پر بھونکنے لگا......مہرداد نے جواباً اسے شُشکارا۔ کتا اپنے گاؤں میں مہینے دو مہینے میں آنے والے اس مہمان کو پہچان گیا تھا چنانچہ وہ اپنی جگہ کھڑا اغراتا رہا...... اور بھونکتا رہا......مہرداد اب گاؤں کے کچے پکے مکانوں کے درمیان سے گزر رہا تھا۔ ہر طرف ہو کا عالم تھا۔صرف اس کے قدموں کی چاپیں اس کا پیچھا کر رہی تھیں۔

یہاں رہنے والے دوسرے لوگ بھی اپنے کمروں میں بستروں میں دبکے موت کی آواز پر دکان لگائے بیٹھے تھے۔

چلتے چلتے اس نے دیکھا کہ ایک گھر کا دروازہ ذرا سا کھلا ہوا تھا۔اس کی جھری سے روشنی باہر گلی میں آرہی تھی اور کوئی ہراساں آنکھ اسے دیکھ رہی تھی۔مہرداد نے جب اسے دیکھا تو تیز سسکیوں کی آواز سنائی دی......

معاً دور سے ایک گھنٹے کی تھرا دینے والی آواز گونجی......

ہوا کے جھکڑ زور زور سے چلنے لگے۔مہرداد نے گھگھیا کر فوراً ہی اپنے کانوں میں انگلیاں ڈال لیں گر اس پراسرار گھنٹے کی آواز اس کے دماغ میں گونج رہی تھی۔ ناگہاں دروازے کا پٹ دھڑ سے کھلا، دروازے کے پیچھے چھپا وہ شخص چیخ مار کر باہر آ گرا اور گلی کے کچے راستے پر ماہی بے آب کی طرح تڑپنے لگا۔

مہرداد پھٹی پھٹی نظروں سے اس آدمی کو مرتا دیکھ رہا تھا اور وحشت سے اپنے سر کے بال نوچ رہا تھا...... پراسرار......خونی قاتل...... اس گھنٹے نے ہر سال کی طرح اس سال بھی ایک جان لے لی تھی۔

مہرداد چیخا...... ’’نہیں ...... یہ بھینٹ ہے۔‘‘

یہ واقعہ پورے سال اسے خوابوں میں نظر آتا رہا۔کبھی خواب میں وہ اپنے آپ کو اس شخص کی جگہ مرتا دیکھتا، کبھی اپنے بیٹے کو اور......کبھی اپنی بیوی کو۔

گاؤں کے کنارے پر لگا وہ بڑا سا آہنی گھنٹہ اور اس کی عمارت صدیوں پرانی تھی۔مگر اب بھی بہت اچھی حالت میں تھی...... گاؤں والے اسے موت کا گھنٹہ کہتے تھے۔اس کا بجنا نحوست کی علامت سمجھا جاتا تھا اور یہ یقین کیا جاتا تھا کہ سال کے شروع رات کو جب وہ پراسرار طور طریقے سے ہل کر بجتا تھا تو کسی نہ کسی کی بھینٹ لے لیتا تھا...... اگر کوئی نہ مرتا تو کسی سخت بیماری میں مبتلا ہو جاتا یا سخت مصیبتیں نازل ہو جاتیں۔

مہرداد کو اس رات یہی خوف تھا کہ وہ کہیں رات کے سناٹے میں پھرتا ہوا اجل کا شکار نہ بن جائے۔لیکن قضا اس کی آئی جو اس سے تھوڑے فاصلے پر اپنے گھر کے دروازے کی اوٹ سے جھانک رہا تھا۔

مہرداد نے اس مرتے ہوئے وجود کو بے بسی سے اینٹھتا ہوا دیکھا اور دروازے سے باہر گلی میں آتی کم زرد روشنی میں زندگی کی تمازت اور سرخی سے محروم ہوتے چہرے کی ایک ایک شکن کرب ناک جھلکتی محسوس کی۔ اس کو بڑی اذیت ناک موت آئی تھی اس کی دہشت نے مہرداد کی زندگی اذیت کے تنور میں جھونک دی تھی۔

آج پھر سال کا اختتام تھا مہرداد گھر جلدی آ گیا تھا۔اس بار سردی بھی بڑی کڑاکے کی پڑ رہی تھی۔تاریکی میں منہ سے بھاپ یوں نکلتی جیسے وحشت کا منظر پیش کرنے والے پرانے مندر میں سلگتی اگربتی سے اٹھتا دھواں خاموشی بھی کسی پتھر کے بت کی طرح ساکن اور منجمد تھی۔

گاؤں کی فضا شہر کی بہ نسبت بہت زیادہ سکون ہوتی ہے......اور اس روز تو معمول سے پہلے ہی گاؤں پر ویرانی چھا گئی تھی۔

مہرداد جب گھر آیا تو اس نے اپنی بیوی کو پریشانی کے عالم میں اپنا منتظر پایا۔اس کے پوچھنے پر بیوی نے بتایا کہ ان کا اکلوتا بیٹا عمرداد بیمار ہے۔اسے سردی سے بخار ہو گیا تھا۔گھر میں کوئی دوا بھی نہیں تھی۔شام سے پہلے گاؤں کا واحد مطب بند ہو گیا تھا۔عمرداد کا بخار بڑھنے لگا تو وہ ہمت کر کے حکیم کے گھر گئی تھی مگر حکیم کو خود اپنی جان کی پرواہ تھی کہ کہیں وہ پراسرار گھنٹے کی بھینٹ نہ

چڑھ جائے۔ کوئی دوسرا بھی اپنی گھوڑا گاڑی یا بیل گاڑی لے کر عمرداد کو دوسرے قصبے میں لے جانے کے لئے تیار نہ تھا۔ کیونکہ سب کو اپنی جان پیاری ہوتی ہے، ویسے بھی یہ گاؤں دوسری آبادیوں سے الگ تھلگ تھا۔ دوسرے گاؤں اور قصبے یہاں سے بہت دور تھے۔ مہرداد نے اپنے طور پر بھی کوشش کی۔ حکیم صاحب کے گھر کا دروازہ کھٹکھٹایا اور انہیں پیسوں کا لالچ دیا۔ پہلے تو حکیم صاحب نے دروازہ نہ کھولا، جب انہیں خوب برا بھلا کہا اور دھمکیاں دیں تو اس کا اتنا ردعمل ضرور ہوا کہ حکیم صاحب نے ڈر کے اسے کسی دوا کی پڑیا دے دی۔

مہرداد نے وہ دوا اپنے بیٹے کو کھلا دی اور کچھ مطمئن ہوگیا۔ تاہم دوسرے لوگوں کی طرح وہی خوف بچھو کے ڈنک کی طرح خیال بن کر اس کے دماغ میں ڈنک مارتا رہا کہ آج کی رات بھینٹ کی رات ہے۔ اس پراسرار گھنٹے کی نحوستیں اپنا شکار تلاش کرنے کے لئے گاؤں میں دندناتی پھر رہی ہیں۔ اس کا شکار اب کون ہوگا......؟

''کیا اس کا اکلوتا بیٹا عمرداد نحوستوں کی گردش میں ہے؟ کیا اس کی موت دھیرے دھیرے قریب آرہی ہے؟ کیا سرہانے بیٹھی اس کی بیوی موت کا گھنٹہ بجنے کا انتظار کررہی ہے؟......''

سوچ سوچ کر وہ پاگل ہورہا تھا۔ ہراساں کردینے والے ان خیالات کو لاشعور کے زندان میں پھینک کر مقفل کردینا چاہتا تھا۔ اس نے اپنے آپ کو دلاسا دینے کی حتیٰ الامکان کوشش کی لیکن خیالات کی جنگ موت اور زیست کی کشمکش کی طرح تھی۔ اس کی پریشانی اور اضطراب بڑھتا جارہا تھا۔

اسی دوران بہت سا وقت بیت گیا۔ رات نے آسمان کو سیاہ ماتمی چادر اوڑھادی تھی فضا تک بوجھل ہورہی تھی۔ چاند اور ستارے بھی دبیز بادلوں کی اوٹ میں چھپے ہوئے تھے۔ مہرداد نے جب اپنے بیٹے کے ماتھے پر ہاتھ رکھ کر بخار محسوس کیا تو وہ متوحش ہوگیا۔ اس کا بیٹا حرارت سے پھنک رہا تھا۔

''یہ سب...... یہ سب نحوستوں کی وجہ سے ہورہا ہے۔'' اس کی بیوی نے سراسیمہ لہجے میں کہا۔

''آج کی رات بڑی بھیانک ہے......'' مہرداد نے بے بسی سے ہاتھ ملے۔ اس کا پورا بدن کانپ رہا تھا۔

''مجھے ایسا لگ رہا ہے جیسے...... اس بار...... مجھے کہتے ہوئے بھی خوف آتا ہے کہ ہمارا بیٹا شکار ہوسکتا ہے۔ مجھے اس تصور سے بھی تکلیف ہوتی ہے۔''

اس کی بیوی نے یکایک وحشت سے چلانا شروع کردیا:

''جاؤ...... جاکر...... کچھ کرو...... میرے بیٹے کو بچالو''۔

مہرداد نے اسے بری طرح جھنجھوڑ ڈالا۔

ہوش میں آؤ...... میں...... میں کیا کرسکتا ہوں...... موت کے آگے کون پہرے ڈال سکتا ہے۔''

''نن...... نہیں...... صرف آج کی رات...... آج کی رات اس منحوس گھنٹے کو بجنے سے روک لو...... ورنہ وہ ہمارے بیٹے کی جان لے لے گا۔'' اس کی بیوی روتی رہی۔

اس کی بات پر مہرداد جھرجھری لے کر رہ گیا۔

''تم اس کے باپ ہو...... اس کو مرنے سے

گھرا کنواں

یہ نئی تہذیب اور ماڈرن سوسائٹی ایک ایسا گہرا کنواں ہے جس کی گہرائی میں گر کر انسان اپنی ہستی کو بھی کھو دیتا ہے۔

آج کل انسانیت کا چہرہ مسخ ہوچکا ہے۔ مگر اس گہرائی میں گرنے والے خوشی خوشی اجالوں کے دھوکے میں اندھیروں میں سماتے جارہے ہیں۔ کیا بنے گا۔ اندھیرے اجالے کی اس کشمکش کا۔ وقت کی ہوش ربا شراب میں مدہوش جب ہوش میں آئیں گے تو کیا اجالوں کو پاسکیں گے؟

(محمد رفیق۔ کھپرو)

بچالو...... یہ خطرہ مول لو...... موت کے گھنٹے کو بجنے سے روک لو......'' اس کی بیوی سر پکڑ کر روتی رہی۔

''ہاں...... ہاں...... یہ ہوسکتا ہے۔'' مہرداد نے بڑبڑاتے ہوئے کہا۔ ''میں...... میں اس گھنٹے کو ضرور بجنے سے روکوں گا۔ اس بار نحوست نہ ہونے دوں گا......''

وہ دیوانہ وار بھاگتا ہوا گھر سے نکل گیا۔ یخ بستہ ہوا کے جھونکوں نے اس کا استقبال کیا۔ اس کے حواس شکستہ ہورہے تھے۔ اس وقت وہ دیوانگی کی حالت میں تھا۔ جنون نے اس کے خوف کو شکست دے دی تھی۔ اس نے تاریک اور سنسان گلیوں میں بھاگنا شروع کردیا۔

اس ویران علاقے میں پہاڑی کے اوپر گھنٹہ اور اس کی کنوئیں جیسی عمارت کسی بدروح کے مسکن کی طرح معلوم ہورہی تھی۔ اسے دیکھ کر مہرداد کو احساس ہوا کہ پراسراریت ماحول کو کس قدر بھیانک بنادیتی ہے۔ اس کھلے علاقے میں ہوا بڑی تیز چل رہی تھی۔ اس کی رگوں میں خون جمنے لگا۔ ''کیا وہ واقعی اس قدیم اور نحوست زدہ گھنٹے کو بجنے سے روک پائے گا۔'' اس نے سوچا اور پہاڑی کے اوپر چڑھنے لگا۔ جب وہ اوپر پہنچا تو اسے ہوا کی شدت میں زیادتی محسوس ہوئی۔ ہوا کے تندو تیز سرد جھکڑ اسے ٹھٹھرا رہے تھے، اس کے حواسوں کو منجمد کررہے تھے۔

پراسرار گھنٹہ اس چوڑے کنوئیں کے اوپر بیچوں بیچ جھول رہا تھا۔ مہرداد نے ستون کا سہارا لیا اور شکستہ پتھروں کی منڈیر پر چڑھ گیا۔ نیچے گہرا کنواں تاریکی سے بھرا ہوا تھا۔ مہرداد نے جلتی نگاہوں سے گھنٹے کے اس موصل کو دیکھا جو بس ٹکرانے کے قریب تھا۔

سیاہ دھات کا گھنٹہ جس کا موصل مہرداد کے قد سے بھی بڑا تھا، گھنٹے کی دیواروں سے ٹکرا کر ہلاکت خیز گونج نکالنے ہی والا تھا۔ مہرداد نے چھلانگ لگائی اور موصل کو پکڑلیا۔ ایک جھٹکے سے جھولتا ہوا وہ گھنٹے کی دیوار سے ٹکرانے لگا تھا مگر اس نے اپنے پیروں کے زور پر خود کو گھنٹے سے ٹکرانے سے روکا۔ پھر بھی موصل کا اپنا وزن تھا اور حرکت کی طاقت تھی۔ پہلی بار موصل ٹکرانے سے بچا مگر اس کے ہاتھوں سے بھی پھسلتے پھسلتے بچا۔ اس نے ایک جانب اپنے آپ کو کنوئیں کی اتھاہ گہرائی میں گرنے سے بچانے کی جدوجہد کی اور دوسری جانب موصل کو گھنٹے سے ٹکرانے سے بچانے کی۔

آج گھنٹہ نہیں بجا تھا...... گاؤں میں اپنے اپنے گھروں میں خوف سے دبکے لوگ حیران تھے۔ ایک انہونی ہوگئی تھی۔

شامت کا مارا مہرداد موصل سے لٹکا تھا اس کے اعصاب شل ہوگئے، وہ اس پراسرار منحوس گھنٹے کے اندر چیخا اور پھر کنوئیں کی تاریکیوں میں گرنے لگا۔ اس کا وجود اندر نیچے ہی نیچے پتھریلے فرش پر جاگرا اور اس کی روح اوپر پرواز کرگئی۔

اگلی صبح گاؤں والے چہ میگوئیاں کررہے تھے۔ ان کے خیال میں جب گھنٹہ نہیں بجا تھا تو مہرداد کی جان کس نے لے لی تھی۔ وہ تو موت سے لڑنے گیا تھا اور خود موت کا شکار ہوگیا تھا۔

گاؤں کی اکلوتی مسجد کے امام صاحب سمجھا رہے تھے۔

''زندگی اور موت دینے کا اختیار اس ذات مطلق کے پاس ہے۔ انسان کے دل میں دنیا کی محبت بھرگئی ہے۔ وہ ہمیشہ دنیا میں رہنا چاہتا ہے۔ وہ موت کو بھلا بیٹھا ہے۔ اس کے لئے موت کو یاد کرنا تو درکنار اس کا خیال بھیانک ہے۔ اسی لیے نحوستیں تو جنم لیں گی۔ ضعیف الاعتقادی کی نحوستیں اور بداعمالیوں کی نحوستیں۔ مجھے دیکھو! میرے گھر کا کوئی فرد گھنٹہ کا نشانہ کیوں نہیں بنا؟ کیونکہ ہمارا گھنٹہ پر نہیں اللہ پر ایمان ہے، جس کی مرضی کے بغیر کوئی ہمارا بال بھی بیکا نہیں کرسکتا۔''

امام صاحب کی باتوں کا گاؤں والوں کے پاس کوئی جواب نہ تھا۔ اسی لئے ان کے سر شرم سے جھکے ہوئے تھے۔





اندھیرے کی آواز

ایس امتیاز احمد۔ کراچی

ایک نامعلوم جزیرے کی کہانی جس پر ایک ناقابل فہم مخلوق کی حکمرانی تھی، وہ مخلوق نہ کچھ کہتی اور کچھ سنتی تھی، بس آہستہ آہستہ غیر محسوس طور پر جاندار کو چاٹتی رہتی تھی اور اسے اپنے جیسا بنالیتی تھی۔

تاریکی کے ایک باسی کی کہانی جو کہ روشنی کا سامنا کرتے ہوئے گھبراتا تھا، پراسرار کہانی

وہ ایک تاریک رات تھی۔ ہم شمالی بحرالکاہل میں تھے۔ ہمارا جہاز کس مقام پر تھا یہ میں یقین سے نہیں بتا سکتا چونکہ ایک ہفتے کے اس تھکا دینے والے سفر کے دوران سورج اس دھند میں چھپا رہا تھا جو تاحد نگاہ چھائی ہوئی تھی۔ ہوا رکی ہوئی تھی اور میں وہ واحد شخص تھا جو عرشے پر کھڑا تھا۔ جہاز کا مختصر عملہ جو دو آدمیوں اور ایک لڑکے پر مشتمل تھا، نچلی منزل میں آرام کررہا تھا۔

ان کے علاوہ آرتھر جو میرا دوست اور اس نجی جہاز کا مالک تھا وہ اپنے کیبن میں سورہا تھا۔ اچانک جہاز کے اطراف میں پھیلی ہوئی تاریکی سے ایک آواز ابھری ''ارے ہوت!''

یہ پکار اس قدر غیر متوقع تھی کہ شدت حیرت کے باعث میں فوری طور پر اس کا جواب نہ دے سکا۔ کسی نے دوبارہ صدا بلند کی۔ وہ عجیب طرح کی بیٹھی

ہوئی اور غیر انسانی آواز تھی جو گھٹا ٹوپ اندھیرے اور سناٹے میں بڑی پراسرار محسوس ہو رہی تھی۔

''ہیلو۔'' میں نے کپکپاتی آواز میں کہا اور پھر اپنے حواس پر کچھ قابو پاتے ہوئے پوچھا۔ ''تم کون ہو اور کیا چاہتے ہو؟''

''تمہیں خوف زدہ ہونے کی ضرورت نہیں۔''

اس عجیب آواز نے جواب دیا۔ شاید اس نے میرے لہجے میں چھپے ہوئے خوف کو محسوس کرلیا تھا۔ وہی آواز پھر آئی۔

''میں ایک کمزور اور...... بوڑھا...... آدمی ہوں۔''

''تو تم جہاز کے قریب کیوں نہیں آتے؟'' میں نے ذرا ترش لہجے میں کہا کیونکہ مجھے یہ بات پسند نہیں آئی کہ اس نے میری کمزوری کو بھانپ لیا تھا۔

''میں...... میں نہیں آسکتا۔ میرا قریب آنا مناسب نہیں ہوگا۔'' میں اس نادیدہ ہستی کی آواز جذبات سے مغلوب ہوگئی اور پھر خاموشی چھا گئی۔

''تمہارا کیا مطلب ہے؟'' میں نے حیرت سے پوچھا۔ ''تمہارا قریب آنا کیوں مناسب نہیں ہوگا؟ تم کہاں ہو؟''

چند ثانیوں تک میں جواب کا انتظار کرتا رہا مگر وہ پراسرار آواز سنائی نہ دی۔ کسی انجانے خوف کے تحت میں نے جلدی سے اپنی دوربین اٹھائی اور دوسرے ہاتھ میں ٹارچ لے کر آرتھر کی کیبن پر دستک دی۔ یہ انتظار کیے بغیر کہ وہ باہر آئے میں واپس عرشے پر آیا اور سمندر کی عظیم وسعت میں اس سمت جہاں سے وہ آواز سنائی دی تھی ٹارچ سے روشنی پھینکی۔

جیسے ہی میں نے ایسا کیا، مجھے گھٹی گھٹی سی چیخ سنائی دی اور اس کے بعد میں نے چھپ چھپ کی آواز سنی جیسے کوئی جلدی جلدی چپو چلا رہا ہو۔ میں یقین سے نہیں کہہ سکتا کہ میں نے کیا دیکھا سوائے اس کے کہ سمندر میں جس جگہ میں نے روشنی پھینکی تھی، پانی پر کوئی چیز تھی جو اب وہاں سے غائب ہوچکی تھی۔

''تم کون ہو؟'' میں نے چیخ کر کہا۔ ''یہ کیا حماقت ہے؟''

مگر سوائے کشتی کھینچنے کی غیر واضح آواز کے کوئی اور آواز نہیں آئی۔

اس کے بعد مجھے آرتھر کی آواز سنائی دی جو کیبن سے نکل رہا تھا۔

''کیا بات ہے جارج؟''

''ذرا یہاں آؤ آرتھر۔''

''ہاں بتاؤ کیا بات ہے؟'' وہ عرشے پر میرے قریب آکر بولا۔

میں نے اسے چند لمحے قبل ہونے والے عجیب واقعہ کے بارے میں بتایا۔ اس نے مجھ سے کئی سوال کئے۔ اس کے بعد اس نے کچھ سوچا اور پھر مجھے خاموش رہنے کا اشارہ کرتے ہوئے چیخ کر کہا۔ ''ارے ہوت کشتی والے۔''

جہاز کے اطراف میں پھیلی ہوئی تاریکی میں کہیں دور سے غیر واضح سا جواب آیا۔ میرے ساتھی نے دوبارہ اس نادیدہ کشتی راں کو آواز دی۔ چند لمحوں کی خاموشی کے بعد ہمیں چپوؤں کی چھپ چھپ کی آواز قریب آتی سنائی دی۔ آرتھر نے اسے پھر پکارا۔

اس بار جواب واضح طور پر سنائی دیا۔

''آپ لوگ روشنی ہٹالیں۔''

''میں ایسا نہیں کروں گا۔'' میں بڑبڑایا لیکن آرتھر نے مجھ سے کہا کہ وہی کرو جو وہ آواز کہہ رہی ہے۔ میں نے بادل ناخواستہ فلیش لائٹ آف کردی۔

''اب قریب آجاؤ۔'' آرتھر نے چلا کر کہا۔

اس کے بعد چپوؤں کی آواز باقاعدگی سے آتی رہی۔ پھر ہمارے جہاز سے تقریباً دس گز کے فاصلے پر اس نادیدہ کشتی راں نے اپنی کشتی روک لی۔ اس کا اندازہ یوں ہوا کہ چپوؤں کی آواز تھم گئی تھی۔

''کچھ اور قریب آجاؤ۔'' آرتھر نے کہا۔ ''تمہیں اس جہاز پر کسی سے خوف زدہ ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔''

''وعدہ کرتے ہو ناکہ تم روشنی نہیں دکھاؤ گے؟''

''کیا بات ہے۔'' میں پھٹ پڑا۔ ''تم روشنی

سے اس قدر خوف زدہ کیوں ہو؟''
''چونکہ......'' اس آواز نے کچھ کہنا چاہا مگر پھر خاموشی چھا گئی۔
''چونکہ کیا؟'' میں نے تیز لہجے میں پوچھا۔ آرتھر نے میرے شانے پر ہاتھ رکھتے ہوئے مجھے غصے پر قابو پانے کا اشارہ کیا۔ اور پھر بولا۔ ''تم ایک منٹ رکو اور مجھے اس سے بات کرنے دو۔''
آرتھر آواز کی سمت عرشے پر جھکتے ہوئے بولا۔'' دیکھو مسٹر یہ بڑی عجیب بات محسوس ہو رہی ہے کہ تم ہمارے پاس اس طرح آنا چاہتے ہو۔ اس وسیع سمندر میں جس پر دھند کی گہری چادر چھائی ہوئی ہے رات کے اس پہر تمہیں کس چیز کی تلاش ہے؟ ہم کیسے اعتبار کرلیں کہ تم ہمیں کوئی نقصان نہیں پہنچاؤ گے؟ تمہیں روشنی پر اعتراض کیوں ہے؟''
جونہی میرے دوست نے اپنی بات مکمل کی، میں نے ایک بار پھر چپوؤں کی آواز سنی۔ اس کے بعد آواز آئی۔ مگر اب یہ آواز زیادہ فاصلے سے آرہی تھی اور لہجہ میں بے حد مایوس اور دردناک تھا۔
''مجھے افسوس ہے ...... بے حد افسوس، میں تمہیں تکلیف نہ دیتا مگر میں بھوکا ہوں اور...... وہ بھی بھوکی ہے۔''
آواز تھم گئی اور پھر چپوؤں کی آواز دوبارہ آنے لگی۔ شاید وہ نادیدہ ہستی مایوس ہو کر واپس جارہی تھی۔
''ٹھہرو۔'' آرتھر چیخا۔ ''میں نہیں چاہتا کہ تم واپس چلے جاؤ...... جہاز کے قریب آجاؤ۔ گر تم روشنی پسند نہیں کرتے تو ہم روشنی نہیں کریں گے۔''
یہ کہہ کر وہ مجھ سے مخاطب ہوا۔ ''ہے تو یہ بڑی عجیب سی بات لیکن میرا خیال ہے کہ یہ کوئی خوف زدہ ہونے والی بات بھی نہیں ہے؟''
اس کا لہجہ سوالیہ تھا اور میں نے جواب دیتے ہوئے کہا۔ ''ہاں تمہارا خیال درست معلوم ہوتا ہے۔ شاید اس غریب آدمی پر اس وسیع سمندر میں کوئی افتاد آپڑی ہے اور وہ پاگل ہو گیا ہے۔''

چپوؤں کی آواز اب کافی قریب آگئی تھی چند گز کے فاصلے پر چپوؤں کی آواز تھم گئی۔
''کیا اب بھی تم جہاز کے قریب آکر ہم سے بات نہیں کروگے؟'' آرتھر نے کہا۔ ''ہم نے فلیش لائٹ بھی رکھ دی ہے۔''
''میں...... میں نہیں آسکتا۔'' اس آواز نے جواب دیا۔ ''میں قریب آنے کی ہمت نہیں کرسکتا اور نہ ہی میں اشیائے خوردنی کی قیمت ادا کرسکتا ہوں۔''
''ٹھیک ہے۔'' آرتھر بولا۔ ''تم جس قدر چاہو اشیائے خوردنی لے جاسکتے ہو۔''
''تم بہت اچھے ہو۔'' اس آواز نے کہا۔ ''خدا تمہیں اس کا صلہ دے۔'' وہ پراسرار آواز بھرا گئی۔
''وہ خاتون۔'' آرتھر نے اچانک کہا۔ ''کیا وہ بھی۔''
''نہیں۔'' نادیدہ ہستی نے بات کاٹتے ہوئے کہا۔ ''میں اسے جزیرے پر چھوڑ آیا ہوں۔''
''کون سا جزیرہ؟'' میں نے پوچھا۔
''مجھے اس کا نام معلوم نہیں ہے۔'' اس آواز نے جواب دیا۔ ''کاش میں اس جزیرے پر نہ۔'' وہ آواز ایک بار پھر بھرا گئی۔
''کیا ہم کشتی بھیج کر اس خاتون کو یہاں بلوالیں؟'' آرتھر نے کہا۔
''نہیں!'' نادیدہ ہستی نے پرزور لہجے میں کہا۔ ''میرے خدا! بالکل نہیں۔''
پھر چند ثانیوں کی خاموشی کے بعد اس نے مزید کہا۔ ''اپنی ضرورت کے ہاتھوں مجبور ہو کر میں نے یہ جرأت کی ہے۔ مجھ سے اس کی اذیت دیکھی نہیں گئی؟''
''مجھے تمہاری مدد کرکے خوشی ہوگی۔'' آرتھر نے کہا۔ ''تم جو کوئی بھی ہو چند لمحے انتظار کرو، میں تمہارے لئے کچھ لے کر آتا ہوں۔''
وہ جتنی تیزی سے اپنے کیبن کی طرف گیا تھا۔ اتنی ہی تیزی سے واپس آگیا۔ اس کے بازوؤں میں اشیائے خوردنی کے کئی ڈبے موجود تھے۔
''کیا تم یہاں آکر یہ ڈبے نہیں لے سکتے؟''

آرتھر نے پوچھا۔

''نہیں...... میں اس کی ہمت نہیں کرسکتا۔'' اس نے جواب میں کہا اور میں نے اس آواز میں بے چارگی سی محسوس کی جیسے کوئی شخص اپنی شدید خواہش کو دبا رہا ہو۔ اس وقت میرے ذہن میں یہ بات آئی کہ تاریکی میں چھپی ہوئی اس نادیدہ ہستی کو کھانے کے ان ڈبوں کی واقعی شدید ضرورت ہے جو آرتھر نے اپنے بازوؤں میں تھام رکھے ہیں مگر کسی ناقابل فہم خوف کی وجہ سے وہ ہمارے جہاز کے قریب آ کر انہیں حاصل نہیں کرسکتا۔

''جارج تم لکڑی کا کوئی خالی ڈبہ لے آؤ۔'' آرتھر نے کہا۔ ''ہم یہ چیزیں اس میں رکھ کر اس کی کشتی کی طرف بہا دیتے ہیں۔''

میں فوراً ہی ایک خالی ڈبہ لے آیا اور ہم نے اسے ایک تختے سے باندھ کر اس آواز کی سمت بہا دیا۔ چند ثانیوں بعد اس نادیدہ ہستی کی مسرت آمیز چیخ سنائی دی۔ ہمیں یہ اندازہ کرنے میں کوئی دشواری محسوس نہیں ہوئی کہ اس نے اشیائے خوردنی سے لبریز وہ ڈبہ حاصل کرلیا ہے۔ اس کے بعد اس آواز نے ہمیں دعا دے کر خدا حافظ کہا پھر چپوؤں کی آواز سنائی دی جو بتدریج دور ہوتی چلی گئی۔

''یہ شخص تو بہت جلد چلا گیا۔'' آرتھر نے کہا۔ ''ٹھہرو۔'' میں نے جواب دیا۔ ''میرا خیال ہے یہ شخص لوٹ کر آئے گا۔ اسے یقینی طور پر خوراک کی دوبارہ ضرورت ہوگی۔''

''ہاں۔'' میں نے جواب دیا۔ اور گہری سوچ میں ڈوب گیا۔

وقت گزرتا رہا۔ ایک گھنٹہ، دو گھنٹے اور آرتھر بھی میرے ساتھ عرشے ہی پر کھڑا رہا۔ اس عجیب ایڈوانچر کے باعث اس کی نیند اڑ گئی تھی۔

تیسرے گھنٹے کے اختتام پر سمندر پر چھائے ہوئے اس پرہول سناٹے میں ہمیں ایک بار پھر چپوؤں کی آواز سنائی دی۔

''سنو۔'' آرتھر پرجوش لہجے میں بولا۔ ''چپوؤں کی آواز قریب سے قریب تر ہوتی جارہی ہے۔ اسے واقعی خوراک کی سخت ضرورت تھی۔''

چپوؤں کی آواز ایک بار پھر ہمارے جہاز سے چند گز کے فاصلے پر آ کر تھم گئی۔

''ارے ہوت! جہاز والو۔'' اس آواز نے کہا۔

''کیا یہ تم ہی ہو؟'' آرتھر نے پوچھا۔

''ہاں۔ معاف کرنا میں اشیائے خوردنی حاصل کر کے فوراً ہی چلا گیا تھا لیکن...... لیکن یہ بہت ضروری تھا۔''

''اس خاتون کی وجہ سے؟'' آرتھر نے پوچھا۔

''ہاں۔ وہ خاتون اب آپ کی بے حد ممنون ہے۔ وہ جلد ہی جنت میں بھی آپ کی مزید شکر گزار ہوگی۔''

''یہ تو ہمارا فرض تھا۔'' آرتھر نے کہا۔ ''لیکن تم یہ......''

''میں آپ سے درخواست کرتا ہوں کہ...... اپنے اس احسان کو یوں سرسری انداز میں تذکرہ نہ کریں۔''

چند ثانیوں کے لئے خاموشی چھاگئی۔ میں حیرت اور ہمدردی کے جذبات سے مغلوب ہو کر کچھ نہ کہہ سکا۔

اس آواز نے سلسلہ کلام آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔ ''میں نے اور میری بیوی نے گفتگو کی تھی...... اس آفت کے بارے میں جو ہم پر نازل ہوئی۔ ہم نے طے کیا تھا کہ...... ان ہولناک واقعات کا تذکرہ اپنی زندگی کے دوران کسی سے نہیں کریں گے، مگر آج رات کے واقعات کے بعد ہم نے یہ ارادہ بدل دیا۔ ہم نے یہ طے کیا کہ میں تمہیں ان مصائب کے بارے میں بتاؤں جن کا سامنا ہم اس وقت سے کر رہے ہیں جب سے...... جب سے۔''

وہ آواز بھرا گئی۔

''ہاں۔ ہاں تم بتاؤ تو سہی۔'' آرتھر نے نرم لہجے میں کہا۔

''جب سے گرین اسٹار ڈوبا۔''

''ارے!'' میں نادانستہ طور پر کیسے چیخ پڑا۔ ''یہ جہاز تو چھ ماہ قبل نیو کیسل سے فرسکو کے لئے روانہ ہوا تھا اور اس کے بعد اس کے بارے میں کوئی اطلاع نہیں ملی۔''

''ہاں۔'' اس آواز نے جواب دیا۔ ''اپنے سفر کے آغاز کے دوسرے ہی دن وہ جہاز شدید طوفان میں گھر گیا اور راستہ بھٹک گیا۔ طوفان کے ختم ہونے پر میں اپنی بیوی کے ساتھ نچلی منزل پر اپنے کیبن میں سامان کے جائزے کے لئے گیا۔ کچھ دیر بعد جب ہم لوٹ کر عرشے پر آئے تو مجھ پر یہ ہولناک انکشاف ہوا کہ جہاز کا عملہ ہمیں تنہا چھوڑ کر کشتیوں کے ذریعے فرار ہوگیا ہے۔ جہاز برباد ہو چکا تھا اور وہ کسی بھی لمحے ڈوب سکتا تھا۔ ان حالات کے باوجود ہم مایوس نہیں ہوئے ہم نے چند تختوں کو رسیوں سے باندھ کر ایک چھوٹی سی کشتی بنالی اور اس پر مختصر سا سامان رکھ کر اپنے آپ کو سمندر کے رحم وکرم پر چھوڑ دیا۔ دو گھنٹے کے سفر کے بعد وہ تباہ شدہ جہاز ہماری نگاہوں سے اوجھل ہوگیا۔

دوسرے دن سمندر پر کہر کی گہری چادر چھا گئی۔ ہوا ساکت تھی اور ہماری یہ تختوں کی کشتی چار دن تک بہتی چلی گئی۔ ایک وقت تو ایسا آیا کہ طوفانی لہریں ہمیں ڈبو نے پر تل گئیں۔ ہم اپنی سلامتی کی دعائیں مانگتے رہے۔ خدا خدا کر کے ہم ہموار سمندر...... میں داخل ہوگئے۔ لہروں کا شور اب بہت پیچھے رہ گیا تھا۔

ہم اس رات سکون سے سوئے۔ صبح جب ہماری آنکھ کھلی تو ہم نے سطح سمندر پر نمک ہی نمک دیکھا۔ سانس لینا دشوار ہو رہا تھا۔ کہر کی دبیز چادر کے باوجود جو سمندر پر اب تک چھائی ہوئی تھی۔ ہمیں ایک جہاز کا ہیولا دکھائی دیا۔ وہ ہم سے چند فٹ کے فاصلے پر تھا۔ ہم نے خدا کا شکر ادا کیا۔ ہم یہ سوچ رہے تھے کہ اب ہمارے مصائب ختم ہوگئے ہیں۔ ہم نے اپنے تختے کو جہاز کے بے حد قریب کرتے ہوئے چلا کر کہا کہ ہمیں بھی جہاز پر سوار کرلیا جائے مگر جہاز سے کسی نے کوئی جواب نہیں دیا۔ اب ہم جہاز کے بالکل قریب پہنچ چکے تھے۔ نیچے کی طرف پانی میں ایک رسی کو لٹکے ہوئے دیکھ کر میں نے اسے پکڑ لیا۔ اس رسی پر اور جہاز کے بیرونی حصے پر اسفنج نما سفید کائی جم گئی تھی جس کی وجہ سے مجھے کافی جدوجہد کرنا پڑی۔

آخر کار میں جنگلے تک پہنچنے میں کامیاب ہوگیا اس کے بعد میں عرشے پر آ گیا۔ وہاں میں نے اس اسفنج نما سفید رنگ کی کائی کی ڈلیاں دیکھیں جن میں سے کچھ چند فٹ اونچی بھی تھیں۔ عرشے پر سناٹا طاری تھا۔ اس امکان کے پیش نظر کہ اندرونی کیبنوں میں کوئی ہو، میں نے چیخ چیخ کر ان کو متوجہ کرنا چاہا۔ مگر مجھے کوئی جواب نہ ملا۔ اس کے بعد میں نے جہاز کے اوپر اور نیچے کی منزلوں میں واقع تمام کیبن دیکھے مگر وہاں کوئی جاندار ہستی موجود نہیں تھی۔ اچانک مجھے شدید تنہائی کا احساس ہوا۔

میری بیوی اب تک اس تختے پر بیٹھی ہوئی تھی۔ جہاز پر مجھے رسیوں کی بنی ہوئی سیڑھی مل گئی جسے میں نے نیچے لٹکا دیا۔ چند لمحے بعد میری بیوی بھی جہاز پر میرے ساتھ تھی۔

ہم دونوں نے مل کر جہاز کا ایک بار پھر جائزہ لیا مگر وہاں زندگی کے کوئی آثار نہیں تھے۔ تب میں نے اپنی بیوی کی توجہ کائی کے ان اسفنج نما ٹکڑوں کی طرف مبذول کرائی جو فرش پر بکھرے ہوئے تھے۔ اس نے انہیں دیکھنے کے بعد کہا کہ وہ صاف کئے جا سکتے ہیں جہاز پر اشیائے خوردنی اور پانی کا کافی ذخیرہ موجود تھا۔ اس طرف سے بے فکر ہو کر ہم نے فرش کی صفائی کی تو تھک کر چور ہوگئے۔

بہر حال عرشے سے ہم ان ٹکڑوں کو صاف کرنے میں کامیاب ہوگئے۔

رات کھانے کے بعد ہم سوئے تو صبح دیر سے جاگے۔ میری بیوی کی نگاہ فرش پر پڑی تو وہ حیرت سے چلا اٹھی وہ اسفنج نما ٹکڑے دوبارہ فرش پر اسی جگہ نمودار ہوگئے تھے۔ ہم نے ناشتے سے فارغ ہو کر جہاز کے اسٹور سے تیزاب کی بوتلیں تلاش کیں اور فرش کو دوبارہ اچھی طرح دھو دیا۔ ہم اس کے بعد کئی دن تک جہاز پر رہے۔ ہم خوش تھے کہ وہ عجیب سی چیز عرشے کے فرش سے غائب ہوگئی

تھی۔ مگر ہماری یہ خوشی عارضی ثابت ہوئی۔

دسویں دن وہ اسفنج نما کائی کے ٹکڑے دوبارہ نمودار ہوگئے۔ اس بار ان کی تعداد پہلے سے بھی زیادہ تھی۔ شاید صاف کرنے سے ان کے جراثیم پھیل گئے تھے۔

دوسرے دن صبح جب ہم ناشتے سے فارغ ہوئے تو میری بیوی نے کہا۔ ”جون ذرا کیبن میں چلو۔ میں تمہیں ایک عجیب چیز دکھاؤں۔“ جب میں اس کے ساتھ کیبن میں گیا تو اس نے اپنا تکیہ میرے سامنے کردیا۔ اس پر بھی وہ عجیب سی اسفنج نما چیز نمودار ہوگئی تھی اور اس کا حجم چنے کی دال کے دانے کے برابر تھا۔ میں اسے دیکھ کر کانپ گیا۔ ہم دونوں نے جہاز کو فوراً چھوڑ دینے کا فیصلہ کیا۔ ہم نے جلدی جلدی اپنا سامان اکٹھا کیا۔ ان میں سے بھی بعض چیزوں پر وہ منحوس شے نمودار ہوگئی تھی۔ میں نے وہ تمام چیزیں وہیں چھوڑ دیں۔

بہرحال اپنی محفوظ چیزوں کے علاوہ میں نے اشیائے خوردنی کے ڈبے لئے اور جہاز سے ایک چھوٹی سی کشتی کو پانی میں اتارنے کے بعد ہم دونوں ساحل کی طرف چل دیئے۔ جونہی ہم ساحل پر پہنچے ہم پر یہ بھیانک انکشاف ہوا کہ منحوس اسفنج نما چیز وہاں بھی پھیلی ہوئی ہے۔ لیکن کچھ دیر کی تلاش کے بعد ہمیں اس جزیرے پر زمین کا ایک چھوٹا سا ٹکڑا ایسا مل گیا جس پر وہ اسفنج نما چیز موجود نہیں تھی۔

میں تمہیں بتا نہیں سکتا کہ ہمیں یہ دیکھ کر کس قدر خوشی ہوئی تھی کہ اس جزیرے کا ایک حصہ تو ایسا ہے جو اس لعنتی چیز سے بالکل محفوظ ہے۔ میں نے ماریا کو وہیں چھوڑا اور جہاز پر دوبارہ جاکر کچھ اور کارآمد اشیاء لے آیا۔ ان میں ایک بادبان اور لکڑی کے تختے بھی تھے۔ جن کی مدد سے ہم نے وہاں رہنے کے لئے ایک ٹینٹ بنالیا۔ اب ہمارے پاس ضرورت کی تمام چیزیں موجود تھیں۔ ہم نے اگلے چار ہفتے بڑے سکون سے گزارے۔ اپنی حسین بیوی کی رفاقت کے باعث وہ دن میری زندگی کے خوش گوار ترین دن بن گئے۔

ہاں، مجھے یاد آیا شاید میں نے تم سے یہ کہا تھا کہ میں ایک بوڑھا آدمی ہوں۔

بہرحال اب ہم ایک محفوظ مقام پر آگئے تھے ایک دن ماریا کے دائیں ہاتھ کے انگوٹھے پر اس اسفنج نما چیز کی نشوونما کے آثار ظاہر ہوئے۔ وہ ٹکڑا ایک چھوٹے سے تل کی مانند تھا۔ جب اس نے مجھے وہ جگہ دکھائی تو میں خوف سے کانپ گیا۔ ہم نے اسے صابن اور پانی سے صاف کیا۔ مگر اگلے دن وہ سفید سا لجلجا ٹکڑا دوبارہ اس کے انگوٹھے پر نمودار ہوگیا۔ کچھ دیر تک ہم خاموشی سے ایک دوسرے کو دیکھتے رہے۔ پھر میں دوبارہ اس کی صفائی میں لگ گیا۔ جب میں اس کام میں مصروف تھا تو اچانک ماریا بولی۔ ”یہ تمہارے چہرے پر بائیں کان کے قریب بالوں کے نیچے کیا چیز ہے ڈیئر؟“

میں نے چہرے پر انگلی گھماتے ہوئے اس جگہ کو تلاش کرلیا۔ تب مجھے معلوم ہوا کہ میں خود بھی اس منحوس چیز کی زد میں آگیا ہوں۔

”ہاں یہ چیز یہاں بھی آگئی۔“ میں نے تشکر آمیز لہجے میں کہا۔ ”بہرحال پہلے میں تمہارے انگوٹھے سے تو اسے صاف کرلوں۔“

وہ مان گئی اور اس نے اس وقت تک میرے چہرے کو نہیں چھوا جب تک کہ وہ ٹکڑا اس کے انگوٹھے سے مکمل طور پر صاف نہ ہوگیا۔ اس کے بعد اس نے بھی میرے چہرے سے اس ٹکڑے کو صاف کردیا۔ ہمیں یہ صورت حال موت سے بھی زیادہ خطرناک محسوس ہونے لگی۔ ہم نے اس بات پر بھی غور کیا کہ ہم کشتی پر خوراک اور پانی کا ذخیرہ رکھ کر کہیں چلے جائیں مگر ہم نے فیصلہ کیا کہ ہم اس وقت تک وہیں رکے رہیں جب تک کہ ہمیں اس مصیبت سے نجات نہ مل جائے۔ اس طرح تین ماہ گزر گئے۔ ہمارے چہرے پر اور جسم پر اس اسفنج نما چیز کی نشوونما کچھ اور زیادہ ہوگئی۔ اب ہمیں یہ احساس ہوگیا تھا کہ ہم تندرست لوگوں کے درمیان نہ رہ سکیں گے اور ہمیں شاید کئی سال اس جزیرے پر گزارنے پڑیں۔

ایک صبح جب میں جہاز کے اسٹور سے کھانے

کی مزید چیزیں لے کر لوٹا تو میں نے اپنی بیوی کو کچھ کھاتے ہوئے دیکھا۔

''ڈیئر یہ کیا ہے؟'' میں نے ساحل پر اترتے ہوئے اس سے پوچھا میری آواز سنتے ہی وہ خوف زدہ ہوگئی اور اس نے کوئی چیز زمین پر پھینک دی۔ میرے دل میں ایک اندیشے نے سر ابھارا اور میں نے دھڑکتے دل سے وہ چیز زمین سے اٹھالی۔ وہ اسی منحوس اسفنج نما چیز کا ٹکڑا تھا۔

''ڈیئر! مائی ڈیئر۔'' میں نے کہا اور پھر مزید کچھ نہ کہہ سکا۔ وہ میری آواز سن کر رونے لگی۔ کچھ دیر کے بعد جب جذبات کا طوفان تھما تو اس نے مجھے بتایا کہ خوراک کی کمی کے پیش نظر اس نے گزشتہ روز اس نجی چیز کو چکھا تھا جو اسے پسند آئی۔

میں نے اس سے وعدہ لیا کہ چاہے کتنی ہی بھوک لگے وہ اس منحوس چیز کو ہاتھ نہیں لگائے گی۔

وعدہ کرنے کے کچھ دیر بعد اس نے مجھے بتایا کہ اچانک اس کے دل میں اس چیز کو کھانے کی خواہش ابھر رہی ہے۔

اس نے بہرحال وعدہ نبھایا اور اس خواہش کو کچل دیا۔

اسی دن شام کو میں پریشانی کے عالم میں جزیرے کے اس حصے کی طرف نکل گیا جہاں وہ اسفنج نما چیز موجود تھی۔ اچانک کسی نے مجھے عقب سے پکارا۔ میں نے گھوم کر دیکھا تو حیران رہ گیا۔ انسانی قد کے برابر وہ اسفنج نماز چیز حرکت کرتی ہوئی میرے بالکل قریب آ گئی تھی۔ اس کی ایک شاخ انسانی بازو کی طرح اٹھی اور میں نے اس کا لمس اپنے چہرے پر محسوس کیا۔ خوف سے میری چیخ نکل گئی اور میں وہاں سے بھاگ کر ہانپتا ہوا جزیرے کے اس محفوظ حصے کی طرف واپس آ گیا۔ جہاں میری بیوی میرا انتظار کر رہی تھی۔

وہاں پہنچ کر میں نے اپنے ہونٹوں پر زبان پھیری تو کچھ مٹھاس سی محسوس ہوئی۔ کسی غیر انسانی خواہش کے تحت میں اپنے ہونٹوں کو چاٹنے لگا۔ میری بیوی ٹینٹ کے پاس کھڑی ہوئی مجھے عجیب سی نگاہوں سے دیکھ رہی تھی شاید اسے وجدانی طور پر میری اس کیفیت کا علم ہوگیا تھا۔ اس کی ترحم آمیز نگاہیں دیکھ کر میں نے اسے اپنی کمزوری کے بارے میں بتایا۔

بہرحال میں نے اسے یہ نہیں بتایا کہ اس کی وجہ کیا ہے۔ شاید اس جزیرے میں کچھ دیر قبل میں نے اس ویران جہاز کے مسافروں میں سے ایک کا انجام دیکھ لیا تھا اور شاید وہی ہم دونوں کا ہونے والا انجام تھا۔

اس کے بعد دن گزرتے گئے اور جہاز پر موجود اشیائے خوردنی ختم ہوگئیں۔ میں نے سمندر سے مچھلیوں کا شکار بھی کیا مگر وہاں مچھلیاں بہت کم تھیں۔ اس طرح چھ ماہ کا عرصہ گزر گیا۔ گزشتہ ہفتے ہم نے آخری بسکٹ کھایا تھا۔ اس کے بعد سے میں صرف تین مچھلیاں پکڑ سکا۔

میں آج رات مچھلیوں ہی کی تلاش میں آیا تھا چونکہ مارا بھوک سے بے حال ہو رہی تھی دھند میں چھپے ہوئے آپ کے جہاز کو دیکھا تو میں نے آپ کو آواز دی۔ اس کے بعد کے واقعات کا تو آپ کو علم ہے۔

آپ نے بے ٹھکانہ روحوں کے جوڑے پر جو مہربانی کی ہے خدا آپ کو اس کا صلہ دے۔

اس کے بعد سمندر میں چپوؤں کی آواز ابھری۔

''خدا آپ کی حفاظت کرے۔'' اس نے کہا۔

''خدا حافظ۔'' سپیدہ سحر پھیلنے لگا تھا اور وہ تیزی سے چپو چلاتا ہوا دور ہوتا چلا گیا۔ میں نے دوربین سے اس سمت میں دیکھا۔ دھند اب کچھ کم ہوگئی تھی اور سمندر میں دور میں نے اسفنج نما انسانی ہیولے کو دیکھا۔ اس کے چپوؤں اور بازوؤں میں مجھے کوئی فرق نظر نہیں آ رہا تھا چونکہ وہ بھی کسی اسفنج نما چیز ہی جیسے نظر آ رہے تھے۔ کچھ دور جانے کے بعد وہ عجیب سی کشتی اپنے مسافر کے ساتھ اس دھند میں غائب ہوگئی جو اب تک مکمل طور پر صاف نہیں ہوئی تھی۔





بزدل روح

ایس امتیاز احمد۔کراچی

ہاتھ کو ہاتھ سجھائی نہ دینے والا گھٹا ٹوپ اندھیرا پورے علاقے پر مسلط تھا، وقفے وقفے سے فلك شگاف چیخیں پوری فضا کو منتشر کردیتی تھیں که پھر اچانك پورا علاقه جیسے روشنی میں نہا گیا اور پھر……

ایک اچھوتی انوکھی عجیب وغریب اور اچنبھے میں ڈالتی دلفریب اور پُرفریب کہانی

جمی اس سڑک کے سامنے سے دن میں دو مرتبہ گزرتا تھا جس پر دو فرلانگ آگے چل کر اس کی چچی کا مکان تھا۔ وہ سڑک اب ٹوٹ پھوٹ چکی تھی اور اس کے اطراف جھاڑیاں اگ آئی تھیں۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ اس سڑک پر کوئی آبادی نہیں تھی اور اس کی چچی کا مکان بھی خالی پڑا رہتا تھا کیونکہ وہ آسیب زدہ مشہور تھا۔ بستی والے اس مکان سے دور رہتے تھے۔ خود بھی اپنی چچی کے ساتھ دوسرے مکان میں رہتا تھا۔ اس کی چچی اپنے مکان سے متعلق کوئی گفتگو نہیں کرتی تھیں وہ صرف اتنا کہتی تھیں کہ ان کا وہ مکان آسیب زدہ نہیں ہے اور وہ سب کہانیاں گڑھی ہوئی ہیں۔ اگر بستی والے توہم پرست نہ ہوں تو وہ اس مکان کو کرائے پر اٹھا سکتی ہیں اور اس طرح جو رقم حاصل ہوگی اس سے وہ جمی کے لئے نئے لباس بنا سکتی ہیں اور اسے تفریح کے لئے سینما لے

جاسکتی ہیں۔

جمی کو معلوم تھا کہ کوئی نہ کوئی گڑبڑ ضرور ہے کیونکہ اس کی چچی نے اس مکان کو تین مرتبہ کرائے پر اٹھایا اور کوئی بھی کرائے دار اس مکان میں ایک ہفتہ سے زیادہ نہیں ٹھہرا۔ اور اب تو ان کی بستی میں آنے والے اجنبی بھی اسے کرائے پر لینے پر تیار نہیں ہوتے تھے۔ جمی کو اس بات کا بہت افسوس تھا۔

روزانہ وہ اسکول جاتے وقت دور سے اس مکان کو دیکھتا اور پھر دوپہر کو واپسی کے وقت بھی۔ وہ سوچتا کہ ''اگر وہ کسی طرح بستی والوں پر ثابت کردے کہ مکان آسیب زدہ نہیں ہے تو......'' اور پھر ایک روز جب اس کی چچی بازار خریداری کے لئے گئی تھیں تو جمی نے اس آسیب زدہ مکان کی چابی جو باورچی خانے میں دیوار پر لٹکی ہوئی تھی اتاری اور اس مکان کی طرف چل دیا۔

مکان کے چاروں طرف بے تحاشا خاردار جھاڑیاں اگی ہوئی تھیں اور درخت پھیلے ہوئے تھے۔ جب جمی کی نظر گرد و غبار سے اٹی ہوئی کھڑکیوں پر پڑی تو اس کا ارادہ متزلزل ہوگیا۔ اسے معلوم تھا کہ روحیں دن کے وقت لوگوں کو پریشان نہیں کرتیں اور جب اس کے ذہن میں یہ خیال آیا کہ کیوں نہ وہ خود اس مکان میں جاکر اس کا معائنہ کرے تو اسے یہ خیال بالکل اچھوتا اور عمدہ نظر آیا تھا لیکن جب وہ جھاڑیوں سے بچتا ہوا مکان کے دروازے کے سامنے پہنچا تو اس کا ارادہ متزلزل ہوگیا۔ زمین نے جیسے اس کے پیروں کو پکڑ لیا اور وہ پانچ منٹ تک خود کو اس بزدلی پر برا بھلا کہتا رہا، پانچ منٹ بعد وہ بمشکل اپنے خوف پر قابو پاسکا اور پھر تالا کھول کر مکان کے اندر داخل ہوگیا۔

تالا کھول کر مکان کے اندر داخل ہونے کا عمل شاید جمی کی زندگی کا سب سے زیادہ جرأت مندانہ اقدام تھا۔ اس نے اپنے پیچھے دروازے کو کھلا رہنے دیا اور غور سے اندر کا معائنہ کیا۔ اس وقت وہ ایک بڑے ہال میں کھڑا تھا جس کے دونوں طرف کمرے تھے اور تمام کمروں کے دروازے بند تھے۔ ہال کے بائیں جانب اسے سیڑھیاں نظر آئیں جو اوپری منزل کی طرف جاتی تھیں۔ کھلے دروازے سے آنے والی روشنی میں اسے ہال میں پڑی ہوئی میز اور کرسیاں نظر آئیں اس کے علاوہ پورا ہال خالی تھا۔

جمی بالکل خاموش کھڑا اپنے دل کی دھڑکنوں کی آوازیں سن رہا تھا پھر آہستہ آہستہ ہال پر تاریکی چھانے لگی جیسے کھلے دروازے کے سامنے کوئی عظیم الشان چیز کھڑی ہوگئی ہو۔ جمی تیزی سے مڑا لیکن اس کے پیچھے کوئی چیز نہیں تھی۔ جمی نے ایک گہرا سانس لیا۔ شاید سورج کے سامنے بادل کا کوئی آوارہ ٹکڑا ہوگا اسی لئے ہال میں تاریکی چھاگئی تھی اس نے سوچا لیکن پھر بڑی تیز آواز کے ساتھ دروازہ خودبخود بند ہوگیا۔ اور جب وہ بدحواسی کے عالم میں کنڈی پکڑے دروازہ کھولنے کی کوشش کررہا تھا تب جمی کو پہلی مرتبہ وہ روح نظر آئی۔

روح کا طرزعمل بالکل وہی تھا جس کی ایک روح سے توقع کی جاتی ہے۔ مدھم سا سفید رنگ کا وہ ہیولہ جسامت میں دبلا پتلا تھا اور وہ ہیولہ سیڑھیوں سے تیرتا ہوا آہستہ آہستہ اس کی طرف آرہا تھا۔

''میرے خدا'' جمی نے خود سے کہا۔ ''میں نے اس روح کو اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے۔'' لیکن پھر چند لمحوں کے بعد اس نے سوچا کہ ''آخر اس روح میں ایسی کیا خاص بات تھی؟ وہ مجھے اس طرح ڈرانے کی کوشش کررہی تھی جس طرح ٹام اسکول میں چپکے سے دوسرے بچوں کے پیچھے آکر زور سے ہاؤ کہہ کر بچوں کو ڈراتا ہے۔'' جمی نے سوچا اسے روح کی اس بچکانہ حرکت پر بے حد افسوس ہوا۔ ''وہ روح کوئی بچہ تو ہے نہیں پھر اسے ایسی ذلیل حرکت نہیں کرنی چاہیے تھی؟''

''تو روح نے اسے ڈرانے کی کوشش کی تھی اور وہ ڈرگیا۔'' جمی نے خیال کیا اور یہ سوچ کر اس کا سارا خوف زائل ہوگیا بلکہ مارے غصے کے اس کا خون کھولنے لگا۔ پھر اسے چابی کا خیال آیا جو دروازے میں

لگی رہ گئی تھی۔ اس چابی کی واپسی بے حد ضروری تھی ورنہ چچی کو اس کی اس حرکت کا لازمی علم ہو جاتا۔

اس مرتبہ وہ بے حد خاموشی کے ساتھ مکان کے دروازے تک پہنچا۔ اس کا ارادہ تھا کہ وہ خاموشی سے دروازہ بند کر کے تالا لگائے گا اور پھر چابی جیب میں رکھ کر واپس گھر چلا جائے گا۔ دروازہ اسی طرح کھلا ہوا تھا جس طرح وہ اسے چھوڑ کر بھاگا تھا۔ اسے اندر سے مدھم آوازیں آتی ہوئی سنائی دیں۔ جمی نے دروازہ بند کرنے کا ارادہ ملتوی کر دیا اور کھلے ہوئے دروازے سے ہال کے اندر جھانکنے لگا جہاں وہ روح موجود تھی۔

وہ روح واپس اوپر جا رہی تھی لیکن اس مرتبہ وہ تیر نہیں رہی تھی بلکہ وہ ایک قسم کا رقص کرتی ہوئی جا رہی تھی۔ وہ ناچتی ہوئی ایک سیڑھی چڑھتی اور پھر پیٹ دبا کر بے تحاشہ ہنسنے لگتی۔ اس کی ہنسی کی آواز جمی کو سنائی دی۔ صاف ظاہر تھا کہ وہ جمی کو ڈرانے اور جمی کے دہشت زدہ ہو کر بھاگنے سے مکمل طور پر، لطف اندوز ہو رہی تھی۔ یہ دیکھ کر جمی کا خون کھول گیا اس نے اپنا منہ دروازے کے اندر کر کے اپنے پھیپھڑوں کی پوری قوت کے ساتھ "ہاؤ" کہا تو روح نے ایک تیز چیخ ماری، فضا میں دو فٹ اچھل گئی اور پھر سیڑھیوں پر بے دم ہو کر گر گئی۔

جیسے ہی جمی نے یہ منظر دیکھا اس کا تمام خوف زائل ہو گیا کیونکہ اس نے اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا تھا کہ وہ روح کو اس سے کہیں زیادہ ڈرا سکتا ہے جتنا کہ خود روح نے اسے ڈرایا تھا وہ بے دھڑک ہال میں داخل ہو گیا۔ روح نے سیڑھیوں کی ریلنگ کا سہارا لیا ہوا تھا۔ اس کا سانس بری طرح اکھڑا ہوا تھا۔ روح اکھڑے اکھڑے سانسوں کے درمیان کہہ رہی تھی۔ "لڑکے تم نے مجھے ڈرا دیا۔ تمہیں ایسا نہیں کرنا چاہیے تھا۔"

"کیوں نہیں کرنا چاہیے تھا۔" جمی نے کہا۔ "تم نے مجھے ڈرایا، میں نے تمہیں ڈرا دیا۔ حساب کتاب برابر ہو گیا۔"

"ایسا نہیں ہوتا لڑکے۔" روح نے کہا۔ "تم بہت زیادہ بے قوف ہو تمہیں اس اصول کا علم نہیں کہ روحیں انسانوں کو ڈراتی ہیں انسان روحوں کو نہیں ڈراتے۔" روح نے کہا۔ اور پھر وہ تیرتی ہوئی سیڑھیوں سے نیچے اتر آئی اور آخری سیڑھی پر بیٹھ گئی۔

"تمہیں شاید معلوم نہیں۔" روح نے کہا۔ "یہ معاملہ میرے لئے بہت اہم ہے اگر لوگوں کو اس واقعے کا علم ہو گیا تو لوگ مجھ سے ڈرنا چھوڑ دیں گے۔ ایک روح کے لئے اس سے زیادہ بے عزتی کی بات اور کوئی نہیں ہو سکتی۔"

"تو تم یہ چاہتی ہو کہ میں کسی کو اس واقعے کے بارے میں نہ بتاؤں" جمی نے پوچھا۔

"ہاں" روح نے جواب دیا۔ "آؤ ہم ایک معاہدہ کر لیتے ہیں۔ تم کسی سے اس واقعے کا ذکر نہ کرنا اور اس کے بدلے...... اس کے بدلے۔" روح نے کہا اور کچھ سوچنے لگی پھر ایک دم اس نے کہا۔ "کیا خیال ہے تمہارا اگر اس کے بدلے، میں تمہیں دوسروں کی نظر سے غائب ہونے کا گر سکھا دوں......؟"

"واہ مزا آ جائے گا۔" جمی نے خوشی سے اچھلتے ہوئے کہا۔ "لیکن...... لیکن کیا تم خود بھی غائب ہو سکتی ہو۔؟"

"کیوں نہیں۔" روح نے کہا اور وہ اچانک جمی کی نظروں سے غائب ہو گئی۔ جمی ہال میں تنہا رہ گیا۔ لیکن اسے روح کی آواز بدستور سنائی دے رہی تھی۔ "دوسروں کی نظروں سے غائب ہونے کی ترکیب بہت آسان ہے اس طرح تم بغیر ٹکٹ کے کسی بھی سینما گھر میں جا کر مفت فلم دیکھ سکو گے اور اگر تم باغ میں کھیل رہے ہو اور تمہاری چچی تمہیں کسی کام کے لئے آواز دیں اور تمہارا دل کام کرنے کو نہیں چاہ رہا تو تم غائب ہو جانا اور تمہاری چچی تمہیں نہیں ڈھونڈ سکیں گی۔"

"لیکن میں چچی کی مدد کرنے میں خوشی محسوس کرتا ہوں۔" جمی نے کہا۔ "مہربانی کر کے تم میرے سامنے آ جاؤ۔ مجھے ہوا سے باتیں کرتے ہوئے عجیب سا لگ رہا ہے۔"

"اوہ معاف کرنا۔ مجھے بالکل خیال نہیں رہا۔"

روح نے دوبارہ ظاہر ہوتے ہوئے کہا۔ وہ بدستور اسی طرح آخری سیڑھی پر بیٹھی ہوئی تھی اور جمی کو اس کے جسم کے آرپار وہ سیڑھی دھندلی سی نظر آرہی تھی۔ "خیر اگر تم غائب نہیں ہونا چاہتے تو میں تمہیں ننھے منے سوراخوں میں سے نکلنے کی ترکیب سکھا سکتی ہوں۔" روح نے کہا اور وہ فضا میں تیرتی ہوئی دروازے کے پاس گئی اور پھر قفل کے سوراخ میں داخل ہوگئی۔ اس طرح جیسے پانی غسل خانے کی نالی میں داخل ہوکر غائب ہوجاتا ہے اور پھر وہ اسی قفل کے سوراخ میں سے واپس آگئی۔

"یہ ترکیب بھی بہت کارآمد ہے۔" روح نے کہا۔ "اس طرح تم کسی بھی بند کمرے میں جاسکتے ہو بلکہ ہر اس جگہ جاسکتے ہو جہاں ہوا جاسکتی ہے۔"

"نہیں" جمی نے سر ہلایا۔ "میں صرف ایک شرط پر تیار ہوسکتا ہوں۔ اگر تم یہ مکان چھوڑ دو اور کسی دوسری جگہ رہنے لگو۔ مثلاً اس مکان میں جو اسی سڑک پر آگے جاکر بنا ہوا ہے۔ وہاں کوئی نہیں رہتا۔"

"اس کباڑ خانے میں!" روح نے کہا اور پیٹ دبا کر بے تحاشہ ہنسنے لگی۔ "جس کے دروازے اور کھڑکیاں ٹوٹی ہوئی ہیں اور جگہ جگہ سے چھت ٹپکتی ہے۔ نہیں شکریہ تمہیں معلوم ہے جب طوفان آتا ہے تو اس مکان کی کیا حالت ہوتی ہے۔ دروازے اور کھڑکیاں زور زور سے بجتی ہیں۔ بارش کا پانی پورے مکان میں ٹپکتا ہے اور اتنا شور ہوتا ہے کہ خدا کی پناہ، بہت بہت شکریہ، تمہیں معلوم ہے روحوں کو سب سے زیادہ کیا چیز پسند ہوتی ہے۔ تنہائی سناٹا اور سکون، یہی روحوں کی زندگی ہوتی ہے۔ اگر تین چیزیں انہیں میسر نہ ہوں تو ان کی زندگی جہنم بن جاتی ہے۔"

"لیکن یہ بھی غلط ہے۔" جمی نے کہا۔ "تم ایسے مکان میں رہتی ہو جو تمہارا نہیں ہے اور تمہاری وجہ سے میری چچی اس مکان کو کرائے پر نہیں دے سکتیں۔"

"میں تو نہیں روکتی تمہاری چچی کو۔" روح نے جواب دیا۔ "وہ بخوشی کسی کو بھی کرائے پر مکان دے سکتی ہیں اب اگر لوگ خود ہی ڈر کر مکان چھوڑ دیتے ہیں تو اس میں میرا کیا قصور؟"

"سب تمہارا قصور ہے۔" جمی نے گرم ہوتے ہوئے کہا۔ "تم لوگوں کو ڈراتی ہو اور میں تم سے کوئی معاہدہ نہیں کروں گا۔ میں شہر کے ایک ایک آدمی کو بتادوں گا کہ کس طرح میں نے تمہیں ڈرایا تھا۔"

"نہیں نہیں۔ ایسا مت کرنا۔" روح نے جلدی سے کہا۔ وہ واقعی پریشان ہوگئی تھی اور اسی بوکھلاہٹ میں وہ کئی مرتبہ جلدی جلدی جمی کی نظروں سے غائب ہوئی اور پھر ظاہر ہوئی۔ "اگر یہ بات پھیل گئی تو ملک کی ہر روح پریشان ہوجائے گی، لوگ ہم سے ڈرنا چھوڑ دیں گے اور ہماری زندگی جہنم بن جائے گی۔"

اس طرح وہ دونوں بہت دیر تک بحث کرتے رہے۔ روح کا کہنا تھا کہ "اگر جمی دولت چاہتا تو وہ غائب ہونے کی ترکیب سیکھ کر دولت کما سکتا ہے۔ وہ کسی سرکس میں بہت بڑی تنخواہ پر ملازم ہوسکتا ہے۔ اس کے غائب ہونے کا کمال دیکھ کر کوئی بھی سرکس والا اسے بہت بڑی تنخواہ پر ملازم رکھ لے گا۔"

لیکن جمی کا کہنا تھا کہ "وہ سرکس میں ملازمت نہیں کرنا چاہتا۔ وہ ڈاکٹر بننا چاہتا ہے۔" جمی اپنے ارادے پر اٹل تھا۔ آخر روح بے بسی کے عالم میں رونے لگی۔

"اچھے لڑکے یہ گھر میری آرام گاہ ہے۔" روح نے روتے ہوئے کہا۔ "میں یہاں تیس سال سے مقیم ہوں۔ میں اسے چھوڑ کر کہاں جاؤں، تم مجھے یہاں سے نکال کر ظالم دنیا کے رحم و کرم پر چھوڑنا چاہتے ہو اور کس لئے؟ صرف چند ٹکوں کی خاطر! تم کتنے ظالم ہو، کتنے بے رحم ہو لڑکے، کتنے سنگدل ہو۔" روح روتی رہی تاکہ جمی آخرکار خود کو ظالم محسوس کرلے۔

لیکن جمی نے خود کو ظالم محسوس نہیں کیا کیونکہ اسی روح نے تیس سال کے عرصے میں کتنے ہی خاندانوں کو اس مکان سے نکال دیا تھا اور ساتھ ہی جمی یہ بھی جانتا تھا کہ اگر لوگوں کو یہ بتا بھی دے کہ اس نے روح کو ڈرا دیا

تھا تو خود اسے کوئی فائدہ نہیں ہوگا۔ کوئی بھی اس پر یقین نہیں کرے گا اور وہ کس طرح ان پر ثابت کرے گا کہ وہ صحیح کہہ رہا ہے؟ جمی نے کچھ دیر غور کرنے کے بعد روح سے کہا۔

"چلو ٹھیک ہے۔ تم مجھے غائب ہونا سکھا دو اور میں کسی کو نہیں بتاؤں گا کہ میں نے تمہیں ڈرا دیا تھا۔"

اس طرح دونوں کے درمیان معاہدہ ہوگیا۔

جمی نے اس روز کے واقعے اور معاہدے کے بارے میں اپنی چچی سے بھی کوئی ذکر نہیں کیا۔ وہ ہر ہفتے باقاعدگی سے غائب ہونے والی ترکیب سیکھنے جاتا رہا۔

جمی نے خوب محنت کی اور جب چھ ہفتوں بعد روح نے اس کا امتحان لیا تو وہ امتیازی نمبروں سے اس امتحان میں کامیاب ہوا۔ اسے روح نے بی گریڈ دیا جو ایک گوشت پوست کے انسان کے لئے بہترین گریڈ ہوتا ہے۔ جمی نے روح کا شکریہ ادا کیا اور اس سے مصافحہ کیا۔

"خدا حافظ" جمی نے کہا۔ "ہماری بہت جلد ملاقات ہوگی۔"

"کیا مطلب؟" روح نے مشتبہ لہجے میں پوچھا لیکن جمی زور سے ہنستا ہوا وہاں سے بھاگ گیا۔

اس رات کھانے کی میز پر اس کی چچی نے اس سے پوچھا۔ "تم آج دن بھر کیا کرتے رہے جمی؟"

"آنٹی میں غائب ہونے کی ترکیب سیکھ رہا تھا۔" جمی نے اطمینان سے جواب دیا۔

"پھر تو بڑا مزا آیا ہوگا۔" اس کی چچی نے ہنستے ہوئے کہا۔ وہ سمجھ رہی تھی کہ جمی مذاق کر رہا ہے۔

"سچ آنٹی میں جھوٹ نہیں بول رہا۔ دادا جان کا مکان ہے نا اس کی روح نے مجھے یہ ترکیب سکھائی ہے۔"

"مجھے ایسا مذاق پسند نہیں جمی۔" چچی نے برا سا منہ بناتے ہوئے کہا۔ "سچ سچ بتاؤ کہ تم سارا دن کہاں رہے.....؟"

جمی فوراً غائب ہوگیا۔

"ادھر آؤ جمی کہاں گئے تم؟" اس کی چچی نے چلا کر کہا۔

"میں یہاں تو بیٹھا ہوں آنٹی۔ آپ کے سامنے۔" جمی نے کہا لیکن وہ بدستور غائب تھا۔

"میرے خدا!" آنٹی نے کہا اور کرسی کھسکا کر اپنی آنکھیں صاف کرنے لگیں اور پھر جمی کی کرسی کی طرف دیکھا لیکن جمی بدستور غائب تھا جمی کو اپنی چچی کو قائل کرنے کے لئے بہت محنت کرنی پڑی اور مزید دو مرتبہ غائب ہوکر دکھانا پڑا اس نے اپنی چچی کو پورا واقعہ سنایا لیکن اس نے وعدے کے مطابق یہ نہیں بتایا کہ اس نے روح کو بری طرح ڈرایا تھا دونوں میں بہت دیر تک باتیں ہوتی رہیں جمی نے اپنی چچی سے کہا کہ اس کے ذہن میں روح کو اس مکان سے نکالنے کا ایک عمدہ منصوبہ ہے۔ جس کے لئے اسے ان کی مدد کی ضرورت ہے۔

دوسرے روز جمی کی چچی اپنے پرانے مکان پر گئیں اور کام شروع کردیا اور انہوں نے تمام کھڑکیاں کھول کر جھاڑیں۔ تمام کمروں کی صفائی کی۔ جھاڑو نکالی۔ پانی سے فرش دھویا۔ اور اس عمل میں وہ جس قدر شور کرسکتی تھی انہوں نے کیا۔ اس شوروغل سے روح بہت پریشان ہوئی کیونکہ اس کے آرام میں خلل پڑ رہا تھا۔ آخر اسے اپنے کمرے سے نکلنا پڑا۔ وہ فضا میں تیرتی ہوئی اس کمرے میں آئی جہاں جمی کی چچی جھاڑو دے رہی تھیں وہ روح کو دیکھ کر ڈر گئیں۔ انہوں نے روح پر جھاڑو پھینک ماری۔ جھاڑو روح کے جسم سے پار ہوگئی اور روح بدستور دونوں ہاتھ پھیلائے اپنے حلق سے عجیب عجیب آوازیں نکالتی ہوئی ان کی طرف بڑھتی رہی اور وہ پیچھے ہٹتی رہی۔

جمی اس تمام عرصے میں اس کمرے میں موجود رہا لیکن وہ اس وقت غائب تھا۔ روح یہ سمجھ رہی تھی کہ کمرے میں جمی کی چچی کے علاوہ اور کوئی نہیں ہے اس لئے وہ پوری تندہی سے انہیں ڈرانے میں مصروف تھی۔

اچانک جمی نے روح کے سامنے ظاہر ہوکر زور سے "ہاؤ" کا نعرہ لگایا اور روح ایک بھیانک چیخ مار کر بے

ہوش گئی۔

جیسے ہی جمی کی چچی نے یہ منظر دیکھا ان کا سارا خوف دور ہوگیا پھر دونوں مل کر روح کو ہوش میں لانے کی ترکیبیں کرنے لگے۔ آخر کار ان کی کوششیں بارآور ثابت ہوئیں اور روح کو ہوش آگیا۔ روح نے جمی کو دیکھتے ہی غصے سے کہا۔ ''تم نے وعدہ خلافی کی ہے۔''

''نہیں میں نے وعدہ خلافی نہیں کی۔'' جمی نے کہا۔ ''میں نے وعدہ کیا تھا کہ میں کسی کو یہ نہیں بتاؤں گا کہ میں نے تمہیں ڈرایا تھا لیکن میں نے اس بات کا وعدہ نہیں کیا تھا کہ میں آئندہ کبھی تمہیں نہیں ڈراؤں گا۔''

جمی کی چچی نے غور سے روح کو دیکھتے ہوئے کہا۔ ''تم روح ہو؟'' میرا خیال تھا کہ لوگوں نے خواہ مخواہ اس مکان کے بارے میں کہانیاں گڑھ لی ہیں۔ خیر معاف کرنا میرے پاس وقت کم ہے اور مجھے کام بہت کرنا ہے۔ یہ کہہ کر وہ دوبارہ اپنے کام میں جٹ گئیں۔ اس مرتبہ وہ پہلے سے بھی زیادہ شور کررہی تھیں وہ زور زور سے دروازے بند کرتیں۔ کرسیاں پٹختیں، کھڑکیاں کھولتیں اور بند کرتیں اور جھاڑو کو پوری قوت سے دیواروں پر مارتیں۔

روح نے گھبرا کر اپنا سر پکڑلیا۔ ''اتنا شور خاتون کیا آپ آہستہ آہستہ کام نہیں کرسکتیں؟''

''تم کون ہوا اعتراض کرنے والی۔'' جمی کی چچی نے کہا۔ ''کیا یہ مکان تمہارا ہے؟ اگر تمہیں شور پسند نہیں ہے تو کسی دوسرے مکان میں چلی جاؤ۔''

جھاڑو کی وجہ سے کمرے میں گرد وغبار اڑ رہا تھا۔ روح کو کئی چھینکیں آئیں کیونکہ مٹی اس کی ناک میں گھس گئی تھی۔ ''معاف کیجئے گا۔'' روح نے معذرت کرتے ہوئے کہا۔ ''مٹی اتنی اڑرہی ہے۔ ارے وہ لڑکا کہاں گیا......؟'' روح نے چونک کر پوچھا کیونکہ جمی پھر غائب ہوگیا تھا۔

''مجھے کیا معلوم۔'' جمی کی چچی نے جھاڑو سے گرد وغبار اڑاتے ہوئے کہا۔ ''شاید وہ تمہیں دوبارہ ڈرانے کی تیاری کررہا ہے۔''

''آپ اس پر کنٹرول رکھا کریں۔'' روح نے سخت لہجے میں کہا۔ ''اگر وہ میرا لڑکا ہوتا تو میں اس کی چمڑی ادھیڑ دیتی۔''

''میری طرف سے تمہیں اس کی اجازت ہے۔'' جمی کی چچی نے جواب دیا اور انہوں نے روح کے جسم کے اندر اپنا ہاتھ ڈال کر کرسی پر پڑے ہوئے کشن کو اٹھایا اور جھاڑتے ہوئے کہا۔ ''اب تمہیں شکایت نہیں ہونی چاہیے روح اس کرسی پر سے اٹھ کر دوسری کرسی پر بیٹھ گئی۔

''لیکن میں تمہیں اس کا مشورہ نہیں دوں گی۔'' روح نے کہا۔ ''کیونکہ آج سے میں اور جمی رات کو یہیں سویا کریں گے اور تم نے وہ ضرب المثل سنی ہوگی کہ دریا میں رہ کر مگر مچھ سے بیر رکھنا دانشمندی نہیں ہوتی۔''

''ہا......ہا......ہا''......روح نے ہنستے ہوئے کہا۔ ''دریا مگر مچھ ہو......ہو......ہو......''

''ہو......ہو......ہو۔'' جمی نے روح کے قریب ظاہر ہوتے ہوئے کہا۔ ''یہ میں جمی ہوں۔'' روح نے زیرلب بڑبڑا کر کچھ کہا اور پھر وہ غائب ہوگئی۔

رات کے وقت جمی کی چچی نے دونوں کانوں میں روئی ٹھونسی اور اس مکان کی سب سے آرام دہ خواب گاہ میں روشنی جلا کر سوگئیں۔ روح پہلے تو خوب چلائی۔ بھیانک آوازیں نکالتی رہی۔ لیکن جب ان آوازوں کا ان دونوں پر کوئی اثر نہ ہوا تو اس نے اپنے مہلک ترین ہتھیار سے کام لینے کا فیصلہ کیا یہ ہتھیار دو سرخ انگاروں کی طرح دہکتی ہوئی بڑی بڑی آنکھیں تھیں جنہیں دیکھ کر اس سے پہلے بڑے بڑے سورما میدان چھوڑ کر بھاگ گئے تھے لیکن اس ترکیب کو استعمال کرنے سے پہلے وہ جمی کی طرف سے اطمینان کر لینا چاہتی تھی کہ جمی کہاں ہے۔ اس نے مکان کا ایک ایک کونا دیکھ لیا لیکن اسے جمی نظر نہیں آیا حالانکہ وہ خود اس وقت غائب تھی لیکن جمی کو

بھی غائب پایا وہ گھبرا گئی۔ اسے یہی دھڑکا لگا رہا کہ کسی بھی لمحے جمی کسی کونے سے اچھل کر اس پر حملہ کر کے اسے ڈرا دے گا۔ اس خوف نے اس کی بری حالت کر دی اور وہ اتنی تھک گئی کہ تہ خانے میں جا کر ساری رات کوئلے کی کوٹھری میں پڑی رہی۔

اس کے بعد آنے والے روز بھی روح کے لئے اتنے ہی تکلیف دہ ثابت ہوئے۔ اس نے کئی مرتبہ جمی کی چچی کو ڈرانے کی کوشش کی لیکن انہوں نے اس پر کوئی توجہ نہ دی۔ اس عرصے میں خود جمی نے دو مرتبہ روح کو بری طرح ڈرا دیا اور وہ بے ہوش ہوتے ہوتے بچی۔ شاید وہ روح خود روحوں کے معیار کے مطابق بھی کچھ ڈرپوک تھی۔ بہت جلد اس روح کی حالت تباہ ہوگئی۔ وہ بے حد پریشان رہنے لگی۔ اس نے جمی کی چچی سے پہلے بحث کر کے انہیں قائل کرنے کی کوشش کی اور پھر رحم کی اپیل کی۔

ایک مرتبہ تو وہ خوب روئی لیکن جمی کی چچی کا دل نہیں پسیجا اور وہ اپنی بات پر اڑی رہیں۔ انہیں اس مکان میں روح کے قیام پر کوئی اعتراض نہیں تھا۔ وہ روح کو اپنا مکان کرائے پر دینے کے لئے تیار تھیں اگر وہ روح باقاعدہ دوسرے کرائے داروں کی طرح اس مکان کا کرایہ ادا کرے۔ اور اگر وہ کرایہ ادا نہیں کر سکتی تو پھر وہ اس...... مکان میں کیوں نہیں جا بستی جو برسوں سے ویران پڑا ہے۔

جب پورا مکان صفائی ستھرائی کے بعد آئینے کی طرح چمکنے لگا تو جمی کی چچی قصبے کے ہوٹل میں گئیں۔ جہاں اس زمانے میں مسٹر اور مسز ڈمسلر مقیم تھے کیونکہ کرائے پر کوئی مناسب مکان نہیں مل رہا تھا۔ انہوں نے مسٹر ڈمسلر کو اپنا مکان کرائے پر دینے کی پیش کش کی۔ جیسے ہی انہوں نے آسیب زدہ مکان کا نام سنا تو...... فوراً انکار کر دیا۔

''لیکن مسٹر ڈمسلر وہ سب کہانیاں جھوٹی ہیں، میں خود ایک ہفتے سے اس مکان میں سو رہی ہوں اور میرے ساتھ میرا بھتیجا جمی بھی وہیں رہتا ہے، وہ بارہ سال کا ہے۔ اگر آپ چاہیں تو جمی آپ کے ساتھ اس مکان میں سو سکتا ہے اور جب آپ کو یقین ہو جائے کہ مکان آسیب زدہ نہیں ہے تو جمی اس مکان میں نہیں سوئے گا۔''

''واہ وہ بارہ سال کا لڑکا۔'' مسٹر ڈمسلر نے کہا۔ ''وہ ایک منٹ کے لئے بھی نہیں ٹھہرے گا اس مکان میں۔''

جمی کی چچی نے فوراً جمی کو بلوایا۔

''میں چچی کے ساتھ وہاں پچھلے پورے ہفتے سویا ہوں اور اب بھی وہاں سونے پر تیار ہوں۔'' جمی نے کہا لیکن اس کے باوجود مسٹر ڈمسلر نے مکان کرائے پر لینے سے انکار کر دیا۔ اس پر جمی کی چچی نے پورے قصبے کو فرداً فرداً گفتگو سنا دی۔ اب لوگوں نے ڈمسلر کا مذاق اڑانا شروع کر دیا کہ ایک بارہ سال کا بچہ مکان میں رہنے پر تیار ہے لیکن یہ سن کر مسٹر ڈمسلر اور ان کی بیوی بچے اس قدر شرمندہ ہوئے کہ انہوں نے خود آ کر جمی کی چچی سے وہ مکان کرائے پر دینے کی درخواست کی تاکہ اپنے چہروں سے بزدلی کا داغ دھو سکیں اور اسی روز وہ خاندان اس آسیب زدہ مکان میں منتقل ہوگیا۔

جمی مسٹر ڈمسلر اور ان کے خاندان کے ساتھ اس مکان میں ایک ہفتے تک رہا۔ لیکن اس ایک ہفتے کے دوران کسی کو بھی وہ روح نظر نہیں آئی نہ کسی قسم کی بھیانک آوازیں سنائی دیں۔ پھر ایک روز جمی کو اسکول کے ایک لڑکے نے بتایا کہ بوسیدہ اور ویران مکان میں اس نے ایک روح کو دیکھا ہے تب جمی کو یقین ہوگیا کہ روح نے ان کا مکان چھوڑ دیا ہے اور مجبوراً اس ٹوٹے ہوئے کباڑ خانے میں، بقول روح کے، رہائش اختیار کر لی ہے۔

چند روز بعد جمی اس روح سے ملنے کے لئے اسی ٹوٹے ہوئے گھر میں پہنچا۔ اس بوسیدہ مکان کا کوئی دروازہ تھا ہی نہیں اس لئے جمی بے دھڑک اندر داخل ہوگیا۔ اسے اندر سے کسی کے رونے کی آواز سنائی دی۔

غالباً وہ روح رو رہی تھی۔ پھر کچھ دیر بعد روح نیچے آئی۔ "لڑکے خدا کے لئے میرا پیچھا چھوڑ دو۔" روح نے بے بسی سے کہا۔ "میں تمہارے ہاتھ جوڑتی ہوں۔ اب تو مجھے سکون سے رہنے دو۔"

جمی نے کہا۔ "وہ صرف اس سے ملنے اور یہ پوچھنے آیا ہے کہ اس کی زندگی کیسی گزر رہی ہے؟"

"بس گزر رہی ہے۔" روح نے افسردگی سے جواب دیا۔ "میرے نقطہ نظر سے یہ بہت اچھی جگہ ہے۔ خاموش ویران، یہاں کوئی نہیں آتا۔"

"ٹھیک ہے۔" جمی نے کہا۔ "اگر تم ہمارے کرائے داروں کو پریشان نہ کرنے کا وعدہ کرو تو میں بھی تمہیں پریشان نہیں کروں گا لیکن اگر تم اس مکان میں واپس آنے کی کوشش کی تو۔"

"نہیں میرا ایسا کوئی ارادہ نہیں۔" روح نے جلدی سے جواب دیا۔ مکان کرائے پر اٹھ جانے کے بعد جمی اور اس کی چچی کے مزے آگئے۔

جمی کے ڈھیر سارے کپڑے بن گئے اور اب وہ ہفتے میں ایک مرتبہ اور کبھی کبھی دو مرتبہ فلم بھی دیکھنے لگے۔ روح سے جمی مانوس ہوگیا تھا اس لئے وہ اس سے ملنے کے لئے ہفتے میں ایک مرتبہ ضرور جاتا تھا۔ بہت جلد وہ آپس میں گہرے دوست ہوگئے۔

اس سال کرسمس کے موقعے پر جمی نے روح کو اپنے گھر کھانے کی دعوت دی جسے اس نے شکریہ کے ساتھ قبول کرلیا۔ ظاہر ہے روح نے کچھ نہیں کھایا لیکن وہ روشن اور گرم مکان میں آکر بہت خوش ہوئی اور اس نے خوب باتیں کیں۔ روح نے جمی کو کئی اور ترکیبیں سکھائیں جن میں سب سے عمدہ ترکیب انگاروں کی طرح روشن اور دہکتی ہوئی آنکھوں والی ترکیب تھی۔ یہ ترکیب بعد میں جمی کے بہت کام آئی۔ جب وہ ڈاکٹر بن گیا تو وہ لوگوں کے گلے کا معائنہ اسی ترکیب سے کرتا تھا اور اسے معلوم ہوجاتا تھا کہ مریض کے ٹونسل نکالنے پڑیں گے یا دوا سے علاج ہوجائے گا۔

جمی کی چچی بھی روح کو بہت پسند کرنے لگی تھیں اور وہ روح بھی بہت شریف اور ہنس مکھ تھی۔ جب سردیاں آئیں تو جمی کی چچی یہ سوچ کر پریشان ہوگئیں کہ اس ٹوٹے پھوٹے مکان میں جس میں آگ کا انتظام تو ایک طرف رہا کھڑکیاں اور دروازے تک نہیں ہیں۔ روح بے چاری کس طرح سردی سے بچاؤ کرتی ہوگی؟ روح نے انہیں بتایا کہ روحوں پر موسم کا اثر نہیں ہوتا اس کے باوجود وہ فکرمند رہیں۔

"ہوسکتا ہے روحوں پر موسم کا اثر نہ ہوتا ہو۔" جمی کی چچی نے کہا۔ "لیکن اس کے باوجود ایسی جگہ پر رہنا بہت دشوار اور تکلیف دہ ثابت ہوگا۔"

جمی کی چچی نے روح کے لئے سوئٹر اور دستانے تیار کئے اور جب انہوں نے روح کو دونوں چیزیں دیں تو روح اس قدر متاثر ہوئی کہ بے اختیار اس کے آنسو بہنے لگے۔ خود جمی کی چچی بھی رونے لگیں۔ جمی نہیں رویا لیکن اس نے کہا۔ "کیا خیال ہے آنٹی اگر یہ سردیاں ہمارے ساتھ ہمارے مکان میں گزار لیں؟"

"مجھے خوشی ہوگی۔" جمی کی چچی نے کہا اور روح کی طرف دیکھا۔ جمی اور اس کی چچی کے اصرار پر روح سردیاں ان کے ساتھ گزارنے پر تیار ہوگئی۔ جب سردیاں ختم ہوگئیں تو جمی کی چچی کی روح سے اتنی گہری دوستی ہوگئی تھی کہ انہوں نے اسے جانے نہیں دیا کیونکہ جمی اسکول جاتا تھا اور اس کی غیر موجودگی میں اس کی چچی بور ہوا کرتی تھیں لیکن روح کی موجودگی میں وہ ان سے باتیں کرتی رہتیں اور اپنا کام کرتی رہتیں۔ اس طرح ان کا دن بڑے مزے میں کٹ جاتا اور رات کو کھانے کی میز پر وہ تینوں خوب باتیں کرتے۔ درحقیقت وہ روح ان کے گھر کا ایک فرد بن گئی تھی۔ اور آج تک وہ ان کے ساتھ رہتی ہے۔



بھیانک موت

ایس امتیاز احمد۔ کراچی

میدان میں پڑے ہوئے صندوق کو اس جگہ موجود لوگوں نے دیکھا جو کہ بالکل خالی تھا مگر پھر پلک جھپکتے ہی صندوق میں جواں سال حسین دوشیزہ اپنی تمام تر حشر سامانیوں کے ساتھ موجود تھی۔

دل میں ہیجان برپا کرتی اپنی نوعیت کی عجیب وغریب ذہن سے محو نہ ہونے والی کہانی

مائیکل نے ریت کی چکا چوند سے آنکھوں کو محفوظ رکھنے کے لئے ان کے سامنے انگلیوں کی باڑ کھڑی کردی اور ان کی دراڑوں سے دور کھڑے درختوں کو دیکھنے لگا، جو دوری کے باوجود طمانیت کا احساس دلا رہے تھے۔ اسے وہاں پڑے ہوئے کوئی چار گھنٹے ہو چلے تھے لیکن اسے یوں لگ رہا تھا جیسے نہ جانے کتنی صدیاں بیت گئی ہیں۔ ان چار گھنٹوں نے اسے صدیوں پیچھے جا پھینکا تھا جہاں سوچنے اور سمجھنے کی صلاحیت سرخی مائل ریت کے ٹیلوں میں مدفون نظر آتی تھی۔ ہوش آنے پر اسے پہلا احساس پیٹ اور سینے کی جلن کا ہوا تھا اور اگر وہ پسینے میں تر بتر نہ ہوتا تو گرم ریت اس کے سینے اور پیٹ کو جھلسا کر رکھ چکی ہوتی۔

اسے یہ تو علم تھا کہ وہ کہاں سے چلا تھا لیکن یہ علم نہ تھا کہ کہاں ہے، علم اور بے علمی کے مابین ایک گہرا بیکراں سمندر تھا جسے پار کر کے وہ اس جگہ جھلستی ہوئی ریت پر تھکن سے چور اور بھوک سے نڈھال پڑا تھا۔ اسے سفر کے صرف پہلے دو دن یاد تھے۔ تیسرا اس لئے یاد نہ تھا کہ اس روز سورج طلوع ہونے سے پہلے جہاز کو طوفان نے آگھیرا تھا۔ دوسرے مسافروں کی طرح وہ بھی نیند کی آغوش میں تھا کہ اچانک غل غپاڑے سے آنکھ کھل گئی۔ جہاز ہلکورے کھا رہا تھا۔ وہ جلدی سے جوتے میں پاؤں ڈال کر بھاگم بھاگ عرشے پر گیا تو وہاں بھگدڑ مچی تھی۔ عورتوں، بچوں کے چیخنے چلانے سے کان پڑی آواز سنائی نہ دیتی تھی پھر اس نے جہاز کے عملے کو لائف بوٹ سمندر میں اتارتے دیکھا اور لوگ لائف بوٹ کو اپنی بقا کا ضامن سمجھتے ہوئے اپنے وجود کو ان کے حوالے کرنے لگے۔

جہاز کا عملہ سخت مشکل میں گرفتار تھا۔ لاؤڈ اسپیکر پر مسافروں سے ڈسپلن قائم رکھنے کی درخواست کی جارہی تھی لیکن ان کے کان تو صرف لائف بوٹ کے انجن کی صدا سن رہے تھے جو انہیں پوری طاقت سے اپنی طرف کھینچ رہی تھی اور جو کہہ رہی تھی۔ ''آؤ جلدی! اپنا سارا زور لگا دو! دوسروں کو دھکے دے کر پیچھے دھکیل دو اور خود آگے بڑھو۔ مت دیکھو کہ تم میں بوڑھے اور کمزور بھی ہیں، عورتیں اور بچے بھی ہیں، آگے بڑھو! موت سے بچنا ہے تو آکر مجھ سے لپٹ جاؤ۔''

مائیکل بھی اپنے دو ساتھیوں کو کیبن میں چھوڑ آیا تھا۔ وہ جب نیند سے ہڑ بڑا کر اٹھا تھا تو نیگرو جوزف عرف جو اور اطالوی انتونیو عرف پنٹو وہسکی کے نشے میں گردو پیش سے غافل پڑے تھے۔ تجسس نے مائیکل کو



انہیں جگانے نہ دیا ورنہ وہ انہیں وہاں چھوڑ کر نہ آتا۔ لیکن عرشے کے منظر نے اسے ایسا کٹھور اور خود غرض بنادیا کہ لائف بوٹ کی کشش نے دوستوں کا تصور تک اس کے ذہن سے نکال دیا۔ اس سمے وہ اپنے ساتھی جو کو فراموش کر چکا تھا اور ہمراز پٹو کو بھول چکا تھا۔ اسے صرف اپنی بقایاد رہا تھا اور سمندر کی بپھری ہوئی موجوں کا غیض وغضب۔ وہ ان بپھری ہوئی لہروں کے رحم وکرم پر کتنے گھنٹے جو صدیوں محیط تھے، اس کا اسے احساس نہ تھا۔ اسے تو یہ بھی علم نہ تھا کہ لہروں کا بہاؤ اسے کس طرف لے جارہا تھا۔ تاڑ کے درختوں کی طرف دیکھتے ہوئے وہ اپنی سوچ میں یوں ڈوبا ہوا تھا کہ اسے اس سیاہ فام کی موجودگی کا احساس تک نہ ہوا جو جانے کہاں سے نکل کر اس کے سر پر آن کھڑا ہوا تھا۔

اس کا سایہ اپنے سامنے دیکھ کر مائیکل نے پیچھے سر گھمایا تو اس کا اوپر کا سانس اوپر اور نیچے کا نیچے رہ گیا۔ وہ اس کے ڈراؤنے چہرے سے خوفزدہ نہیں تھا۔ کیونکہ اس جگہ کسی خوش شکل اور خوش پوش انسان سے ملنے کی توقع نہیں تھی۔ ڈر وہ یوں گیا تھا کہ آسمان سے گرا اور کھجور میں اٹکا تھا۔

اسے یہ جاننے میں ذرا بھی دیر نہ لگی تھی کہ وہ تہذیب وتمدن سے بہت دور گمنام جزیرے میں نکل آیا ہے۔ وہ دل مضبوط کر کے نیم برہنہ سیاہ فام کی طرف دیکھ کر مسکرایا جیسے دوستی اور خیر سگالی کا پیغام دے رہا ہو۔ لیکن جواب میں سیاہ فارم نے جھک کر اس کا ریت پر پھیلا ہوا بازو سختی سے پکڑ لیا اور اسے اپنی طرف کھینچنے لگا۔

مائیکل کے گھٹنوں میں اتنی طاقت نہ تھی کہ اپنے آپ کو اس سے چھڑا کر اپنی ٹانگوں پر کھڑا ہو سکتا، سو وہ اسی طرح پڑا رہا۔ شاید سیاہ فام اس کی کیفیت کو جان گیا تھا۔ چنانچہ وہ اسے مرے ہوئے کتے کی طرح گھسیٹتا ہوا لے چلا۔ اس کی انگلیوں کے شکنجے میں مائیکل کی کلائی جیسے چیخ رہی تھی اور گھٹنے ریت کی رگڑ سے چھلے جارہے تھے۔ لیکن رحم کا اس جزیرے پر کوئی گزر نہ لگتا تھا اور سیاہ فام اسی ماحول کی پیداوار تھا۔

جب وہ تاڑ کے درختوں سے کچھ دور رہ گئے تو سامنے سے اسی وضع کے دو آدمی آتے دکھائی دیئے۔ قریب آ کر دونوں نے مائیکل کو لانے والے سے کچھ سوال جواب کئے۔ اور پھر وہ بھی مائیکل کو گھسیٹنے کے کار خیر میں شریک ہوگئے۔ وہ تاڑ کے جھنڈ سے نکل کر میدان میں آئے، جہاں تھوڑے تھوڑے فاصلے پر سرکنڈوں اور ناریل کے پتوں کی جھونپڑیاں بنی ہوئی تھیں۔ یہ جھونپڑیاں خاص انتظام سے بنائی گئی تھیں اور یہ ذہانت کی علامت تھیں، مائیکل کو یک گونہ اطمینان ہوا کہ وہ شعور سے قطعی عاری انسانوں کے درمیان میں نہیں۔ اسے لے جا کر ایک جھونپڑی میں مردہ جانور کی طرح ڈال دیا گیا۔

ان کے جانے کے بعد اس نے چاروں طرف دیکھا۔ زمین پر گھاس کے سوا ایک تنکا تک نہ تھا۔ چھت بھی نہیں تھی۔ اس بات سے اسے خیال گزرا کہ یہ مویشی باندھنے کی جگہ ہوگی۔ بہر حال اس کے تھکے ہوئے اعصاب کو یہاں بڑا سکون مل رہا تھا اور اسی سکون نے تھپکیاں دے کر اسے سلا دیا۔

اور پھر اس کے سر پر ایک زوردار ٹھوکر لگی تو اس کی آنکھ کھل گئی۔ سر کو تھامتے ہوئے اس کی نظر دو بھدی بھدی بے ڈول ٹانگوں پر پڑی اور اوپر سرکتی ہوئی ہو بہو ایک ویسے ہی چہرے پر جارکی جس کے تین نمونے وہ پہلے دیکھ چکا تھا۔ کچھ دیر تک وہ شخص اسے قصائی کی نظروں سے دیکھتا رہا۔ پھر اس کے سرہانے اکڑوں بیٹھ گیا۔ ”کلوے خنزیر!“ مائیکل نے اسے اپنی طرف ٹکٹکی باندھے دیکھتا پا کر اکتاہٹ سے انگریزی میں کہا لیکن وہ ٹس سے مس نہ ہوا اور پلکیں جھپکائے بغیر مائیکل کو دیکھتا رہا۔

”جا دفع ہو!“ مائیکل نے کہا تو وہ اچانک اٹھ کر چلا گیا جیسے اس نے مائیکل کی زبان سمجھ لی ہو۔ اس کے جانے کے بعد مائیکل نے اپنا ایک گال نرم گھاس پر رکھ دیا اور خوف آمیز مایوسی کے اندھے کنویں میں لٹک گیا۔ سیاہ فام جنگلیوں کے بارے میں اس نے یہی سنا اور

پڑھا تھا، فلمیں بھی دیکھی تھیں کہ وہ سفید چمڑی کے ازلی دشمن ہیں۔ انہیں اپنے دیوتاؤں کی بھینٹ چڑھا دیتے یا کھا جاتے ہیں۔

وہ وسوسوں کے یہی تانے بانے بن رہا تھا کہ ایک اور کالا بھجنگ دونوں ہاتھوں پر کیلے کے بڑے بڑے پتے اٹھائے ہوئے آیا اور انہیں مائیکل کے سامنے رکھ دیا۔ ان پتوں پر کچا ناریل تاڑ گولے، کیلے، کھجوریں اور چٹنی جیسی کوئی چیز تھی۔ وہ جلدی سے اٹھا اور ان نعمتوں پر پل پڑا۔ چٹنی جیسی چیز اسے بے حد مزے دار لگی اور اس نے پتہ بھی چاٹ ڈالا سیاہ فام خالی پتے اٹھا کر چلا گیا اور مائیکل کے جسم میں کچھ توانائی آئی تو وہ اٹھ کر چار دیواری میں ٹہلنے لگا۔

تارے ایک ایک کر کے جاگنے لگے تھے اور ہر سو بڑھتی ہوئی تاریکی میں ان کی جھلملاہٹ دل کی کچھ تقویت کا باعث بن رہی تھی۔ وہ سوچنے لگا کہ اگر رات کو اوس پڑی تو اس بے چھت جھونپڑی میں اس کا کیا حال ہوگا! وہ اسی ادھیڑ بن میں تھا کہ دو آدمی آئے اور اس کے دائیں بائیں کھڑے ہوگئے۔ پھر انہوں نے اس کا ایک ایک بازو تھام لیا۔

مائیکل نے انہیں خود کو گھسیٹنے کا موقع نہ دیا اور خود ہی قدم آگے بڑھا دیئے۔ چار دیواری سے نکل کر وہ اسے ایک سمت میں لے چلے۔ ساری جھونپڑیوں میں اندھیرا تھا۔ البتہ باتوں کی آوازیں آرہی تھیں۔ کہیں کہیں کسی جسم کی جھلک نظر آجاتی یا کسی بچے کے رونے کی آواز سنائی دے جاتی۔ وہ دونوں مائیکل کو لئے ایک جھونپڑی کے پاس پہنچے اور اسے اندر دھکیل دیا جس کے چاروں کونوں پر تین فٹ لمبی روغنی مشعلیں گڑی ہوئی تھیں۔ ساری آبادی میں صرف یہی ایک جھونپڑی روشن تھی اور بڑی بھی تھی۔

اندر داخل ہوتے ہی اس نے خود کو دس سرخ دہکتی آنکھوں کا نشانہ پایا۔ پانچ آدمی قطار میں چٹائی پر آلتی پالتی مارے بیٹھے تھے۔ درمیان میں بیٹھے ہوئے شخص پر نظر پڑتے ہی وہ جان گیا کہ جزیرے کا حکمران یا قبیلے کا سردار یہی ہوگا۔ اس نے گردن سے کمر تک ضرب کے نشان کی طرح ایک سرخ پٹکا باندھ رکھا تھا۔ ماتھے پر سرخ کپڑے کی پٹی بندھی تھی۔ اور مشعلوں کی روشنی میں اس کا بڑا سا گنجا سر چمک رہا تھا۔ اس کے دائیں جانب بیٹھے ہوئے دو آدمی چھریرے بدن اور مضبوط کاٹھی کے تھے اور چہرے مہرے سے زیادہ خونخوار نظر آتے تھے۔ ان کے ہاتھوں میں دو دو فٹ کے بھالا نما ہتھیار تھے۔ چاروں کے سروں پر پیال کے نام پر چھوٹی چھوٹی گھنگریالی سیاہ گھاس سی تھی اور سب نے کیلے اور ناریل کے پتوں سے اپنے جسم کی ستر پوشی کر رکھی تھی!

سردار جھونپڑی میں چھائی بھیانک خاموشی میں بڑی دیر تک اسے گھورتا رہا۔ پھر اس نے اسے اشارے سے بیٹھنے کو کہا۔ مائیکل اکڑوں بیٹھ گیا تو سردار اپنے دائیں جانب بیٹھے ہوئے موٹے آدمیوں سے کھسر پھسر کرنے لگا۔ کچھ دیر بعد اس نے اپنے بائیں جانب بیٹھے ہوئے ایک ہتھیار بند آدمی سے کچھ کہا۔ وہ اٹھ کر مائیکل کے پاس آیا اور اسے اٹھانے لگا تو مائیکل خود ہی کھڑا ہوگیا۔

اگلے لمحے وہ اس آدمی کے ساتھ جھونپڑی سے باہر تھا۔ ان چند لمحوں بعد اسے ایک چھت والی جھونپڑی میں پہنچا دیا گیا، جو باقی جھونپڑی سے الگ تھلگ ایک سرے پر تھی۔

اس جھونپڑی میں ایک طرف کھجور کے پتوں کی چٹائی تھی اور ایک کونے میں مٹکے جیسا مٹی کا ایک بڑا سا برتن تھا اور اس کے قریب ناریل کا ایک پیالہ نما خول پڑا تھا۔ چھت میں جگہ جگہ سوراخ تھے جن سے کہیں کہیں تارے جھانک رہے تھے۔ مائیکل جھونپڑی میں آتے ہی چٹائی پر لیٹ گیا۔ اس نے کھانے کے بعد پانی نہیں پیا تھا لیکن اسے پیاس بالکل نہیں محسوس ہو رہی تھی۔ اور خلاف توقع اس پر غنودگی بھی طاری ہو رہی تھی۔

ابھی اس کی آنکھ نہیں لگی تھی کہ جھونپڑی میں آہٹ سی ہوئی اور اس نے دروازہ نما آڑ کی طرف سر گھما کر دیکھا تو سردار جھونپڑی میں داخل ہو رہا تھا، وہ اٹھ بیٹھا اور متجسس نظروں سے سردار کی طرف دیکھنے لگا۔ وہ آ کر

چٹائی پر مائیکل کے پاس ایک گھٹنا ٹیک کر بیٹھ گیا۔ اندھیرے میں مائیکل کو اس کا چہرہ اچھی طرح نظر نہیں آ رہا تھا۔ وہ صرف اس کا ہیولہ دیکھ سکتا تھا اور اس کی آنکھوں کی تپش اور چمک کو محسوس کر سکتا تھا۔ جھونپڑی میں سردار کی بھاری بھاری سانسوں کے سوا ہلکی سرسراہٹ تک نہ تھی۔ مائیکل کا سینہ بھی اس غیر یقینی صورت حال سے دھونکنی کی طرح جل رہا تھا۔

''اجنبی!'' معاً سردار کی گھمبیر سرگوشی ابھری تو مائیکل اچھل پڑا۔ سردار نے یہ لفظ یورپی لہجے کی انگریزی میں ادا کیا تھا۔ ''میں نہیں جانتا کہ تم کون ہو، کہاں سے آئے ہو!'' سرگوشی سے پھر اس کے کان کے پردے تھرانے لگے۔ ''اور مجھے یہ جاننے کی ضرورت بھی نہیں ہے۔ تم صرف ایک شکار ہو جو شکاریوں کے نرغے میں خود کھنچے چلے آئے ہو اور شکاریوں کے سینے میں رحم نہیں ہوتا ہے۔ یہ رات تمہاری زندگی کی آخری رات بھی ہو سکتی ہے۔ جیسا کہ میرے مشیروں نے مجھے مشورہ دیا، تم سفید فام انسانوں کے خون کے پیاسے لوگوں میں آ گئے ہو اور صبح کا چڑھتا ہوا سورج کتوں کو تمہاری ہڈیاں بھنبھوڑتے دیکھ سکتا ہے۔ سن رہے ہو؟''

اندھیرے میں مائیکل نے جلدی سے گردن ہلا دی جیسے سردار اسے دیکھ رہا ہو۔

''لیکن...... لیکن میں ایک مختلف طریقے سے سوچنے کی بھی صلاحیت رکھتا ہوں۔'' سردار کہہ رہا تھا کیونکہ میں ایک جزیرے پر حکومت کرتا ہوں۔ یہ سب میری رعایا ہیں۔ میں ان سے افضل ہوں، اور اسی لئے میں نے فیصلہ کیا ہے کہ تمہاری جان بخش دی جائے بشرطیکہ......'' وہ کہتے کہتے رکا اور جھونپڑے میں ایک بھیانک سکوت تیر گیا۔ باہر ہوا ساکت تھی جیسے سردار کی سرگوشی نے اسے بھی دم بخود کر دیا ہو۔ ''بشرطیکہ تم ایک فرد کو ٹھکانے لگا دو۔ اس کے بعد میں تمہیں یہاں سے زندہ سلامت نکل جانے دوں گا۔ کوئی تمہارا بال بھی بیکا نہ کر سکے گا۔ تمہیں حفاظت سے کشتی میں سوار کرا دوں گا۔ کیا کہتے ہو؟''

''آں!'' مائیکل چونکا سردار نے اس کی پسلی میں ٹھوکا دیا تھا جیسے اس کی آنکھیں اندھیرے میں بھی دیکھنے کی عادی تھیں۔ ''کیسے؟ کیسے؟'' مائیکل بہ مشکل کہہ سکا۔

''سب کچھ بتا دیا جائے گا!'' سردار نے کہا۔ ''لیکن تمہیں یہ کام مکمل رازداری سے کرنا ہوگا!''

''منظور ہے مجھے!'' مائیکل کو اپنی زندگی کے سامنے دوسری زندگی ہیچ نظر آئی۔

''بہت اچھے!'' سردار نے اسے پیٹھ پر تھپکی دے کر شاباش دی۔ ''کبھی...... کسی کو قتل کیا ہے؟''

''آں......! ہاں......'' مائیکل نے جلدی سے کہا۔

''پھر تو تمہارے لئے یہ کوئی مسئلہ نہیں ہے!'' سردار بولا۔ ''بس تیار رہو۔ البتہ تمہارے پاس اس فرد کو ٹھکانے کے لئے کوئی ہتھیار نہیں ہوگا۔ اس لئے تمہیں گلا گھونٹ کر اسے مار ڈالنا ہوگا اور پھر اس کی لاش کو سمندر میں پھینک دینا ہوگا، سمجھے......؟''

مائیکل نے بمشکل تھوک نگلا۔

''یہ نہ سمجھو کہ میں خود اسے دنیا سے رخصت نہیں کر سکتا یا اپنے کسی آدمی سے نہیں کرا سکتا۔ میں اسے چٹکی سے مسل سکتا ہوں یا اس کے ٹکڑے ٹکڑے بھی کرا سکتا ہوں لیکن ایک وجہ کے سبب میں ایسا کرنا نہیں چاہتا اور تمہیں یہ جاننے کی ضرورت بھی نہیں ہے۔''

قتل کرنے کا تصور مائیکل کے لئے چنداں کٹھن نہیں تھا لیکن گلا گھونٹنے کے خیال سے اس کا پتہ پانی ہو رہا تھا۔ وہ یہاں کے قوی الجثہ لوگوں کو دیکھ چکا تھا۔ کسی کا گلا اتنا نرم نظر نہ آیا تھا کہ اس کی انگلیوں سے دب سکے۔ وہ گلا دباتا ہی رہ جائے گا اور اس کے اپنے جبڑے ٹوٹ چکے ہوں گے یا کلائیاں موڑ دی جا چکی ہوں گی۔

''کیا کسی ہتھیار سے یہ کام نہیں ہو سکتا؟'' اسے اپنی سرگوشی بڑی ڈراؤنی لگی۔

''نہیں!'' سردار نے دانت بھینچ کر کہا جیسے اسے مائیکل کی بات بڑی احمقانہ لگی ہو۔ ''اس کا گلا گھونٹنا تمہارے لئے مشکل نہ ہوگا۔ وہ ایک لڑکی ہے!''

''لڑکی!'' مائیکل کے منہ سے بے ساختہ نکل گیا۔
''میں تمہیں اس سے گھلنے ملنے کا پورا موقع فراہم کروں گا!'' سردار نے اس کی بات کو نظر انداز کر کے کہا! ''لیکن تم اس کے ساتھ کوئی ایسی ویسی حرکت نہیں کرو گے۔ میری نظریں ہر وقت تمہارا پیچھا کرتی رہیں گی۔ تمہاری ہر حرکت میری نظروں میں ہوگی! سنا تم نے!!
''ہاں! مائیکل نے مری ہوئی آواز میں بولا۔
''وہ لڑکی کنواری ہے اور اسے دنیا سے کنواری ہی جانا ہے۔'' سردار نے کہا۔ ''اب میں جا رہا ہوں۔ صبح ملاقات ہوگی اور ہاں...... تم کسی کے سامنے مجھ سے بات نہیں کرو گے۔ یہ سمجھو کہ مجھے انگریزی نہیں آتی دراصل یہاں انگریزی کسی کو بھی نہیں آتی۔ تم اپنی ہر ضرورت ان سے پوری کراؤ گے۔ اس لڑکی سے بھی اشاروں میں ہی بات کرو انگریزی اسے بھی نہیں آتی!'' سردار اٹھ کر چلا گیا اور مائیکل کو ذہنی عذاب میں مبتلا چھوڑ گیا۔
وہ رات اس پر بڑی کٹھن گزری۔ نیند آنکھوں سے یوں غائب ہوگئی جیسے اس نے اس کی پلکوں کو کبھی چھو کر بھی نہ دیکھا ہو۔ شراب کا وہ رسیا تھا اور سگریٹ کا عادی اب تک تو فکر و تردد نے اسے ان دونوں کی یاد نہیں دلائی تھی لیکن رات جوں جوں طویل لگتی جا رہی تھی۔ شراب اور سگریٹ کی طلب اسے بے کل بنائے دیئے جا رہی تھی۔ کوئی بے چینی سی تھی۔ ہر چند کہ اسے یقین تھا، یہ دونوں چیزیں اس کے لئے خواب و خیال ہو کر رہ گئی ہیں۔
صبح جب پو پھٹی اور وہ بے تابی سے اٹھ کھڑا ہوا۔ اب جو اس نے دیکھا تو جھونپڑی میں ایک دروازہ بھی تھا جو پشت پر کھلتا تھا۔ اس نے سرکنڈوں اور کھجور کے پتوں کے اس دروازے کو کھولا اور باہر جھانکا تو بائیں رخ پر ایک گیند نما گول جھونپڑی نظر آئی جو چاروں طرف سے بند تھی اور یہی اس بستی کی آخری جھونپڑی تھی۔ اس سے کچھ فاصلے پر کھجوروں کے جھنڈ تھے جن کے قدموں میں ایک چشمہ یا ننھی منی جھیل سی تھی۔ وہ اپنی جھونپڑی سے نکلا اور اس کے قدم خود بخود پانی کی سمت بڑھنے لگے۔
سورج کی کرنیں درختوں کی چوٹیوں پر سنہرا پانی پھیرتی جا رہی تھیں اور پرندوں کی مدھر آوازوں سے پتے جھوم رہے تھے۔ مہک آمیز ہوا کے جھونکے جھیل کے پانی کو ہلکورے دے رہے تھے۔
مائیکل ماحول سے سحر زدہ سا ہوگیا تھا۔ اس نے جھیل کے کنارے بیٹھ کر دونوں پاؤں پانی میں ڈال دیئے اور منہ پر چھینٹے مارے تو اس پر سرور طاری ہونے لگا۔ بیساختہ اس کے ہونٹوں پر ایک گیت مچلنے لگا۔ یہ گیت اس نے برمنگھم کے ایک کیبرے میں نیگرو مغنیہ سے سنا تھا۔ اس میں حسن و شباب کی چیخ پکار نہیں تھی وطن سے دوری اپنوں سے بچھڑنے اور آسائشوں سے محرومی کا تاثر تھا۔ اس سمے مائیکل کو اپنی آواز کسی پرندے کی پکار لگ رہی تھی۔ جس میں وہ ڈوب کر ابھرتا اور ابھر کر ڈوب رہا تھا۔ دفعتاً ایک چھوٹا سا پتھر پیچھے سے آیا اور جھیل کے پانی کے وجد کی کیفیت کو توڑ گیا۔ اس کا وجدان بھی بکھر گیا اور اس نے پلٹ کر دیکھا تو دیکھتا ہی رہ گیا۔
ایک لڑکی درخت کے جھکے ہوئے تنے سے پشت ٹیکے کھڑی تھی۔ نہ جانے وہ وہاں کب سے کھڑی تھی۔ اس نے ستر پوشی کے لئے کیلے کے پتوں کی جھالر اور کھجور کے پتوں کی کترن سے مدد لی تھی۔ اس کا رنگ سانولا تھا اور نقوش کچھ زیادہ تیکھے نہیں تھے۔ ناک ستواں تھی اور آنکھیں بڑی بڑی لیکن دہانہ چوڑا اور ماتھا چھوٹا تھا۔ البتہ جسم ضرور سڈول تھا۔ اس کے بال شانوں پر لہرا رہے تھے جن کا رنگ نہ جانے بھورا تھا یا براؤن، مائیکل یہ فیصلہ نہ کر سکا۔ اس نے کیلے کے پتے کی چوڑی سی پٹی سر پر باندھ رکھی تھی۔
مائیکل اٹھا اور آہستہ آہستہ اس کی طرف بڑھا۔ قریب پہنچا تو غیر ارادی طور پر مسکرا دیا۔ وہ بھی مسکرائی۔ اس کے کھڑے ہونے کا انداز نہیں بدلا اور مائیکل اس کی بے باکی پر کچھ حیران سا بھی ہوا۔ پھر اس کی حیرانی اس جواز میں بدل گئی کہ وہ......
بہر حال دنیا کے کسی دور افتاد گوشے میں تہذیب نا آشنا تھی اور...... شاید...... اس جیسے کسی مرد کی متلاشی

تھی۔ دونوں دیر تک کھڑے ایک دوسرے کو دیکھتے رہے۔ پھر وہ اچانک سیدھی ہوکر کھڑی ہوگئی۔ مڑی اور چل دی۔ مائیکل اس کے پیچھے لپکا لیکن وہ سر گھما کر اس کی طرف دیکھے بغیر تیز تیز قدموں سے چلتی رہی۔ اس کے قدم اس گول جھونپڑی کی سمت میں اٹھ رہے تھے اور اس نے ایک بار بھی پلٹ کر نہ دیکھا تھا جھونپڑی کے قریب پہنچ کر بھی اس نے مائیکل کی طرف دیکھا نہیں اور اندر داخل ہوگئی۔

اب بند جھونپڑی مائیکل کا منہ چڑانے لگی۔ اور وہ بے نیل ومراد اپنی جھونپڑی کی طرف بڑھا۔

جھونپڑی میں قدم رکھا تو اس کی نظر دو نیم برہنہ عورتوں پر پڑی۔ دونوں ایک دوسرے سے جڑ کر ایک کونے میں کھڑی تھیں۔ انہیں خوش شکل کہا جاسکتا تھا نہ بہ شکل سیاہ آبنوسی رنگت، چھوٹی چھوٹی آنکھیں جو نیم وا ہونے کے باعث اور بھی چھوٹی لگتی تھیں۔ ناک سامنے سے چپٹی، نچلے ہونٹ موٹے جن میں اوپر کے ہونٹ چھپ گئے تھے۔ بال سیاہ چمکدار لمبے لمبے، البتہ جسم بہت سڈول تھے اور ان میں اتنی کشش تھی جو مائیکل کو یورپ اور ایشیا کی عورتوں میں خالی خالی نظر آتی تھی۔

اس کے جھونپڑی میں داخل ہوتے ہی دونوں ایک دوسرے سے قریب ہوکر کھڑی ہوگئیں اور اسے حیرت آمیز تشویش کی نظروں سے دیکھنے لگیں۔ مائیکل کی نظر ان سے ہٹ کر زمین پر پڑی تو وہاں کیلے کے پتوں پر اس کا ناشتہ رکھا تھا۔ وہی کیلے، ناریل، تاڑ گولے اور دو گول گول ایسے پھل تھے جو اس نے پہلے نہیں دیکھے تھے۔ وہ بلاتامل زمین پر آلتی پالتی مار کر بیٹھ گیا۔ اور ان چیزوں پر ہاتھ صاف کرنے لگا۔ کھاتے کھاتے وہ نگاہیں اٹھا کر ان عورتوں کو دیکھتا اور مسکرادیتا۔ وہ جواباً مسکرانے کے بجائے سپاٹ چہرہ لئے ایک دوسرے سے اور چپک جاتیں۔

چند منٹوں میں مائیکل نے سب کچھ ختم کر ڈالا اور اطمینان سے بیٹھ گیا جیسے ان عورتوں سے کہہ رہا ہو کہ اس کام سے تو میں نمٹ گیا۔ اب بتاؤ کیا کروں؟ اس کی نظریں یہ سوال کرتے ہوئے ان کے جسموں کے کھلے حصوں پر دوڑنے لگیں جنہیں ناریل کے ریشوں اور کیلے کی چھال کا لباس چھپا نہ سکا تھا۔ اس کی ایک بھوک ختم ہوگئی تھی اور دوسری بھوک بیدار ہوکر انگڑائیاں لے رہی تھی۔ عورتیں اس کی نظروں کے پیغام سے لاتعلق جھکیں، خالی پتے اٹھائے اور ایک دوسرے سے لگی لگی باہر نکل گئیں۔

ان کے جانے کے بعد مائیکل اکتایا، اکتایا سا اٹھا اور گول جھونپڑی کی طرف خالی خالی نظروں سے دیکھنے لگا۔ اسے وہاں کھڑے چند سیکنڈ ہی گزرے تھے کہ پیچھے سے آہٹ ہوئی اور اس نے پلٹ کر دیکھا تو سردار اپنے ایک موٹے مشیر کے ساتھ کھڑا تھا۔ اس کے منہ سے ''گڈ مارننگ'' پھسلتے پھسلتے رہ گیا۔

بروقت یاد آیا کہ سردار نے اسے مخاطب کرنے سے منع کیا تھا...... سردار اور مشیر اپنی بولی میں آہستہ آہستہ باتیں کرنے لگے۔ اگر وہ بلند آواز سے بولتے تب بھی مائیکل کے پلے کچھ نہ پڑتا۔ پھر سردار نے مشیر سے کچھ کہا۔ اور وہ مائیکل کے قریب آیا۔ اس کے جسم پر شرٹ اور پتلون اب تک موجود تھی۔

سردار کے مشیر نے اس کے گریبان پر ہاتھ ڈالا اور ایک ہی جھٹکے سے بشرٹ کو تار تار کر ڈالا۔ پھر گوشت سے بھرے بھرے سفید سینے اور پیٹ پر بھرپور نظر ڈال کر اسے گھمایا اور پشت کو دیکھنے لگا جیسے اس کا ڈاکٹری معائنہ کررہا ہو۔ اس نے مائیکل کے جسم کو چھوا نہیں اور فاصلے سے اسے دیکھتا رہا۔ اس معائنے سے فارغ ہوکر وہ سردار کے پاس گیا اور دونوں باتیں کرنے لگے۔ مائیکل بھی گھوم کر ان کے روبرو ہوگیا۔ اس نے محسوس کیا جیسے وہ دونوں ماہرین جسم کسی بات پر بحث کررہے تھے۔ پھر اسے مشیر کا پلہ بھاری اور حکمران کا ہلکا محسوس ہوا کیونکہ موٹے نے آگے بڑھ کر اس کی پتلون کی پیٹی پر ہاتھ رکھا اور اسے پھاڑنے کی کوشش کرنے لگا۔

مائیکل اس کا عندیہ سمجھ گیا کہ وہ اسے پتلون سے بھی محروم کرنا چاہتا ہے۔ اس نے گھبرا کر سردار کے

چہرے پر نظر ڈالی تو سردار نے اسے آنکھ ماری۔ مجبوراً اس نے پتلون کی بیلٹ اور زپ خود ہی کھول دی اور وہ اس کے پیروں پر ڈھیر ہوگئی۔ پھر اس نے دونوں پاؤں جھٹک کر خود کو پتلون سے آزاد کرلیا۔ اب وہ ان دونوں کے ساتھ مادرزاد برہنہ کھڑا تھا۔ مشیر نے آگے بڑھ کر پتلون دو انگلیوں سے اٹھالی جیسے کسی نجس چیز کو اٹھا رہا ہو اور اس کے بعد دونوں جھونپڑی سے نکل گئے۔ مائیکل منہ ہی منہ میں انہیں گالیاں دیتا رہ گیا۔

کچھ دیر بعد ایک آدمی آیا۔ وہ مائیکل کے لئے لباس فاخرہ لایا تھا جیسے شاہی دربار سے خلعت عطا کی گئی ہو۔ ان لباس نما چیزوں سے ستر پوشی کرکے مائیکل کو اپنے میں اور اس آدمی میں سوائے رنگ اور روپ کے اور کوئی فرق دکھائی نہ دیا۔ وہ بے ساختہ ہنسنے لگا اور ہنستے ہنستے دہرا ہوگیا مگر کیا مجال کہ دوسرے آدمی کے ہونٹوں پر مسکراہٹ نام کی کوئی چیز آئی بھی ہو۔ مائیکل نے اس سے بے تکلف ہونے کے لئے اس کے سینے پر ہلکا سا دھپ لگایا تو وہ مٹی کا بت چند قدم پیچھے ہٹ گیا۔ اس کے ہونٹ کھلے نہ آنکھوں سے کوئی ردعمل ظاہر ہوا۔ مائیکل اس کی بے حسی پر جھنجلا گیا اور اسے دو چار لذیذ گالیاں دے ڈالیں جنہیں سن کر جیسے اپنی خدمت کا انعام لے کر وہ خاموشی سے چلا گیا۔

مائیکل پچھلے دروازے سے نکل کر گرد و پیش پر نظریں دوڑانے لگا۔ اس کی نظریں گول جھونپڑی والی لڑکی کو تلاش کررہی تھیں۔ وہ کون تھی؟ اس نے اسے اپنی طرف متوجہ کیوں کیا تھا؟ دوسری عورتوں سے قدرے مختلف کیوں تھی؟ یہ سوال اس کے ذہن میں رینگ رہے تھے اور اس کے تجسس میں اضافہ کررہے تھے۔

وہ آہستہ آہستہ چلتا ہوا گول جھونپڑی کے قریب پہنچا اور اس سے کان لگادیئے۔ اندر سے کسی قسم کی آواز نہیں آرہی تھی۔ چلنے پھرنے کی نہ بولنے چالنے کی۔ اس کی مایوسی بڑھنے لگی اور قدم جھیل کی طرف اٹھنے لگے۔ دور دور تک کسی انسان کا وجود نظر نہ آتا تھا جیسے اس کی قطعی نگرانی نہیں کی جارہی تھی۔ اسے گھومنے پھرنے کی مکمل آزادی تھی اور وہ شاید اس لئے کہ اس کے فرار ہونے کا کسی کو کوئی خدشہ نہ تھا۔ لیکن اس کے لئے فرار کی کوئی راہ نہ تھی۔ البتہ سردار کی مہیب پیش کش نے یہ راہ فراہم بھی کردی تھی اور اس کے رضامند نہ ہونے کی راہ مسدود بھی تھی۔

اس کی چھٹی حس رہ رہ کر اسے یقین دلانے کی کوشش کررہی تھی کہ ہونہ ہو، سردار اسی گول جھونپڑی والی لڑکی کو اس کے ہاتھوں قتل کرانا چاہتا ہے۔ اس احساس کی وجہ محض یہ تھی کہ اس لڑکی میں اسے ایک انفرادیت نظر آئی تھی۔ لیکن یہ انفرادیت کس بناء پر تھی۔ اور سردار اسے کیوں قتل کرانا چاہتا تھا؟ یہ باتیں اس کی پریشانی کا باعث بن رہی تھیں۔ ہر چند کہ جہاں تک اس کی ذات کا معاملہ تھا، اسے پریشان ہونے کی ضرورت نظر نہ آتی تھی۔ اسے اس لڑکی سے کوئی واسطہ نہ تھا اور اس کی ہلاکت میں ہی نجات تھی لہٰذا اسے سردار کی بات ماننا ہی تھی۔

وہ اس لڑکی یا کسی بھی لڑکی کا گلا گھونٹ کررہے گا اور اس کام میں ذرا بھی دیر نہیں کرے گا کیونکہ اس جگہ ایک ایک لمحہ اس کے لئے عذاب ناک تھا۔ اگر اس کا بس چلتا تو آئندہ چند سیکنڈ میں وہ اس فرض سے سبکدوش ہوجاتا تاکہ آزادی کے لمحات بلا تاخیر اسے گلے لگالیں۔ اسی ادھیڑبن میں وہ جاکر جھیل کے کنارے بیٹھ گیا اور بار بار سر گھما کر دیکھنے لگا کہ شاید وہ لڑکی ادھر آنکلے۔ لیکن اس کی نظریں خالی زمین اور گول جھونپڑی سے ٹکرا کر مایوس لوٹ آتیں۔ پھر اسے گانے کا خیال آیا کہ مبادا اس کی آواز لڑکی کو کھینچ لائے۔ اس نے وہی افسردہ اور محرومی کا احساس دلاتا ہوا گیت شروع کیا اور اس بار زیادہ بلند آواز سے گیت ختم ہوگیا اور کوئی نہ آیا۔

وہ جھنجلا کر اٹھا اور ہمت کرکے دوسری جھونپڑی کی طرف بڑھا۔ اس نے اندازہ لگایا کہ کوئی ڈیڑھ سو جھونپڑیاں ہوں گی۔ گویا ایک بھرپور آبادی تھی لیکن حیرت کی بات تھی کہ اس وقت کوئی مرد نظر نہیں آرہا تھا۔ صرف جھونپڑیوں کے اندر اور باہر عورتیں تھیں یا ننگ دھڑنگ، کالے بھجنگ، ہر عمر اور ہر سائز کے بچے تھے جو گروپوں

میں بچے مختلف کھیل کھیل رہے تھے۔ اس پر نظر پڑتے ہی ان کی چیخیں نکل گئیں۔ ان چیخوں میں ڈر بھی تھا اور حیرت بھی تھی۔ وہ سب کے سب کھیل چھوڑ چھاڑ کر ایک گروہ کی شکل میں اسے دیکھنے لگے۔ عورتوں نے بھی کام چھوڑ دیا اور جھونپڑیوں سے باہر نکل آئیں۔ وہ بھی ٹکڑیوں میں بٹی اسے اس طرح دیکھ رہی تھیں جیسے کوئی نیا جانور بستی میں نکل آیا ہو۔ جو بے ضرر تو ہو لیکن انوکھا بھی ہو۔

مائیکل ان کے حیرت زدہ چہرے کو دیکھ کر سوچنے لگا کہ انہوں نے کبھی کوئی سفید فام باشندہ نہیں دیکھا ہوگا۔ سائنس کی ترقی اور خلا کی تسخیر کے اس دور میں وہ کس مقام پر نکل آیا تھا جہاں انسان اپنے ایک ہم جنس کو یوں آنکھیں پھاڑے دیکھ رہے تھے جیسے اس کے بارے میں کبھی سنا ہو اور نہ اسے دیکھا ہو۔ یہ کون سا جزیرہ تھا جہاں اب تک کسی مہذب انسان کے قدم نہیں آئے تھے؟ یہ کیسی دنیا تھی جو تمدن کی دنیا سے یوں کٹی ہوئی تھی؟

بچوں کا خوف اور عورتوں کی حیرت اس کے لئے بھی حیران کن تھی۔ بچوں کا خوف دور کرنے کے لئے وہ مسکراتا ہوا ان کی طرف بڑھا تو ان میں بھگدڑ مچ گئی اور وہ چیختے چلاتے ہوئے جھونپڑیوں کی طرف بھاگے یا اپنی ماؤں سے لپٹ گئے۔ مائیکل کے بڑھتے ہوئے قدم رک گئے اور اس نے ایک پر امید مسکراہٹ عورتوں کی طرف اچھالی لیکن ان کے چہروں کے تاثرات بھی نہ بدلے تاہم کسی نے اپنی جگہ سے کوئی جنبش نہیں کی۔ اس سے صاف ظاہر ہو رہا تھا کہ انہیں اس سے بالکل ڈر نہیں لگ رہا تھا۔ اس کی طرف سے کوئی خطرہ محسوس نہیں ہو رہا تھا۔ البتہ مائیکل کو یہ خدشہ ضرور تھا کہ اگر اس نے ایک قدم بھی آگے بڑھایا تو اس کی خیر نہیں۔

ان عورتوں کی شکل بدصورت حلیہ اور وضع قطع میں غضب کی مماثلت تھی جیسے سب ایک ہی سانچے سے مختلف سائز میں ڈھل کر نکلی ہوں۔ ایک ہی خاندان کے فرد ہوں، جسمانی کشش بیشتر عورتوں میں قدرے مشترکہ تھی اور مائیکل دل ہی دل میں ان کے مردوں پر رشک کر رہا تھا۔ ان کے سامنے اسے یورپ کی گوری چٹی، خوبرو عورتیں ہیچ نظر آ رہی تھیں۔ تسکین اور آسودگی کے تصور سے وہ کاغذ کے پھولوں اور شاخوں پر لہلہاتے ہوئے تر و تازہ پھولوں میں خود کو محسوس کر رہا تھا۔ لیکن یہ پھول اس کی دسترس سے باہر تھے۔ چنانچہ وہ مڑا اور اپنی جھونپڑی کی طرف بوجھل قدموں سے چل پڑا۔

دھوپ میں تمازت تھی اور اسے جسم میں جابجا سوئیاں سی چبھتی لگ رہی تھیں۔ اس کا علاج اسے جھیل میں اترنے میں نظر آیا۔ سو وہ جا کر ٹھنڈے پانی میں بیٹھ گیا اور دیر تک بیٹھا رہا۔ اس نے آنکھیں موند رکھی تھیں جیسے کوئی گیانی تپسیا کر رہا ہو۔

کچھ دیر بعد اسے چڑیوں کی چہچہاہٹ اور طوطوں کی ٹائیں ٹائیں سنائی دیں تو اس نے آنکھیں کھول دیں اور دیکھا کہ جھیل کے کنارے بہت سارے بچے کھڑے اسے دیکھ رہے تھے اور آپس میں باتیں کرتے جا رہے تھے۔ وہ اپنی جگہ سے نہیں ہلا کہ کہیں وہ بھاگ نہ کھڑے ہوں۔ پھر اسے دیکھ کر کہ بچوں کا خوف کچھ دور ہو گیا ہے، وہ آہستہ آہستہ سے اٹھا اور کنارے کی طرف بڑھا۔ اسے آتا دیکھ کر بچے بھاگے نہیں البتہ پیچھے ہٹ ہٹ کر کھڑے ہونے لگے۔ وہ جھیل سے نکل کر مسکراتا ہوا ان کی طرف دیکھنے لگا۔

بے ساختہ کئی بچے کھلکھلا کر ہنس پڑے۔ اس سے اس کی ہمت بڑھی اور اس نے آگے بڑھ کر قریب ترین بچے کے گالوں کو تھپتھپایا۔ وہ بچہ ٹس سے مس نہ ہوا تو اس نے دوسرے بچے کے سر پر پیار سے ہاتھ پھیرا۔ اس پر بھی بچوں کا کوئی ردعمل ظاہر نہ ہوا تو اس نے ایک چھوٹے سے بچے کو گود میں اٹھالیا۔ بچے نے ایک فلک شگاف چیخ ماری اور اس کے ہاتھوں میں تھر تھر کانپنے لگا۔

اچانک دیکھتے ہی دیکھتے بہت سی عورتیں جیسے درختوں کے جھنڈوں میں ابل پڑیں۔ وہ بھاگتی آ رہی تھیں۔ مائیکل گھبرا گیا لیکن وہ حاضر دماغی سے کام لے کر بچے کو چمکارنے لگا۔ بچہ گلا پھاڑ پھاڑ کر روئے جا رہا تھا۔ اتنے میں ایک عورت آگے بڑھی تو مائیکل نے کراہیت محسوس کرنے کے باوجود بچے کے گندے گالوں کے چٹ

چٹ بوسے لے ڈالے اور سے عورت کے بڑھے ہوئے ہاتھوں میں دے دیا۔ پھر اس نے ایک اور بچے کو اٹھالیا اور اسے جھلانے لگا۔ وہ بچہ رویا پیٹا نہیں اور جھولنے سے لطف اندوز ہوتا رہا۔ مائیکل نے اسے زمین پر کھڑا کردیا اور عورتوں پر گہری نظر ڈالتا ہوا اپنی جھونپڑی کی سمت چل پڑا۔ بچوں کا ہجوم اس کے پیچھے ہولیا۔

مائیکل پلٹ پلٹ کر فتح مندی سے عورتوں کی طرف دیکھتا رہا۔ اس نے میدان مارلیا تھا۔ ان کے بچوں کو اپنا گرویدہ بنالیا تھا۔ اب اس کی بوریت ختم ہونے کے واضح امکان تھا وہ ان جنگلیوں میں اپنے لئے اپنائیت کا احساس پیدا کرنے میں کامیاب ہو چلا تھا۔

جب وہ اپنی جھونپڑی میں داخل ہورہا تھا تو سوچ رہا تھا کہ ان عورتوں میں وہ لڑکی کیوں نہیں تھی۔ وہ ساری بستی میں نظر کیوں نہیں آئی تھی؟ ''وہ کون ہے؟ اس میں کیا خصوصیت ہے؟ کیا اس میں اب کوئی شبہ رہ جاتا ہے کہ سردار اس کی زندگی کو ختم کرانا چاہتا ہے؟''

سردار نے کہا تھا کہ وہ اسے ہلاک کی جانے والی لڑکی سے گھلنے ملنے کا موقع دے گا اور جب وہ اپنی بات پر عمل کرے گا تو یہ غیر یقینی کیفیت ختم ہوجائے گی۔ معلوم ہوجائے گا کہ جس لڑکی کو ختم کرنا ہے وہ یہی گول جھونپڑی والی ہے یا کوئی اور جھونپڑی میں کھانا اس کا منتظر تھا۔ اس بار کھانے میں تبدیلی تھی، پتوں پر چھوٹے چھوٹے بھنے ہوئے پرندے تھے۔ اور پھلوں میں صرف کیلے تھے۔ جھونپڑی میں کوئی اور موجود نہیں تھا۔ اس نے ڈٹ کر کھایا اور لیٹ گیا۔ اس کی آنکھ لگ گئی اور پھر اچانک کھل گئی۔ سردار نہ جانے کب سے کھڑا تھا۔ مائیکل اسے دیکھ کر اٹھ بیٹھا۔

''تم یہاں بوریت محسوس کررہے ہوگے؟'' سردار نے اس کے پاس بیٹھ کر بہت آہستہ سے کہا۔

''اس میں کیا شک ہے؟'' مائیکل نے جھنجلا کر اسی آہستگی سے جواب دیا۔

''عورت کے بارے میں تمہارا کیا تجربہ ہے؟'' سردار نے خفگی مسکراہٹ سے پوچھا۔

''میں تمہارا مطلب نہیں سمجھا!'' مائیکل نے حیرانی سے پوچھا۔

''میرا مطلب ہے تم عیش وعشرت کرتے رہے ہو یا دکھی پھیکی زندگی گزارر ہے ہو؟''

''میں ابھی جوان ہوں اور جوانوں کے سے جذبات رکھتا ہوں۔''

''ٹھیک ہے تمہارے جذبات کی تسکین کا سامان ہوجائے گا، لیکن اپنا وعدہ یاد رکھنا کہ میں نے جس لڑکی کے بارے میں کہا ہے اس کی طرف میلی آنکھوں سے نہ دیکھنا۔''

''مجھے کیا غرض پڑی ہے! اور تم بھی اپنا وعدہ نہ بھولنا کہ میرے بھاگنے کا پہلے سے سارا انتظام کر رکھو گے؟''

''اس کی تم فکر نہ کرو۔ تمہیں فوراً فرار کردینے میں میرا اپنا مفاد ہے۔ تو آج رات تمہیں تفریح کا سا سامان مل جائے گا!'' سردار اٹھ کر جانے لگا تو مائیکل نے کہا۔ ''مجھے اپنا مقصد پورا کرنے کے لئے کتنا انتظار کرنا ہوگا؟''

''زیادہ دنوں تک نہیں!'' سردار نے رک کر کہا۔ ''تمہیں اس لڑکی سے خود متعارف ہونا پڑے گا اور اس کے بعد تم اس کام میں جتنی جلدی کرو گے اتنا ہی تمہارا فائدہ ہے۔ وہ لڑکی تمہاری پیچھے والی جھونپڑی میں رہتی ہے!''

''گول جھونپڑی میں!'' مائیکل نے بے ساختہ کہا اور سردار اس کے شبہے کی تصدیق کرکے چلا گیا۔

''مجھے اس سے خود ہی متعارف ہونا پڑے گا۔'' مائیکل نے اپنے آپ سے کہا۔ ''وہ تو میں ہو چکا ہوں۔ لیکن اس سے مراسم کیسے بڑھائے جائیں کیا میں جاکر اس کی جھونپڑی پر دستک دوں؟ اس سے کیا کہوں گا کہ اس سے دوستی کرنا چاہتا ہوں۔ کہوں گا کیسے؟ کس زبان میں؟ میں آنکھوں اور قدموں کے ذریعے تو اس تک پہنچنے کی پہلے ہی کوشش کرچکا ہوں اور اس میں اس نے میری حوصلہ افزائی نہیں کی؟ کیا اسے سردار کے ارادوں کا علم ہے یا وہ دوسری عورتوں کی طرح مجھ سے خائف ہے؟'' سوالات کی بوچھاڑ سے بچنے کے لئے اس کے ذہن نے اپنے دروازے بند کرلئے اور وہ دوبارہ سوگیا۔

وہ سو کر اٹھا تو جھٹپٹے کا وقت تھا۔ جھونپڑی کا پچھلا دروازہ کھول کر باہر نکلا اور گول جھونپڑی کی ٹکٹکی باندھے دیکھتا رہا۔ سوچتا رہا کہ ''وہ لڑکی...... اس کے ہاتھوں زندگی کی رمق سے محروم ہو کر سمندری مچھلیوں کا کھانا بن جانے والی لڑکی اس وقت کیا کر رہی ہوگی؟ وہ اپنی کن عزیزوں سے بچھڑ جائے گی؟ اور کون اس کے غم میں روئے گا؟ کوئی روئے گا یا بھی یا نہیں؟ اس کا کوئی ہے بھی یا وہ دنیا میں تنہا ہے؟'' وہ سوچتا رہا اور گول جھونپڑی دم بہ دم بڑھتے ہوئے اندھیرے کے لبادے میں لپٹتی گئی۔

پرندے اپنی اپنی بولیوں سمیت آشیانوں میں جا چھپے تھے اور سوائے کسی جھینگر یا جھیل سے اٹھنے والی مینڈک کی آواز کے...... ہولناک سناٹا چھاتا جا رہا تھا۔ وہ جھونپڑی میں آ کر سامنے کے دروازے پر جا کھڑا ہوا تو وہاں بھی منظر کچھ مختلف نہیں تھا۔ دور سے جھونپڑیاں بڑے بڑے دھبے سی نظر آ رہی تھیں۔ کسی بچے کے رونے کی ایک آدھ آواز ابھرتی اور رات کو پہنائیوں میں ڈوب جاتی۔ وہ دیر تک دروازے پر کھڑا آسمان پر تاروں کو ایک ایک کر کے بزم سجاتا دیکھتا رہا اور درختوں کے پتوں کی سرسراہٹ کو سنتا رہا۔ اس کا بڑی شدت سے دل چاہ رہا تھا کہ اس وقت جا کر گول جھونپڑی والی کا گلا گھونٹ دے اور پھر صبح کو طلوع ہوتا ہوا سورج اس کی کشتی کو سمندر کے سینے پر ہمکتا، مچلتا دیکھے بڑی بے چینی سے وہ دروازے پر سے لوٹا اور بڑی بے کلی سے چٹائی پر ڈھیر ہو گیا۔ اگر اسے رونے کا تجربہ ہوتا تو بے اختیار رو دیتا۔

ابھی چند لمحے نہ گزرے تھے کہ دروازہ آہستہ سے کھلا اور اس نے کسی کو اندر آتے دیکھا۔ کچھ زیادہ اندھیرا ابھی نہیں تھا۔ لیکن عورتوں اور مردوں کے ملتے جلتے حلیے کے باعث وہ پہلی نظر میں پہچان نہ سکا کہ آنے والا مرد تھا یا عورت تھی لیکن دوسرے ہی لمحے ایک عورت اس کے قریب کھڑی تھی۔ وہ اٹھ بیٹھا اور سر اٹھا کر نگاہوں سے اس نے جسم کی پیمائش کرنے لگا۔ اسے یہ سمجھنے میں زیادہ دیر نہ لگی کہ سردار نے حسب وعدہ اس کی دلچسپی کا سامان فراہم کر دیا تھا۔ یہاں اس کی زندگی اتنی اذیت رساں اور تنہائی اتنی تلخ نہ ہوتی تو وہ بھوکے کتے کی طرح اس پر نہ جھپٹتا۔

عورت جس کی شکل اس نے دیکھی نہیں تھی اپنے پرکشش جسم کو لئے خاموشی سے آئی تھی، اسی خاموشی سے چلی گئی۔ اور وہ طمانیت سے پاؤں پھیلا کر لیٹ گیا۔ آسودگی اس کے پپوٹوں کو تھپکنے لگی اور وہ بھاگنے اور سونے کے درمیانی وقفے میں تھا کہ پچھلا دروازہ کھلنے کی سرسراہٹ سنائی دی۔ اس نے گردن کو گھما کر دیکھا تو کوئی آہستہ سے جھونپڑی میں داخل ہو رہا تھا۔ وہ بے حس و حرکت پڑا رہا۔ تاہم وہ پوری طرح تیار تھا کہ اگر اس پر حملہ کیا گیا تو وہ پھرتی سے خود کو بچالے گا۔ آنے والا اس کے سرہانے آ کر رکا تو پھولوں کی ہلکی مہک اس کے نتھنوں میں سما گئی۔ یہ جانتے ہی کہ اس تنہائی میں دوسرا وجود کس کا ہے، وہ تڑپ کر اٹھ بیٹھا اور اس کی دونوں پنڈلیاں پکڑ لیں۔

گول جھونپڑی والی اپنا توازن برقرار نہ رکھ سکی اور اس پر آ رہی۔ دونوں اوپر تلے چٹائی پر گر گئے۔ لڑکی کا سانس تیز تیز چل رہا تھا اور مائیکل کے دل کی دھڑکن تیز تر ہو رہی تھی۔ لڑکی نے اس کی گرفت سے نکلنے کی کوئی کوشش نہیں کی اور مائیکل نے اس کے گرد بازوؤں کا حلقہ مضبوط کیا ہی تھا کہ اس کی بائیں پسلی کے نیچے کوئی نوک دار چیز چبھی اور اس کی گرفت ڈھیلی پڑ گئی۔

لڑکی اس کے بازوؤں کے حصار سے نکل کر پرے ہٹ بیٹھی۔ مائیکل نے آنکھوں کا پورا زور لگا کر دیکھا تو اس لڑکی کے ہاتھ میں خنجر نظر آیا۔ وہ سنبھل کر بیٹھ گیا۔

ایک خیال بجلی کی چمک کی طرح اس کے ذہن میں کوند گیا کہ وہ خنجر اس کے ہاتھ سے جھپٹ لے اور اسے قابو کر کے اس کا گلا گھونٹ دے۔

پھر ایک دوسرا خیال بم کی طرح اس کے ذہن میں دھماکہ کر گیا کہ اگر اندھیرے کے باعث وہ لڑکی کے ہاتھ سے خنجر نہ چھین سکا اور زور آزمائی میں لڑکی چیخ پڑی تو اس کا سر تن سے جدا کرنے والا پہلا شخص وہی سردار ہوگا۔

وہ سوچ میں پڑ گیا کہ کیا کرے؟ لڑکی اس کے

پاس رات کی تنہائی میں کیوں آئی تھی اور خنجر لے کر کیوں آئی تھی؟ ظاہر تھا وہ اس سے دوستی کرنا چاہتی تھی اور یہ بھی ظاہر تھا کہ وہ اپنی عزت کی حفاظت کرنا جانتی تھی۔

اب وہ اس کی طرف دوستی کا ہاتھ بڑھانے کے لئے کیا کرسکتا تھا؟ دن کا وقت ہوتا تو اشاروں میں اپنے دل کی بات کہہ بھی سکتا تھا لیکن اب اندھیرے میں کیا کرے؟ وہ اسی سوچ میں غلطاں تھا کہ اسے اپنے ہاتھ پر لڑکی کا گداز اور گرم ہاتھ محسوس ہوا۔ اس نے اس ہاتھ کو جلدی سے دونوں ہاتھوں میں لے لیا اور اسے سہلانے اور ہولے ہولے دبانے لگا۔ اسی طرح وہ اپنے جذبات کا اظہار کرسکتا تھا، اور اس میں اس کی کامیابی کا ثبوت یہ تھا کہ لڑکی اس کے قریب کھسک آئی اس کے جسم سے اس عورت کی طرح بو نہیں اٹھ رہی تھی جو مائیکل کے پاس آ کر گئی تھی...... اس کے برعکس اس لڑکی کے جسم سے ایک انجانی سی مہک اٹھ رہی تھی جیسے مختلف پھولوں کی ملی جلی خوشبو ہو۔

پھر لڑکی نے اپنے بازو اس کی گردن میں حمائل کردیئے۔

مائیکل کا دل بے اختیار اس کا بوسہ لینے کو چاہا لیکن لڑکی نے اپنا سر اس انداز سے جھکا رکھا تھا کہ مائیکل کے ہونٹ صرف اس کے سر کو چھو سکتے تھے۔ وہ چاہتا تو اپنے آزاد ہاتھوں سے اس کا چہرہ اوپر اٹھا سکتا تھا لیکن خنجر کی نوک اس کی گردن کو چھو رہی تھی اور اسے خبردار کررہی تھی کہ وہ لڑکی کے خلاف مرضی کوئی حرکت نہ کرے۔

دونوں دیر تک اسی حالت میں بیٹھے رہے اور مائیکل اپنی گردن پر اس کی گداز بانہوں کا لمس محسوس کرتا ہوا اپنے دل کی ہلچل کو دبارہا تھا۔

اچانک لڑکی نے اپنے بازو اس کی گردن سے ہٹالئے اور اس کے ذہن کو ماؤف چھوڑ کر جھونپڑی سے چلی گئی۔ اس نے جاتے ہوئے مائیکل کے گال کا چٹ سے بوسہ لیا تھا۔

وہ ساری رات مائیکل نے کروٹیں بدلتے گزاری اور صبح کی سنہری کرنوں نے اسے سوتے پایا۔ کوئی اسے جگانے بھی نہ آیا۔ وہ اٹھا تو اس کا ناشتہ رکھا تھا لیکن وہ اس کی طرف دیکھے بغیر پچھلے دروازے سے نکل گیا اور گول جھونپڑی کے پاس جا کھڑا ہوا اور اس نے ایک سمت سے اسے تھپتھپایا۔ پھر زور زور سے ہاتھ مارے لیکن اسے کوئی جواب نہ ملا اور وہ مایوس ہو کر جھیل پر چلا گیا۔ دیر تک نہاتا اور رات کے واقعے کو ذہن میں تازہ کرتا رہا اور جب سوچ کا دھارا کسی جگہ ختم ہوتا نظر نہ آیا تو جھیل سے نکل کر بھیگے ہوئے جسم سے جھونپڑی میں آیا جہاں سردار اس کا منتظر تھا۔

''رات وہ تمہارے پاس آئی تھی؟'' سردار نے چھوٹتے ہی بولا...... یہ سن کر مائیکل چکرا سا گیا۔

''ہاں۔'' اس نے مختصر جواب دیا۔

''تم دونوں کیا کرتے رہے؟'' سردار کے لہجے میں حکم تھا۔

''کچھ نہیں!'' مائیکل نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا کہ اس کے سوا اور چارہ نہ تھا۔ ''میں اس سے کس زبان میں بات کرتا۔ وہ میرے پاس خاموش بیٹھی رہی اور اندھیرے میں اس کا چہرہ بھی نہ دیکھ سکتا تھا۔ اس کے پاس خنجر بھی تھا۔''

سردار ہنس دیا۔ پھر یکا یک سنجیدہ ہوگیا۔

مائیکل اسے حیرت سے دیکھنے لگا۔ ''وہ اپنی حفاظت کرنا جانتی ہے۔'' سردار نے ٹھہر ٹھہر کے کہا۔

''لیکن اس کے پاس...... خنجر کہاں سے آیا؟''

یقیناً اس نے میرا خنجر چرایا ہے۔ ہاں ضرور چرایا ہے۔'' وہ اٹھ کھڑا ہوا۔ پھر جلدی سے بولا۔ ''کیا تم کسی طرح اس سے خنجر نہیں لے سکتے۔''

مائیکل نے نفی میں سر ہلایا اور چھت کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ ''وہ بے حوصلہ اور کمزور دل لڑکیوں سے مختلف ہے۔ رات کی تاریکی میں کسی نوجوان کے پاس تنہائی میں جانا اور پھر اپنے تحفظ کا مکمل انتظام بھی رکھنا کسی معمولی لڑکی کے بس کا کام نہیں ہے۔ یہ غیر معمولی لڑکی نظر آتی ہے یا پھر...... کیا یہاں کی ساری لڑکیاں ایسی ہی ہوتی ہیں؟ ایسا ہی کرتی ہیں؟''

اب سردار کے نفی میں سر ہلانے کی باری تھی۔ ''تم رات کے وقت اس کی جھونپڑی میں جا کر سوتے میں اس کا گلا گھونٹ دو!'' سردار اچانک بولا تو مائیکل اس کا منہ دیکھنے لگا۔ ''مجھے خدشہ ہے کہ تم اس سے متاثر نہ ہو جاؤ۔'' سردار کہہ رہا تھا۔ ''اور نتیجہ یہ نکلے کہ وہ تمہیں موت کے گھاٹ اتار دے!''

مائیکل پوچھنا چاہتا تھا کہ سردار اپنی رعایا میں سے ایک لڑکی سے اتنا خائف کیوں ہے؟ کیا اس لڑکی کو جزیرے کے بااثر لوگوں کی پشت پناہی حاصل ہے؟ یہ خیال آتے ہی اس کی نظروں کے سامنے سردار کے مشیروں کے ہیبت زدہ کرنے والے خونخوار چہرے گھوم گئے اور اسے اپنے خیال میں وزن نظر آیا۔

''بہتر ہے!'' اس نے کہا۔ ''میں یہی کرنے کی کوشش کروں گا۔ لیکن اگر اس نے چیخ و پکار کی تو میری حفاظت کا کیا انتظام ہے؟''

''تم اسے چیخنے کا موقع ہی کیوں دو!'' سردار نے کہا۔ ''اس سے پہلے کہ اسے خبر ہو اس کا گلا گھونٹ دو!''

''اگر وہ بھاگ رہی ہو یا جاگ جائے تب......!''

''اس سے چکنی چپڑی باتیں کرو اور موقع پا کر......''

''گلا دبا دوں!'' مائیکل نے بات پوری کی۔ ''اور تمہیں اسی وقت اطلاع دے دوں؟''

''یہ ممکن نہیں ہے!'' سردار نے کہا۔ ''تم مجھ تک آسانی سے پہنچ نہیں سکو گے!''

''اور میرے فرار ہونے کا بندوبست؟ کیا میں ان پتوں میں لپٹا ہوا جاؤں گا؟ دور سے ہی پہچان لیا جاؤں گا یا کوئی جہاز یا کشتی والا مجھے دیکھتے ہی گولی مار دے گا!''

''تمہیں کپڑے مل جائیں گے مطمئن رہو۔'' سردار نے مسکرا کر کہا۔ ''اور جب یہاں سے جاؤ گے تو مالا مال بھی ہو گے۔ ایک طویل عرصے تک مزے کرو گے بشرطیکہ عیاشی میں خود نہ لٹا دو۔ دوپہر کو میں تمہیں بلوا بھیجوں گا اور تمہیں کام کی چند چیزیں دکھاؤں گا۔''

سردار کے جاتے ہی ایک نوجوان عورت اس کا ناشتہ لے آئی۔ یہ کوئی نئی عورت تھی۔ اس نے پتے زمین پر ہی رکھے تھے کہ مائیکل نے بلا جھجک اس کی کلائی پکڑ لی۔ عورت نے سر اٹھا کر اس کی طرف دیکھا تو اس کی آنکھوں میں نہ حیرت تھی اور نہ خوف تھا۔ ایک سمجھنے والی بات کی جھلک تھی جو خود سپردگی کی علامت تھی۔

ناشتہ کر کے وہ فارغ ہوا ہی تھا کہ اسے جھونپڑی کے دروازے پر بہت سے چھوٹے چہرے نظر آئے۔ وہ ہنستا ہوا اٹھا اور باہر نکلا تو بچوں کی فوج اسے گارڈ آف آنر پیش کرنے کی منتظر تھی۔ وہ ان سب کو لے کر جھیل کی طرف نکل گیا اور گھاس، پتوں کی گیند سی بنا کر بچوں کو کھلانے لگا۔ بچے بڑے جوش و خروش سے کھیل میں حصہ لے رہے تھے اور خوب شور مچا رہے تھے۔ ان کا شور وغل سن کر عورتیں بھی آ گئیں اور ہنس ہنس کر بچوں کی حوصلہ افزائی کرنے لگیں۔ مائیکل کی کم از کم جزیرے کی عورتوں اور بچوں سے دوستی ہو ہی گئی تھی۔ البتہ کوئی مرد دوست بن کر اس کے قریب تک نہ بھٹکا تھا بلکہ اس نے اب تک گنے چنے مردوں کے سوا کسی کو دیکھا تک نہ تھا۔ اور سوچتا تھا کہ سارے مرد ہر وقت کہاں غائب رہتے ہیں خاص کر دن کے وقت تو ایک بھی دکھائی نہیں دیتا۔

عورتوں کو یوں خوش اور بے تکلف ہوتے دیکھ کر اس کے دل میں گدگدی ہونے لگی اور وہ گیند ان کی طرف بھی اچھالنے لگا اور پھر گیند اٹھانے کے بہانے ان سے لپٹ لپٹ جاتا رہا۔ وہ گیند پھینکتا تو کئی نوجوان عورتیں اور لڑکیاں اس کی طرف لپکتیں اور مائیکل جا کر ان سے لپٹ جاتا۔ وہ ہر طرح کی دست درازی کر رہا تھا لیکن کوئی بھی عورت اس کی حرکتوں کا برا مان نہیں رہی تھی۔ شاید وہ اس کی بدنیتی سے آگاہ نہیں تھیں یا پھر لطف اندوز ہو رہی تھیں۔ پھر ایک سمت سے دو آدمی نمودار ہوئے اور انہیں دیکھتے ہی عورتیں بھاگ کھڑی ہوئیں۔ البتہ بچے وہیں کھڑے رہیں۔

دونوں میں سے ایک نے مائیکل کو اپنے ساتھ چلنے کا اشارہ کیا اور وہ چل پڑا۔

سردار کے انگریزی بولنے سے اسے شک تھا کہ دوسرے لوگ بھی انگریزی بولتے یا سمجھتے ہوں گے۔

چنانچہ اس نے ایک آدمی سے پوچھا کہ کیا اسے سردار نے بلایا ہے؟ وہ شخص منہ اٹھا کر اس کی طرف دیکھنے لگا۔ مائیکل نے دوسرے سے بھی یہی سوال کیا اور وہ بھی خاموش رہا۔ مائیکل نے انہیں آزمانے کے لئے موٹی سی گالی دی اوران کے چہروں کے تاثرات معلوم کرنا چاہے تو وہ بالکل سپاٹ تھے۔ گالی کا ان پر کوئی ردعمل نہ ہوا تھا۔

دونوں آدمی اسے سردار کی جھونپڑی کے باہر چھوڑ گئے۔ وہ اندر گیا تو سردار اکیلا تھا۔ جھونپڑی کے ایک کونے میں سرکنڈوں کا چھوٹا سا دروازہ تھا جس پر مائیکل کی نظر سردار سے گزشتہ ملاقات کے دوران نہیں پڑی تھی۔ سردار نے اسے اپنے پیچھے آنے کا اشارہ کیا اور وہ دروازہ کھول کر کھڑا ہو گیا۔

مائیکل دروازے میں داخل ہوا تو وہ ایک چھوٹی سی جھونپڑی میں تھا۔ اس بڑی جھونپڑی کی پارٹیشن کے ذریعے دو جھونپڑیاں بنائی گئی تھیں۔ اس میں ایک طرف بڑا سا لکڑی کا صندوق رکھا تھا۔ سردار نے زور لگا کر اسے سرکایا تو ایک گڑھا نظر آیا جس پر صندوق کے پیندے کے سائز کی دبیز چٹائی بچھی ہوئی تھی۔

سردار نے چٹائی اٹھائی تو نیچے پتھر کی ایک سل تھی۔ اس نے اسے بھی اٹھا کر ایک طرف رکھا اور گڑھے میں ہاتھ ڈال کر ایک پوٹلی نکالی۔ اسے کھولا تو اس میں کپڑوں کا ایک جوڑا اور ایک چمڑے کی جیکٹ تھی۔ سردار نے یہ چیزیں مائیکل کو دکھائیں اور پوٹلی باندھ دی۔ پھر اس نے گڑھے میں ہاتھ ڈال کر ایک دوربین نکالی اور مائیکل کو دکھا کر وہیں رکھ دی۔ اس کے بعد ایک ریوالور نکال کر دکھایا اور آخر میں فولاد کی ایک صندوقچی نکالی اور اسے کھولا تو اس میں سونے کے چھوٹے چھوٹے چوکور ٹکڑے اور چھوٹے بڑے ہیرے تھے۔ ان کی چمک مائیکل کی آنکھوں کو خیرہ کر گئی۔ سردار نے جلدی سے صندوقچی بند کر کے گڑھے میں رکھی اور بڑی پھرتی سے اس پر پتھر کی سل اور چٹائی رکھ کر لکڑی کا صندوق اس پر اس طرح جما دیا کہ چٹائی نظر نہ آتی تھی۔ اس نے دونوں ہاتھ ملتے ہوئے مائیکل کے کان میں کہا۔ ”یہ سب تمہارے لئے ہیں!“

مائیکل نے صرف اس کے چہرے کو دیکھنے پر اکتفا کیا جس پر ہلکی سی مسکراہٹ تھی لیکن یہ مسکراہٹ خوش دلی کی نہیں بلکہ مکاری کی تھی اور مائیکل اسے دل سے قبول نہ کر سکا۔ دونوں بیرونی جھونپڑیوں میں آ گئے اور سردار نے اسے ہاتھ کے اشارے سے جانے کو کہا تو وہ خاموشی سے باہر نکل گیا۔ راستے میں پھر وہی بچوں کا شور مچاتا ہوا ہجوم تھا اور ہنستی ہوئی دوسری طرف سے جاتی ہوئی عورتیں تھیں جو شاید گیند کا کھیل پھر کھیلنے کی چاہت کر رہی تھیں۔

وہ اپنی جھونپڑی میں جا کر دیر تک سردار کی پراسرار شخصیت کے بارے میں سوچتا رہا۔ یہ تو وہ سمجھ گیا تھا کہ سردار نے ان چیزوں کو اپنے لوگوں سے چھپا کر گڑھے میں چھپا رکھا ہے لیکن اس کی وجہ سمجھ میں نہیں آ رہی تھی بالکل اسی طرح جیسے لڑکی کو ہلاک کرنے کی وجہ مائیکل کی سمجھ سے بالاتر تھی۔

بہرحال سردار نے اسے اطمینان دلایا تھا کہ وہ اسے فرار کرا دے گا اور مال بھی اتنا دے گا جس سے اس کی زندگی بڑے ٹھاٹھ سے گزرے گی۔ یہی خوش کن تصور لئے وہ شام تک سوتا رہا کہ رات کو چستی سے اپنا کام کر سکے۔

وہ سو کر اٹھا تو اس کا کھانا رکھا تھا۔ لیکن اس کا کھانے کو دل نہ چاہا۔ پھر شام ڈھلی، مغرب کا وقفہ ختم ہوا اور رات آئی۔ تارے جھونپڑی کی چھت کے سوراخوں سے جھانکنے لگے۔ اور وہ رات گہری ہونے کا انتظار کرنے لگا۔ پھر جب رات گہری ہوتی گئی تو وہ اٹھ کر پچھلے دروازے سے باہر نکلا۔

چند ثانئے وہ دم سادھے کھڑا رہا۔ اسے شبہ تھا کہ سردار اس کی ٹوہ میں ہوگا اور وہ آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر چاروں طرف دیکھتا رہا۔ پھر اسے لاحاصل سمجھ کر وہ گول جھونپڑی کی طرف چل پڑا۔ اسے معلوم تھا کہ وہ جھونپڑی کا دروازہ تلاش نہیں کر سکے گا۔ اس لئے وہ اس پر ہاتھ کا دباؤ ڈالتا ہوا قدم قدم آگے بڑھتا رہا۔ اور وہ

بہت اضطراب بڑی الجھن محسوس کررہا تھا۔
اچانک جھونپڑی ایک جگہ سے کھل گئی۔ ایک ہاتھ باہر نکلا اور اسے اندر کھینچ لیا۔ اگلے لمحے وہ نرم نرم، گداز بانہوں میں تھا۔ اس سے پہلے کہ لڑکی کو اس کے ارادے کی خبر ہوتی اس نے اس کے لچکدار جسم کو اپنے سینے سے چمٹالیا اور اس کے چہرے کے ہر حصے پر بوسوں کی بوچھاڑ کردی۔ لڑکی کسمساتی ہوئی خود کو اس کی گرفت سے چھڑانے کی کوشش کرتی رہی لیکن اس کی ایک نہ چلی۔ مائیکل کو اطمینان یہ تھا کہ لڑکی کے ہاتھ میں خنجر نہیں تھا۔
''چھوڑو...... میری بات سنو!''
جیسے بارودی سرنگ پھٹ گئی ہو یا بم کا دھماکہ ہوا ہو یا دو جیٹ طیارے آپس میں ٹکرا گئے ہوں۔ مائیکل پر سکتہ سا طاری ہوگیا۔ لڑکی اس کا ہاتھ پکڑ کر چٹائی پر بیٹھانے لگی تو وہ مٹی کے تودے کی طرح ڈھیر ہوگیا۔
''جو کچھ میں کہہ رہی ہوں اسے غور سے سنو......''
اچانک اسے ہوش آ گیا جیسے کسی غیر مرئی طاقت نے اس کے خوابیدہ حواس کو تازیانہ لگا کر جگا دیا ہو اور اس نے جھٹ لڑکی کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا۔ اسے یقین تھا کہ سردار جھونپڑی سے باہر کان لگائے کھڑا ہوگا۔ پھر اس نے اپنا منہ لڑکی کے کان سے لگا کر آہستہ سے کہا۔
''صبح منہ اندھیرے جھیل پر......''
لڑکی نے اپنے منہ پر سے اس کا ہاتھ ہٹانے کی کوشش کی تو پھر اس نے اس کے کان میں کہا......
''سردار!'' یہ کہہ کر وہ جلدی سے اٹھا اور ایک لمبا ڈگ بھر کر جھونپڑی سے نکل گیا۔ اس نے لڑکی کا ردعمل جاننے کا بھی انتظار نہ کیا۔
وہ رات پھر اس نے کروٹیں بدل کر کاٹ دی اور صبح کی پہلی کرن کے ساتھ جھونپڑی سے نکل کر جھیل پر چلا گیا۔ اسے لڑکی کا زیادہ انتظار نہ کرنا پڑا۔ چند سیکنڈ کے بعد ہی وہ آ گئی اور اس کا چہرہ دیکھ کر مائیکل سمجھ گیا اس نے بھی رات جاگ کر گزاری ہے۔ وہ جھیل کی طرف پشت اور درختوں کی طرف منہ کرکے بیٹھ گیا تاکہ اگر سردار یا کوئی دوسرا آجائے تو اسے دیکھ سکے۔ اس نے لڑکی کو اشارے سے جھیل پر منہ دھونے کے لئے کہا۔ وہ منہ دھوتی جاتی تھی اور باتیں کرتی جاتی تھی۔
''تمہیں میرے بات کرنے سے حیرت ہو رہی ہے نا!'' وہ دھیمی آواز سے کہہ رہی تھی۔ ''اس المناک داستان کے لئے تمہارے پاس وقت ہے نہ میرے پاس لیکن وہ وقت ضرور آئے گا جب میں تمہیں سب کچھ بتاسکوں گی۔ اس وقت مجھے یہ کہنا ہے کہ میں ایک مظلوم اور بے بس لڑکی ہوں جو انسانی درندوں میں گھری ہوئی ہے اور ان کا سربراہ وہ شخص ہے جسے تم نے سردار کہا ہے۔ وہ تمہیں بھی یہاں سے زندہ سلامت جانے نہیں دے گا۔
اگر تم میری مدد کرو اور اپنی جان بھی بچانا ہو تو اس کا قصہ پاک کردو۔ پھر ہم دونوں یہاں سے فرار ہوجائیں گے۔ خواہ تم مجھے کہیں لے جاکر چھوڑ دینا یا اپنے پاس ہی رکھ لینا۔ یہ تمہاری مرضی پر منحصر ہے۔ میں اپنے ساتھ اتنا مال و دولت لے چلوں گی کہ تمہاری زندگی بن جائے گی۔ ساری عمر عیش کروگے۔ میں اس میں سے کچھ نہ لوں گی۔''
''لیکن...... لیکن......'' مائیکل نے تھوک نگلتے ہوئے اور نظریں چاروں طرف وہ دوڑاتے ہوئے سرگوشی میں کہا۔ ''میں اسے کس طرح ٹھکانے لگاسکوں گا، یہاں اتنے سارے آدمی ہیں ہر دم اسے گھیرے رہتے ہیں چھوٹی سی جگہ ہے۔ یہ لوگ میری تکابوٹی کرڈالیں گے۔''
''وہ تمہاری جھونپڑی میں آتا رہتا ہے!'' لڑکی پاؤں دھوتی ہوئی بولی۔ ''میں تمہیں خنجر دوں گی۔ اس سے اسے جہنم رسید کردینا اور بھاگ کر میری جھونپڑی میں آجانا۔ گھنٹوں کسی کو اس بات کی خبر ہوگی کیونکہ وہ تنہائی کے کئی کئی گھنٹے کہیں نہ کہیں گزارتا ہے۔ میں نے بھاگنے کا سارا بندوبست کررکھا ہے اور میں یہاں کے چپے چپے سے واقف ہوں۔ اس کے قتل کی خبر پھیلنے سے پہلے ہم ان لوگوں کی پہنچ سے دور جاچکے ہوں گے۔ یہ ہمارا پیچھا بھی نہ کرپائیں گے۔ میں انہیں اچھی طرح جانتی ہوں، بس، اب کوئی اور سوال نہ پوچھو۔ یاد رکھو، اگر میری بات پر عمل نہ کیا تو دو ایک روز میں آگ پوجا کا تہوار ہوگا اور وہ تمہاری زندگی کا آخری دن ہوگا!''

لڑکی اٹھ کھڑی ہوئی اور اپنے گیلے بال جھٹکتی ہوئی بولی۔ ''تمہیں یہ کام اس منحوس دن سے پہلے کرنا ہے، آج رات کو خنجر تمہیں مل جائے گا!'' وہ چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتی ہوئی چلی گئی اور مائیکل کے دماغ پر ہتھوڑے برستے چھوڑ گئی۔

''قتل...... قتل...... قتل...... سردار لڑکی کو قتل کرانا چاہتا ہے اور لڑکی سردار کے قتل کے درپے ہے۔ دونوں اسے آلہ کار بنانا چاہتے ہیں۔ آخر اس کی وجہ کیا ہے جو دونوں ایک دوسرے کے خون کے پیاسے کیوں ہیں؟ اور دونوں نے ایک دوسرے کے قتل سے اس کی زندگی کو مشروط کر رکھا ہے۔ اس کی زندگی اس بہیمانہ فعل سے نتھی ہو کر کیوں رہ گئی ہے؟ کیا وہ جوزا کے قتل کے بعد مستقل طور پر اس جرم کا غلام بن کر رہ گیا ہے؟''

''جوزا...... جوزا فیل......''

جوزا سے اس کی ملاقات برمنگھم کے ایک اوسط درجے کے کیفے میں انتونیو عرف پنٹو نے کرائی تھی۔ جوزا کے چہرے سے معصومیت اور آنکھوں سے صاف دلی جھلک رہی تھی۔ اس کے اسکرٹ کا گلا بھی مائیکل کے نزدیک ضرورت سے زیادہ تنگ تھا اور اس نے نیچی ایڑی کا سینڈل پہن رکھا تھا جس سے اس کی چال لچک سے محرومی تھی۔ مائیکل کو وہ قطعیت سے ایک سپاٹ لڑکی نظر آئی۔ اس کی عمر اٹھارہ اور بیس کے درمیان رہی ہوگی۔ رنگ گلابی، بال بھورے، آنکھیں نیلی اور بڑی بڑی اور ہونٹ پتلے پتلے تھے۔ اس نے بتایا کہ وہ حیفہ میں پیدا ہوئی، پیرس میں تعلیم پائی، جرمنی میں کچھ عرصہ رہی اور اب برمنگھم میں ملازمت کر رہی تھی۔

''جوزا کو آثار قدیمہ اور نوادرات سے بہت لگاؤ ہے!'' پنٹو نے اس کا تعارف کراتے ہوئے بتایا۔ ''اور یہی بات ہم دونوں کی دوستی کا باعث بھی ہے۔'' پھر اس نے جوزا سے کھانے کے متعلق پوچھا تو مائیکل کو اس کی آواز بڑی کھردری سی لگی۔

''میں صرف سوپ پیوں گی!'' اس نے کہا تھا۔

''تم یہودی ہو؟'' مائیکل نے بے ساختہ پوچھا۔

''نہیں!'' جوزا نے نفی میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔ ''میرا باپ جرمن ڈاکٹر تھا۔ ماں فرانسیسی اسکول ٹیچر تھی۔ البتہ دونوں کچھ عرصے حیفہ میں رہے تھے اور وہیں میں پیدا ہوئی تھی۔''

وہ دیر تک غیر ضروری باتیں کرتے رہے اور اس دوران میں مائیکل کو جوزا کے وجود میں خالص عورت کسی لمحے نظر نہ آئی۔ اس کی باتیں خشک اور معلوماتی تھیں۔ مائیکل اس سے مل کر سخت مایوس ہوا۔

اس کے برعکس پنٹو سے پہلی ملاقات بہت دلچسپ رہی تھی۔ وہ ایک تیسرے درجے کے بار میں بیٹھا ایک شوقیہ دست شناس کو اپنا ہاتھ دکھا رہا تھا۔ ہاتھ دیکھنے والا دور کی ہانک رہا تھا اور مائیکل اس کی احمقانہ باتوں سے لطف اندوز ہو رہا تھا کہ اسے اپنی پشت پر کسی کی موجودگی کا احساس ہوا۔ اس نے سر گھما کر دیکھا تو ایک لمبوترے آم جیسے چہرے، لمبی ناک، گول گول آنکھوں والا پستہ قد شخص تھا جو بڑے انہماک سے دست شناس کی باتیں سن رہا تھا۔ جب یہ کھیل ختم ہوا اور مائیکل اٹھا تو وہ اجنبی اسے دیکھ کر مسکرایا۔ مائیکل کو بھی اخلاقاً مسکرانا پڑا۔ اور اجنبی نے بڑے تپاک سے اسے کھانے کی دعوت دی۔

''غیر ملکی ہو؟'' دونوں ایک کونے میں جا بیٹھے اور مائیکل اس کے تلفظ اور لہجے سے جان گیا کہ وہ وسطی یورپ کا رہنے والا ہے۔ مائیکل نے اثبات میں سر ہلایا تو اس نے اپنا تعارف کرایا۔ ''میں انتونیو ہوں لیکن مجھے پنٹو کہتے ہیں۔ محکمہ آثار قدیمہ میں ریکارڈ کیپر ہوں۔ تم قسمت کے بہت زیادہ قائل معلوم ہوتے ہو؟ ہندوستانی ہو؟''

''پیدا تو وہیں ہوا تھا لیکن عمر کا زیادہ حصہ یہیں گزرا ہے۔ تم مجھے چوتھائی انگریز کہہ سکتے ہو۔ میرا نام...... مائیکل ہے اور میں بس کنڈیکٹر ہوں!'' مائیکل ایک سانس میں کہہ گیا۔ ''تم شاید پہلی مرتبہ اس بار میں آئے ہو۔ میں نے پہلے تو تمہیں نہیں دیکھا؟''

''درست کہتے ہو دوست!'' پنٹو نے مسکرا کر کہا۔ ''میں یہاں اتفاقیہ آنکلا ہوں۔ ایک شخص نے یہاں

ملنے کو کہا تھا لیکن وہ نہیں آیا۔"

"دوسرا تو مل گیا!" مائیکل نے بے تکلفی سے ہنستے ہوئے کہا تو پٹھو بھی ہنسنے لگا۔

"بہت دلچسپ آدمی ہو دوست!" اس نے کہا۔

"اچھا کیا پیو گے!"

"گائے کا دودھ!" مائیکل نے کہا۔ اسے یہ شخص خود دلچسپ لگ رہا تھا۔ پٹھو نے ایک پتلا، تیز قہقہہ لگایا۔ پھر اس نے قریب سے گزرتی ہوئی نیگرو ویٹرس سے مائیکل کے لئے وہسکی اور اپنے لئے بیئر لانے کو کہا۔

"ہاں تم نے بتایا نہیں کہ قسمت کے کچھ زیادہ ہی قائل ہو گیا؟" ویٹرس کے جانے کے بعد اس نے کہا۔

"بھئی دیانتداری کی بات تو یہ ہے کہ قائل ضرور ہوں، لیکن اس دست شناس سے بالکل متاثر نہیں ہوا۔" مائیکل نے سگریٹ کیس کھولتے ہوئے کہا۔ ویٹرس نے دو گلاس لاکر میز پر رکھے تو مائیکل نے اس کے بھرے بھرے، آبنوسی بازو پر چٹکی لی۔ وہ ایک ادا سے وہسکی لے کر دوہری ہوگئی اور کولہے مٹکاتی چلی گئی۔

"اس پہلی ملاقات کا جام......" پٹھو نے بیئر کا گلاس اٹھاتے ہوئے کہا۔

"تمہاری خوش دلی کے نام!" مائیکل نے اپنا گلاس اس کے گلاس سے ٹکرا کر کہا۔

دونوں پیتے اور گپیں ہانکتے رہے۔ ایک دور ختم ہوا تو پٹھو نے مزید آرڈر دیا اور مائیکل اس کی مہمان نوازی سے بہت متاثر ہوا۔

"کل پکاڈلی میں کہیں ملو گے؟" مائیکل نے اس کا احسان اتارنے کے لئے پوچھا۔

"جہاں چاہو گے ملوں گا۔ کہو تو اسپتال یا جیل میں ملوں۔" پٹھو نے ہنستے ہوئے کہا۔

"اگر کسی جوئے خانے کا کہتے تو بات بھی تھی! مائیکل نے اسے آنکھ مارتے ہوئے کہا! مجھ شریف آدمی کے لئے زیادہ شرافت کی جگہ چاہئے۔"

چنانچہ وہ اگلے روز ایک بڑے اور پرتکلف بار میں ملے اور مائیکل نے اس کی شاندار تواضع کرنا چاہی لیکن پٹھو نے اصرار کر کے اپنے لئے آئس کریم منگوائی۔ اس ملاقات کے بعد ان کے درمیان تکلف اور وضع پرستی کی رہی سہی دیوار بھی گر گئی اور وہ یوں گھلے ملے جیسے برسوں کے یار ہوں۔

"یہ تمہاری جوزا کیسی لڑکی ہے؟" مائیکل نے جوزا سے ملاقات کے بعد اس شام پٹھو سے پوچھا۔

"اب تو وہ تمہاری بھی ہے!" پٹھو نے اپنی لمبی ناک کو مروڑتے ہوئے مسکرا کر کہا۔ "رہا سوال کیسی لڑکی ہے تو اچھی لڑکی ہے۔ دکھی ہے اور سیدھی سادی ہے۔"

"ہوں!" مائیکل نے ہنکارا بھرا بڑی دلچسپ لڑکی ہے۔ "ہاں تم جیسے رنگین مزاج کے شاید کام کی نہ ہو۔" پٹھو نے چوٹ کی اور مائیکل اسے پی گیا۔ البتہ حساس ہے۔ دکھ سکھ کی ساتھی ہے۔ ایک اچھی دوست ہے!" پٹھو نے بات ختم کر کے بیئر کا ایک بڑا گھونٹ بھرا۔

"مجھے کسی دکھ سکھ کے ساتھی کی ضرورت ہے نہ اچھے دوست کی۔" مائیکل نے منہ بنا کر کہا۔ "میری زندگی ساری پابندیوں اور تکلفات سے آزاد گزری ہے۔ میں اچھائی کا معیار دیکھنا چاہتا ہوں نہ برائی کی پرکھ کرنا آؤ پکچر چلیں۔"

"چلو!" پٹھو فوراً تیار ہو گیا۔ بل ادا کر کے وہ بار سے نکلے اور پیدل ہی فٹ پاتھ پر چل پڑے۔

مائیکل نے اپنے بارے میں کھری بات کہی تھی۔ وہ ہر پابندی سے آزاد تھا۔ اس کے نزدیک اچھائی اور برائی کا کوئی معیار نہ تھا۔ گزشتہ دو سال سے وہ بس کنڈیکٹری کر رہا تھا۔ اس سے پہلے کھاتا تھا، سوتا تھا اور دندناتا پھرتا رہا۔ اس وقت اس کا مربی اور سرپرست زندہ تھا۔ وہ ایک انگریز ریٹائرڈ فوجی افسر تھا۔ مائیکل نے اس کی عمر کے آخری حصے میں دل و جان سے خدمت کی۔ پھر ایک دن وہ ریٹائرڈ بوڑھا اس اپنائیت اور خدمت سے منہ موڑ کر رشتہ حیات سے بھی ریٹائر ہو گیا اور مائیکل کو مجبوراً نوکری کرنی پڑی کیونکہ اس کے روحانی باپ نے اس کے لئے دولت یا جائیداد قسم کی کوئی چیز نہیں چھوڑی تھی۔

مائیکل کو اس کے بارے میں صرف اتنا معلوم تھا کہ وہ کبھی ہندوستان کی فوج میں کوئی افسر تھا اور اپنے بارے میں یہ کہ وہ اس انگریز کالے پالک تھا جو جانے کیتھولک تھا یا پروٹسٹنٹ آزاد خیال عیسائی تھا، یا ملحد؟ مائیکل نے اسے کبھی گرجا جاتے نہیں دیکھا تھا۔ کبھی اپنا کوئی تہوار مناتے نہیں دیکھا تھا۔ اس کے گھر میں یسوع مسیح یا کنواری مریم کی کوئی شبیہہ نہیں تھی۔ اس کا محبوب مشغلہ شراب نوشی اور ریس کھیلنا تھا۔ اچھا کھانے کا شوق تھا لیکن پہننے سے شغف نہ تھا۔ اس نے مائیکل کو کبھی یہ نہیں بتایا کہ وہ کس کا لڑکا ہے؟ اس کے ماں باپ کون تھے؟ وہ اسے کیسے اور کہاں ملا؟

مائیکل نے بھی یہ جاننے کی کوشش نہیں کی کہ وہ کرسچن ہے، ہندو یا مسلمان کبھی کبھی اسے اپنے اچھوت ہونے کا شبہ گزرتا تھا لیکن اس نے اپنے روحانی باپ سے اس کی تصدیق نہیں چاہی۔ اسے پرائیویٹ اسکول میں داخل کرایا گیا تھا اور وہاں اس کا نام الیکس لکھوایا گیا تھا۔ یہاں ریڈ کراس کے اساتذہ پڑھاتے تھے۔

انگریز فوجی افسر اپنی ملازمت سے ریٹائر ہوگیا تو پنشن لے کر انگلینڈ چلا آیا اور برمنگھم میں سکونت اختیار کرلی۔ یہاں وہ اکثر شراب نوشی سے ٹی بی میں مبتلا ہوگیا۔ اور اس کی تیمار داری پڑھائی جاری رکھنے سے زیادہ ضروری تھی۔ مائیکل ہائر سیکنڈری کرچکا تھا۔ پنشن کی رقم دو آدمیوں کی کفالت کے لئے کافی لیکن اب بوڑھا اسے دنیا میں تنہا چھوڑ گیا تو اس کے پاس پھوٹی کوڑی نہ تھی۔

مائیکل ہاتھ پاؤں کا مضبوط اور اچھے قد و قامت کا تھا۔ تھوڑی سی بھاگ دوڑ کرکے اسے بس کنڈیکٹری مل گئی اور اس نے ایک پسماندہ علاقے میں سستی رہائش اختیار کرلی۔

جب تک اس کا مربی زندہ رہا، اس نے اپنے گرد و بیش سے کوئی علاقہ نہ دیکھا لیکن اس سے بچھڑ کر اور ملازمت سے ناطہ جوڑلیا۔ شراب اس کی ایک ضرورت بن گئی اور عورت بھی شجر ممنوعہ نہ رہی۔ ریس کھیلنا اس کے بس سے باہر تھا لیکن جوئے کے لئے زیادہ رقم درکار نہیں ہوتی تھی سستے کلبوں کی شراب اور طوائفیں اس کے فرصت کے اوقات کی دلچسپیاں تھیں اسے رنگ و روپ اور قابل رشک صحت دینے میں قدرت نے بہت فراخدلی سے کام لیا تھا اور جسم کا کاروبار کرنے والیاں اسے اپنے نفع بخش کاروبار میں رعایت بھی دیتی تھیں ان ہی مرحلوں پر اس کی ملاقات اس خوش طبع اور نیم مسخرے انتونیو عرف پنٹو سے ہوئی تھی۔

☆......☆......☆

اس دوپہر مائیکل اپنے اپارٹمنٹ میں بستر پر کروٹیں بدل رہا تھا۔ اس کی جیب خالی تھی اور ہفتہ وار تنخواہ ملنے میں ابھی پورے بیس گھنٹے باقی تھے۔ اس کے پاس سگریٹ تک کے لئے پیسے نہیں تھے۔ ناشتہ تو اس نے ڈبل روٹی مکھن اور کافی سے کر ہی لیا تھا لیکن اب مزید ایک ناشتہ اور دو کھانے درکار تھے۔ وہ سوچ رہا تھا کہ اپنے ایک نیگرو دوست برٹن سے ادھار لے اور جاکر پنٹو کو کہیں پکڑے کہ باہر دستک ہوئی۔ وہ دعا مانگتے ہوئے اٹھا کہ دروازے پر پنٹو ہو اور سلیپنگ سوٹ کے بٹن لگاتا جاکر دروازہ کھولا تو سامنے جوزا تھی۔

''تم......؟'' اسے حیرت ہوئی کہ جوزا نے اس کا اپارٹمنٹ کیسے تلاش کرلیا۔

''جستجو سے کیا نہیں ملتا ہے!'' وہ بے تکلفی سے کمرے میں داخل ہوئی اور تنقیدی نظروں سے کمرے کا جائزہ لینے لگی۔ پھر دھپ سے بستر پر بیٹھ کر بولی۔ ''پنٹو سے پتہ معلوم کرلیا تھا!''

''اوہ!'' مائیکل نے گہری سانس لے کر کہا۔ ''اس شیطان نے میرا گوشہ عافیت تمہیں بتا ہی دیا۔''

''میں تمہیں لینے آئی ہوں!'' جوزا نے بغیر تمہید کے کہا۔ ''تمہیں اپنے گھر لے جانا چاہتی ہوں۔''

''تمہارے گھر؟ کوئی تقریب ہے کیا؟'' مائیکل نے نیم مسکراہٹ سے پوچھا۔

''ارے نہیں!'' جوزا اٹھ کر اس کے پاس آئی اور اس کے سلیپنگ سوٹ کے بٹن سے کھیلتے ہوئے کہنے

گی۔ ”تم سے باتیں کرنی ہیں!“

مائیکل نے اس کا ہاتھ پکڑ کر بستر کی طرف معنی خیز اشارہ کرکے کہا۔ ”باتیں تو یہاں بھی ہوسکتی ہیں!“

جوزا ہنس کر اس سے الگ ہٹ گئی۔ اور ڈریسنگ ٹیبل پر رکھی ہوئی چیزوں کو ترتیب سے رکھتی ہوئی بولی۔ ”کھانے کے ساتھ باتیں ہوں گی، میں نے اپنے ہاتھ سے ڈشیں تیار کی ہیں اور بہت عمدہ وہسکی بھی لے آئی ہوں۔ چلو جلدی کرو۔“

مائیکل نے دل ہی دل میں اس کا شکریہ ادا کیا اور باتھ روم میں جاکر لباس تبدیل کرنے لگا۔ کچھ دیر بعد وہ جوزا کے ساتھ اس کے چھوٹے سے بڑے سلیقے سے سجے ہوئے دو کمروں کے فلیٹ میں تھا۔

”بڑی باذوق لڑکی ہو!“ اس نے نشست گاہ کی دیواروں اور ساز وسامان پر نظریں دوڑاتے ہوئے کہا۔

”شکریہ!“ جوزا بولی اور ملحقہ کچن میں کھانا لگانے چلی گئی۔

”اتنا تکلف کیوں کیا؟“ مائیکل نے تلی ہوئی مچھلی کے قتلوں، روسٹ گوشت کے پارچوں، ابلے ہوئے انڈوں، آلو کے چپس، پڈنگ اور ڈھیر سے تروتازہ سلاد پر نظریں ڈالتے ہوئے کہا۔

”تم پہلی بار آئے ہو اس لئے۔“ جوزا نے صاف گوئی سے کہا۔ ”آتے رہو گے اسی طرح خاطر مدارات کروں گی!“

”اب کرو باتیں!“ مائیکل نے اطمینان سے ڈشوں کی طرف ہاتھ بڑھاتے ہوئے کہا۔

”میرے پاس کچھ چیزیں ہیں جو میں فروخت کرنا چاہتی ہوں۔“ جوزا نپکین اپنے گلے میں ٹھونستے ہوئے بولی۔ ”یہ چیزیں مجھے ورثہ میں ملی ہیں اور میں اپنے ماں باپ کی نشانیوں کو ہرگز اپنے سے جدا نہ کرتی لیکن...... مجبوراً کرنا پڑ رہا ہے۔ مجھے پیسوں کی ضرورت ہے سن رہے ہو۔“

مائیکل کی توجہ کا مرکز مچھلی کے قتلوں کو بنتا دیکھ کر اس نے ٹوکا۔

”کہے جاؤ سن رہا ہوں۔“ مائیکل نے بھرے ہوئے منہ سے کہا۔ ”ان نعمتوں کے ساتھ انصاف بھی تو کرنا ہے۔ بہت لذیذ پکاتی ہو۔“

”شکریہ!“ جوزا نے مسکرا کر کہا۔ ”میں چاہتی ہوں کہ ان قیمتی اور نادر چیزوں کو تم لے جاکر فروخت کردو۔“

”کیوں؟“ مائیکل کی اٹھی ہوئی بھنوؤں نے پوچھا۔

”مجھے کسی اور پر بھروسہ نہیں ہے!“ جوزا نے اس کی سوالیہ ابروؤں کو بتایا۔ ”اور یہ کام تمہیں روم یا پیرس جاکر کرنا ہوگا۔“

”کیوں؟“ اس نے پوچھا۔

”یہ انگریز بڑے کنجوس ہوتے ہیں، ضرورت سے زیادہ فالتو چیزیں نہیں خریدتے اور پھر یہ چیزیں ایسی ہیں کہ ان کے خریدار جدی پشتی رئیس ہوسکتے ہیں یا دولت لٹانے والے سیاح اور وہ روم میں ملیں گے یا پیرس میں، میرے پاس جو چیزیں ہیں وہ امیروں کے چونچلوں کی طرح ہیں۔“

”مثلاً۔“ مائیکل نے سلاد پر ہاتھ صاف کرتے ہوئے کہا۔

”یہ تم خود دیکھ کر اندازہ لگالو گے۔“ جوزا نے نپکن سے ہونٹ صاف کرتے ہوئے کہا۔ ”اور میں تمہاری اس مدد کے لئے تمہیں بھی تمہارا حصہ دوں گی!“

مائیکل نے ہاتھ روک کر کہا۔ ”کمیشن دو گی؟ مجھے سیلز مین بنا کر بھیجو گی۔“

اس کی تنی ہوئی بھنویں دیکھ کر جوزا جلدی سے بولی۔ ”ارے نہیں تم تو برا مان گئے جانی میرا مطلب یہ تھا کہ تم چھٹی لے کر جاؤ گے۔ آنے جانے اور وہاں ٹھہرنے کا خرچ بھی ہوگا۔ اس کی ادائیگی تو مجھے کرنا ہی ہے۔“

”اس کی تم پرواہ مت کرو۔“ مائیکل نے اسے ہمدردی سے دیکھتے ہوئے کہا۔ ”اگر میں تمہارے کسی کام آسکوں تو میرا اس میں کیا جاتا ہے۔ اس بہانے روم اور پیرس کی سیر بھی ہوجائے گی۔“

”میں تمہارا یہ احسان کبھی نہیں بھولوں گی لیکن سفر

خرچ تو تمہیں بہر حال لینا ہے۔ تم ایسے کہاں کے رئیس ہو۔'' جوزا اپنی مسرت کو چھپانے کی کوشش کرتے ہوئے بولی۔

کھانا کھا کر وہ نشست گاہ میں آ گئے اور جوزا نے وہسکی کی بوتل اور گلاس لا کر رکھا اور برف لانے چلی گئی۔ مائیکل نفیس وہسکی کی چسکیاں مزے لے لے کر پی رہا تھا کہ وہ ساتھ کے کمرے سے ایک سوٹ کیس اٹھا لائی اور اسے صوفے کے سامنے تپائی پر رکھ دیا۔ اس نے چابی سے اسے کھولا اور اندر سے ایک چھوٹا سا سفری سوٹ کیس نکالا۔ پھر اسے چابی سے کھولا تو اس کے اندر سے لکڑی کی ایک مستطیل صندوقچی برآمد ہوئی۔

مائیکل دلچسپی سے اس کے ہاتھوں کی حرکت کو دیکھتا رہا۔ اس نے صندوقچی کو بھی چابی لگا کر کھولا اور اس کا ڈھکن اٹھا کر صندوقچی مائیکل کی طرف بڑھا دی۔ مائیکل نے اسے دونوں ہاتھوں میں لے کر دیکھا تو اس میں وینس کا ایک بالشت بھر لمبا چمکتا ہوا مجسمہ اور جگمگاتے ہوئے ہیروں کے دو ہار تھے۔ ''میں نے صرف یہ دو چیزیں یہاں رکھی ہیں۔'' جوزا کہہ رہی تھی۔ ''باقی چیزیں میری نانی کے پاس ہیں۔ وہ یہاں سے کوئی اسی میل دور رہتی ہیں یہاں چوری ہونے کا خطرہ ہے۔''

''ان کی مالیت کیا ہوگی؟'' مائیکل نے مجسمے کو الٹتے ہوئے کہا۔

''اس لحاظ سے یہ چیزیں انمول ہیں کہ میرے باپ کی یادگار ہیں۔'' جوزا نے افسردگی سے کہا۔ ''اور مالی اعتبار سے ان کی قیمت ہزاروں پونڈ میں ہے۔ یہ تو گاہک کی پسند اور فروخت کرنے والے کی ہنرمندی پر منحصر ہے کہ وہ گاہک کا انتخاب کیسے کرتا ہے اور ان چیزوں کی قدر و قیمت سے اسے کیسے قائل کرتا ہے۔''

''پھر بھی تم کچھ اشارہ تو دو گی۔ میں نے یہ کام پہلے کبھی نہیں کیا ہے اس لئے اناڑی ہوں۔ کہیں گھاٹے کا سودا نہ کر بیٹھوں۔'' مائیکل نے مجسمہ صندوقچی میں رکھ کر ہار اٹھاتے ہوئے کہا۔

''یہ تم نے ٹھیک کہا۔'' جوزا نے اس کی بات سے اتفاق کرتے ہوئے کہا۔ ''یوں کرو......'' وہ سوچنے لگی پھر بولی۔ ''اس مجسمے کو تین چار ہزار پونڈ تک نکالنے کی کوشش کرو۔ خالص سونے کا ہے اور بڑی نایاب چیز ہے۔ سیاح اسے ضرور پسند کریں گے اور یہ ہار بھی بڑے قیمتی ہیروں کے ہیں۔ انہیں تو رئیس لوگ اور ان کی بیگمات ہی خرید سکتی ہیں۔ ایک ہار پانچ ہزار سے سات ہزار پونڈ تک نکال دو۔''

مائیکل کی آنکھیں پھیل گئیں۔ اس نے رک رک کر کہا۔ ''اس کے لئے تو بہت کوشش کرنا ہوگی۔ بہت سے لوگوں کو انہیں دکھانا ہوگا۔''

''یہ تو ہوگا!'' جوزا نے کہا۔ ''اور یہ تو دیکھو کہ اتنی قیمتی چیزیں کیسے، میں تم پر بھروسہ کر کے بغیر ثبوت کے دے رہی ہوں۔''

مائیکل نے تشکر سے لبریز دل سے اس کی بات کو تسلیم کیا اور جوش سے بولا۔ ''میں تمہارے اعتماد کو ٹھیس نہیں پہنچاؤں گا۔ تم نے مجھے جو مقام بخشا ہے اس کا پاس کروں گا۔''

جوزا اس کے پاس صوفے پر بیٹھی اور اس سے لگتے ہوئے کہنے لگی۔ ''ہاں تم سے دائمی دوستی چاہتی ہوں۔ چاہتی ہوں کہ تم یہ گھٹیا بس کنڈیکٹری چھوڑ دو اور ہم ایک چھوٹا موٹا ریستوران کھول لیں۔''

''پھر تو وہاں ہیڈ ویٹر ہوگا!'' مائیکل نے اس کے ہاتھ پر ہاتھ رکھتے ہوئے شگفتگی سے کہا۔

''نہیں دربان ہوگا۔ گاہکوں کے لئے دروازہ کھولے گا!'' جوزا ہنس کر بولی۔ پھر سنجیدہ ہو کر کہنے لگی۔ ''بہت مخلص آدمی ہے، اس کی وجہ سے تو تم سے تعلق پیدا ہوا ہے۔''

مائیکل نے اس کے آدھے کھلے ہونٹوں پر ایک مزید بوسہ کی مہر ثبت کی۔

''میں تمہیں پانچ سو پونڈ نقد دے رہی ہوں۔ وہاں تمہیں بہترین لباس میں ٹھاٹھ سے رہنا ہوگا۔ اسی طرح تم لوگوں کو متاثر کر سکو گے!'' جوزا نے اپنا چہرہ اس کے تنفس کی گرمی سے دور ہٹاتے ہوئے کہا۔ ''تو

کب جارہے ہو؟''

''کل صبح چھٹی لوں گا اور شام کو ہی چلا جاؤں گا۔ پاسپورٹ تو میرے پاس ہے ہی۔'' مائیکل نے دوستی کے رشتے کو پختہ کرنے کے لئے اس کی کمر میں ہاتھ ڈالتے ہوئے کہا۔

''آج رات یہیں رہ جاؤ۔'' جوزا شوخی سے بولی۔ ''بڑی مزیدار چیز سے تمہاری دعوت کروں گی!''

''سچ!'' اس کی پر معنی مسکراہٹ کو دیکھتے ہوئے مائیکل نے کہا۔

جوزا نے ایک ادا سے اثبات میں سر ہلایا اور ایک جھٹکے سے اٹھ کھڑی ہوئی مائیکل اس کی اس ادا پر مر گیا۔

☆......☆......☆

جوزا کے مشورے سے اس نے روم کو اپنی پہلی منزل پر منتخب کیا۔ وہاں امریکی، برطانوی، یورپی اور ایشیائی سیاح کی ریل پیل تھی۔ مائیکل نے ایک پر رونق شاہراہ کے باوقار ہوٹل میں قیام کیا جہاں ٹھہرنے والوں کی اکثریت امریکیوں کی تھی۔ اور تیسرے دن ہی اپنے مقصد میں کامیابی ہوگئی۔ ایک سنکی امریکن سے مجسمے کا سودا ہوگیا۔ البتہ دام جوزا کی بتائی ہوئی رقم سے کم لگے۔ گاہک نے اٹھائیس سو پونڈ کی پیشکش کی اور مائیکل نے یہ سوچ کر کہ وہ ہاروں میں کسر پوری کرلے گا۔ یہ پیش کش قبول کرلی لیکن اسے روم میں ہاروں کا گاہک نہ مل سکا۔ تین دن وہ ہوٹل میں ٹھہرا اور اس دوران میں تیس چالیس عورتوں مردوں سے بات چیت ہوئی لیکن کوئی اتنا بیش قیمت ہار خریدنے پر آمادہ نہ ہوا۔ ناچار اس نے پیرس جا کر قسمت آزمائی کرنے کی ٹھانی۔ مجسمے کے خریدار نے اسے امریکی ڈالر میں رقم دی تھی۔ ڈالر اس نے پونڈ میں تبدیل کرائے اور پیرس کے لئے روانہ ہوگیا۔

پیرس میں وہ سب سے پہلے دو جوہریوں کی دکان پر گیا اور دونوں نے اس سے ہار خریدے جانے کی رسید طلب کی۔ وہ آئیں بائیں شائیں کرکے وہاں سے کھسک گیا۔ تیسری دکان پر قسمت آزمانے پہنچا تو اس کا مالک درمیانہ عمر کا ایک معقول آدمی نظر آیا۔ اس نے دونوں ہاروں کو دیکھا اور مائیکل کو بڑی تعظیم سے بیٹھایا۔ مشروب کی بھی پیشکش کی لیکن مائیکل نے شکریہ ادا کرنے پر اکتفا کیا۔ پھر دکاندار نے کہا کہ ''وہ اپنے پارٹنر سے مشورہ کرکے بات آگے بڑھا سکے گا۔''

وہ دونوں ہار اس کے پاس چھوڑ جائے اور ان کی رسید لے لے۔ اگلے روز آکر معلوم کرلے۔ دکان بہت بڑی تھی۔ لاکھوں فرانک کی مالیت کے زیورات شوکیس میں رکھے تھے۔ پھر دکاندار کا طرز عمل اور لب و لہجہ بہت متاثر کن تھا۔ مائیکل نے کوئی تردد محسوس نہ کیا بخوشی ہار اسے دے کر رسید لی، اپنے ہوٹل کا پتہ لکھوایا اور مطمئن ہوکر چل دیا۔

رات گیارہ بجے کے قریب وہ ہوٹل میں اپنے بستر پر لیٹا سگریٹ کے کش لگاتا ہوا جوزا کے ساتھ مستقبل کے خوش آئند تصورات میں کھویا ہوا تھا کہ کمرے پر دستک ہوئی۔ یہ سمجھ کر کہ بیرا کچھ کہنے آیا ہوگا، اس نے دروازہ کھولا تو لمبے کوٹوں میں ملبوس فلیٹ ہیٹ لگائے دو آدمی تھے۔ ایک نے اس کی طرف ایک چٹ بڑھائی جس پر اس کا نام اور ہوٹل کا پتہ لکھا ہوا تھا اور مائیکل اسے سوالیہ نظروں سے دیکھنے لگا۔

''ہم دونوں پولیس انسپکٹر ہیں اور تم سے کچھ پوچھنا چاہتے ہیں!'' چٹ دکھانے والے نے کہا اور اس کے جواب کا انتظار کئے بغیر دونوں کمرے میں داخل ہوگئے۔ مائیکل حیران نظروں سے انہیں دیکھتا رہ گیا۔

''موسیو کی......'' انسپکٹر نے کہا۔

''مائیکل!'' مائیکل نے اپنا نام پورا کردیا اور کرسیوں کی طرف اشارہ کرکے انہیں بیٹھنے کو کہا۔

''تمہارے پاس وہ ہار کیسے آئے جو تم جوہری کی دکان پر چھوڑ آئے ہو!'' انسپکٹر نے بلاتمہید پوچھا۔

''ہار......! کیسے آئے؟ کیا مطلب؟'' مائیکل نے بلاخوف کہا۔ اور ان کے سامنے بستر پر بیٹھ گیا۔

''مطلب یہ ہے کہ تم نے وہ ہار کسی سے خریدے ہیں یا تمہارے اپنے ہیں؟'' انسپکٹر کے ساتھی نے

سوال کیا۔

مائیکل اس سوال سے چکرا گیا۔ ایک انجانا خوف اس کے رگ و پے میں سرایت کرگیا اور اس نے دلجمعی سے کہنے کی کوشش کی۔ ''ہاں...... یہ میرے اپنے ہیں!!''

دونوں انسپکٹروں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔ پھر ایک نے اس سے کہا۔ ''تمہیں ہمارے ساتھ پولیس ہیڈ کوارٹر چلنا ہوگا!''

''کیوں؟'' مائیکل نے ماتھے پر بل ڈال کر کہا۔

''کیوں چلنا ہوگا؟ یہ ہار......!''

''کوئی ثبوت؟'' اب مائیکل نے اس کا جملہ مکمل نہ ہونے دیا۔ ''اس بات کا کوئی ثبوت ہے کہ یہ چوری کے ہیں؟''

''ثبوت بھی فراہم کردیا جائے گا موسیو!'' انسپکٹر نے رسان سے کہا۔ ''ہمیں صرف یہ معلوم کرنا ہے کہ یہ ہار تمہارے پاس کیسے اور کس ذریعے سے آئے ہیں یا......!''

''میں نے چرائے ہیں یہی بات ہے نا!'' مائیکل نے غصے سے کہا۔ ''تو سن لو کہ اس کا مالک موجود ہے خواہ وہ میں ہوں یا کوئی اور فی الحال یہ میری ملکیت ہیں اور ہوسکتا ہے...... ہوسکتا ہے تمہیں غلط فہمی ہوئی ہو یا جوہری نے غلط سمجھ لیا ہو۔''

''یہی بات جاننے کے لئے تو تمہیں ہیڈ کوارٹر لے جایا جارہا ہے۔'' انسپکٹر نے تحمل مزاجی سے کہا۔ ''تمہیں کوئی اعتراض نہیں ہونا چاہئے۔ تمہارے ساتھ ناانصافی نہیں ہوگی۔ اب جلدی سے تیار ہو جاؤ۔''

مائیکل سخت مخمصے میں تھا کہ کیا کرے۔ اس نے جھوٹ بولا تھا کہ ہار اس کے ہیں اور اب وہ ان کی ملکیت کو کیسے ثابت کرے گا کیوں نہ اصل بات بتادی جائے کہ ان کی مالکہ انگلینڈ میں ہے اور یہ ہار چوری کے نہیں ہیں۔

بہرحال اسے پولیس ہیڈ کوارٹر جانا تھا اور وہ گیا۔ پولیس افسر نے اسے سر سے پاؤں تک دیکھا اور دونوں انسپکٹروں سے فرانسیسی میں باتیں کرنے لگا۔ کچھ دیر بعد ایک انسپکٹر نے اٹھ کر دفتر کے ایک کونے میں کھڑا ہوا لوہے کا بڑا سا کیبنٹ کھولا اور اس میں کچھ تلاش کرتا رہا۔ اس اثناء میں مائیکل چھت کو گھورتا رہا، گاہے گاہے پولیس افسر اور دوسرے انسپکٹر کے چہروں پر نظر ڈالتا اور ہر مرتبہ ان کی نظریں اپنے چہرے پر گڑی دیکھتا تو گھبرا کر نظریں چرا لیتا۔ اسے سخت بے چینی ہورہی تھی۔ اور دل بری طرح دھڑک رہا تھا۔ پانچ سات منٹ بعد کیبنٹ کھولنے والا انسپکٹر دونوں ہاتھوں میں کوئی چالیس کے قریب تصویریں اٹھائے آیا اور انہیں پولیس افسر کی میز پر ڈھیر کردیا۔

''ان تصویروں میں اگر تمہارا کوئی شناسا چہرہ ہو تو بتاؤ۔'' پولیس افسر نے مائیکل سے کہا۔ اور اس نے متذبذب سا ہوکر اپنی کرسی آگے کھسکالی۔ عورتیں اور مرد، دونوں کی تصویریں تھیں۔ وہ ایک ایک کرکے اٹھاتا، دیکھتا اور رکھ دیتا۔ تقریباً بیس تصویریں دیکھنے کے بعد اس کے ہاتھ رک گئے اور اس نے ہاتھ میں لی ہوئی تصویر میز پر نہیں رکھی غور سے اسے دیکھتا رہا۔

''اسے پہچانتے ہو؟'' پولیس افسر نے اس کا انہماک دیکھ کر پوچھا اس نے اثبات میں سر ہلایا وہ پیٹو کی تصویر کو کیسے نہ پہچانتا۔

''اب اسے دیکھو!'' پولیس نے بقیہ تصویروں کو پنسل کی پشت سے کرید کر ایک عورت کی تصویر کو اس کے سامنے کردیا اور وہ چونک پڑا۔ ''اسے بھی پہچانتے ہو؟'' پولیس افسر کی نرم لیکن تحکمانہ آواز اس کی سماعت سے ٹکرائی۔

''یہ...... یہ...... جوزا فیل ہے!'' اس نے ہکلاتے ہوئے کہا۔

''تمہارا جرم ثابت ہوگیا ہے میرے دوست!'' پولیس افسر نے پشت کرسی سے ٹکاتے ہوئے کہا۔ ''اب تمہیں ان دونوں کے پتے ٹھکانے بتانے ہوں گے۔''

''ہاں...... میری سمجھ میں...... یہ سب کیا ہے؟'' الفاظ اس کے منہ سے ٹوٹ ٹوٹ کر نکلے۔

''پکڑے جانے والے سب ہی یہ کہتے ہیں۔''
پولیس نے طنزیہ مسکراہٹ سے کہا۔ ''کوئی نئی بات کرو نئی کہانی سناؤ۔''
''میں سچ کہتا ہوں......میری سمجھ میں کچھ نہیں آرہا ہے۔'' اس کی زبان کی گرہ کھل نہیں رہی تھی۔
''اب زیادہ اداکاری نہ دکھاؤ۔'' پولیس افسر نے آنکھیں نکال کر اور لہجہ بدل کر کہا۔ ''صرف یہ بتادو کہ ہمیں کس ملک میں اور کس شہر میں چلنا ہے، ہمیں ایک عرصے سے تمہارے گروہ کی تلاش تھی۔ لاکھوں فرانک کا مال ہضم کر گئے ہو تم لوگ!''
''میں قسم کھا کر کہتا ہوں کہ میں کسی گروہ کو نہیں جانتا!'' اس نے زندگی میں پہلی بار خود کو کسی عقیدے کا پیرو سمجھا۔ ''اگر یہ لوگ چور ہیں......!'' اس نے پٹو اور جوزا کی تصویروں کی طرف اشارہ کرکے کہا۔
''تو میں بلا تامل تمہیں ان کے پاس لے چلوں گا۔ میں ایک قانون پسند شہری ہوں۔''
''تو پھر ہمیں کہاں چلنا ہے۔'' پولیس افسر نے کرسی سے اٹھتے ہوئے کہا۔
''انگلینڈ برمنگھم......'' مائیکل نے بلاپس وپیش کہا۔
''تم وہاں کیا کرتے ہو؟''
''وہاں چل کر تمہیں میرے بارے میں سب کچھ معلوم ہوجائے گا!''
''ہم صبح کی فلائٹ سے چلیں گے۔ تم رات یہیں رہوگے۔''
اسے حوالات میں بند کردیا گیا۔
☆......☆......☆
برمنگھم کے محکمہ آثار قدیمہ کی دو منزلہ عمارت سے کچھ فاصلے پر ایک سیاہ رنگ کی کیڈلک آکر رکی۔ اور اس میں سے مائیکل کے ساتھ بلیک سوٹوں میں ملبوس فلیٹ ہیٹ لگائے دو آدمی اترے، ایک وہیں کار کے پاس کھڑا رہا اور دوسرا عمارت کی طرف بڑھا اور باہر ہی رک گیا۔ پروگرام کے مطابق مائیکل کو اندر جا کر پٹو کو باہر لے آنا تھا۔ اس نے استقبالیہ پر پٹو کے بارے میں معلوم کیا تو اسے دوسری منزل کا ایک کمرہ بتادیا گیا۔
پٹو فائلوں اور رجسٹروں سے بھرے ہوئے چھت کو چھوتے ہوئے شیلفوں کے درمیان بیٹھا اونگھ رہا تھا۔ مائیکل کو دیکھتے ہی وہ ہڑبڑا کر کھڑا ہوگیا اور اس کی باچھیں کھل گئیں۔ اس کی صورت دیکھ کر مائیکل اپنا قانون پسند شہری ہونا بھول گیا۔ اس کا جرائم پیشہ ہونا بھول گیا۔ اسے صرف اپنا دوست پٹو یاد رہا۔ ایک خوش مزاج اور فراخدل انسان یاد نہ رہا، مائیکل کو اس کے چہرے پر جرم کی علامت کہیں نظر نہ آئی۔ وہاں تو اسے خلوص اور جذبہ ہمدردی کی چھاپ دکھائی دی۔ اس نے پھولی ہوئی سانس سے اسے جلدی جلدی سب کچھ بتادیا۔
''پولیس کہاں ہے؟'' پٹو نے اضطراب سے پوچھا۔
''نیچے سڑک پر!'' مائیکل نے بتایا۔
پٹو اس کا ہاتھ پکڑ کر کمرے سے باہر لایا اور دونوں لمبی راہداری سے تقریباً دوڑتے ہوئے گزر کر آخری سرے پر لوہے کے گول زینے سے نیچے اترنے لگے۔ چند منٹوں میں وہ عمارت کی پچھلی سڑک پر تھے۔ انہوں نے تیز تیز قدموں سے موڑ کاٹا اور پٹو نے ایک ٹیکسی روک کر ڈرائیور کو جوزا کا پتا بتادیا۔ راستہ بھر دونوں خاموش رہے۔ جوزا کے فلیٹ پر پہنچ کر پٹو نے دروازے پر مکہ مار کر چلاتے ہوئے کہا۔ ''جوزا......! دروازہ کھولو۔''
چند لمحوں بعد اندر سے سلیپر گھسیٹ کر چلنے کی آواز آئی۔ اور جوزا نے دروازہ کھولا۔ اس کے جسم پر صرف ایک باریک گاؤن لپٹا ہوا تھا۔ اور وہ اس کے بٹن لگا رہی تھی جیسے برہنگی کی حالت میں اٹھ کر آئی ہو۔ پٹو بھاگ کر کمرے سے گیا تو مائیکل بھی نیم برہنہ جوزا کو حیرت زدہ چھوڑ کر اس کے پیچھے دوڑا۔ وہ ملحقہ کمرے کے دروازے پر پہنچا تو اس کی نظر ایک نیگرو پر پڑی۔ جس کے جسم کا اوپر کا حصہ ننگا تھا اور دروازے کی طرف پشت کیے اطمینان سے پتلون پہن رہا تھا۔
مائیکل کی دوسری نظر شکن آلود بستر پر گئی اور وہ سمجھ

گیا کہ کچھ دیر پہلے کمرے کے در و دیوار کیا منظر دیکھ رہے ہوں گے۔ اس کے تخیل میں جوزا کا مرمریں بت گر کر پاش پاش ہوگیا۔ اس نے پلٹ کر جوزا کی طرف دیکھا اور نفرت آمیز حقارت کی چنگاریاں اس کی آنکھوں سے نکل کر جوزا کے خفت زدہ چہرے سے ٹکرائیں۔ پھر اس نے سر گھما کر نیگرو کی طرف دیکھا جو اسی اطمینان کے ساتھ قمیض پہن رہا تھا۔ اس کے چہرے پر نظر پڑتے ہی مائیکل کی نگاہیں جم سی گئیں۔

پیرس میں پولیس افسر نے اسے شناخت کے لئے جو تصویریں دکھائی تھیں ان میں ایک چہرہ یہ بھی تھا۔ اس نے پٹو کی طرف دیکھا جو دیوار سے جڑی ہوئی الماری سے نہ جانے کیا کیا نکال کر ایک سوٹ کیس میں ڈالتا جارہا تھا۔ اور پھر وہ دانت پیستا ہوا جوزا کی طرف بڑھا۔

''مکار...... چور......!'' اس نے جوزا کو شانوں سے پکڑ کر جھنجھوڑ دیا۔ ''تو...... تو نے چوری کے ہار مجھے دیئے کہ......''

''جو......!'' جوزا نے چیخ کر اس کی بات پوری نہ ہونے دی۔ ''جو اسے پکڑلو...... ختم کردو اسے۔''

اگلے لمحے اس کے کانوں نے کمانی دار چاقو کھلنے کی کڑکڑاہٹ ٹکرائی اور بجلی کی سی سرعت سے اس نے ایک طرف اچھل کر جو کا وار خالی کردیا۔ جو غراتا ہوا دوبارہ اس پر جھپٹا اور اس نے جھکائی دے کر جو کے پیٹ میں ایک زوردار گھونسہ لگایا اور وہ کراہ کر لڑکھڑایا تو مائیکل نے اس سے چاقو چھین لیا۔ وہ آپے سے باہر ہو رہا تھا اور ایک جنونی کیفیت سے چاقو تانے وہ جو پر لپکا۔

جو نے چیتے کی طرح پھرتی دکھا کر جوزا کو پیچھے سے پکڑ کر اس کے سامنے کردیا۔ اس کا بڑھا ہوا ہاتھ رک نہ پایا اور چاقو جوزا کے پیٹ میں اتر گیا۔ اس کی دلخراش چیخ سن کر اپنے کام میں مستغرق پٹو نے پلٹ کر دیکھا اور پھر لمبے لمبے قدم اٹھا کر ان کے قریب آیا تو فرش پر چت پڑی ہوئی جوزا کی کھلی آنکھیں چھت کو تک رہی تھیں۔

''یہ...... یہ تم نے کیا کیا؟ اسے...... م...... م...... مارڈالا؟'' وہ لکنت سے بڑبڑایا۔

مائیکل سناٹے میں تھا اور جو دونوں ہاتھ پیچھے باندھے ڈھیلے بدن سے لاپرواہ سا کھڑا تھا۔ جیسے جوزا کا قتل چنداں افسوس اور تشویش کی بات نہیں تھی۔

''جو...... وہ سوٹ کیس اٹھا لاؤ...... چلو جلدی کرو!'' پٹو نے مائیکل کا ہاتھ پکڑا اور اس کے پتھرائے ہوئے جسم کو گھسیٹتا ہوا دروازے کی طرف بڑھا۔ باہر آکر اس نے ٹیکسی روکی اور تینوں پیچھے بیٹھے تو پٹو نے ڈرائیور کو کسی جگہ کا پتا بتایا ٹیکسی چلتی رہی اور دروازے کے قریب بیٹھا ہوا پٹو بند شیشے سے سر ٹکا کر مستقل باہر دیکھتا رہا۔ دروازے میں بیٹھا جو مزے سے پاؤں پھیلا کر گنگناتا رہا اور مائیکل جیسے کھلی آنکھوں سے خواب دیکھتا رہا تھا۔

پٹو انہیں جہاں لے گیا وہ صنعتی علاقہ تھا۔ گردوپیش میں دور دور تک فیکٹریاں پھیلی ہوئی تھیں۔ وہ ایک پانچ منزلہ بوسیدہ بلڈنگ کی پانچویں منزل پر ایک سیلن زدہ نیم تاریک کمرے میں ٹھہرے جہاں ہوا کا گزر یوں تھا جیسے چھپ چھپا کر کبھی ادھر بھی نکل آئی ہو۔ وہ ساری رات اور اگلا سارا دن پٹو غائب رہا۔ مائیکل کی تو بھوک پیاس ہی غائب تھی۔ جو بھی اس طرف سے بے فکر نظر آتا تھا۔ مائیکل سوچتا رہا کہ جانے یہ جو کس مٹی کا بنا ہوا ہے کہ انسانی احساسات اسے چھو کر نہیں گزرے تھے۔

اگلے روز پٹو لوٹا تو اس نے آتے ہی ان سے چلنے کو کہا۔ اس دوران میں مائیکل اپنے حواس پر قابو پاچکا اور جوزا کا قتل اس کے ذہن کے پردے پر اس کے انجام کی ایک بھیانک تصویر کھینچ رہا تھا۔ اس نے مری ہوئی آواز سے پوچھا کہ پٹو اسے کہاں لے جارہا ہے۔ تو پٹو نے جواب میں صرف اتنا کہا۔ ''جہاں جیل خانہ اور گیس چیمبر نہیں ہوگا۔ آزادی اور درندگی نہ ہوگی۔ رہنے کھانے پینے، پہننے اور عیش کرنے کے لئے دولت ہوگی۔''

مائیکل نے یہ نہیں پوچھا کہ موجودہ حالات میں عارضی جنت کہاں ہے؟ اسے تو صرف گیس چیمبر سے دوری مقصود تھی۔ جو نے پٹو سے قطعی کچھ نہیں پوچھا۔

اسی شام کو تینوں ایک جہاز پر سوار ہو کر ایک ایسی منزل کی طرف چل پڑے، جس کا علم صرف پنٹو کو تھا لیکن پنٹو اور جو راہ میں کھو گئے اور مائیکل کو سمندر کی پر غضبناک لہروں نے ایسے مقام پر پہنچا دیا جہاں ایک اور قتل اس کا منتظر تھا۔

☆......☆......☆

مائیکل کے لئے یہ فیصلہ کرنا مشکل ہی نہیں بلکہ تشویشناک تھا کہ سردار اور گول جھونپڑی والی لڑکی میں سے کس کی پیشکش کو قبول کرے اور کس کی جان لے کبھی لڑکی کی مظلومیت اسے واسطہ دیتی اور کبھی سردار کی باثر شخصیت ترغیب دیتی تھی۔ دونوں باتوں کے درمیان اپنے تحفظ کا سوال تھا کہ کس کا ساتھ دینے سے کس کی بات ماننے سے تحفظ مل سکتا ہے۔

جوں جوں شام کے سائے لمبے ہو رہے تھے اس کا ذہنی خلفشار بڑھتا جا رہا تھا کیونکہ صبح کی ملاقات میں گول جھونپڑی والی نے کہا تھا کہ وہ رات کو اسے خنجر دے گی۔ ایک خیال اسے یہ بھی آ رہا تھا کہ وہ لڑکی سے خنجر لے کر رکھ لے اور پھر اس کا گلا گھونٹ دے۔ یہ خنجر جس کا سردار کو علم نہیں ہوگا بوقت ضرورت اس کے کام آئے گا۔ اسے اس لڑکی کی مظلومیت سے کیا واسطہ! وہ تو اسے کوئی فراڈ نظر آ رہی تھی کیونکہ وہ انگریزی صاف بول رہی تھی۔ کیا وہ سردار اور دوسرے لوگوں سے بھی تو فراڈ نہیں کھیل رہی تھی۔ جس کا سردار کو علم ہو گیا تھا اور وہ اسے ختم کرنے پر تلا تھا!

اس رات لڑکی اس کے پاس آئی اور خنجر اسے دیا تو اس نے پوچھا کہ کیا اسے یقین ہے کہ سردار یا کسی اور نے اسے یہاں آتے نہیں دیکھا ہے۔

"سردار کی طرف سے رات کے اس حصے میں کوئی خطرہ نہیں ہے۔ وہ نشہ آور مشروب استعمال کرنے کا عادی ہے۔ اور اس وقت اسے اپنا ہوش نہیں رہتا ہے۔" لڑکی نے انکشاف کیا تو مائیکل کو تاسف ہوا کہ وہ خواہ مخواہ ڈرتا رہا کہ کہیں سردار اسے لڑکی کے ساتھ پکڑ نہ لے۔

"رہے دوسرے لوگ!" لڑکی کہہ رہی تھی۔ "تو انہیں میری پرواہ نہیں ہے۔"

"وہ جو موٹے تازے آدمی اس کے ساتھ رہتے ہیں ان کا چکر کیا ہے!" مائیکل کا اشارہ سردار کے دونوں بڑے مشیروں کی طرف تھا۔

"اُس نے انہیں اور سب لوگوں کو الو بنا رکھا ہے۔" لڑکی نے بتایا۔ "وہ بے حد چالاک اور مکار ہے۔ جزیرے بھر میں کوئی اس کا بال تک بیکا نہیں کر سکتا۔ سب اس سے ڈرتے ہیں اور اس کے وفادار بھی ہیں۔"

"تو اس صورت میں کیا میرا مشن ناکام نہیں ہو جائے گا۔" مائیکل نے تردد سے کہا۔ "سردار کی ہلاکت کی خبر سنتے ہی سب کے سب شکاری کتوں کی طرح میرے پیچھے پڑ جائیں گے۔"

"میں نے ساری چیزیں پہلے ہی سوچ رکھی ہیں!" لڑکی نے اس کا ہاتھ تھام کر کہا۔ "تمہیں گھبرانے کی بالکل ضرورت نہیں ہے!"

اس کے ہاتھ کا لمس محسوس کرتے ہی مائیکل کو اچانک اپنے قریب ایک لڑکی کی موجودگی کا احساس ہوا، اور اس کے الفاظ بھی ذہن میں دوڑ گئے کہ اس وقت سردار کی طرف سے کوئی خطرہ نہیں ہے۔ اس کا سونا اور مرنا برابر ہے۔ اس نے سردار سے لڑکی کو نہ چھونے کا جو وعدہ کیا تھا وہ وعدہ اس گھڑی نشے میں بے سدھ تھا۔ لڑکی کا خنجر اس کے قبضے میں آ کر اب اسے نہتا کر چکا تھا۔ وہ اپنا تحفظ کرنے سے قاصر تھی۔ اس لڑکی کی طرف پیش قدمی کو اب کون سی طاقت روک سکتی تھی۔ اس کے اور لڑکی کے درمیان اب رکاوٹ کی کونسی دیوار حائل رہ گئی تھی وہ ابھی یہی سوچ رہا تھا کہ لڑکی ایک کٹی ہوئی شاخ کی طرح اس کی گود میں گر گئی۔ اس نے مائیکل کے جسم کے مطالبے کے بغیر اپنا جسم اس کے سپرد کر دیا۔

وہ اس شکاری کی طرح مسرت آمیز حیرت میں ڈوبا ہوا تھا جو درخت پر بیٹھے ہوئے چوکنا اور چالاک پرندے کا نشانہ باندھ رہا ہو کہ وہ پرندہ خود اس کے قدموں میں آ گرے، کیف و مستی کے لمحات گزر گئے تو

لڑکی نے نیم خوابیدہ اور شکست خوردہ آواز میں کہا۔ ''اجنبی میں تمہیں دوست کہوں یا دشمن، تم نے ایک پاک وصاف برتن میں غلاظت بھردی ہے۔ معطر...... پانی میں بدبودار سفوف گھول دیا ہے۔ صاف شفاف قالین پر کبھی نہ مٹنے والے دھبے ڈال دیئے ہیں اور یہ سب تم نے نادانستہ نہیں کیا ہے اور تم سے کرایا بھی دانستہ گیا ہے۔ تم قصور وار نہیں ہو، تمہیں اپنے جسم کی تسکین کی صورت میں معاوضہ مل گیا ہے۔ آئندہ بھی ملتا رہے گا، مالی معاوضہ الگ ہے اور اتنا بہت ہے کہ تم اس سے دنیا کی ہر آسائش خرید سکو گے۔ اب تمہیں سردار کو ٹھکانے لگانے میں کوئی تامل نہیں ہونا چاہیے۔''

''نہیں ہوگا۔'' مائیکل نے اس کی باتوں سے متاثر ہوکر بے ساختہ کہا اور اسے پھر اپنے بازوؤں میں بھرلیا۔

''اب میں چلتی ہوں!'' لڑکی بولی۔ ''اور اپنی جھونپڑی میں خوشخبری سننے کی منتظر رہوں گی۔'' اس نے اٹھتے اٹھتے مائیکل کے گال کا ایک زبردست بوسہ لیا اور سائے کی طرح جھونپڑی سے نکل گئی اور اسے سوچ کے سمندر میں ڈبکیاں کھاتا چھوڑ گئی۔

وہ اس نتیجے پر پہنچا کہ جب تک سردار کی شخصیت پوری طرح بے نقاب نہیں ہوجاتی ہے وہ اس زندگی سے رشتہ نہیں توڑے گا۔ جہاں تک لڑکی کی بات تھی سو اس کی اصلیت بھی ظاہر ہوکر رہے گی کہ اس کا یہ روپ کس روپ کی پردہ پوشی کررہا ہے۔ اس نے تہیہ کیا کہ سردار کی جھونپڑی میں جاکر اس کے خفیہ سامان کی تلاشی لے گا۔ اور یہ کام اسے مشکل نظر نہ آیا۔ اس نے دن کے وقت بستی کو مردوں سے خالی دیکھا تھا۔ اس کے علاوہ اس کے گھومنے پھرنے پر کوئی پابندی نہ تھی۔ وہ آسانی سے سردار کی جھونپڑی میں جاسکتا تھا۔

وہ اگلے روز جھونپڑی سے نکلا تو راستے میں بچوں کی شور مچاتی فوج نے اس کا حسب معمول والہانہ استقبال کیا اور عورتوں کی منہ پھاڑ ہنسی نے بھی سواگت کیا۔ دو ایک جگہ وہ رکا بھی تاکہ اپنے بے مقصد گھومنے کا جواز پیدا کرسکے۔ ایک جگہ بچوں کے دائرے میں بے ہنگم ناچ دکھاتا اور مسخرے پن سے انہیں ہنستا رہا۔ اور دوسری جگہ عورتوں کے جھرمٹ میں مضحکہ خیز شکلیں بنا کر انہیں گدگداتا اور خود کو گرماتا رہا۔

بالآخر وہ سردار کی جھونپڑی میں پہنچ گیا۔ وہاں پہنچ کر ایک لمحہ ضائع کئے بغیر وہ پچھلے حصے میں گیا جہاں گڑھے کو چٹائی سے ڈھک کر اس پر صندوق رکھ دیا گیا تھا۔ اس نے زور لگا کر صندوق کو اٹھایا پھر چٹائی ہٹا کر ایک طرف رکھی اور پتھر کی سل ہٹائی۔ اس کے بعد گھٹنوں کے بل جھک کر گڑھے میں دیکھنے لگا۔ پوٹلی اور اس کے اندر کی چیزیں وہ دیکھ ہی چکا تھا۔ اسے ہٹایا تو ایک کونے میں سبز پلاسٹک کی جلد کی ایک ڈائری نظر آئی۔

غیر ارادی طور پر اس کے منہ سے سیٹی نکل گئی اور اس نے جلدی سے ڈائری اٹھا کر بڑی پھرتی سے گڑھے کو بند کرکے اس پر صندوق جمادیا اور ڈائری کو پتوں کے زیر جامہ میں چھپا کر جھونپڑی سے نکل آیا۔ واپسی کے لئے اس نے جھونپڑی کی پشت کا راستہ منتخب کیا اور اپنی جھونپڑی میں آنے کے بجائے جھیل کے کنارے کنارے بائیں ہاتھ پر چلا گیا۔ جب خاصا دور نکل گیا تو کھجوروں کے ایک جھنڈ میں گھس کر بیٹھ گیا اور ڈائری کھولی۔ ڈائری کیا کھلی گویا انکشافات کے باب کھلتے گئے۔

سردار کا نام ایڈمنڈ تھا۔ وہ میکسیکو کے مضافات کا رہنے والا تھا۔ اس کا آبائی پیشہ مائیکلت کاری تھا اس نے جوانی ہی میں رہزنی کو اپنا پیشہ بنالیا۔ مسلح ڈاکے ڈالتا رہا کئی قتل کئے، ایک زمیندار کی ناز و نعم میں پلی خوش جمال لڑکی کو اغوا کیا اور اسے اپنی داشتہ بنا کر رکھا۔ اس کا مکسن پہاڑ کے کھوہ اور کھنڈرات تھے۔ پولیس اس کی تلاش میں سرگرداں تھی لیکن وہ ہاتھ نہ آتا تھا۔ زمیندار کی لڑکی کو اس نے قیدی بنا کر رکھ چھوڑا تھا۔ اس کے بطن سے مارگریٹ پیدا ہوئی۔

وقت کے ساتھ ساتھ ایڈمنڈ کے کس بل جواب دیتے جارہے تھے۔ اس نے رہزنی کم کردی اور جنگلی قبائل خصوصاً ریڈ انڈین لوگوں کو اسلحہ اور اجناس اور

مویشی اسمگل کرنے لگا۔ اس کا یہ کاروبار خوب چمکا اور وہ ان لوگوں سے خوب گھل مل گیا۔ مارگریٹ دس برس کی تھی کہ اس نے اپنی بیوی کا ایک ریڈ انڈین سے سودا کیا تو اس کی بیوی نے احتجاجاً خودکشی کرلی۔

مارگریٹ ذہنی طور پر اپنی عمر سے بہت آگے تھی۔ سب دیکھتی اور سمجھتی تھی۔ اس کے دل میں باپ کے خلاف نفرت اور حقارت کا چشمہ ابل رہا تھا۔ اس کی دنیا پہاڑوں کے کھوہ اور کھنڈرات تک محدود تھی اور وہاں سے نکلنے کے سارے راستے مسدود تھے۔

پھر ایک روز پولیس نے سارے علاقے کو گھیرے میں لے لیا۔ ایڈمنڈ مارگریٹ کے ہاتھ پاؤں باندھ کر اور اس کے منہ میں کپڑا ٹھونس کر مختصر سے سامان کے ساتھ خچر پر بیٹھ کر بھاگ نکلا۔ وہ مسلسل تین راتوں تک سفر کرتا رہا۔ دن میں کہیں چھپ جاتا۔

چوتھے روز وہ ایک ساحلی علاقے میں پہنچا اس نے ایک بوری خریدی اور مارگریٹ کو ایک نشہ آور مشروب پلا کر اس کے منہ پر کپڑا باندھ کر بوری میں بند کردیا۔

پھر ایک مال بردار جہاز کے کپتان کو بھاری رشوت دے کر جہاز پر سوار ہوگیا۔

سات روز تک وہ جہاز پر رہا۔ رات کی تاریکی میں وہ مارگریٹ کو کھلاتا پلاتا اور پھر اس کا منہ باندھ کر بوری میں بند کردیتا۔ آٹھویں رات کو اسے جزیرہ نظر آیا اور اس نے اپنی سکونت کے لئے منتخب کیا۔ وہ گمنام دنیاؤں کے سارے خطرات سے آگاہ تھا اور اس سے نمٹنے کے لئے تدبیریں بھی اس کے ذہن میں تھیں۔

جزیرے پر اتر کر اس نے سب سے پہلے تاروں کی جھلملاہٹ میں نرم ریتلی زمین پر گڑھا کھودنا شروع کیا اور صبح کاذب تک ایک گہرا کھود ڈالا۔ پھر اس نے مارگریٹ کے سارے کپڑے اتار دیئے اور اسے برہنہ بوری میں بند کرکے بوری گڑھے میں رکھ دی اور اس نے لکڑی کے صندوق کا جس میں وہ چند جوڑے کپڑے، سونا، ہیرے، جواہرات اور ہلکا اسلحہ لایا تھا...... اس نے اپنے اور مارگریٹ کے سارے کپڑے سمندر میں بہادیئے اور مادر زاد ننگا ہوگا۔ صندوق کے پیندے کے ٹکڑے ٹکڑے کئے اور انہیں صندوق میں ڈال دیا اور صندوق کو گڑھے پر رکھ کر ریت برابر کردی۔

سپیدہ صبح نمودار ہوا تو اس نے اپنے سارے جسم پر ساحل کی گاڑھی کیچڑ ملی اور صرف سینے کے حصے کو صاف رکھا۔ جب کیچڑ خشک ہوگیا تو اس نے مٹھیاں بھر بھر کر خشک ریت جسم پر پھیری۔ جس سے اس کے جسم کی رنگت بڑی عجیب سی ہوگئی اور وہ اسی حلیے میں چل پڑا۔

توقع کے عین مطابق زرختوں کے جھنڈوں کے قریب اس کا سامنا مقامی لوگوں سے ہوگیا۔ وہ سفید فام تھا نہ سیاہ فام ان لوگوں نے ستر پوشی کر رکھی تھی اور وہ الف ننگا تھا اور چھوٹے سے جیبی پستول سے ہوائی فائر کرتا تھا اور ہاتھ پشت پر کرکے پستول چھپالیتا تھا۔ وہ اس عجیب وغریب شخص کو حیرت سے دیکھنے لگے۔ اس نے ریڈ انڈین لوگوں اور میکسیکو کے جنگلی قبائلیوں سے جو زبان سیکھی تھی، اس کے جملے ادا کرکے انہیں اور بھی ششدر کردیا۔ کیونکہ ان جملوں کا ایک آدھ لفظ ان کی بولی سے ملتا جلتا تھا۔ وہ اسے پکڑ کر اپنے سردار کے پاس لے چلے تو وہ راستے میں رک رک کر بازی گروں کی طرح قلا بازی کھاتا اور پھرتی سے ہوائی فائر کرتا تو سارے لوگ سراسیمہ نظر آتے۔

سردار نے بھی اس منظر کو اچنبھے سے دیکھا اور اس کے سامنے جانے سے پہلے اس نے سب کی نظر بچا کر پستول کو ایک جھاڑی میں اچھال دیا۔

سردار کے سامنے بھی اس نے بڑی گھمبیر اور ڈراؤنی آواز میں جنگلیوں کی زبان کے جملے ادا کئے جن کے کچھ الفاظ اس کے سیانوں کے پلے پڑ گئے۔ اس نے اشاروں سے بتایا کہ ''وہ آسمان سے اترا ہے۔''

اور پھر اشاروں سے ہی انہیں اپنے ساتھ چلنے کو کہا۔ وہ ورطہ حیرت میں ڈوبے اس کے پیچھے چل پڑے اور وہ انہیں اپنے صندوق کے پاس لے آیا۔ اس نے صندوق کا ڈھکن اٹھا کر سردار اور سیانوں کو اندر کا حصہ دکھایا اور پھر بلند آواز سے انٹ شنٹ بکنے لگا۔ کچھ دیر

بعد اس نے جھک کر صندوق کی چیزیں ادھر ادھر کیں اور ہاتھ بڑھا کر اس کے نیچے گڑھے میں رکھی ہوئی بوری کا منہ کھولا۔ مارگریٹ کے منہ پر بندھا ہوا کپڑا ہٹایا اسے بالوں سے پکڑ کر صندوق سے باہر کھینچ نکالا۔

سردار اور دوسرے لوگوں کے منہ سے حیرت کے مارے چیخیں نکل گئیں۔ انہوں نے خود اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا کہ صندوق میں کوئی انسان نہیں تھا اور اب ان کے سامنے سفید چمکتی جلد کا حسین و جمیل نور کے پیکر میں ڈھلا انسانی وجود تھا اس کے شانوں پر لہراتے ہوئے سنہرے بال سونے کی تاروں کی طرح چمک رہے تھے۔ سینے کا چھوٹا سا مخروطی ابھار مقناطیسی طاقت سے اپنی طرف کھینچ رہا تھا اور......

وہ یقیناً اس روئے زمین کا باشندہ نہ تھا۔ اگر آسمان سے نہیں اترا تھا تو زمین پر پیدا بھی نہیں ہوا تھا۔ پھر وہ سفید فام بھی نہ تھا۔ جس کے وہ جانی دشمن تھے۔ اس کے ساتھ خوف سے لرزاں یہ نسوانی پیکر دیوتاؤں کی طرف سے سوغات تھا۔ اسے ہاتھوں ہاتھ لیا گیا اور اس کی جان لینے کے ارادے ختم کر دیئے گئے۔ اس نے اشارے میں سب لوگوں کو چلے جانے کو کہا اور وہ سب اس سے مرعوب ہوگئے۔ ان کے دور جاتے ہی اس نے مارگریٹ سے کہا ”اگر اس نے زبان کھولی یا شور مچایا تو اسے جیتے جی سمندر کے حوالے کر دیا جائے گا۔

جاتے ہی جیسے ہی حالات درست ہو جائیں گے اور مہذب دنیا اس کے جرائم کو بھول جائے گی تو وہ اپنی دنیا میں واپس چلے جائیں گے۔“ اس نے مارگریٹ کو یہ کہہ کر بھی ڈرا دیا کہ ”اگر ان کا بھید کھل گیا اور جزیرے والوں کو معلوم ہوگیا کہ وہ اور مارگریٹ سفید فام انسان ہیں تو وہ انہیں زندہ جلا دیں گے۔ یا کچا ہی کھا جائیں گے۔“

مارگریٹ اس مقصد سے لرز گئی۔ اسے اپنی زندگی عزیز تھی خواہ وہ کسی ماحول اور حلیے میں ہو۔ وقت کی نزاکت کو دیکھتے ہوئے اس نے بلا چوں و چرا باپ کی بات پر عمل کرنے کا وعدہ کیا۔

ایڈمنڈ نے جلدی جلدی صندوق کا پیندا اس کے ٹکڑے جوڑ کر ٹھیک کیا اور اسے اٹھا کر بستی میں لے گیا۔

مارگریٹ اس ماحول میں رہ کر اور اس سے الگ تھلگ جوان ہوتی گئی۔ اس دوران میں اس نے مقامی زبان بھی سیکھ لی اور رسم و رواج بھی۔ اور اسی دوران میں جزیرے کا سردار ایک روز اچانک مر گیا۔ ایڈمنڈ نے اس کا گلا گھونٹ دیا تھا۔ سردار کی موت کے بعد جزیرے کے لوگوں نے اسے اپنا سردار تسلیم کر لیا۔

مارگریٹ اب بھرپور جوان تھی۔ جزیرے کی عورتیں اسے پوجنے کی حد تک عقیدت رکھتی تھیں۔ بچے اس کے جنون کی حد تک گرویدہ تھے اور مرد اسے کوئی آسمانی مخلوق سمجھتے تھے لیکن ایڈمنڈ نے کمال ہوشیاری سے اس کے اور ان لوگوں کے درمیان حد فاصل قائم کر رکھی تھی۔

وہ مارگریٹ کو کسی سے گھلنے ملنا کا موقع نہ دیتا تھا اور اب وہ بھی اس کے منہ آنے لگی تھی۔ اسے کوستی اور برا بھلا کہتی تھی۔ اپنی ماں کا قاتل بتاتی اور اسے انجام کی دھمکیاں دیتی تھی۔

ایڈمنڈ نے اپنی سرداری اور بالادستی قائم رکھنے کے لئے اپنے تحفظ کے لئے اسے اپنے راستے سے ہٹانا ضروری سمجھا تھا۔ مارگریٹ اس کا اپنا خون تھی لیکن یہ خون اس کے وجود کو بہا دینا چاہتا تھا اور کیسے ممکن تھا کہ وہ اس بہاؤ کو نہ روکتا۔

ڈائری پڑھ کر مائیکل نے ایک طویل گہری سانس لی۔ اب اس کی آنکھوں کے سامنے سب کچھ روشن تھا۔ تذبذب اور ہچکچاہٹ کی گنجائش نہ تھی۔ اسے ایڈمنڈ یا مارگریٹ میں سے ایک کو ختم کرنے کا فیصلہ کرنا تھا، اور اس نے فیصلہ کر لیا کہ وہ ایڈمنڈ کا قصہ پاک کر دے گا اور مارگریٹ کو اپنے ساتھ لے جا کر مہذب دنیا کو رہزن اور قاتل ایڈمنڈ کے انجام سے آگاہ کرے گا۔ اس کے دل میں مارگریٹ کے لئے انسیت پیدا ہوگئی تھی۔ وہ واقعی مظلوم تھی اس نے دکھ سہے تھے۔ اگر شہری زندگی گزارتی تو ایک باعزت مقام حاصل کرتی لیکن وہ

دس سال کی عمر سے انسان نما جانوروں میں پل رہی تھی۔ اب ایک مہذب، تعلیم یافتہ اور فیشن ایبل معاشرہ اس جاہل اور نیم پختہ شعور کی مالک لڑکی کو کیسے قبول کرے گا؟ حالانکہ اس غیر مہذب ماحول نے اسے معصومیت اور پاکیزگی کی وہ دولت عطا کر رکھی تھی جس سے مہذب دنیا کی بیشتر دوشیزائیں محروم تھیں اسے مردوں کے ہاتھوں نے تو کجا میلی نظروں تک نے نہیں چھوا ہے وہ پہلا انسان ہے جس نے اس کی دوشیزگی کو پارہ پارہ کر دیا ہے۔ اس لئے وہ اسے اپنا لے گا۔ یورپ کے کسی حصے کسی شہر میں اسے اپنی شریک حیات کی حیثیت سے لے جائے گا۔

وہ سارا دن اس نے بڑے اضطراب سے گزارا۔ اس سے کھانا بھی نہ کھایا گیا۔ شام کو سردار اس سے ملنے آیا تو اس نے سر میں شدید درد کا بہانہ کیا۔ سردار اسے پھر پرزور نصیحت کر گیا۔ مغرب تک وہ جھیل کے کنارے بیٹھا تھا۔ اپنے منصوبے کے ہر پہلو پر غور کرتا رہا۔

شام رات کے طرف بڑھنے لگی تو وہ جھونپڑی میں آ گیا۔ اسے مارگریٹ کا انتظار تھا وہ اسے بتانا چاہتا تھا کہ حقیقت اس پر آشکار ہو چکی ہے اور اس نے مستقبل کے بارے میں کیا سوچ رکھا ہے۔ اس نے شام کا کھانا بھی نہ کھایا اور کھانا لانے والی پرکشش جسم کی عورت کی سپردگی کے لئے آمادگی پر بھی توجہ نہ دی۔ پھر رات آ ہی گئی اور اس کی سیاہ چادر میں لپٹی مارگریٹ بھی......!

''مارگریٹ۔'' اس نے اندھیرے میں سرگوشی کی تو اس کی آنکھیں مارگریٹ کے چہرے کے تاثرات دیکھنے سے قاصر تھیں مارگریٹ چپ تھی۔ ''میرے ہاتھ تمہارے باپ کی...... ڈائری...... ڈاکو، اسمگلر اور قاتل کی...... تمہاری ماں کے قاتل کی ڈائری آ گئی ہے اور اب یہ راز میرے لئے راز نہ رہا ہے۔ تم میرے ساتھ میری بیوی بن کر چلنے کو تیار ہو۔ اگر میری بن کر نہ رہنا ہے تب بھی میں تمہیں یہاں چھوڑ کر نہیں جاؤں گا۔ میں آج ہی ایڈمنڈ کا...... تمہارے باپ کا قصہ پاک کر دوں گا۔ تم جھونپڑی میں میرا انتظار کرنا۔ فرار ہونے کا سارا انتظام تو مکمل ہے ناں۔''

''ہاں۔'' مارگریٹ کی آواز جیسے کسی کنوئیں سے آئی۔

''تم میرے ساتھ شادی کرنا چاہو گی؟''

''پچھلے پہر یہ کام کرو گے ناں!''

''ہاں ہونا تو اسی وقت چاہئے۔'' مائیکل نے جواب دیا۔ مارگریٹ نے اسے پیشگی کی دوسری قسط دینا چاہی لیکن وہ ایک غلطی کا اعادہ نہیں کرنا چاہتا تھا۔

''تم میرے ساتھ آؤ۔ میں تمہیں ایک ایسے راستے سے اس کی جھونپڑی تک لے جاؤں گی جدھر سے کوئی تمہیں دیکھ نہ سکے گا۔ ہم اس کی جھونپڑی کی پشت پر نکلیں گے۔ تم خنجر سے اس میں شگاف ڈال دینا اور اندر چلے جانا۔''

تجویز معقول تھی، مائیکل اس کے پیچھے چل پڑا۔ وہ اسے جھیل کی سمت لے گئی اور دونوں بائیں ہاتھ پر جھیل کے کنارے کنارے چلنے لگے۔ کوئی پچاس گز جا کر مارگریٹ نے کہا کہ وہ ہتھیلیوں اور گھٹنوں کے بل جھک جائے اور دونوں اس حالت میں چوپایوں کی طرح درختوں کے جھنڈ میں داخل ہوئے۔ مائیکل کی ہتھیلیوں اور گھٹنوں میں سنگریزے چبھ رہے تھے اور اسے تکلیف بھی ہو رہی تھی لیکن مارگریٹ بلی کی طرح اطمینان سے دبکی دبکی چلی جا رہی تھی۔ سردار کی جھونپڑی کے قریب جا کر وہ رک گئے اور اس کے کان میں...... ''انتظار کروں گی؟'' کہہ کر مارگریٹ اس کے گال کا بوسہ لے کر لوٹ گئی۔

مائیکل جھونپڑی کی پشت پر گیا اور اس نے خنجر سے اسے کاٹنے کی کوشش کی تینوں جگہوں کے بعد چوتھی جگہ نرم مل گئی اور آسانی سے کٹ بھی گئی۔

اتنا بڑا شگاف ہو گیا تھا کہ وہ آسانی سے اندر داخل ہو سکے۔ وہ سانس روکے جھونپڑی کے پچھلے حصے میں اور پھر سامنے کے حصے میں گیا جہاں ایڈمنڈ گینڈے کی طرح پڑا سو رہا تھا۔ وہ دم سادھے اسے ٹکٹکی باندھے دیکھتا رہا۔ پھر دبے پاؤں آگے بڑھا۔ آہستہ سے

گھٹنوں کے بل جھکا اور باہاں ہاتھ مضبوطی سے اس کے منہ پر رکھ کر خنجر اس کے نرخرے پر یوں زور سے تین چار بار پھیرا جیسے کسی موٹے سانڈ کو ذبح کر رہا ہو۔ گرم گرم گاڑھے گاڑھے خون سے اس کا ہاتھ کلائی تک لتھڑ گیا اور وہ ایڈمنڈ کے جسم کو تڑپتا چھوڑ کر جھونپڑی کے پچھلے حصے میں گیا۔ جلدی سے اس کا ہاتھ گڑھے تک پہنچا اور اس نے ٹٹول ٹٹول کر کپڑوں کا جوڑا، دوربین، ریوالور اور صندوقچی نکالی۔ پھر سب کو کپڑے میں لپیٹ کر گٹھری سی بنالی اور شگاف کے راستے باہر نکل گیا۔

پہلے کی طرح چوپایہ بن کر جھیل کے کنارے پہنچا اور لمبے لمبے ڈگ بھرتا ٹھوکریں کھاتا سنبھلتا کنارے کنارے چلنے لگا۔ جب کافی دور آ گیا تو اس نے گٹھری ایک جھاڑی میں رکھی اور جھیل میں اتر گیا۔ خوب مل مل کے اس نے ہاتھوں اور جسموں سے خون کے چھینٹے صاف کئے اور جھاڑی سے گٹھری اٹھا کر چلا تو معاً یاد آیا کہ خنجر تو وہ جھونپڑی ہی میں بھول آیا ہے۔ ایک ثانئے میں اس نے فیصلہ کرلیا کہ اسے لوٹنا نہیں ہے، اور وہ مارگریٹ کی جھونپڑی پر پہنچ گیا، پہلی ہی دستک پر دروازہ کھل گیا۔

''مارگریٹ وہ ختم ہوگیا ہے! میں نے اسے مار ڈالا۔'' اس نے گٹھری زمین پر رکھ کر پھولی ہوئی سانس سے کہا تو مارگریٹ اس سے لپٹ گئی۔ اس نے مائیکل کے چہرے سینے اور بانہوں پر بوسوں کی بوچھاڑ کردی۔

''مارگریٹ۔'' اس نے خود کو چھڑاتے ہوئے کہا۔ ''میں اس کی خفیہ چیزیں بھی لے آیا ہوں۔ اس میں سب سے زیادہ فوری طور پر کارآمد چیز ریوالور ہے۔ اب جو سامنے آئے گا میں اسے گولی ماردوں گا۔ ہم بڑی حفاظت کے ساتھ یہاں سے روانہ ہوں گے۔ اب بتاؤ تم نے کیا انتظام کر رکھا ہے؟ کوئی کشتی ہے جس سے سمندر میں جا سکیں یا خشکی کا کوئی راستہ ہے۔''

''صبر سے کام لو میرے نجات دہندہ میرے جیون ساتھی تھوڑا صبر کرو تمہیں سب کچھ معلوم ہوجائے گا۔ سب کچھ، تم گٹھری یہیں چھوڑ دو اور اپنی جھونپڑی میں جاؤ، میں وہیں آتی ہوں۔'' مارگریٹ کی آواز مسرت سے کانپ رہی تھی۔ مائیکل فوراً وہاں سے چل دیا۔

اپنی جھونپڑی میں آ کر وہ بڑی بے صبری سے مارگریٹ کا انتظار کرنے لگا۔ اس کے کان پچھلے دروازے پر لگے تھے لیکن سامنے کے دروازے پر آہٹ سن کر اس نے چونک کر دیکھا تو مارگریٹ پہلی بار اس دروازے سے داخل ہو رہی تھی۔ اس نے دل میں سوچا کہ اب مارگریٹ کا حوصلہ بڑھ گیا ہے اب اسے کسی کا ڈر نہیں ہے اس لئے سینہ تان کر سامنے کے دروازے سے آئی ہے۔ مائیکل سے دو قدم کے فاصلے پر وہ رک گئی۔

''میرے محسن!'' اس کی سرگوشی کی لہریں مائیکل کے کانوں میں رسانیت سے اتریں۔ ''میں تمہاری شکرگزار ہوں کہ تم نے اس موذی کو جہنم رسید کردیا۔ یہی میری زندگی کا اولین مقصد تھا اور آخری مقصد یہ تھا کہ میں اس جزیرے پر حکمرانی کروں۔ اس ملعون کی جگہ میں لوں، مجھے تمہاری دنیا کا کوئی تجربہ نہیں ہے۔ اس لئے میری نظروں میں اس کی کوئی اہمیت نہیں ہے اور پھر مجھے بھی وہاں پر عورت سے زیادہ اہمیت نہیں دی جائے گی۔ میں یہاں کی دنیا میں پروان چڑھی ہوں۔ یہاں میرا عقیدت کی حد تک احترام کیا جاتا ہے۔ مجھے آسمانی مخلوق سمجھا جاتا ہے۔ میرا باپ تو محض ان کا دنیاوی حکمران تھا۔ میری حکمرانی کو آسمانی حکومت سمجھا جائے گا۔ تمہاری دنیا میں مجھے یہ رتبہ یہ مقام کہاں ملے گا، میرے نجات دہندہ میں نے تمہارے احسان کا بدلہ تمہارے ہاتھوں اپنے پاک کنوارے جسم کو پامال کرا کے چکا دیا ہے تاکہ اگر میرے ہاں اولاد ہو......تو وہ سفید فام ہو......لیکن کوئی......اس کا باپ کہلوانے کا دعویٰ نہ کرسکے گا۔ اس طرح ان لوگوں کے نزدیک یہ ایک معجزہ ہوگا۔'' اس نے دروازے کی طرف منہ کرکے ایک عجیب آواز نکالی تو چشم زدن میں جھونپڑی آدمیوں سے بھرگئی۔

چھوٹے چھوٹے کئی بھالے فضا میں بلند ہوئے اور مائیکل کے جسم میں اترتے چلے گئے!





پراسرار بوڑھا

ایس امتیاز احمد۔کراچی

آئے دن نوجوان تقدیر اور قسمت کو جھٹلانے کے چکر میں تگ و دو کرتا رہا، لیکن اس کی ہر چال پٹتی رہی، وہ اپنے کسی بھی مقصد میں کامیاب نہ ہوا، پھر ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر بیٹھ گیا کہ پھر اچانک......

قسمت کے لکھے کو کوئی نہیں مٹا سکتا اور یہ حقیقت ہے، کہانی میں ثبوت مفصل موجود ہے

وانس کوئی سال سے اپنے لئے کسی خوب صورت اور معقول قسم کی بیوی کی تلاش میں تھا۔ لیکن اب تک اسے کامیابی نصیب نہیں ہوئی تھی۔ اس ناکامی کی بڑی وجہ یہی تھی کہ اس نے اپنے ذہن میں اپنی ہونے والی بیوی کے لئے ایک خاص معیار مقرر کر رکھا تھا اور وہ اس معیار سے کم تر لڑکی سے شادی کرنے کے لئے کسی صورت تیار نہیں تھا۔

807ء میں سنگ ہو کی طرف جاتے ہوئے شہر سنگ چینگ کی ایک سرائے میں ٹھہرا جو شہر کے جنوبی دروازے کے باہر واقع تھی۔ کسی شخص نے اس سے یان خاندان کی ایک لڑکی سے اس کا رشتہ کرا دینے کی بات کی تھی۔ یہ خاندان ہر لحاظ سے اس کے اپنے خاندان کے ہم پلہ تھا۔ رشتہ طے کرانے والے شخص نے اس سے صبح کے وقت لنگ شنگ مندر میں ملنے کا وعدہ کیا تھا تاکہ

رشتے کی بات کو بشرط پسند آگے بڑھایا جا سکے۔

وائی کو کے دل میں اس ملاقات کا اتنا اشتیاق تھا کہ وہ ٹھیک سے سو بھی نہیں سکا اور منہ اندھیرے ہی تیار ہو کر سرائے سے نکل کھڑا ہوا۔ آسمان پر پچھلی رات کے چاند کی پھیکی پھیکی چاندنی پھیلی ہوئی تھی۔ صبح ہونے میں ابھی کافی دیر تھی لیکن وائی کو کے لئے کچھ دیر اور انتظار کرنا بھی مشکل تھا۔ وہ تیز تیز قدم اٹھاتا مندر کی طرف چل دیا۔

مندر کی سیڑھیوں پر وائی کو نے ایک بوڑھے کو دیکھا۔ وہ ایک بڑی سی کتاب اپنے گھٹنوں پر رکھے چاند کی روشنی میں اس کا مطالعہ کر رہا تھا۔ اس کے قریب ہی ایک چھوٹا سا تھیلا پڑا تھا۔

بوڑھے کو اس بے وقت مطالعے میں مصروف دیکھ کر وائی کو بڑا حیران ہوا۔ اس نے جھک کر کھلی ہوئی کتاب پر ایک نظر ڈالی۔ وہ دنیا کی تقریباً ہر قدیم وجدید زبان سے آشنا تھا لیکن کتاب کی تحریر اس کے لئے اجنبی تھی۔ اس نے آگے بڑھ کر کہا۔ ''یہ تم کیا پڑھ رہے ہو بڑے میاں؟ میں دنیا کی ہر زبان پڑھ سکتا ہوں لیکن تمہاری یہ کتاب معلوم نہیں کون سی زبان میں ہے۔ میں نے اس قسم کی تحریر آج تک نہیں دیکھی۔''

''یقیناً نہیں دیکھی ہوگی۔'' بوڑھے نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔ ''یہ کتاب کسی ایسی زبان میں نہیں ہے جسے تم یا تمہاری دنیا والے جانتے ہیں۔''

''تو پھر یہ کس زبان میں ہے؟''

''تم ایک فانی انسان ہو اور یہ کتاب غیر فانی روحوں کی دنیا کی ہے۔''

''اچھا!'' وائی کو کا اشتیاق ایک دم بڑھ گیا۔ ''اور یہ کتاب تمہارے پاس کہاں سے آئی ہے؟''

''میرے پاس!'' بوڑھے نے ہنستے ہوئے کہا۔ ''بھلے آدمی! میں اس علاقے کے انسانی معاملات کا نگراں ہوں اس کتاب میں ان تمام لوگوں کے نام اور پتے درج ہیں جن کے معاملات کی نگرانی میرے سپرد ہے۔ ہر رات میں یہ کتاب ساتھ لے کر گشت پر نکلتا ہوں۔ اور ان لوگوں کے ناموں اور پتوں کی پڑتال کرتا ہوں جن کے معاملات مجھے سونپے گئے ہیں۔''

''کیسے معاملات؟''

''شادی کے معاملات۔''

شادی کا لفظ سن کر وائی کو کی آنکھیں خوشی سے چمک اٹھیں۔

''معاف کرنا بڑے میاں! آپ ہی وہ ہستی ہیں جن سے میں کچھ مشورہ کرنا چاہتا ہوں۔ میں ایک مدت سے شادی کی کوشش کر رہا ہوں لیکن اب تک مجھے کوئی موزوں بیوی نہیں مل سکی۔ میں دراصل یہاں آیا بھی اس لئے تھا کہ ایک شخص نے مجھ سے یہاں ملنے کا وعدہ کیا تھا۔ وہ میرا رشتہ پان خاندان کی ایک لڑکی سے طے کرنا چاہتا ہے جو بڑی خوب صورت، مہذب اور شائستہ بیان کی جاتی ہے۔ ذرا بتاؤ تو بات بن جائے گی کہ نہیں؟''

''تمہارا نام اور پتہ کیا ہے؟'' بوڑھے نے پوچھا۔

وائی کو نے اپنا نام اور پتہ بتایا۔ کتاب کے چند ورق الٹنے کے بعد بوڑھے نے وائی کو کی طرف دیکھا اور کہا۔

''یہ بیل منڈھے نہیں چڑھے گی میاں! تمہیں معلوم ہونا چاہئے کہ سب سنجوگ آسمان پر ہوتے ہیں اور وہ سب اس کتاب میں درج ہیں۔ تمہاری بیوی اس وقت صرف تین سال کی ہے۔ جب وہ سترہ سال کی ہو جائے گی تو تم اس سے شادی کر سکو گے گھبرانے کی کوئی ضرورت نہیں۔''

''گھبرانے کی کوئی ضرورت نہیں!'' وائی کو چڑ گیا۔ ''تو گویا مجھے چودہ سال اور اسی طرح کنوارا رہنا ہوگا اور تم کہتے ہو گھبرانے کی کوئی ضرورت نہیں۔''

''اور کیا کہوں میاں! تمہیں اس وقت تک انتظار کرنا ہوگا جب تک تمہاری ہونے والی بیوی سترہ سال کی نہیں ہو جاتی۔''

''اور یہ پان خاندان کی جولڑکی ہے اس سے میری شادی نہیں ہوسکے گی؟''

''نہیں۔'' بوڑھے نے جواب دیا۔

وائی کوکوکچھ بھی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ وہ بوڑھے کی باتوں کا یقین کرے یہ نہ کرے۔ اس نے اس کے قریب پڑے ہوئے تھیلے کی طرف دیکھا اور پوچھا۔

''اس تھیلے میں کیا ہے؟''

''شگون کے سرخ ریشمی دھاگے۔'' بوڑھے نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔'' میاں! یہ بھی میرے فرائض کا ایک حصہ ہے جب بھی اس دنیا میں ایسا لڑکا اور ایسی لڑکی پیدا ہوتے ہیں جنہیں آگے چل کر میاں بیوی بننا ہو، تو میں رات کے وقت جا کر ان دونوں کے پیروں میں یہ لال دھاگا باندھ دیتا ہوں اور باندھتا بھی بڑی مضبوطی سے ہوں۔ خواہ لڑکا غریب گھرانے میں پیدا ہوا ہو اور لڑکی امیر گھرانے میں اس کے برعکس، خواہ وہ ایک دوسرے سے ہزاروں میل دور ہوں، خواہ ان دونوں کے خاندانوں کے درمیان شدید دشمنی ہو، وہ انجام کار میاں بیوی بن کر رہتے ہیں۔''

''تم نے میرے پاؤں میں بھی دھاگا باندھا ہوگا۔''

''ہاں۔''

''اور وہ تین سالہ لڑکی کہاں ہے جسے بقول تمہارے سترہ سال کی ہو کر میری بیوی بننا ہے؟''

''وہ!'' بوڑھے نے مسکراتے ہوئے کہا۔''وہ ایک سبزی فروش عورت کے پاس رہتی ہے۔ وہ جگہ یہاں سے زیادہ دور بھی نہیں ہے۔ اور وہ عورت سبزی فروخت کرنے کے لئے سویرے سویرے مارکیٹ میں آجاتی ہے تم چاہو تو میرے ساتھ چل کر اسے دیکھ بھی سکتے ہو۔''

صبح ہو رہی تھی۔ وائی کو جس شخص سے ملنے کے لئے مندر میں آیا تھا وہ ابھی تک نہیں پہنچا تھا۔ بوڑھے نے کہا۔

''میاں! اس شخص کا انتظار کرنے کا کوئی فائدہ نہیں۔ آؤ میرے ساتھ۔''

وہ دونوں مارکیٹ کی طرف چل دیئے۔ راستے میں بوڑھے کی باتوں سے وائی کو نے بہت ہی لطف لیا۔ بوڑھا کہہ رہا تھا۔

''مجھے اپنا یہ کام بہت ہی پسند ہے۔ میرا ذرا سا لال دھاگا ایسا لاجواب کام انجام دیتا ہے جس کا تم تصور بھی نہیں کر سکتے لڑکا اور لڑکی اپنے اپنے گھر میں پرورش پاتے رہتے ہیں اور طویل مدت تک انہیں ایک دوسرے کے وجود کی خبر بھی نہیں ہوتی۔ لیکن جب وقت آتا ہے تو وہ ایک دوسرے پر سوجان سے فدا ہو جاتے ہیں۔ اس چاہت پر ان کا بس نہیں چلتا۔ اگر کوئی اور لڑکی یا لڑکا ان کے درمیان حائل ہو جائے تو وہ اس دھاگے سے الجھ کر اس میں کچھ ایسی بری طرح پھنس جاتا ہے کہ بالآخر خودکشی کر لیتا ہے۔ میں نے ہزاروں بار ایسا ہوتے دیکھا ہے۔''

تھوڑی ہی دیر میں وہ دونوں مارکیٹ تک پہنچ گئے۔ وہاں پہنچ کر بوڑھے نے سبزی بیچنے والی ایک بہت ہی میلی کچیلی عورت کی طرف اشارہ کیا۔ اس عورت کے بال گندے اور پراگندہ تھے۔ ایک بچی اس کی چھاتی سے چمٹی ہوئی تھی۔ عورت کی آنکھیں دھندلی دھندلی سی تھیں۔ اور اسے مشکل سے ہی دکھائی دیتا تھا۔ بوڑھے نے کہا۔

''وہ دیکھو۔ وہ بچی تمہاری بیوی ہے۔''

عورت کو ایک نظر دیکھتے ہی وائی کو نے سخت گھن محسوس کی۔ اس نے قدرے برہم ہو کر بوڑھے کو مخاطب کیا۔

''یہ کیا مذاق ہے بڑے میاں!''

''میں مذاق نہیں کر رہا ہوں۔'' بوڑھے نے جواب دیا۔'' یہ لڑکی بہت خوش قسمت ہے۔ اس کا ستارہ بلند ہے۔ وہ تم سے شادی کرکے بڑے عیش و آرام سے زندگی گزارے گی اور پھر اپنے بیٹے کی وجہ سے ایک اعزاز بھی حاصل کرے گی۔''

بوڑھے کی باتیں سن کروائی کو نے ایک بار پھر اس میلی کچیلی عورت کی طرف دیکھا اور اسے اپنا دل ڈوبتا محسوس ہونے لگا۔ وہ ایک بار پھر بوڑھے کی بات کو جھٹکنا چاہتا تھا۔ لیکن جب اس نے پلٹ کر دیکھا تو بوڑھا غائب ہو چکا تھا۔

وائی کو انتہائی سوگواری اور نامرادی کے عالم میں سرائے کو واپس ہوا۔ ایک تو جس شخص نے اس سے مندر میں ملاقات کرنے کا وعدہ کیا تھا وہ نہیں آیا تھا۔ دوسرے اس کو سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ بوڑھے کی باتوں کا یقین کرے یہ نہ کرے۔ وہ سوچنے لگا کہ میں ایک پڑھا لکھا بلکہ اچھا خاصا عالم فاضل آدمی ہوں، مجھے کسی امیر خاندان کی خوب صورت اور مہذب لڑکی نہ سہی، کوئی عام خاندان کی تعلیم یافتہ لڑکی تو یقیناً مل سکتی ہے۔ بلکہ ذرا کوشش کروں تو فنون لطیفہ کی دلدادہ کسی لڑکی سے میری شادی ہو سکتی ہے۔

ان خیالات کے ساتھ جب وہ اس میلی عورت کی چھاتی سے چمٹی ہوئی میلی سی لڑکی کا تصور کرتا تو اسے وحشت ہونے لگتی۔ اس لڑکی سے شادی کا خیال ہی اسے پاگل کر دینے کے لئے کافی تھا۔ مارے پریشانی کے وہ ساری رات نہیں سو سکا۔

اگلی صبح اس نے اپنے نوکر کو ساتھ لیا اور مارکیٹ میں پہنچ گیا۔ وہ میلی عورت مارکیٹ میں موجود تھی اور بچی اس کی چھاتی سے لگی ہوئی تھی۔ وائی کو نے اس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے نوکر سے کہا۔

''اگر تم اس بچی کو جان سے مار ڈالو تو میں تمہیں منہ مانگا انعام دوں گا۔''

تھوڑی سی پس و پیش کے بعد نوکر اس کام پر آمادہ ہو گیا اور ایک چاقو لے کر مناسب موقع کا انتظار کرنے لگا۔ جب اسے موقع ملا تو اس نے چاقو نکالا اور بچی پر وار کیا۔ اور ساتھ ہی بھاگ نکلا۔ بچی چیخنے چلانے لگی اور عورت نے ''خون! خون!'' کا شور مچا دیا۔ مارکیٹ میں افراتفری سی پھیل گئی۔ اور اس افراتفری سے فائدہ اٹھا کر وائی کو اور اس کا نوکر بڑی آسانی سے وہاں سے بھاگ جانے میں کامیاب ہو گئے۔

سرائے میں پہنچ کر وائی کو نے اپنے نوکر سے پوچھا۔ ''کیا تم نے اس کا کام تمام کر دیا تھا؟''

''نہیں جناب۔'' نوکر نے جواب دیا۔ ''میں جب چاقو کھول کر اس کا نشانہ لئے اس کی طرف لپکا تو یکا یک وہ بچی ایک طرف کو مڑ گئی۔ میرا خیال ہے کہ میرا چاقو اس کی کنپٹی کی طرف لگا ہے۔''

وائی کو نے صورت حال کو سمجھتے ہوئے شہر سنگ چینگ سے خاموشی کے ساتھ چلے جانے میں ہی خیریت جانی وہ وہاں سے رخصت ہو گیا اور پھر جلد ہی یہ واقعہ بھی اس کے دماغ سے نکل گیا۔

اپنی شادی کی کوششوں میں ناکامی سے دل برداشتہ ہو کر وائی کو نے شادی کے متعلق سوچنا ہی چھوڑ دیا اور اپنی توجہ دوسرے معاملات کی طرف مبذول کی۔

تین سال بعد کی بات ہے کہ بالکل اتفاقی طور پر اور بعض احباب کی کوششوں سے اس کی نسبت تان خاندان کی ایک لڑکی سے طے پا گئی۔ لڑکی بہت خوب صورت تھی اور تعلیم یافتہ بھی۔ جس نے بھی اس کے متعلق سنا، وائی کو کو خوش قسمتی پر اسے مبارک باد دی۔ وائی کو نے بھی اس شادی کے لئے زور و شور سے تیاریاں شروع کر دیں۔ لیکن اچانک ایک صبح اسے خبر ملی کہ اس کی منگیتر نے خودکشی کر لی ہے۔ وہ کسی اور نوجوان کی محبت میں مبتلا تھی۔

دو سال تک پھر وائی کو نے شادی کے متعلق سوچنے کی بھی ہمت نہیں کی۔ اب اس کی عمر اٹھائیس سال ہو چکی تھی اور وہ اچھے خاندان کی کسی خوب صورت، مہذب اور شائستہ لڑکی کو اپنی بیوی بنانے کا ارادہ تقریباً ترک کر چکا تھا کہ ایک کسان کی لڑکی اس کی زندگی میں داخل ہوئی۔

ہوا یوں کہ ایک سفر کے دوران اس کا گزر ایک گاؤں کے قریب سے ہوا۔ گاؤں کے مندر کے پاس اس نے ایک کسان کی لڑکی کو دیکھا اور لڑکی نے اسے۔ دونوں ایک دوسرے پر ہزار جان سے عاشق

ہو گئے۔ وائی کو اپنا سفر منقطع کر کے اسی گاؤں میں ٹھہر گیا۔ ذرا سی بھاگ دوڑ کے بعد ان دونوں کی منگنی ہوگئی۔ اور وائی کو شادی کے لئے ریشمی ملبوسات اور دیگر اشیاء کی خریداری کرنے کے لئے قریبی شہر چلا گیا۔ جب وہ واپس آیا تو اسے معلوم ہوا کہ اس کی منگیتر سخت علیل ہوگئی ہے۔ وائی کو اس کی صحت یابی تک انتظار کرنے کے لئے تیار تھا لیکن لڑکی کی علالت طول پکڑتی گئی۔

ایک سال بعد یہ حال ہوگیا کہ اس بے چاری کی صورت بھی پہچانی نہیں جاتی تھی۔ اس کے سر کے تمام بال جھڑ گئے تھے اور اس کی خوب صورت کٹورا سی آنکھیں تقریباً بے نور ہو چکی تھیں۔ اس حالت میں خود اس لڑکی نے ہی وائی کو کی بیوی بننے سے انکار کردیا، اس حالت میں وہ اپنے آپ کو وائی کو کے قابل نہیں سمجھتی تھی۔ وائی کو ایک بوجھل دل کے ساتھ وہاں سے چلا آیا۔

کئی سال اور گزر گئے۔ پھر بالکل اتفاقی طور پر وائی کو کی نسبت ایک لڑکی سے قرار پا گئی۔ لڑکی نہ صرف خوب صورت تھی بلکہ اسے علم وادب اور فنون لطیفہ سے بھی گہری وابستگی تھی۔ وائی کو خود بھی علم وادب کا دلدادہ اور فنون لطیفہ کا شیفتہ تھا اس لحاظ سے دونوں کا جوڑ ہر طرح سے موزوں تھا۔ کوئی رقیب بھی ان کے درمیان حائل نہیں تھا۔ اس لئے دونوں کی منگنی بڑی آسانی سے ہوگئی۔ شادی کی تیاریاں زوروں پر تھیں کہ شادی کی تاریخ سے صرف تین روز پہلے فرش پر چلتے ہوئے اس کا پاؤں پھسل گیا۔ قریب ہی ایک بھاری سل پڑی تھی وہ گری تو اس کا سر اس سل سے جا ٹکرایا اور وہ مرگئی۔

یہ وائی کو کے لئے انتہا تھی۔ اب اس نے شادی اور عورت کے متعلق سوچنا بالکل ہی چھوڑ دیا اور اپنی تمام توجہ اپنے سرکاری فرائض پر منعطف کردی۔ اس وقت وہ شیانگ چو میں ایک مجسٹریٹ کے ماتحت کام کر رہا تھا۔ صبح سے شام تک وہ اپنے کام میں جتا رہتا اور بھولے سے بھی شادی کرنے کا خیال دماغ میں نہ لاتا۔

مجسٹریٹ جس کا نام وانگ تائی تھا اس کی محنت فرض شناسی اور کام کی لگن سے بہت متاثر ہوا۔ ایک روز اس نے وائی کو، کو اپنے پاس بلایا اور ایک تجویز اس کے سامنے رکھی۔ وہ اپنی بھتیجی کی شادی وائی کو سے کرنا چاہتا تھا۔

وائی کو کے لئے شادی کے بارے میں سوچنا بھی انتہائی تکلیف دہ تھا۔ اس نے کہا۔

’’صاحب! آپ اپنی بھتیجی کی شادی مجھ سے ہی کیوں کرنا چاہتے ہیں؟ مجھے تو شادی سے کوئی دلچسپی نہیں اور پھر میری عمر بھی تو اتنی زیادہ ہو چکی ہے۔‘‘

لیکن مجسٹریٹ تو اس کی کارکردگی سے متاثر تھا اس نے وائی کو کی ایک نہ سنی۔ وائی کو اس کا ماتحت تھا اور ماتحتی کے دباؤ میں آ کر بالآخر اس نے اس شادی پر آمادگی ظاہر کردی لیکن دلی طور پر اسے کوئی خوشی نہیں تھی اس لئے اس نے اپنی ہونے والی دلہن کو شادی سے پہلے ایک نظر دیکھنے کی بھی خواہش نہیں کی۔ تاہم شادی کے بعد جب اس نے اپنی بیوی کو دیکھا تو اسے ایک گونہ

عرض حال

پروفیسر صاحب کلاس کو پڑھا رہے تھے۔ سامنے کی میز پر بیٹھا ہوا ایک طالب علم ادھر ادھر دیکھ رہا تھا۔ پروفیسر نے انگلی سے اس کی طرف اشارہ کیا اور بولے۔

’’مجھے یقین ہے کہ تم غور سے میرا لیکچر نہیں سن رہے ہو۔‘‘

طالب علم نے پروفیسر کی طرف دیکھا اور بولا۔

’’بالکل درست جناب۔ اگر غور سے سن رہا ہوتا تو باقی سب کی طرح سو گیا ہوتا۔‘‘

(عمران حمید۔ دیپالپور)

اطمینان ہوا۔ وہ نوجوان تھی اور کسی قدر خوب صورت بھی کہی جاسکتی تھی۔ اور پھر وہ اسی کے لئے ایک اچھی خانہ دار عورت بھی ثابت ہوئی۔ یہ بات اس کے لئے اور بھی تسکین اور اطمینان کا باعث تھی۔

وہ اپنے بال ہمیشہ ایک خاص انداز میں بنائے رکھتی تھی جس سے اس کی دائیں کنپٹی پورے طور پر چھپ جاتی تھی، بال بنانے کا یہ انداز اگرچہ دلکش تھا لیکن وائی کو یہ سوچ کر حیران ہوتا تھا کہ عورتیں موقع محل کے مطابق اپنے بالوں کی آرائش کے انداز بدلتی رہتی ہیں لیکن اس کی بیوی نے جیسے ایک ہی انداز ہمیشہ کے لئے اختیار کرلیا تھا۔ آخرایک دن اس نے پوچھ ہی لیا۔

''یہ تم اپنے بال ہمیشہ ایک ہی طرح سے کیوں بنائے رکھتی ہو؟ میرا مطلب ہے کہ جب میں دیکھتا ہوں، تمہارے بال چہرے کے ایک طرف گرے نظر آتے ہیں۔''

اس کی بیوی نے اپنے گھنے بالوں کو اوپر اٹھایا اور اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

''لو دیکھو!''

وائی کو نے دیکھا اور حیران رہ گیا۔ اس کی دائیں کنپٹی پر ایک مندمل شدہ زخم کا گہرا نشان تھا۔ اس نے کہا۔

''یہ زخم کیسے آیا تمہیں؟''

''یہ زخم اس وقت کا ہے جب میں تین سال کی تھی۔ میرے والد اپنے سرکاری فرائض انجام دیتے ہوئے وفات پاگئے تھے اور میری ماں اور بھائی کا انتقال بھی اسی سال ہوگیا تھا میری پرورش میری انا نے کی تھی۔ ہمارا گھر شہر سنگ چینگ کے جنوبی دروازے کے پاس تھا اور میری انا مارکیٹ میں سبزی فروخت کیا کرتی تھی۔ ایک روز ایک چور نے نہ جانے کیوں، مجھے جان سے مار ڈالنے کی کوشش کی۔ ہم کچھ نہیں سمجھ سکے کہ یہ کیا ماجرا تھا کیونکہ ہمارے ساتھ کسی کی دشمنی نہیں تھی۔ وہ چور تو اپنے ارادے میں کامیاب نہیں ہوسکا لیکن اس کے چاقو کے وار سے میری دائیں کنپٹی پر ایک گہرا زخم آیا جس کا نشان اب تک موجود ہے، اسی نشان کو چھپانے کے لئے میں نے بال بنانے کا یہ انداز اپنا رکھا ہے۔''

''کیا تمہاری انا تقریباً اندھی تھی۔''

''ہاں۔ لیکن آپ کو کیسے معلوم ہوا؟''

''وہ چور میں تھا۔ کتنی عجیب بات ہے۔ قسمت کا لکھا بالکل اسی طرح پورا ہوکر رہا ہے جس طرح اس بوڑھے نے بتایا۔''

اور پھر وائی کو نے اپنی بیوی کو اس پراسرار بوڑھے سے ملاقات کی داستان سنائی جو چودہ سال پیشتر ہوئی تھی اس کی بیوی نے اسے بتایا کہ ''جب وہ چھ سال کی ہوئی تو اس کے چاچا نے اسے ڈھونڈ نکالا تھا اور پھر اپنے ساتھ شیانگ چو لے آیا تھا جہاں اس کا اپنا خاندان رہائش پذیر تھا۔ تب سے وہ شیانگ چو میں ہی تھی۔''

تب ان دونوں کو معلوم ہوگیا کہ ان کا سنجوگ آسمانی سنجوگ ہے۔ اس انکشاف کے بعد دونوں ایک دوسرے کو اور بھی زیادہ والہانہ طور پر چاہنے لگے۔

آگے چل کر ان کے ہاں ایک لڑکا پیدا ہوا جس کا نام انہوں نے کن رکھا۔ یہ لڑکا بڑا ہوکر تائی یوان کا مجسٹریٹ بنا اور اس کی وجہ سے اس کی ماں کو ایک اعزازی خطاب دیا گیا۔

یہ بات تو بعد کی ہے لیکن وائی کو کی شادی کے کچھ دن بعد ہی وائی کو کی اس پراسرار بوڑھے سے ملاقات کی کہانی شہر سنگ چینگ کے مجسٹریٹ تک جا پہنچی۔ جب اسے اپنے شہر میں پیش آنے والے اس عجیب وغریب واقعہ کا علم ہوا تو اس نے اس سرائے کا نام، جس میں وائی کو ٹھہرا تھا۔ ''سنجوگ سرائے'' رکھ دیا۔ یہ سرائے آج بھی موجود ہے اور چین کی قدیم ترین سرائے میں شمار ہوتی ہے یہ اور بات ہے کہ پھر کسی اور شخص کی ملاقات اس پراسرار بوڑھے سے نہیں ہوئی۔



پراسرار جزیرہ

ایس امتیاز احمد - کراچی

صدیوں سے دنیا میں عجیب عجیب ناقابل یقین اور ناقابل فراموش انکشافات ہوتے رہتے ہیں، انہی انکشافات میں سے جب اس سوچ کا انکشاف ہوا تو لوگوں کی عقل حیران رہ گئی مگر پھر قدرت کا اصل قانون جب سامنے آیا تو......

ذہن سے برسوں محو نہ ہونے والی اپنی نوعیت کی دل گرفتہ سوچ کے افق پر سکتہ بیٹھاتی کہانی

میں اس بدقسمت جہاز کا واحد خوش قسمت مسافر ہوں جو اٹھارہ ماہ قبل سمندر کی ہولناکی کا شکار ہوا تھا۔ جہاز پر مسافروں کی تعداد کا علم میرے علاوہ کسی اور کو نہیں ہوسکتا۔ کیونکہ جہاز کا کپتان میرا عزیز دوست تھا اور میرا بیشتر وقت اس کے ساتھ ہی گزرتا تھا جب اچانک جہاز ایک تنکے کی طرح اچھل کر زیر سمندر کسی گلیشیر سے ٹکرایا تو میں نے ایسا ہولناک منظر دیکھا جس کا اظہار الفاظ میں ممکن نہیں ہے۔ حادثہ اس قدر اچانک اور آناً فاناً ہوا تھا کہ احتیاطی تدابیر سے پہلے ہی جہاز کا پچھلا حصہ نصف سے زیادہ سمندر میں ڈوب گیا اور چشم زدن میں عرشے کی ہر چیز لڑھک کر سمندر میں جا گری۔

بھاری چیزوں کے لڑھکنے سے بہت سے بدنصیب مسافر زخمی ہوگئے اور ان کے رہے سہے ہوش و حواس بھی گم ہوگئے۔

میرا دوست کپتان بھی اس ناگہانی حادثے سے حیران اور سراسیمہ ہوگیا لیکن اس کے گزشتہ تجربات اسی وقت کام آئے۔ اس نے فوراً ایک جہازی ملازم کی مدد سے حفاظتی کشتی کو سمندر میں اتار دیا۔ میں اپنی زندگی کے لئے ان دونوں کا آج تک احسان مند ہوں۔ اگر وہ دونوں بروقت اقدام میں ذرا بھی تساہل کرتے تو شاید جہاز کے اور مسافروں کی طرح میں بھی گہرے سمندر میں آبی جانوروں کی غذا بن چکا ہوتا۔

حفاظتی کشتی میں سب سے پہلے کودنے والا شخص جہاز کا ملاح تھا۔ اس کے بعد کپتان نے مجھے تقریباً دھکا دیا تو میں افراتفری کے عالم میں کشتی کے اندر گرا۔ میرے بعد کپتان کشتی میں کودا۔ ایک چوتھے آدمی کو بھی ہم نے کودتے دیکھا مگر وہ کودتے وقت گھبرا گیا تھا کیونکہ وہ توازن برقرار نہ رکھ سکا پہلے تو وہ جہاز کی دیواروں سے ٹکرایا پھر ایک رسے سے الجھ کر اس نے پلٹا کھایا اور تیر کی طرح سمندر میں گیا۔ ہم نے چند ثانیے اس کے ابھرنے کا انتظار کیا مگر وہ نہ ابھرا۔ ہم وہاں زیادہ دیر رک بھی نہیں سکتے تھے کیونکہ ہمارے اختیار میں بھی نہ تھا۔

تیز موجیں اور ہوا کے جھکڑ ہمیں ادھر سے ادھر لئے پھر رہے تھے۔ جائے حادثہ سے دو گز کے فاصلے پر ہمیں ایک اور مقامی کشتی نظر آئی جس میں بہت سے لوگ تقریباً ٹھنسے ہوئے تھے، جان بچانے کے لئے گنجائش سے زیادہ لوگوں نے کشتی میں پناہ لی تھی وہی ہوا جس کا خدشہ تھا۔ وہ حفاظتی کشتی جو ہماری کشتی سے بڑی تھی، ایک جگہ جا کر چکرائی۔ مسافروں نے پریشانی میں ادھر ادھر پاؤں مارے مگر ان میں سے شاید کوئی بھی کشتی


KHURRAM
2008

چھوڑنا نہیں چاہتا تھا۔ ہر شخص کو اسی کشتی میں اپنی زندگی نظر آرہی تھی۔ ہمارے دیکھتے ہی دیکھتے وہ کشتی غرق ہوگئی۔

ہماری اپنی کشتی بہت چھوٹی تھی۔ ہمارے پاس خوردونوش کا بھی ذخیرہ نہ تھا۔ دوسرے دن سمندر کا غصہ ٹھنڈا ہوا اور کشتی جو پہلے ہچکولے کھا رہی تھی، پرسکون انداز میں چلنے لگی۔ ہم تینوں بالکل خاموش تھے۔ کھانے پینے کا سامان ہمارے پاس نہ تھا۔ امداد پہنچنے کا کوئی آسرا نہیں تھا اور نقاہت کے مارے ہمیں ہاتھ پاؤں مارنے کی بھی سکت نہ تھی۔ سورج کی تیز تیز کرنیں ہمارے جسموں میں تیر کی طرح چبھ رہی تھیں۔

تیسرے دن ہمارے جسم تڑخ گئے اور حلق میں کانٹے پڑنے لگے۔

اسی دن کپتان نے بے حد مردہ اور تھکی ہوئی آواز میں مجھ سے کہا۔ ''ہم تینوں میں سے ایک کو دو کے لئے قربانی دینا ہوگی۔''

میں اور جہاز کا ملاح دونوں اسے دیکھنے لگے۔ ایسے موقعے پر کسی کو کیا قربانی دینی ہوگی! یہ بات ہماری دونوں کی سمجھ میں نہیں آئی تھی۔

''ہم قرعہ اندازی کرتے ہیں جس کا نام نکلے گا، باقی دو اسے ذبح کرکے......''

کپتان نے بات پوری بھی نہ کی تھی کہ میرا منہ غصے سے سرخ ہوگیا۔ ''نہیں!'' میں نے مخالفت کی۔ ''بہتر ہے کہ ہم شارک مچھلیوں کا لقمہ بن جائیں۔'' میں اس وقت تک انسانی قدر اور انسانی خون کی عظمت کا قائل تھا۔

میں نے تو اپنے دوست کپتان کا کہا ماننے سے انکار کردیا تھا مگر جہاز کا ملاح اس کی تجویز پر فوراً راضی ہوگیا۔ اس کے بعد تقریباً بارہ گھنٹے بے حد اضطراب میں گزرے۔ میں نے چاقو ہاتھ میں لے لیا تھا۔ ملاح کا خیال تھا کہ مجھے ذبح کردیا جائے اور کپتان بہرصورت قرعہ اندازی پر اڑا ہوا تھا۔ اس صورتحال کا مقابلہ کرتے کرتے میرے اعصاب جواب دے گئے اور میں جو کچھ دیر پہلے انسانی خون کے تقدس کا قائل تھا۔ ان کے اس گھناؤنے کھیل میں شامل ہونے پر تیار ہوگیا۔

قرعہ ڈالا گیا۔ قدرت کی ستم ظریفی کہ اسی کا نام نکلا جو کچھ دیر پہلے کپتان کو اس بات پر تیار کررہا تھا کہ مجھے ذبح کردیا جائے یعنی ملاح۔

ملاح ہم دونوں سے زیادہ طاقت ور تھا۔ وہ اس قرعہ کو ماننے سے منکر ہوگیا۔ کپتان نے دفعتاً اس کے منہ پر مکا مارا۔ وہ بھی کپتان سے گتھ گیا۔ چھوٹی سی کشتی ایک طرف جھکی۔ دونوں ایک دوسرے سے اس طرح الجھے ہوئے تھے کہ انہیں سنبھلنے کا موقع بھی نہ ملا۔ دونوں لڑھک کر سمندر میں گر گئے۔ اب میں کشتی میں اکیلا تھا۔ ان دونوں میں سے کوئی بھی سطح آب پر نہ ابھرا۔

اس دن کے بعد کے دنوں کی گنتی مجھے یاد نہیں ہے۔ میں نیم بے ہوشی کے عالم میں کشتی پر پڑا ہوا تھا۔ میں نے اسی عالم میں محسوس کیا کہ کوئی مجھ پر جھکا ہوا ہے۔ ایک عام انسانی چہرہ اور اس کے عقب میں ذرا بھیانک قسم کا غیر انسانی قسم کا چہرہ تھا۔ پھر کوئی کسیلی چیز میرے حلق میں انڈیل دی گئی۔

میں کب تک دنیا ومافیہا سے بے خبر رہا۔ مجھے اس کا صحیح طور سے علم نہیں ہے مگر مجھے ذرا سا ہوش آیا تو میں نے محسوس کیا کہ میں کسی جہاز کے کیبن میں ہوں۔ بحری جہاز پر سفر کرنے کا تجربہ رکھنے والے جانتے ہیں کہ سمندر میں جہاز ایک خاص قسم کے ہچکولے لیتا ہے جس کا اثر جہاز کی تمام اشیاء پر پڑتا ہے۔

میری آنکھ کھلی تو ایک غیر جذباتی اور سبز رنگ کی آنکھوں والا چہرہ میرے اوپر جھکا ہوا تھا۔

''کیسی طبیعت ہے؟'' جو شخص میرے اوپر جھکا ہوا تھا اس نے بڑے سپاٹ لہجے میں پوچھا۔

''ٹھیک ہوں۔'' مجھے اپنی آواز سن کر احساس ہوا کہ اس میں نقاہت کا دور دور تک پتا نہیں۔ دوسرا احساس مجھے یہ ہوا کہ میں جسمانی طور پر بھی توانا ہوں۔

''تم غالباً کسی بدقسمت جہاز کے مسافر تھے۔ ہم نے تمہیں ایک کشتی میں ساکت وصامت تیرتے دیکھا

ہا۔" سبز آنکھوں والے نے حسب دستور بے حد سپاٹ لہجے میں کہا۔ اسی لمحے مجھے چھت کے اوپر کسی کے بھاگنے اور عجیب سی چیخ کی آواز سنائی دی۔ عجیب بھیانک سی آواز تھی مگر آواز میں ایسی لرزش ضرور تھی جس نے میرا دل دہلا دیا تھا۔

میرے ہمدرد نے بے چینی سے پہلو بدلا۔ ایک لمحہ کے لئے اس کی توجہ ادھر گئی مگر دوسرے لمحے اس نے خود کو قابو میں رکھتے ہوئے کہا۔ "تمہارا کیا نام ہے؟"

"لیونارڈ!" میں نے جواب دیا۔ اسی لمحے دوبارہ وہ مکروہ آواز سنائی دی۔ اس بار اس کے ساتھ ساتھ بہت سے ملاحوں کی چیخ و پکار بھی شامل تھی۔ میرے ہمدرد نے بے چینی سے کان لگا کر آواز سنی۔ یہ سب شور و غل تین چار منٹ میں ختم ہوگیا۔ ایک سناٹا سا چھا گیا۔ اور پھر اچانک کتوں کے غرانے کی آواز سنائی دی۔ ایسا لگتا تھا جیسے پچاس ساٹھ کتے ایک ساتھ غرا رہے ہوں۔

"کم بخت" میرا معالج یہ کہتا ہوا اچانک اٹھا اور نہایت تیزی کے ساتھ کیبن سے نکل گیا۔ باہر وہ کسی کو ڈانٹ رہا تھا۔ ڈانٹ کے جواب میں کسی نے اپنی صفائی پیش کی، صفائی پیش کرنے والے کا مفہوم تو میں نے خوب سمجھا مگر اس کی آواز کانوں کے لئے غیر مانوس تھی اور لفظوں کی ادائیگی ایسی تھی جیسے کوئی یاد کر کے ایک ایک لفظ ادا کر رہا ہو۔

باہر میرے معالج اور غیر مانوس آواز کے درمیان گفتگو ہوتی رہی پھر ایسی آواز آئی جیسے فضا میں چمڑے کا چابک لہرایا ہو۔ اسی کے ساتھ ایک چیخ ابھری جو خوف اور اذیت سے بھرپور تھی۔

"پتا نہیں کیا پراسراریت ہے۔" میں نے دل میں سوچا۔ جانوروں کی آوازیں کتوں کی غراہٹ، چابک کی آواز اور میرا ہمدرد، سب چیزیں اپنے اندر ایک خوفناک اسرار لئے ہوئے تھیں۔ اور میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ میں ان تمام چیزوں کو کس خانے میں رکھ کر فیصلہ کروں۔ آخری آواز چمڑے کے چابک کی آواز اور ساتھ ہی ایک چیخ نے میرے ذہن کو جھنجھوڑ کر رکھ دیا تھا۔

معلوم نہیں کس ظالم نے کس بے چارے کو چمڑے کے چابک سے سزا دی ہے۔ مگر میرے اس سوال کا جواب جلد مل گیا۔ جب میرا معالج سرخ چہرہ لئے اور بائیں ہاتھ پر چمڑے کا چابک لپیٹے کیبن میں دوبارہ داخل ہوا۔ چابک بالکل اسی قسم کا تھا جیسا ہمارے تانگے والے گھوڑوں پر استعمال کرتے ہیں۔

میرے معالج کا چہرہ غصے سے سرخ ہو رہا تھا۔ اس کی سبز رنگ کی آنکھوں میں وحشت سی چھائی ہوئی تھی وہ دھم سے کرسی پر گر پڑا۔ اور تیز تیز سانس لینے لگا۔ کوئی پانچ منٹ بعد کیبن کا دروازہ دوبارہ کھلا اور بے ڈھنگے جسم والی ایک آدمی نما کوئی شے اندر داخل ہوئی۔ آدمی نما اس لئے کہ اس کے ہاتھ پاؤں، ناک منہ اور آنکھیں سب انسانی تھیں مگر جسم کا ہر حصہ غیر متناسب تھا۔ اس کے چہرے پر خوف اور اذیت کے آثار تھے۔ وہ چپ چاپ اندر آیا اور ایک کونے میں کھڑا ہوگیا۔ بار بار وہ میرے معالج کے اس ہاتھ کو گھور رہا تھا۔ جس میں چابک موجود تھا۔ اس کی خوفزدہ صورت سے میں نے اندازہ لگا لیا کہ جو مظلوم چابک سے پیٹا گیا تھا۔ وہ یہی تھا بے ڈھنگے جسم اور بدقطع لباس میں وہ مجھے زمین کی مخلوق نہیں معلوم ہو رہا تھا۔ جب وہ بولا تو مجھ پر دوسرا راز منکشف ہوا۔ غیر مانوس کی آواز! یہ وہی تھا جس سے میرا معالج تھوڑی دیر پہلے سوال جواب کر رہا تھا۔

"سب مجھے تنگ کر رہے تھے۔" اس نے ایک ایک لفظ توڑ کر کہا۔

"خبیث!"

میرا ہمدرد شاید مجھ کو بھول گیا اور اس آنے والے بدوضع شخص نے تو جیسے مجھے دیکھا ہی نہیں تھا۔ میں نے بے چینی سے کروٹ بدلی تو دونوں کی نگاہ مجھ پر رکی۔ میرا ہمدرد تو خاموش رہا مگر آنے والے آدمی نما شخص نے مجھے خوف اور ندامت سے دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں سرخی مائل رنگ جھلکا اور ایک گھبراہٹ تھی۔

"جاؤ، وہاں رہو! یہاں کیا کر رہے ہو۔"

"وہ مجھے قریب ہی نہیں آنے دیتے۔"

''قریب نہیں آنے دیتے! مگر میں کہتا ہوں کہ جاؤ۔''

وہ جواب میں کچھ کہنا چاہتا تھا مگر اس کے چہرے سے مجھے ایسا لگا جیسے کوئی طالب علم کچھ یاد کرنا چاہتا ہو اور اسے یاد نہ آ رہا ہو۔ اچانک اس کے چہرے پر غصے کے آثار ابھرے اور وہ مڑ کر جھلاہٹ کے انداز میں کیبن سے نکل گیا۔

میرا معالج پوری توجہ سے میرے معالجے میں مصروف تھا۔ چھٹے دن میں خود کو چاق و چوبند محسوس کر رہا تھا، ساتویں دن میں صبح ہی صبح اٹھ کر کیبن سے باہر نکلا۔ کیبن میں پڑے پڑے اوپر سے آنے والی آوازیں سن کر مجھے اندازہ ہو گیا تھا کہ سب آوازیں عرشے کی طرف سے آتی ہیں۔ عرشے پر جانے کے لئے رسی کی سیڑھی لٹکی ہوئی تھی۔ میں سیڑھی کے ذریعے عرشے پر پہنچ گیا۔ عرشے پر جانے کا ایک سبب یہ بھی تھا کہ میں وہاں سے پورے جہاز کا جائزہ لے سکتا تھا مگر عرشے پر جاتے ہی میں پاگل سا ہو گیا۔ اتنا گندا عرشہ میں نے کسی ماہی گیری کی کشتی کا بھی نہ دیکھا تھا۔ وہاں عجیب سڑاندسی پھیلی ہوئی تھی۔ وہاں بڑے بڑے پنجرے موجود تھے۔ بعض میں کتے بند تھے بعض میں خرگوش۔ ایک پنجرے میں ایک قوی الجثہ تیندوا اٹھا سا ہوا تھا۔

میں حیرانی سے اس چڑیا گھر کو دیکھ رہا تھا۔ سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ یہ جہاز اتنے جانوروں کو لے کر کہاں جا رہا ہے۔ ویسے جہاز بہت بڑا نہ تھا۔ وہ ایک بے حد چھوٹا اور معمولی سا جہاز تھا۔ ان جہازوں کی طرح جو بڑے سمندروں میں ساز و سامان کو ایک جزیرے سے دوسرے جزیرے تک لے جانے کے کام میں لائے جاتے ہیں۔ تاہم جہاز مضبوط اور شاندار معلوم ہو رہا تھا۔ جہاز کی دوسری چیزوں کو دیکھ کر اندازہ ہوتا تھا کہ اس کی بناوٹ میں صفائی اور نفاست کا خصوصی خیال رکھا گیا تھا۔ مگر اس نفیس قسم کے جہاز پر جانوروں کے پنجرے اور بو عجیب سی لگ رہی تھی۔ میری نظر پنجروں سے گزرتی ہوئی عرشے کی انتہائی سرے پر جنگلے سے ٹکرائی جہاں وہ آدمی نما شخص بڑے مزے سے لہروں کو دیکھ رہا تھا۔ اتنے میں کتوں نے غرانا شروع کر دیا۔ میرے قدموں کی چاپ پر تو اس نے کوئی توجہ نہیں دی تھی مگر کتوں کے غرانے کی آواز پر وہ مشینی انداز میں مڑا۔

میں نے دیکھا کہ اس کے چہرے پر خوف کے شدید ترین آثار پیدا ہو گئے تھے۔ مجھے دیکھ کر اس نے ہاتھ کے اشارے سے کچھ کہا اور ساتھ ہی ایک عجیب سی آواز نکالی جیسے کوئی جنگلی جانور اس وقت نکالتا ہے جب اسے اچانک کسی نئی صورت حال سے واسطہ پڑ جائے۔ کئی روز کی بیماری اور کیبن میں پڑے پڑے میرے اعصاب کمزور ہو گئے تھے۔ کوئی اور وقت ہوتا تو میں عرشے پر کچھ مزید وقت گزار کر ہر چیز کا بغور جائزہ لیتا مگر اس کی اچانک ڈپٹ سے نروس ہو گیا اور فوراً نیچے اترنے کے لئے پلٹ پڑا۔ جب میں ہاں پہنچا جہاں تھوڑی دیر پہلے رسی کی سیڑھی لٹکی ہوئی تھی تو حیران رہ گیا۔ کسی نے وہ سیڑھی وہاں سے ہٹالی تھی۔

میں نے گھبرا کر نیچے جھانکا۔ میری گھبراہٹ دیکھ کر دو، تین ملاح نیچے ایک جگہ جمع ہو گئے۔ جو ادھر ادھر کام کر رہے تھے اور مجھے آتے وقت نظر نہیں آئے تھے۔ ملاح مجھے حیرت سے تکنے لگے۔

''ارے یہ تو وہ مسافر ہے جسے ہم نے بچایا تھا۔'' ایک ملاح نے مجھے پہچانتے ہوئے کہا۔

یہ سنتے ہی دوسرے ملاحوں کے چہروں پر مایوسی کی لہر دوڑ گئی جیسے میں نے نمودار ہو کر انہیں کسی دلچسپ کھیل سے محروم کر دیا ہو۔

جس ملاح نے مجھے پہچانا تھا، اس نے رسی کی سیڑھی اوپر اس طرح پھینکی کہ وہ فوراً سیڑھی کے لئے بھی عرشے کے غیر انسانی و بدبودار ماحول میں رہنا پسند نہ کرتا۔ میں بغیر سیڑھی بھی نیچے کود پڑنے سے دریغ نہ کرتا۔

میں جلدی جلدی سیڑھی سے اترا۔ میرے پیچھے بد وضع آدمی نے بھی اترنا چاہا مگر کسی ملاح نے زور سے

یک لکڑی اس کی ٹانگوں پر ماری اور وہ۔ بے چارا بلبلاتا ہوا واپس چلا گیا۔ وہ خوفزدہ نگاہوں سے پیچھے دیکھنے لگا۔ اوپر کتوں نے ایک بار پھر زور زور سے بھونکنا اور غرانا شروع کردیا تھا۔ بدوضع آدمی کے لکڑی مار کر اور اس کے بلبلانے کی آواز سن کر سب ملاح یکبارگی خوشی سے چیخے۔ ان کی آوازوں میں ایسی مسرت تھی جیسے آوارہ بچے کسی کتے کے پلے کو پتھر مار کر اور اس کی چیاؤں چیاؤں سن کر چیختے چلاتے ہیں۔

میں نیچے اتر کر ملاحوں کی خوش طبعی پر غور کررہا تھا اور وہ سب زور زور سے ''کالا شیطان، کالا شیطان'' چلا رہے تھے اور کالا شیطان کتوں کی غراہٹ سے پریشان جھانک جھانک کر رحم طلب نظروں سے سب کو دیکھ رہا تھا۔

اسی شور وغل میں مجھے ایک آواز سنائی دی۔

''چپ رہو۔''

میں نے مڑ کر دیکھا۔ ایک سفید بالوں والا شخص جو اپنے لباس سے جہاز کا کپتان معلوم ہورہا تھا۔ اپنی کمر پر ہاتھ رکھے کھڑا تھا۔

سب ملاحوں نے چپ ہوکر اسے دیکھا۔ کپتان کی نگاہ مجھ پر ٹھہر گئی۔

''یہ بھی کالے شیطان کا بھائی ہے۔'' اس کے لہجے میں تمسخر اور حقارت تھی۔

''مجھے کپتان کے رویے پر سخت حیرت تھی۔ میں احتجاج کرنے والا تھا کہ میرا معالج وہاں نکل آیا۔ میرے معالج کو دیکھ کر اوپر کالے شیطان نے شکایتی لہجے میں معلوم نہیں کیا کہا۔ میں تو کپتان کے رویے پر شش و پنج کا شکار تھا۔

''مسٹر کپتان۔'' میرے معالج نے غصے سے کہا۔ ''جب ہم کرایہ دے کر سفر کررہے ہیں تو تمہارے آدمیوں کو ہمارا خیال رکھنا چاہئے۔''

''خیال رکھنا چاہئے۔'' کپتان نے تمسخر سے کہا۔

''جانوروں کا خیال رکھوں! کالے شیطان کا خیال رکھوں!'' پھر کپتان نے میری طرف انگلی سے اشارہ کیا۔ اس خبیث کو بھی کالا شیطان بنادو۔''

''میرے معالج نے غصے سے ہونٹ چبائے۔ ''مسٹر کپتان!''

''تمہیں شرافت کا دامن نہیں چھوڑنا چاہئے۔''

''شرافت؟ شرافت کیا چیز ہوتی ہے۔ مسٹر فرٹ؟''

مجھے پہلی دفعہ اپنے ہمدرد معالج کا نام معلوم ہوا۔

فرٹ نے اس کے لہجے پر توجہ دیئے بغیر کہا۔ ''بس ایک دن کی بات اور ہے۔''

''ہاں ایک دن کی بات! مگر اس کمینے کا کرایہ بھی ادا کردینا۔''

کپتان نے اس بار مجھے کمینہ کے نام سے پکارا تھا۔

''شٹ اپ!'' میں غصے سے بے قابو ہوگیا اور یہ بھی بھول گیا کہ میں جہاز پر بے سہارا مسافر ہوں۔ میرے شٹ اپ کہنے پر کپتان آپے سے باہر ہوگیا اور اس نے میری سات پشتوں کو لاتعداد قسم کی مغلظات سے نواز ڈالا۔

فرٹ مجھے کھینچ کر کیبن میں لے گیا۔ کیبن میں بھی مجھے کپتان کی آوازیں سنائی دیتی رہیں۔ وہ کسی جزیرے میں فرٹ کے اس کے جانوروں، کالے شیطان اور مجھے اتارنے کے بارے میں چلا چلا کر اعلان کررہا تھا۔ میں نے اس وقت کی صورت حال دیکھ کر اس جزیرے کے بارے میں فرٹ سے کچھ پوچھنا مناسب نہیں سمجھا۔ میرے اور جزیرے کے درمیان شاید چوبیس گھنٹوں کا وقفہ باقی رہ گیا تھا۔

ان چوبیس گھنٹوں میں مجھے اچھی طرح علم ہوگیا کہ جہاز کا ایک ایک فرد میرے ہمدرد فرٹ، اس کے جانوروں اور اسی کے بدوضع ملازم کو سخت ناپسند کرتا ہے اور مجھے بھی نفرت سے اس لئے دیکھتا ہے کہ فرٹ ہی کے ایماء پر مجھے جہاز میں اٹھوایا گیا تھا۔ میں نے اپنی سی بہت کوشش کی کہ کسی طرح جہاز والوں سے تعلقات بڑھاؤں۔ میں صرف اپنے لئے ہی نہیں بلکہ اپنے

معالج اور اس کے ملازم کے لئے بھی فضا اور ماحول خوشگوار کرنا چاہتا تھا۔ میرے اندازے کے مطابق بے چارا ملازم تو گفت وشنید کے معاملے میں بالکل کورا تھا۔ رہا فرٹ تو اسے بھی زمانہ سازی کا فن نہیں آتا تھا۔ کپتان تو میری شکل بھی دیکھنے کا روادار نہیں تھا۔

اس کے تھرڈ اسسٹنٹ نے میری پیہم چاپلوسی پر رحم کھاتے ہوئے صرف اتنا ہی کہا۔ ''تم بھی اسی کے ساتھی ہو گے ورنہ وہ تمہیں مردہ حالت میں کیوں اٹھوا لیتا۔''

میں نے بہت کوشش کی مگر فرٹ کے کیبن میں اس کے ہی زیر علاج رہنے کی وجہ سے وہ میری طرف سے مشکوک تھے۔ وہ مجھ سے کسی قیمت پر بات کرنے کے لئے تیار نہیں تھے۔ میرا وجود انہیں اسی وقت تک جہاز پر منظور تھا جب تک فرٹ کی منزل نہیں آ جاتی۔ فرٹ کی منزل ایک جزیرہ تھا۔ مگر کیسا جزیرہ! یہ مجھے معلوم نہیں تھا۔ لاعلمی کے باوجود میں اسی کے ساتھ کسی جزیرے پر زندگی بسر کرنے کے لئے تیار نہیں تھا۔ وہ ایسا پراسرار شخص تھا کہ مجھے اس کی رفاقت میں دل ڈوبتا محسوس ہوتا تھا۔

شاید دوسرا پہر ہونے والا تھا جب دور کسی جزیرے کے آثار نظر آئے۔ ملازم جزیرے کو دیکھ کر ایسا خوش ہوا تھا جیسے وہ جنت کے قریب پہنچ گیا ہو مگر فرٹ کا چہرہ سپاٹ تھا۔ نہ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اسے خوشی ہے اور نہ وہ رنجیدہ معلوم ہوتا تھا۔ بس سپاٹ اور بے جان چہرے کے ساتھ وہ ساز وسامان بندھوانے میں مصروف تھا۔ اس نے اس بھاگ دوڑ میں یہ بھی نہ پوچھا کہ میں اس کے ساتھ اتروں گا یا جہاز پر رہوں گا۔ اس کے انداز سے معلوم ہو رہا تھا کہ وہ مجھے بھول ہی گیا ہے۔

جہاز، جزیرے سے ذرا دور رکا جہاز کو دیکھتے ہی چند کشتیاں جہاز سے آ لگیں۔ جن کو ہونق سے چند آدمی دیکھ رہے تھے۔ میرے دیکھتے دیکھتے ملاحوں نے بڑی بے دردی سے سارے پنجرے ان کشتیوں میں دھکیل دیئے۔ میں سارا تماشا خاموشی سے دیکھ رہا تھا۔ میں نے جھک کر دیکھا کہ فرٹ بھی جہاز سے لٹکی ہوئی رسی کی ایک سیڑھی سے ایک کشتی میں اتر رہا تھا۔

کسی نے میرے کندھے پر ہاتھ رکھا۔ میں مڑا۔ کپتان میرے سامنے کھڑا ہوا تھا۔

''ہیلو...... مسٹر شٹ اپ! تم بھی سدھارو! رخصت ہو جاؤ اپنے شیطانوں کے ساتھ!''

''اول تو میرا نام لیونارڈ ہے۔ دوئم یہ کہ......''

میں نے کہنا چاہا مگر اس نے میری بات کاٹ دی۔

''تمہارا نام صرف شٹ اپ ہے۔ مسٹر شٹ اپ۔ اب تو دو گیارہ ہو جاؤ!''

میں ہکا بکا ہو کر کپتان کی صورت دیکھنے لگا۔ ادھر فرٹ، کشتی پر بیٹھ کر روانہ بھی ہو چکا تھا۔ کوئی چھ کشتیاں تھیں۔ پانچ کشتیوں میں سامان لدا ہوا تھا اور ایک کشتی میں میرا دوست کسی اور کے ہمراہ بیٹھا ہوا تھا۔ میں حیران تھا کہ فرٹ کو کیا ہوا۔ اس نے جاتے وقت مجھ سے رخصت بھی نہ ہونا چاہا اور ادھر کپتان تھا کہ میرے لئے عذاب کے فرشتے کی صورت موجود تھا۔

''مگر وہ تو چلے گئے۔'' میں نے بے بسی سے کہا۔

''چلے گئے تو تم بھی جاؤ! کود و فوراً پانی میں! تیر کر جاؤ......!!'' اتنی دیر میں جہاز کے ملاح چاروں طرف جمع ہو گئے تھے۔ ان کی حرکات وسکنات سے بھی ظاہر ہو رہا تھا کہ انہیں بھی جہاز پر میرا وجود ناگوار ہے۔

''مگر مسٹر کپتان۔'' میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کپتان اور اس کے عملے کی ہمدردیاں کیسے حاصل کروں۔

''نو مسٹر! نو مسٹر کپتان، سب گیا جہنم میں!'' کپتان چلایا پھر اس نے ملاحوں کو حکم دیا۔ ''مسٹر شٹ اپ کو اٹھا کر پانی میں پھینک دو!''

میں چاہتا بھی تو مزاحمت نہ کر پاتا۔ وہ پندرہ بیس تھے اور میں تنہا۔ انہوں نے اسی بے دردی سے مجھے اٹھایا جس بے دردی سے تھوڑی دیر پہلے وہ جانوروں کے پنجرے اٹھا رہے تھے۔ میں نے ہاتھ پاؤں مارے کیونکہ اگر وہ مجھے پانی میں پھینکتے اور میں کوئی مداخلت نہ

کرتا تو میں سیدھا غوطہ لگا جاتا۔ ایسی صورت میں میرے زندہ ابھر کر آنے کے امکانات بہت کم تھے۔ میں ان کے ارادے میں حائل تو نہیں ہوسکا۔ البتہ یہ ضرور ہوا کہ ان کے دھکا دینے کے ساتھ ساتھ میں خود بھی کودنے کے لئے تیار تھا۔ ایک زوردار چھپاکا ہوا۔ شروع شروع میں تو مجھے یقین ہی نہیں آیا کہ ہوا کیا!

رفتہ رفتہ میرا دماغ اور ہوش و حواس کام کرنے لگے۔ میں نے جزیرے کی طرف تیرنا شروع کردیا۔ تھوڑی دیر کے بعد مڑ کر دیکھا تو خر دماغ کپتان والا جہاز دور چلا جارہا تھا اور دو کشتیاں میری طرف بڑھ رہی تھیں۔ فرٹ کو میں نے پہچان لیا۔ اسے شاید میری حالت پر رحم آگیا تھا۔ کشتی میرے قریب آئی اور دو ہاتھوں نے مجھے کشتی پر اٹھالیا۔ کشتی میں فرٹ کے علاوہ ایک بھورے بالوں والا شخص سفید قمیض اور کالی پتلون پہنے بیٹھا ہوا تھا۔ دو ملاح مسلسل چپو چلا رہے تھے۔ بھورے بالوں والے نے بے دلی سے مجھے دیکھا۔

''مسٹر فرٹ۔ کیا یہ شخص اب جزیرے پر رہے گا؟'' اس نے فرٹ سے پوچھا۔

''کیا کروں؟'' فرٹ کے لہجے میں ندامت اور شرمندگی تھی۔ ''مجبوری ہے سر! وہ تو اس کو پھینک ہی گئے۔''

بھورے بالوں والے نے ناگواری سے سر جھکالیا۔ فرٹ کی بے تعلقی اب میری سمجھ میں آگئی۔ دراصل وہ بھورے بالوں والے کی مرضی کے بغیر مجھے جزیرے پر لانا نہیں چاہتا تھا۔ مگر اتفاق سے صورت حال بدل گئی تھی۔ اب میں بھورے بالوں والے کی مرضی کے خلاف جزیرے کی طرف جارہا تھا۔

میں نے چپو چلانے والوں کو غور سے دیکھا۔ بڑے گھناؤنے چہرے تھے ان کے۔ وہ بھوری بھوری رنگت کے تھے۔ ان کے پورے بدن پر سفید سفید پٹیاں بندھی ہوئی تھیں۔ حتیٰ کہ ان کے ہاتھوں اور پیروں پر بھی سفید پٹیاں تھیں۔ انہوں نے سر پر سفید کپڑا اس طرح لپیٹ رکھا تھا جیسے کوئی بے ڈھنگے پن سے پگڑی باندھے ہو۔ ان کے جسم انسانی ہونے کے باوجود غیر متناسب تھے دھڑ عام انسانوں کی نسبت بڑا تھا اور ٹانگیں چھوٹی تھیں۔ صرف یہی نہیں بلکہ گھٹنوں کے نیچے مڑی ہوئی بھی تھیں۔ وہ انسانی شکل میں کوئی اور مخلوق معلوم ہوتے تھے میں ان تینوں بدہیئت جسموں کا جائزہ لیتا رہا۔ کشتی کنارے سے جا لگی۔ جزیرہ ڈھلوانی تھا۔ ڈھلان پر پتھروں کی ایک چوکور فصیل نظر آرہی تھی۔ اس فصیل کے اندر شاید گھر تھے۔ فصیل کے اندر سے دھواں اٹھ رہا تھا۔

ایک آدمی کنارے پر ہمارا منتظر تھا۔ اس کے ہاتھ غیر معمولی طور پر لمبے تھے۔ اس کے علاوہ اس کا سر بڑا سا اور بے ڈھنگا تھا۔ ہمیں دیکھ کر وہ ریت اڑا اڑا کر مضحکہ خیز حرکتیں کرنے لگا پھر اس جوکر اور عجیب الخلقت ملاحوں نے سامان اٹھا اٹھا کر کنارے پر رکھنا شروع کردیا۔ جب وہ سامان اٹھا اٹھا کر کنارے پر رکھ رہے تھے تو مجھ پر ایک اور بات منکشف ہوئی کہ ان کی ٹانگوں کی حرکت انسانوں جیسی نہ تھی ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ان کی ٹانگوں کے جوڑ غلط لگا دیئے گئے ہیں۔ وہ اکڑی اکڑی ٹانگوں سے چل رہے تھے۔ سفید بالوں والے نے میرے کندھے پر ہاتھ رکھ دیا۔ وہ میرا جائزہ لیتا رہا تھا اور میرے خیال کے مطابق میری توجہ ان آدمیوں کی طرف سے ہٹانا چاہتا تھا۔

''تم بن بلائے مہمان ہو مگر ہم تمہاری خاطر کرنے میں کوئی کسر نہ رکھیں گے۔'' اس نے یہ جملہ اس روکھائی سے کہا تھا کہ میں پہلے تو اس کا مفہوم غلط سمجھا مگر اس کی آنکھیں کہہ رہی تھیں کہ وہ جو کچھ کہہ رہا ہے ہمدردی سے کہہ رہا ہے۔

تھوڑی دیر کے بعد وہیں کنارے پر ہم لذیذ قسم کے بسکٹوں کے ساتھ چائے پی رہے تھے۔ چائے پینے کے دوران میری چھٹی حس نے مجھے چوکنا کردیا۔ مجھے محسوس ہوا جیسے بہت سی آنکھیں آس پاس کی جھاڑیوں کے پیچھے سے ہمیں دیکھے جارہی ہیں۔ وہ آنکھیں ہماری حرکات و سکنات کا تفصیلی جائزہ لینے میں مصروف ہیں۔ مگر میں لاکھ کوشش کے باوجود ان نادیدہ آنکھوں کو نہ

دیکھ سکا۔ میں تو ان آنکھوں کو محسوس کر رہا تھا مگر میرے دونوں میزبان بڑے مطمئن تھے۔ انہوں نے ایک بار بھی کسی قسم کا ردعمل ظاہر نہیں کیا حالانکہ ایک آدھ بار جھاڑیوں کے پیچھے پتوں کی چرمر اور درختوں کی ٹہنیوں کے ٹوٹنے اور چٹخنے کی آوازیں بھی سنائی دیں جو بھاری جسموں کے ادھر ادھر چلتے پھرنے کی وجہ سے پیدا ہوئی تھیں۔

ہم چائے پینے میں مصروف تھے اور عجیب الخلقت قسم کے ملازم ساز وسامان لاد لاد کر لے جا رہے تھے ان میں کالا شیطان بھی تھا۔ کالا شیطان جزیرے پر آ کر بہت مطمئن تھا۔ مگر اس نے کتوں کے پنجروں کی طرف جانے سے گریز کیا۔

وہ خرگوش کا پنجرہ اٹھائے جا رہا تھا کہ بھورے بالوں والے نے اسے حکم دیا۔

''خرگوش کو آزاد کردو!''

''کالے شیطان نے پنجرے کھول دیئے اور ننھے منے خرگوش اچھلتے کودتے جھاڑیوں میں غائب ہوگئے۔

''جاؤ نسل بڑھاؤ!'' بھورے بالوں والے نے پرمسرت لہجے میں کہا! اور پھر میری طرف دیکھ کر کہنے لگا۔

''کچھ دنوں سے جزیرے پر گوشت کی کمی ہوگئی تھی۔''

ساحل سے اونچائی پر بنا ہوا قلعہ بہت قریب معلوم ہوتا تھا مگر جب ہم نے چلنا شروع کیا تو مجھے معلوم ہوا کہ کنارے پر ناشتہ کرنا بہت ضروری تھا۔ میں تو کئی جگہ ہانپ ہانپ گیا۔ فرث بھی مضمحل دکھائی دے رہا تھا۔ مگر میرا دوسرا میزبان عمر رسیدہ ہونے کے باوجود بے حد چاق وچوبند اور پھرتیلا نظر آ رہا تھا۔ اس کے ملازم اس سے بھی زیادہ پھرتیلے تھے۔ وہ پنجروں کو اٹھائے تیز تیز قدموں سے ہم سے کہیں آگے آگے چل رہے تھے۔ مگر ان کی چال بے حد بے ڈھنگی تھی۔ ایسا لگتا تھا کہ انہیں اپنے پیروں پر مجبوراً چلنا پڑ رہا ہو۔ عجیب ٹیڑھی ٹیڑھی ٹانگیں تھیں۔ ہر لمحے ایسا لگتا تھا جیسے وہ چلتے چلتے گر پڑیں گے۔ یہ دوسری بات ہے کہ وہ کہیں لڑکھڑائے بھی نہیں۔

قلعہ کے قریب جا کر اندازہ ہوا کہ وہ سچ مچ ایک مضبوط قلعہ ہی تھا۔ مگر بہت زیادہ بڑا نہیں۔ ملازمین نے اس کے مضبوط آہنی دروازے کے باہر تمام پنجرے رکھ دیئے اور واپس آ گئے۔

جزیرہ کے پراسرار ماحول اور وہاں موجود سناٹے نے مجھے بے چین کرنا شروع کر دیا تھا۔ عجیب الخلقت ملازم تیزی سے لوٹ گئے تھے جیسے وہ اگر وہاں تھوڑی دیر مزید رکے تو ان پر قیامت ٹوٹ پڑے گی۔ اب وہاں ہم تین افراد ہی رہ گئے تھے یا پنجرے تھے جن میں موجود جانور بھی سہمے سہمے سے تھے معلوم نہیں یہ جزیرے کی فضا کا اثر تھا یا بھورے بالوں والے کی شخصیت کا تاثر تھا۔ میں خود بھی لرزش سی محسوس کر رہا تھا۔

''یہ بن بلائے مہمان کو کہاں رکھا جائے۔'' بھورے بالوں والے نے فرث کو مخاطب کیا۔ فرث نے متفکرانہ انداز میں سر ہلایا۔ دونوں کے چہروں پر فکر مندی کے آثار تھے۔ ان کے نزدیک میرے ٹھہرائے جانے کا مسئلہ بہت اہم مسئلہ تھا۔ میں نے استفہامیہ نظروں سے دونوں کو دیکھا۔

''بات یہ ہے کہ ہم قلعہ میں کسی تیسرے شخص کو جانے نہیں دیتے۔'' فرث نے کہا۔

''یہاں تک کہ ہمارے ملازم بھی قلعہ سے باہر رہتے ہیں۔'' بھورے بالوں والے نے وضاحت کی۔

میں سر ہلا کر رہ گیا۔ دونوں تھوڑی دیر سوچتے رہے، پھر فرث نے مسئلے کا حل تلاش کرلیا۔

''وہ دائیں طرف جو کمرہ ہے جس کا ایک دروازہ باہر کھلتا ہے اسے وہاں ٹھہرا دیا جائے۔''

''مگر وہ تو اس سے ملا ہوا ہے۔'' بھورے بالوں والے نے کہا۔ اس سے بھورے بالوں والے کی کیا مراد تھی! یہ بات، اس وقت تو میری سمجھ میں نہیں آئی مگر جب مجھے رہنے کے لئے کمرہ دکھایا گیا تو میں سب کچھ سمجھ گیا۔

اس کمرے کا پچھلا دروازہ قلعہ کے اندر کھلتا تھا۔ یہ دوسری بات ہے کہ وہ بند تھا۔ اس کے بند ہونے کا یقین، بھورے بالوں والے نے دروازے کو دھکا دے کر

دو بھی کیا۔ بند دروازے سے ایسی بو آ رہی تھی جیسی بارٹری سے آتی ہے۔

''یہ ہمارا کھانے کا کمرہ ہے۔'' فرٹ نے کہا۔

میں نے ایک کرسی پر ڈھیر ہوگیا۔ وہ دونوں بند رواز ے کو بہت احتیاط سے کھول کر اندر غائب ہوگئے۔ ہوں نے بڑی احتیاط سے دروازہ کھولا اور بند کیا تھا۔ ب میں اس کمرے میں اکیلا تھا۔ ایک طرف بڑی بڑی ماریاں رکھی ہوئی تھیں۔ جن میں سینکڑوں کتابیں رکھی میں۔ میں یوں ہی تجسس کے سبب الماریوں کے قریب نچ گیا۔ تمام کتابیں علم جراحی کے بارے میں تھیں۔ یں کتابوں کا جائزہ لے رہا تھا کہ دروازے کے پیچھے سے ایسی آواز آئی جیسے کسی ذی روح کے جسم میں چھری گھونپ دی گئی ہو۔ میں کانپ گیا۔ اس کے بعد شکاری کتوں کی غراہٹ سنائی دی۔ شکاری کتوں کی غراہٹ میں اچھی طرح پہچانتا ہوں کیونکہ میرے ایک وست کو، جو پولیس میں تھا، شکاری کتوں کی تربیت ینے کی ذمہ داری تفویض کی گئی تھی۔ کچھ دیر بعد سناٹا چھا گیا۔ چند لمحے گزرتے ہی عقبی دروازہ آہستہ سے کھلا۔ ایک اور بدہیت آدمی اندر داخل ہوا۔ اس کے اتھ میں کھانے کی ٹرے تھی۔

''آپ کا کھانا۔'' اس نے کھانے کی میز پر ٹرے کھ دی۔ جب وہ ٹرے رکھنے جھکا تو میں نے دیکھا کہ س کے کان بلی کے کانوں جیسے تھے۔ ان پر چھوٹے چھوٹے بال بھی تھے۔

''وہ لوگ کہاں ہیں؟'' میں نے پوچھا۔

''کون ڈاکٹر مورو؟ وہ کھانا نہیں کھائیں گے۔''

مجھے بھورے بالوں والے کا نام معلوم ہوگیا مگر یہ سنتے ہی مجھ پر جیسے بجلی گرگئی۔ جزیرے کا پراسرار ماحول، عجیب الخلقت مخلوق، جانوروں کے پنجرے، لیبارٹری، کمرے میں موجود علم جراحی پر کتابیں اور میرے سامنے موجود کھانا لانے والا۔ ڈاکٹر مورو کا نام سنتے ہی ان سب کے درمیان رشتہ پیدا ہوگیا۔ یہ وہ شخص تھا جس نے جانوروں پر عمل جراحی کرکے نئی نئی وضع قطع کے جانور تیار کرنے میں شہرت حاصل کی تھی۔ مگر اس کا عمل جراحی اس قدر بھیانک اور ظالمانہ تھا کہ کئی سال پہلے مہذب دنیا نے اس کا بائیکاٹ کرکے اس پر مقدمہ چلانا چاہا تھا۔ اس کے بعد ہی ڈاکٹر مورو تہذیب یافتہ دنیا کے اسٹیج سے اچانک غائب ہوگیا اور اب میں اس کی تجربہ گاہ کے قریب بیٹھا تھا۔

میرے اور تجربہ گاہ کے درمیان صرف بند دروازہ حائل تھا۔ یہی نہیں اس کا بنایا ہوا ایک آدمی میرے سامنے موجود تھا۔ میں لرز کر رہ گیا۔ میں نے سوچا کہ اس تجربہ گاہ تک پہنچنے سے بہتر ہوتا کہ میں جہاز کے حادثے میں ہلاک ہوجاتا لیکن اب کچھ ممکن نہیں تھا۔ اگر بچاؤ کی کوئی صورت تھی تو صرف جزیرے کے چاروں طرف پھیلا ہوا سمندر تھا۔ مگر وہاں بھی موت تھی۔ میں نے چند لمحوں ہی میں یہ سب سوچ لیا۔

میری پوری زندگی مہمات ہی میں بسر ہوئی تھی۔ جب خطرہ بالکل مقابل آجائے تو اعصاب پوری طرح ساتھ دینے لگتے ہیں۔ یہی میرے ساتھ ہوا۔ خطرے کو سر پر منڈلاتا دیکھ کر میں خوفزدہ ہونے کے بجائے ہر قسم اور ہر نوع کے خطرات کا مقابلہ کرنے کے لئے کمربستہ ہوگیا۔ میں پورے حوصلے کے ساتھ کھانے کی میز پر جا ڈٹا اور کھانا کھانے لگا۔ جب تک میں کھاتا رہا۔ بلی نما آدمی ٹکٹکی باندھے مجھے دیکھتا رہا۔ اندر سے مختلف آوازیں آرہی تھیں۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ظالم ڈاکٹر مورو کسی بھیانک آپریشن میں مصروف ہے۔ مختلف جانوروں کی کراہیں اس بات کا ثبوت تھیں۔

میں نے کھانا ختم ہی کیا تھا کہ فرٹ آگیا۔ اس کا چہرہ اندرونی اضطراب سے سرخ ہورہا تھا۔

''معاف کرنا مسٹر لیونارڈ! ہم دونوں ذرا مصروف تھے۔'' وہ میرے سامنے والی کرسی پر جم کر بیٹھ گیا۔ کیا تم ڈرے ہوئے ہو؟'' اسے میری حالت دیکھ کر شاید دلی کیفیت کا اندازہ ہوگیا تھا۔

''تمہارا جو ملازم میرے لئے کھانا لایا تھا۔ اس کے کان بلیوں جیسے ہیں۔''

"اچھا! ارے میں نے کبھی اس پر غور نہیں کیا تھا۔" فرث، نے میری آنکھوں میں آنکھیں ڈالتے ہوئے کہا مگر اس کے لہجے سے ظاہر تھا کہ وہ جھوٹ بول رہا ہے۔

دفعتاً دروازے کے پیچھے سے کسی جانور کی آواز آئی۔ جو اس تیندوے کی معلوم ہورہی تھی۔ جسے بحفاظت جہاز پر سے لایا گیا تھا۔ میں نے لمحے بھر کو فرث کے چہرے پر بھی خوف کے آثار دیکھے۔ تیندوا پھر چیخا۔ ایسا لگتا تھا کہ کوئی اسے سخت اذیت پہنچا رہا ہو۔ میرا ذہن پھر ڈاکٹر مورو کی طرف مڑ گیا۔ جس کے بارے میں مشہور تھا کہ وہ اپنے تجربات اور عمل جراحی زندہ اجسام پر کرتا ہے اور بے ہوش کرنے کا قائل ہی نہیں ہے۔ یقیناً اس وقت بھی وہ تیندوے کو باندھ کر اور بے ہوش کیے بغیر اس پر تجربات کر رہا تھا۔ ظالم، بے حس، غیر متمدن ڈاکٹر میں نے سوچا۔

مقفل دروازہ آہستہ سے کھلا۔ وہ اندر داخل ہوا جو میرا کھانا لایا تھا۔ اسے دیکھ کر میں اس نتیجے پر پہنچا کہ اس جزیرے پر میرے، فرث اور ڈاکٹر کے علاوہ تمام ذی روح ایسے ہیں جیسے ان کے اعضا کی قطع برید کر کے انہیں زبردستی آدمی بنانے کی کوشش کی گئی ہو۔ بلی نما آدمی نے فرث کے کان میں کچھ کہا اور وہ دونوں دروازے کے اندر غائب ہو گئے۔ اب تیندوے کی چیخ و پکار میں اضافہ ہو گیا تھا۔ اس کی چیخ پکار میرے اعصاب کے لئے عذاب بن گئی تھی۔ میں نے انگلیاں کانوں میں ٹھونس لیں مگر آوازیں پھر بھی آتی رہیں۔ اب میرے لئے یہ سب کچھ ناقابل برداشت تھا۔ میں اٹھ کر کھلی فضا میں آ گیا۔ ذرا فاصلے پر سمندر کی لہریں کناروں سے سر پٹخ رہی تھیں۔ دائیں طرف جھاڑیوں اور چھوٹے چھوٹے درختوں کا طویل جنگل پھیلا ہوا تھا۔ میرے قدم خود بخود جنگل کی طرف اٹھ گئے۔

بہت خوب صورت جنگل تھا۔ میں کافی دور نکل آیا تھا۔ میں آخر تھک کر ایک چشمے کے کنارے اونچی سی چٹان پر لیٹ گیا۔ جس پر ایک اونچے سے درخت کا سایہ پڑ رہا تھا۔ معلوم نہیں کب نیند آ گئی۔ آنکھ کسی آواز سے کھلی تو میں نے دیکھا کہ چشمے کے دوسرے کنارے کوئی آدمی، جانوروں کی طرح ٹانگوں پر جھکا پانی پی رہا ہے۔ وہ نیلے کپڑے پہنے ہوئے تھا۔ میرے چونکنے سے کوئی پرندہ پھر سے اڑا اور اس آدمی کی نگاہیں مجھ پر پڑیں۔ وہ اچھل کر کھڑا ہو گیا جیسے پانی پینا کوئی گناہ ہو۔ اس کی ٹانگیں ناقابل یقین حد تک چھوٹی تھیں۔ معاً وہ بھاگ کر قریبی جھاڑیوں میں گھس کر غائب ہو گیا۔ اور مجھے یہ سوچتا چھوڑ گیا کہ نیلے رنگ کے کپڑے پہنے ہوئے آدمی کا تعلق کسی قدیم عہد اور کسی قدیم نسل سے تھا۔

اچانک جب مجھے یاد آیا کہ چشمے پر پانی پیتا ہوا وہ مجھے کیسا لگ رہا تھا۔ تو ایک بات منکشف ہو گئی۔ وہ ایک بھیڑیا تھا جس کے ہاتھ پیروں کی قطع برید کر کے اور دوبارہ جوڑ کر اسے آدمی بنانے کی کوشش کی گئی تھی۔ ڈاکٹر مورو کا یہ جزیرہ اس کے تجربات کے جانوروں سے بھرا پڑا تھا۔

میں گھبرا کر اٹھ کھڑا ہوا۔ میں جلد از جلد قلعہ تک پہنچنا چاہتا تھا کیونکہ مجھے معلوم نہیں تھا کہ اس گھنے جنگل میں ڈاکٹر مورو نے کیسے کیسے جانوروں کا آپریشن کر کے انہیں آدمی نما شکل دی ہے۔

کچھ دور چل کر مجھے احساس ہوا کہ میں راستہ بھول چکا ہوں۔ کیونکہ کافی دیر چلنے کے باوجود میں قلعہ تک نہیں پہنچ سکا بلکہ جنگل اور گھنا ہو گیا تھا۔ معاً میں نے محسوس کیا کہ جب میں چلتا ہوں تو کوئی اور بھی جھاڑیوں کے پیچھے پیچھے چلتا ہے۔ اور وہ میرا پیچھا کر رہا ہے۔ اب شام کے سائے بڑھنے لگے تھے۔ چاروں طرف گھنے درخت تھے۔ میں صرف اندازہ نہیں کر سکا تھا۔ میں پھر اسی طرف لوٹا جہاں چشمہ تھا۔ میرا تعاقب کرنے والا اب بھی میرے ساتھ تھا۔ خوف سے میرے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ میں نے ایک پتھر اٹھا کر اس سمت پھینک دیا۔ کسی کے غرانے کی آواز سنائی دی۔ میرا اندازہ صحیح تھا کوئی تھا جو میرے تعاقب میں تھا۔

پانی کی چھپا چھپ اور موجوں کے مدھم شور سے

میں نے اندازہ لگایا کہ میں ساحل کے قریب پہنچ گیا ہوں۔ میں ہر صورت میں جنگل سے نکل بھاگنا چاہتا تھا۔ نہ چاہنے کے باوجود میں بھاگ کھڑا ہوا۔ درختوں کی ٹہنیوں کے ٹوٹنے کی آواز سنائی دی۔ میرا تعاقب کرنے والا بھی میری رفتار سے بھاگ رہا تھا۔ میں ایک چیخ مارنے والا تھا کہ کسی نے مجھے آواز دی۔ یہ آواز فرٹ کی تھی اور میں بے ہوش ہوگیا۔

مجھے ہوش آیا تو ڈاکٹر مورو اور فرٹ میرے بستر کے قریب تھے۔ ڈاکٹر مورو نے کڑوی کسیلی دوا دی۔ اس کے پیتے ہی جیسے میرے جسم میں خون دوڑ گیا۔ میں تمام نقاہت اور کمزوری بھول گیا۔ میری آنکھوں کے سامنے جو دھندلاہٹ تھی وہ بھی غائب ہوگئی۔ اب مجھے ہر چیز صاف اور واضح نظر آرہی تھی۔

"ہمارے وہم وگمان میں بھی نہ تھا کہ تم یوں سیر کو نکل جاؤ گے۔" ڈاکٹر مورو نے ایک گلاس میں مزید دوا ڈالتے ہوئے کہا۔

انہوں نے مجھ سے مزید گفتگو نہ کی کیونکہ اسی وقت عقبی دروازے کے پیچھے سے تیندوے کے چلانے کی آواز سنائی دی۔ اور وہ دونوں جھپٹ کر مجھے ہکا بکا چھوڑ کر دروازہ کھول کر چلے گئے۔ اس بار وہ اس قدر جلدی میں رخصت ہوئے تھے کہ دروازہ اندر سے بند کرنے کی کلک مجھے سنائی نہ دی۔ یعنی وہ دروازہ بند کرنا بھول گئے تھے۔ میں یوں ہی بیٹھا چیخیں سنتا رہا پھر وہ چیخیں ہچکیوں میں تبدیل ہوگئیں۔ جیسے کوئی آدمی شدید عذاب میں مبتلا ہو۔

میں جلدی سے اٹھا اور دروازے کو چوپٹ کھول دیا۔ اندر بڑی سی تجربہ گاہ تھی۔ وہاں لاتعداد بوتلیں اور شکنجے رکھے ہوئے تھے۔ بیچوں بیچ ایک میز پر کوئی پٹیوں میں لپٹا ہوا تھا۔ اور تکلیف میں تڑپ رہا تھا۔ میز کے ساتھ ایک بڑے سے ٹب میں خون ہی خون بھرا ہوا تھا۔

اچانک فرٹ کی آواز سنائی دی اور میز کے پیچھے سے ڈاکٹر مورو کا چہرہ ابھرا۔ وہ مجھے دیکھ کر مجھ پر جھپٹا اور قریب آکر اس نے مجھے بغلوں میں ہاتھ دے کر اوپر اٹھالیا جیسے کوئی بچے کو اٹھالیتا ہے۔ پھر مجھے میرے کمرے میں واپس پھینک کر اس نے دروازے کو زور سے بند کرلیا۔ میں اٹھا، مجھ پر لرزہ طاری تھا۔ یقیناً میز پر کوئی آدمی زیر تجربہ تھا۔ کیا میرا انجام بھی یہی ہونے والا ہے۔ بس اسی خیال نے مجھے لرزا دیا۔ میں کسی صورت میں عجیب الخلقت ہو کر جزیرے کے دیگر آدمی نما جانوروں میں اضافے کا سبب بننا نہیں چاہتا تھا۔ میں نے کمرے میں نگاہ ڈالی۔ وہاں صرف ایک مضبوط ڈنڈا نظر آیا وہی لے کر میں کمرے سے باہر نکل گیا اور شمال کی طرف دوڑنے لگا۔ گزشتہ بار میں مغربی جنگل میں گھسا تھا۔

کوئی چار سو گز دوڑنے کے بعد میں نے مڑ کر دیکھا تو فرٹ اور بلی نما آدمی میرے پیچھے بھاگتے آرہے تھے میں نے رفتار مزید تیز کردی اور ایک میل تک سیدھا بھاگتا چلا گیا۔ اب دور سے شکاری کتے کی آواز بھی سنائی دے رہی تھی مگر جنگل اور گھنا ہو چلا تھا۔ ڈاکٹر مورو نے میرے لئے شکاری کتا چھوڑ دیا تھا۔ میں نے ڈنڈے کو اور مضبوطی سے تھام لیا مگر میں اچانک رکنے پر مجبور ہوگیا۔ میرے سامنے وہ بندر نما آدمی کھڑا تھا جسے میں نے پہلے دن کنارے پر مضحکہ خیز حرکتیں کرتے دیکھا تھا۔ میں ٹھٹکا تو وہ کہنے لگا۔ "دوست، دوست! اپنا، اپنا آؤ گھر!"

میں اس کے پیچھے اضطراری کیفیت میں چل پڑا۔ ایک موڑ کے بعد بہت سی جھونپڑیاں نظر آرہی تھیں۔ مگر گھنے درختوں کی وجہ سے وہاں بہت اندھیرا تھا۔ سب چیزیں دھندلی دھندلی نظر آرہی تھیں۔ اور ایسی بو پھیلی ہوئی تھی جیسے چڑیا گھروں میں جانوروں کے پنجرے میں ہوتی ہے۔

جھونپڑوں کے درمیان صرف تین فٹ چوڑی گزرگاہ تھی۔ میں اور میرا رہبر اس پر چلنے لگے۔ بہت سی جھونپڑیوں میں سے مختلف چہرے ہمیں دیکھ رہے تھے۔ میرا دل ان کے لئے ہمدردی کے جذبات سے بھر گیا کیونکہ ان کی حرکات وسکنات تو انسانی تھیں مگر ان کا ڈیل ڈول اور چہرے مہرے کی ساخت مختلف جانوروں کی سی

تھی۔ وہ آپس میں میرے بارے میں اظہار خیال بھی کررہے تھے۔ ''کون ہے؟ دشمن! نہیں دوست، یہاں رہے گا! کیا کھائے گا'' یہ سب ان کی مختلف آوازیں تھی جو میں صاف طور سے سن رہا تھا۔ ڈاکٹر مورو کے خطرناک تجربات کے قابل افسوس نتائج میرے سامنے تھے۔

میرا رہبر مجھے ایک گول سی جھونپڑی میں لے گیا۔ جہاں بہت زیادہ تاریکی تھی۔ ایک کونے میں کوئی بال دار چیز پھیلی پڑی تھی۔ میں اور میرا رہبر ایک کونے میں بیٹھ گئے۔ جھونپڑی کے دروازے پر بستی کے دوسرے جانور نما یا آدمی نما باسی جمع تھے۔ میں نے ہاتھ کے ڈنڈے پر اپنی گرفت مزید مضبوط کرلی تھی۔

''ہاؤ!'' بال دار ڈھیر میں سے آواز آئی۔

''یہ آدمی ہے۔'' میرے رہبر نے منمناتی آواز میں کہا۔

''رہنے آیا ہے؟''

''ہاں رہنے آیا ہے۔'' میرے ساتھی نے کہا اور پھر میری طرف دیکھا جیسے وہ مجھ سے بھی یہی کہلوانا چاہتا۔

''میں آدمی ہوں اور تمہارے ساتھ رہنے آیا ہوں۔'' میں نے کہا۔

''اچھا تو قانون پڑھو! میں یہاں تاریکی میں لیٹا قانون پڑھاتا ہوں۔'' پھر اس نے کہنا شروع کیا۔

''چار ٹانگوں سے چلنا گناہ ہے۔ چشمے یا ندی سے منہ لگا کر پانی پینا گناہ ہے۔''

میں نے محسوس کیا کہ قانون پڑھانے والا جو بولتا ہے وہی الفاظ میرا رہبر دہراتا ہے! صرف یہی نہیں بلکہ باہر سے بھی دہرائے جانے کی آوازیں آتی تھیں۔ میں بھی دہرانے لگا۔

''درختوں پر ناخون گھسنا گناہ ہے کیونکہ ہم آدمی ہیں۔''

''دوسرے آدمیوں پر حملہ کرنا گناہ ہے کیونکہ ہم آدمی ہیں۔''

اسی طرح کے بہت سے احکامات ہم سب مل کر گاتے رہے پھر ان کا احکاماتی سلسلہ ختم ہوا تو سب نے مل کر ایک تعریفی گیت گانا شروع کردیا۔

وہ جزیرے کا مالک ہے۔

وہ ہمیں بتاتا ہے۔

اس کا حکم ماننا ہم سب کا فرض ہے۔

وہ ہمیں سزا دیتا ہے۔

وہ بیچ جزیرے میں رہتا ہے۔

اس آخری جملے پر میں چونک گیا۔ یہ گیت ڈاکٹر مورو کی تعریف میں تھا تو ڈاکٹر مورو نے ان کے جسموں پر ہی نہیں دماغوں پر بھی تجربات کئے تھے۔ میں نہ چاہنے کے باوجود ان کی آوازوں میں آواز ملاتا رہا۔ میں اب بھی خطرے میں تھا۔ وحشی درندوں کے درمیان گھرا ہوا تھا۔ ایسے وحشی جو ڈاکٹر مورو کو سب کچھ سمجھتے تھے۔ پھر گیت ختم ہوگیا اور بالوں کا ڈھیر سیدھا ہوکر بیٹھ گیا۔

''میں یہاں آنے والوں کو قانون سکھاتا ہوں، جو قانون توڑتا ہے۔ اسے وہ سزا دیتا ہے۔''

''بے شک قانون توڑنے والوں کو وہ ضرور سزا دیتا ہے۔'' سب نے دہرایا۔

اچانک باہر بھاگ دوڑ کی آوازیں سنائی دیں۔ میرے راہبر اور قانون پڑھانے والے نے کان لگا کر سنا۔ شکاری کتے کی آواز مجھے بھی سنائی دی پھر ڈاکٹر مورو کی آواز آئی۔ ''مسٹر لیونارڈ! باہر آجاؤ۔''

میں نے چاروں طرف نظر دوڑائی۔ دروازے میں سے ایک کتا اندر آنے کے لئے لپک رہا تھا۔ جس کی زنجیر کوئی کھینچ رہا تھا۔ جھونپڑی کی عقبی دیوار میں ایک چھوٹی سی کھڑکی تھی۔ میں جھپٹ کر کھڑکی کی طرف لپکا اور باہر کود گیا۔ یہ جھونپڑی اس بستی کے کنارے پر تھی کیونکہ میں پتھروں پر گرا۔ مگر دیر کرنے کی بالکل گنجائش نہ تھی۔ میں گر کر فوراً اٹھا اور سیدھا دوڑتا چلا گیا۔ اب مجھے اپنے پیچھے، بہت سے قدموں کی آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔ یقیناً ڈاکٹر مورو اور اس کے بنائے ہوئے آدمی میرے پیچھے دوڑ رہے تھے۔ دوڑتے قدموں کی آوازیں، چیخ پکار، منمناتی آوازیں شکاری کتے کی

غراہٹ اورڈاکٹر مورو کی آواز۔''
''رک جاؤ! بھاگو گے تو اور کسی مصیبت میں پھنس جاؤ گے۔''
میں ہر مصیبت کا مقابلہ کرنے کے لئے تیار تھا۔ لیکن ڈاکٹر مورو کی تجربہ گاہ میں پڑی ہوئی میز پر لیٹنے کے لئے ہرگز تیار نہیں تھا۔
میں بھاگتا رہا مگر اچانک آس پاس سامنے غرض ہر طرف جھاڑیوں میں جان پڑ گئی۔ میں گھر گیا تھا۔ سامنے بہت سے جانور نما آدمی مجھے گھیرے ہوئے تھے اور عقب سے ڈاکٹر مورو اور فرٹ کی آوازیں آرہی تھیں۔ میں رک گیا اور میں نے ہاتھ میں پکڑے ہوئے ڈنڈے کو حملہ کرنے کے انداز میں اٹھالیا۔ حیوان نما آدمی اپنی جگہ رک گئے۔ انہوں نے میرے انداز سے سمجھ لیا تھا کہ جو میرے قریب آئے گا، میں اسے مار ڈالوں گا یا پھر انہیں ڈاکٹر مورو نے صرف اسی قدر حکم دیا تھا کہ وہ مجھے گھیر لیں۔
ڈاکٹر مورو اور فرٹ کوئی بیس قدم کے فاصلے پر رک گئے، ڈاکٹر نے جس کتے کی زنجیر پکڑ رکھی تھی وہ میری طرف بار بار آنے کی کوشش کر رہا تھا۔
''واپس چلو!'' فرٹ نے کہا۔
''نہیں! میں واپس نہیں جاؤں گا۔ میں تمہارے ہاتھوں اذیت سہنے کے بجائے یہیں لڑ کر مرنا پسند کروں گا۔''
''اذیت؟'' ڈاکٹر مورو کا چہرہ بجھ گیا۔
''ہاں اذیت!'' مجھ پر جنون سا طاری ہوگیا۔ ''تمہارا اپریشن تھیٹر کسی جہنم سے کم نہیں۔ تم نے ان بے چاروں کو کیا سے کیا بنا دیا ہے۔'' میں نے ہاتھ سے ان حیوان نما آدمیوں کی طرف اشارہ کیا جو مجھ سے دور کھڑے تھے۔
''شش! چپ رہو......'' فرٹ نے مجھے ڈانٹا۔
''نہیں! میں چپ نہیں رہوں گا۔ تم نے شیطانی عمل سے ان انسانوں کو حیوان سے بدتر بنا دیا ہے۔ تم ان پر ظلم کرتے ہو۔'' میں نے محسوس کیا کہ حیوان نما آدمی میری بات توجہ سے سننے لگے تھے۔
''سنو اے لوگو'' میں بدہیبت لوگوں سے مخاطب ہوگیا۔ تم ان دو سے مت ڈرو انہیں قتل کر دو!'' میں نے جوش میں انہیں باقاعدہ اکسایا۔ میں نے اچھی طرح محسوس کرلیا تھا کہ حیوان نما آدمی میری بات غور سے سن رہے ہیں۔ وہ خاموشی سے میرے قریب آگئے تھے جیسے میری بات سننا چاہتے ہوں۔
''سنو لیونارڈ!'' فرٹ نے غصے سے کہا۔ ''پاگل مت بنو! یہ حیوان ہیں ہم نے انہیں انسانی شکل دینے کی کوشش کی ہے تم واپس چلو میں تمہیں تجربات کی روداد سنا دوں گا۔''
میں نے قہقہہ لگایا۔ ''میں تمہارے فریب میں نہیں آؤں گا۔''
''اچھا تو یہ لو!'' فرٹ نے کوئی چیز میری طرف پھینکی جو میرے قدموں کے پاس آکر گری۔ وہ پستول تھا۔ جو میں نے جھپٹ کر پستول اٹھالیا۔
''یہ بھرا ہوا پستول ہے۔ مسلح ہوکر ہمارے ساتھ واپس چلو۔'' ڈاکٹر مورو نے کہا۔
میں نے اطمینان کی غرض سے قریبی پتھر پر پستول داغ دیا۔ آواز آئی اور پتھر کے ٹکڑے اڑ گئے۔ پستول بھرا ہوا تھا۔
''بہت اچھا! مگر تم دونوں آگے آگے چلو گے۔'' میں مزید خطرہ مول لینے کے حق میں نہیں تھا۔
اب وہ دونوں میرے آگے آگے تھے۔ حیوان نما آدمیوں کا گروہ اپنی جگہ کھڑا تھا۔ ڈاکٹر مورو نے کچھ عجیب سی آواز میں اشارہ کیا اور وہ سب لوگ بھرے ہوئے کھلونے کی طرح بھاگ بھاگ کر جھاڑیوں کے پیچھے چلے گئے۔ ہم تینوں قلعے کی طرف واپس آرہے تھے مگر میں پوری طرح چوکنا تھا۔
راستے میں مجھے خیال آیا کہ میں پستول کی ایک ایک گولی سے ڈاکٹر مورو اور فرٹ کو ہلاک کردوں مگر دوسرے لمحے مجھے وہ وحشی یاد آگئے جن کے ہمراہ دن گزارنے محال تھے۔ یہ دونوں بہر صورت ان وحشیوں

سے بہتر تھے اب مجھے ان پر کسی حد تک اعتماد بھی آ گیا تھا۔ اگر وہ میرے دشمن ہوتے تو بھرا ہوا پستول میرے حوالے نہ کرتے۔ یقیناً انہوں نے آدمیوں کو جانور نہیں بلکہ جانوروں کو آدمی کی شکل دینے کے تجربات کیے تھے۔

قلعہ میں پہنچ کر ڈاکٹر مورو نے مجھے غور سے دیکھا اور کہنے لگا۔ ''لیونارڈ! ہم دونوں بھی آدمی ہیں اور آدمی کی صحبت پسند کرتے ہیں۔ یہ تو سوچو کہ تم بن بلائے مہمان تھے۔ رہا تمہارا شک، تو وہ بے جا ہے۔ ہم نے تجربات حیوانات پر کیے ہیں، اور بڑی حد تک کامیاب بھی رہے ہیں۔'' اس نے غور سے ایک بار پھر مجھے دیکھا اور گفتگو کا سلسلہ جاری رکھا۔ ''تم سے ہماری ہمدردی صرف انسانی سطح پر ہے۔ یہ حیوان، جن کو میں نے آدمی بنایا ہے۔ کبھی کبھی حیوانی سطح پر لوٹ جاتے ہیں۔ میں نے ان کو انسانی زندگی کے قوانین سکھانے کا بھی بندوبست کیا ہے۔''

مجھے قانون سکھانے والا بالدار ڈھیر یاد گیا۔

''جس طرح، ایک سنگ تراش پتھر کو تراش کر مورتیاں بنا سکتا ہے۔ اسی طرح میں نے حیوانات کے اعضاء کی قطع برید کر کے انہیں انسانی شکل دی ہے۔ میں نے ان کی جسمانی ساخت ہی نہیں بلکہ دماغی ساخت بدلنے کے لئے بھی سرجری کی ہے اور ان میں بولنے کی صلاحیت بھی پیدا ہو گئی ہے۔''

میں نے پستول فرٹ کی طرف بڑھا دیا جسے اس نے لے کر بے دلی سے، میز پر رکھ دیا۔

ڈاکٹر مورو نے پستول کو دیکھا پھر میری طرف دیکھا۔ اس بار پہلی دفعہ میں نے اس کے چہرے پر مسکراہٹ دیکھی۔ ''مسٹر لیونارڈ! تم بہت جلد مشکوک ہو گئے ورنہ ہم خود تمہیں ساری باتیں بتا دیتے!''

میں اس سے بہت مرعوب تھا مگر دل ہی دل میں اس کے اس طریقہ کار سے مطمئن نہ تھا۔ میرے نزدیک یہ تجربات ظلم کی حیثیت رکھتے تھے۔ بے چارے جانور اپنی عادتیں ترک کر کے، انسانی طور طریقے اپناتے تھے۔ روزانہ ورد کرتے تھے کہ وہ آدمی ہیں اور ان کے لئے کیا کیا باتیں گناہ ہیں!

''مگر کیا یہ مکمل آدمی بن چکے ہیں؟'' میں نے سوال کیا۔

''نہیں! میں ابھی تجربات کر رہا ہوں۔ کبھی کبھی ان کی اصلی عادتیں عود کر آتی ہیں۔ ایسی صورت میں وہ خطرناک ہو جاتے ہیں مثلاً میں نے ایک ریچھ بنایا تھا مگر جب اس کی عادت واپس آ گئی تو اس نے بڑی تباہی پھیلا دی۔'' اس پر فرٹ نے اپنا داہنا بازو مجھے دکھایا۔ اوپری حصہ جیسے کسی کے سخت دانتوں نے چبا ڈالا تھا۔

''پھر ہم نے اسے گولی مار دی۔''

یہ ڈاکٹر مورو کا آخری جملہ تھا جو میں نے سنا۔ مجھ پر غنودگی طاری ہونے لگی تھی۔ کافی بھاگ دوڑ کے بعد جب میرا دل ان دونوں کی طرف سے مطمئن ہونے لگا تھا تو شاید میرے اعصاب سکون چاہتے تھے۔ میں کئی گھنٹے پرسکون نیند لینے کے بعد اٹھا تو دوپہر ہو چکی تھی۔ میں دس بارہ گھنٹے سو چکا تھا۔

اس واقعے کے بعد زندگی نارمل طور سے گزرنے لگی۔ میں ڈاکٹر مورو اور فرٹ کی جانب سے مطمئن تھا مگر اس کے ان ملازموں کی جانب سے خوفزدہ رہتا تھا جو مختلف جانوروں کے آپریشن کرنے کے بعد بنائے گئے تھے۔ مثلاً بیل آدمی، بھیڑیا آدمی، کتا آدمی! میں سوچتا تھا کہ معلوم نہیں کب ان کی وحشت ان میں جاگ اٹھے! وحشی آدمیوں کی بستی کی طرف میں اکیلا کبھی نہیں گیا۔ کیونکہ انہیں دیکھ کر میرے دل میں ہمدردی کے جذبات ابھر آتے تھے۔ مجھے ان پر رحم آتا تھا۔

ادھر ڈاکٹر مورو تیندوے پر اپنے تجربات کرنے میں مصروف تھا۔ وہ ایک نیا آدمی نما تیندوا بنانے میں دن رات مصروف رہتا تھا۔ اس لئے میری ملاقات اس سے مہینوں نہ ہو سکی۔

میں ڈاکٹر مورو اور فرٹ کا اس لئے ضرور احسان مند رہا کہ انہوں نے ایک دفعہ بھی مجھے اپنے تجربات میں شامل کرنے کی کوشش نہیں کی۔ میں قلعہ کے اندر واقع ایک لائبریری میں وقت گزارتا تھا۔ جہاں دنیا جہان کے

اخبارات اور کتابیں موجود تھیں۔ ایک ٹوٹا پھوٹا ریڈیو بھی مجھے مل گیا جسے درست کرکے میں نے بیرونی دنیا سے اپنا رشتہ جوڑ لیا۔ اس طرح میں نے چھ ماہ تفریح اور پرسکون رہ کر گزار دیئے۔

مہذب دنیا مجھے اکثر یاد آتی۔ ڈاکٹر مورو اور فرٹ نے مجھے یقین دلایا تھا کہ وہ مجھے بہت جلد مہذب دنیا تک پہنچا دیں گے۔ ان کے کہنے کے مطابق ان کا کوئی دوست چھ ماہ میں جہاز لے کر جزیرے کے دو تین چکر ضرور لگالیتا ہے۔ یہ دوسری بات ہے کہ چھ ماہ کی طویل مدت میں مجھے روزانہ یہی آس رہی کہ آج کسی وقت جہاز کے مستول مجھے نظر آجائیں گے مگر روزانہ یہی حسرت لے کر میں سوجاتا اور خوابوں میں بھی جہاز نظر آتے۔

ایک دن فرٹ کا خاص ملازم جسے جہاز پر کالے شیطان کے نام سے یاد کیا جاتا تھا، بڑی پریشانی کے عالم میں آیا۔ اس کے ایک ہاتھ میں خرگوش کا سر تھا۔ اور دوسرے ہاتھ میں مردہ جسم۔ فرٹ اسے دیکھ کر بے چینی سے اس کی باتیں سنتا رہا۔ یہ اطلاع فوراً ڈاکٹر مورو کو پہنچائی گئی اور وہ وہاں بھی آگیا۔ کالا شیطان جلدی جلدی بتارہا تھا کہ اس نے یہ خرگوش کہاں سے اٹھایا۔ مجھے ان سب کی بے چینی اور پریشانی کا مطلب سمجھ میں نہیں آرہا تھا۔

''غصب ہوگیا۔'' ڈاکٹر مورو نے مجھے مخاطب کیا۔ اب اکثر وہ مجھے جزیرے کے معاملات میں، اعتماد میں لے لیا کرتا تھا۔

''میں سمجھا نہیں!'' میں نے حیرت سے کہا۔

''کوئی آدمی نما جانور خون کا عادی ہونے والا ہے۔'' اس نے بتایا۔ تو؟''

''بس یہی ایک خرابی ہے اگر کوئی وحشی جانور مثلاً بھیڑیا وغیرہ آدمی بننے کے بعد خون کا مزہ چکھ لے تو وہ خطرناک ہوجاتا ہے۔ اور اس سلسلے میں قانون ہے کہ گوشت نہیں کھلایا جائے گا۔''

''خطرناک! مگر اکثر جانور تو قانون توڑتے رہتے ہیں۔''

''نہیں ایسا نہیں ہوتا۔ اگر ایسا ہو تو سزا دی جاتی ہے۔''

ڈاکٹر مورو اور فرٹ اب جنگل میں چلنے کی تیاری کررہے تھے۔ انہوں نے ملازم سے فل بوٹ منگوائے تھے جن کی تعداد تین تھی۔ ظاہر ہے کہ وہ مجھے اس مہم میں ساتھ لے جانا چاہتے ہیں۔''

''کیا یہ قانون نہیں ہے کہ کوئی جانور چشمہ یا ندی سے جانوروں کی طرح پانی نہیں پئے گا۔'' مجھے وہ واقعہ یاد آگیا جب نیلے لباس والے ایک حیوان نما آدمی کو میں نے چشمے سے جانوروں کی طرح ہاتھ پیروں پر جھک کر پانی پیتے دیکھا تھا۔

''اس کی بھی سزا ہے مگر تم نے کیسے دیکھا۔''

''نیلے لباس میں کوئی تھا۔'' میں نے اس کا واقعہ دہرایا۔

''نیلے لباس والا!'' ڈاکٹر مورو اور فرٹ نے ایک دوسرے کو دیکھا۔' اس خرگوش والے حادثے میں بھی وہی مشکوک ہے۔''

جب ہم نیلے لباس والے کو سزا دینے نکلے تو ہم تینوں کے ہاتھ میں ایک ایک چابک تھا۔ فرٹ کا ملازم تاروں کا ایک لچھا لئے ہوئے تھا۔ ڈاکٹر مورو کے دائیں کندھے پر ایک بگل لٹکا ہوا تھا۔ ہم اسی راستے پر جارہے تھے۔ جو وحشی بستی کی طرف جاتا تھا۔ بستی کے قریب واقع میدان میں پہنچ کر ڈاکٹر نے بگل بجادیا۔ اس کی کرخت آواز گونجی۔ دور بستی میں بھنبھناہٹ شروع ہوئی اور پندرہ منٹ کے اندر اندر میدان میں ہر طرف بدوضع جانور نما آدمی یا آدمی نما جانوروں کا اجتماع ہوگیا۔ وہ سب ایک دوسرے سے لگے بیٹھے تھے۔

فرٹ نے بلند آواز میں گنتی شروع کی۔ اکسٹھ تک گن کر وہ رک گیا۔ اب تک ہر نمبر کے جواب میں کوئی نہ کوئی بول رہا تھا مگر باسٹھ نمبر پر کوئی آواز نہ ابھری۔ فرٹ بلند آواز میں بولا۔ ''باسٹھ نمبر کہاں ہے؟''

میں نے اجتماع میں نظر ڈالی ان میں نیلے لباس

والا نہیں تھا۔ یقیناً وہی مجرم تھا۔ تمام آدمی نما حیوان اپنے نمبروں سے شناخت کیے جاتے تھے۔

''قانون پڑھا جائے!''

''قانون پڑھانے والے نے ابھی آغاز بھی نہیں کیا تھا کہ مشرقی سمت سے نیلے لباس والا آتا دکھائی دیا اور وہ بھی اس مجمع میں شامل ہوگیا۔ اب جزیرے کی پوری آبادی وہاں موجود تھی۔ قانون دہرایا جانے لگا۔

''چار ہاتھ پیروں پر چلنا گناہ ہے کیونکہ ہم آدمی ہیں۔ چشمے یا ندی سے منہ لگا کر پانی پینا گناہ ہے کیونکہ ہم آدمی ہیں۔'' جب یہ قانون پڑھا گیا ''کسی جانور کو ہلاک کرکے اس کا خون پینا گناہ ہے کیونکہ ہم آدمی ہیں۔'' تو ڈاکٹر نے ہاتھ ہلا کر سب کو خاموش کردیا۔ سارے مجمعے پر خاموشی چھا گئی۔

''یہ قانون توڑا گیا ہے۔'' ڈاکٹر کی آواز گونجی۔

''سزا دینے والے سے کوئی نہیں بچ سکتا۔'' سارا مجمع ایک آواز میں چلایا۔

ڈاکٹر آہستہ آہستہ چلتا ہوا نیلے لباس والے کے پاس پہنچ گیا اور زور سے بولا۔ ''جو قانون توڑے گا اسے کہاں لے جایا جائے گا۔''

''عذاب گھر میں!'' مجمع یکبارگی چلایا۔

''تو تم عذاب گھر جاؤ گے!'' ڈاکٹر مورو نے نیلے لباس والے کے سینے پر اپنے چابک کا دستہ مارا مگر یکبارگی نیلے لباس والا اچھلا اور اس نے ایک زناٹے دار طمانچہ ڈاکٹر کے گال پر رسید کردیا۔ حملہ اس قدر اچانک اور شدید تھا کہ ڈاکٹر زمین پر کافی دور تک لڑھکتا چلا گیا۔ ہجوم میں گڑبڑ مچ گئی۔ معلوم ہوتا تھا کہ سب لوگ ہم پر پل پڑیں گے۔

صرف قانون پڑھانے والے کی آواز سنائی دے رہی تھی۔ وہ اس وقت بھی قانون پڑھانے میں مصروف تھا یا چند آوازیں اس کا ساتھ دے رہی تھیں۔ باقی سب کھڑے ہوگئے تھے۔ مجھے آنکھیں پڑھنے کا زعم نہیں ہے۔ مگر میں نے اندازہ لگایا کہ بیشتر آنکھوں میں غصہ اشتعال اور نفرت تھی۔

میری اس دن کی تقریر کا اثر آج ہو رہا تھا۔ صورت حال کی نزاکت کا احساس فرٹ کو بھی ہوا کیونکہ اس کے پستول سے دو شعلے نکلے اور ہماری طرف بڑھنے والے قدم ٹھٹک گئے۔ اتنی دیر میں نیلے لباس والا اچھل کر چاروں ہاتھ پیروں کے بل برق رفتاری سے جنگل میں گھس گیا تھا۔ ڈاکٹر مورو سنبھل کر اٹھا اور اس نے پوری طاقت سے چابک ہلایا۔

''سب بیٹھ جاؤ!'' وہ چیخا

سارا مجمع پھر بیٹھ گیا۔ چندان آدمی نما جانوروں کی لاشوں پر بھی بیٹھ گئے جو فرٹ کے پستول کی گولیوں کے نتیجے میں ہلاک ہوئے تھے۔

قانون پھر دہرایا جانے لگا۔

ڈاکٹر مورو کے اعصاب کی مضبوطی کا میں قائل ہوگیا۔ قانون ختم ہوا پھر ڈاکٹر مورو کی تعریف ہوئی۔ اس کے بعد ڈاکٹر نے سب کو حکم دیا کہ وہ نیلے لباس والے کی تلاش میں مدد دیں۔

نیلے لباس والا ایک گھنٹے کی تگ و دو کے بعد مجھے ساحل کے قریب ایک کھائی میں چھپا ہوا ملا۔ وہ اپنی تیز تیز خونی آنکھوں سے مجھے گھور رہا تھا۔ مجھے اچانک خیال آیا کہ اگر یہ زندہ پکڑا گیا تو اس پر ڈاکٹر اپنے خصوصی تجربات ضرور آزمائے گا۔ اس خیال کے آتے ہی میں نے اس کی پیشانی کا نشانہ لیا۔ گولی کھاتے ہی وہ سیدھا میری طرف آیا۔ اگر میں ایک طرف نہ ہٹ جاتا تو وہ مجھے ساتھ لے کر گرتا لیکن میں بال بال بچ گیا۔ پستول کی آواز پر مورو اور فرٹ سب سے پہلے وہاں پہنچ گئے تھے۔

''ارے، اسے ہم زندہ گرفتار کرنا چاہتے تھے۔''

اب بہت سے آدمی نما حیوان جمع ہوگئے تھے اور اشتیاق سے مجرم کی لاش کو دیکھ رہے تھے۔

وہ آپس میں سرگوشیاں بھی کرتے جا رہے تھے اور بار بار ہمیں دیکھ رہے تھے۔ ان کے دیکھنے کے انداز مشکوک تھے۔ میں اچھی طرح محسوس کر رہا تھا کہ نیلے لباس والے کے حملے کے بعد باقیوں پر ڈاکٹر مورو کا رعب کم ہوگیا تھا۔ میری وحشی حس بتا رہی تھی کہ صورت حال کافی

بدل گئی ہے۔

صورت حال بدلنے کا احساس ڈاکٹر مورو اور فرٹ کو بھی تھا۔ مگر وہ اپنے تیندوے والے تجربات میں اس قدر مصروف تھے کہ انہوں نے اس سلسلے میں کوئی منصوبہ نہیں بنایا۔ ڈاکٹر مورو نے صرف اسی قدر کہا تھا۔

"ہمیں زیادہ سخت طریقے اختیار کرنے ہوں گے۔"

وہ ہر طرف سے بے پروا ہو کر اپنے تجربات میں مصروف ہو گئے مگر میں نے احتیاطی تدابیر کے طور پر جنگل کی سمت جانا قطعاً ترک کر دیا تھا۔ یہی نہیں بلکہ جب قلعہ کے خاص حیوانی ملازم میری خدمت کے لئے آتے تب بھی میں پوری طرح چوکنا رہتا تھا۔ بھرا ہوا پستول ہر وقت میرے پاس رہتا تھا۔ کمرے میں بھی میں نے چابک اس طرح رکھ دیا تھا۔ جو بوقت ضرورت میری دسترس میں ہو۔

آخر میری احتیاط پسندی ایک دن میرے کام آ گئی۔ اتوار کا دن تھا۔ میں ناشتے سے فرصت پا کر اپنی بنائی ہوئی سگریٹ سے لطف اندوز ہو رہا تھا کہ ایسا معلوم ہوا جیسے طوفان آ گیا ہو۔ عقبی دروازہ افراتفری میں کھولا گیا۔ پہلے سراسیمہ حالت میں ڈاکٹر مورو نکلا اور اس کے بالکل پیچھے ایک بھیانک چہرہ۔ وہ تیندوا ہی تھا مگر کس حالت میں! اس کے بے پوٹوں کی آنکھیں خون سے سرخ ہو رہی تھیں۔ اور دانت باہر نکلے پڑ رہے تھے۔

ڈاکٹر مورو کو چھوڑ کر وہ سیدھا میری طرف جھپٹا۔ میں نے اسے روکنے کے لئے ہاتھ بڑھائے مگر اس نے زور سے مجھے ٹکر ماری اور میں دائیں پہلو کے بل زمین پر گر پڑا۔ وہ مجھے پھلانگ کر جنگل کی طرف دوڑ گیا۔

ڈاکٹر مورو اب خود پر قابو پا چکا تھا۔ اس نے میز پر سے پستول اٹھا لیا تھا مگر اسے دیر ہو گئی تھی۔ اتنی دیر میں تیندوا نگاہوں سے اوجھل ہو چکا تھا۔ اور میں! مجھ سے اٹھا بھی نہیں جا رہا تھا۔ میرا دایاں ہاتھ کاندھے سے ہی اتر گیا تھا۔

[illegible]

کے کسی دور افتادہ حصے میں کسی کام میں مصروف تھا۔ شور سن کر آیا۔ جب میں نے اسے واقعے سے آگاہ کیا تو اس کے چہرے پر مردنی چھا گئی۔ فرٹ نے سب سے پہلے میرا ہاتھ اپنی جگہ پر بیٹھایا۔ تکلیف تو کم ہو گئی تھی مگر ٹیسیں برابر جاری تھیں۔ ہم دونوں ڈاکٹر مورو کے تعاقب میں جانے کے لئے تیار ہو گئے۔

فرٹ نے قلعہ کے ملازمین کو جمع کر لیا۔ اب ہم چار ہو گئے تھے۔ فرٹ، فرٹ کا وہ ملازم جو قدرے کتے کی شکل کا تھا۔ اور ایک ریچھ نما آدمی۔

ہم جزیرے کے شمالی جنگل کی طرف چل پڑے کیونکہ میں نے تیندوے کو اسی سمت جاتے ہوئے دیکھا تھا۔ کچھ فاصلے طے کر کے ہم نے بستی کے آدمی نما حیوانوں کی بلند آوازیں سنیں۔

"چابک والا آقا مر گیا ہے۔" وہ ایک دوسرے کو اسی طرح اطلاع دے رہے تھے جیسے مبارک باد دے رہے ہوں پھر وہ ہمارے قریب آ گئے۔ ان میں قانون پڑھانے والا بھی تھا اور بندر نما آدمی بھی۔

"کیا بات ہے؟" فرٹ نے گونجدار آواز میں پوچھا۔

"ارے دوسرا آقا! پہلا آقا مر گیا ہے۔ میں نے خود اس کی لاش دیکھی ہے۔" قانون سکھانے والے کی آواز گونجی۔ آج اس کی آنکھوں سے درندگی جھلک رہی تھی۔

"کیا اب بھی قانون باقی ہے؟" بہت سی ملی جلی آوازیں آئیں...... فرٹ ایک لمحہ کے لئے ٹھٹکا اور پھر سیدھا کھڑا ہو گیا۔ حالات کو قابو میں رکھنے کے لئے اب ذہانت کا سہارا لینا پڑ رہا تھا۔

"وہ مرا نہیں ہے۔ میں زندہ ہوں تو وہ بھی زندہ ہے۔" ان سب پر سناٹا چھا گیا۔ فرٹ نے ان درندوں کو کنٹرول میں کر لیا تھا۔ "کہاں ہے وہ جسم جسے پہلا آقا بے کار سمجھ کر چھوڑ گیا ہے۔" فرٹ کی گونجیلی آواز ابھری۔

تھا۔ اس کے بال خون سے سرخ ہو رہے تھے۔ ایک ٹانگ غائب تھی۔ میری آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ اور یہی حال فرٹ کا بھی ہوگا۔ مگر اس وقت ہم ذرا سی بھی کمزوری دکھانے کے موقف میں نہیں تھے۔ چند قدم پر تیندوا بھی مردہ حالت میں پڑا تھا۔ میں نے اور فرٹ نے اطمینان کی سانس لی۔

ڈاکٹر مورو کی لاش کئی آدمی نما حیوانوں کی مدد سے قلعے میں لائی گئی۔ جب وہ آدمی نما حیوان چلے گئے تو ہم نے قلعہ اندر سے بند کرلیا۔ پھر شام تک ہم تجربہ گاہ میں زیر تجربہ تمام ذی روح اجسام کو تلف کرنے میں مصروف رہے۔

ڈاکٹر مورو کی موت نے ہمیں غیر محفوظ کر دیا تھا۔ اس جزیرے پر اب صرف دو انسان تھے۔ بقیہ آدمی نما حیوان۔ فرٹ کی اس اطلاع نے مجھے مزید پریشان کر دیا کہ جب یہ آدمی نما حیوان دوبارہ حیوانیت کی سطح پر اتر آتے ہیں تو اس درندگی میں وہ ذہانت بھی شامل ہوتی ہے۔ جو انسانوں کی خصوصیت ہے اس لئے وہ زیادہ خطرناک ہو جاتے ہیں۔

میں اور فرٹ جزیرے سے نکلنے کی ترکیبیں سوچنے لگے۔ مگر قدرت کو کچھ اور ہی منظور تھا۔ جیسے ہی شام ڈھلی چاندنی پھیلنی شروع ہوئی۔ بستی کی طرف سے ان وحشیوں کے زور زور سے گانے کی آوازیں آنے لگیں۔ اس سے پہلے بھی انہوں نے زور زور سے گانے کی جسارت نہیں کی تھی۔ چند ثانیے کے بعد یہ گیت شور و غل میں تبدیل ہوگیا۔ اور قلعہ سے قریب آنے لگا۔ میں اور فرٹ خوف سے لرز گئے۔ معلوم نہیں وحشی کس لئے قلعہ کے قریب آ گئے تھے۔ ایسا اس سے پہلے کبھی نہ ہوا تھا۔ اتفاق کی بات کہ ڈاکٹر مورو کے مرنے کے بعد قلعہ کے خصوصی حیوانی ملازم بستی میں ہی رہ گئے تھے۔

ہم نے جلدی جلدی قلعہ کے دروازے بند کئے۔ ہم دونوں مین گیٹ کے اوپر بنائی ہوئی جگہ پر چڑھ گئے۔ وحشی شور مچاتے قلعہ کے بالکل قریب آ گئے تھے۔ ان میں سے کسی نے ہمیں دروازے کے اوپر فصیل پر دیکھ لیا۔ ان میں سے بعض کی نگاہیں بہت تیز تھیں۔ وہ شور مچاتے ہوئے دروازے کے سامنے بیٹھ گئے۔

فرٹ ذرا آگے بڑھا۔ وہ ان سے کچھ کہنا چاہتا تھا مگر پتا نہیں اچانک کیا ہوا۔ اس کا پیر پھسل گیا۔ وہ نیچے گر پڑا۔ بالکل ان وحشیوں کے درمیان میں۔ اس کا گرنا اس قدر حیران کن نہیں تھا۔ جس قدر یہ بات حیران کن اور خوفزدہ کرنے والی تھی کہ وحشی اسی پر ٹوٹ پڑے اور میں نے دوسرے آقا کو ٹکڑے ٹکڑے ہوتے دیکھ لیا۔

میری پھیلائی ہوئی بغاوت کی آگ رنگ لا رہی تھی۔ اور اب اس کے شعلے میرے جسم تک پہنچ گئے تھے۔ میں نے اس ہجوم پر پستول داغ دیا۔ ایک ہلڑ مچا۔ وہ بھاگ کر ادھر ادھر ہو گئے لیکن شاید وہ پستول کے استعمال سے ذہنی طور پر زیادہ خوفزدہ نہیں تھے۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ ڈاکٹر مورو اور فرٹ نے انہیں پستول کی گولی سے نہیں بلکہ چابک سے ڈرنا سکھایا تھا۔ ان کا وہ عارضی خوف میرے کسی کام کا نہیں تھا۔ ان کے ارادے خطرناک تھے اور میں ان کے قریب جانے کا خطرہ مول نہیں لے سکتا تھا۔ تاہم مجھے اس بات کا ضرور اطمینان تھا کہ وہ قلعہ کے اندر داخل ہونے کی ہمت نہیں کریں گے۔ اگر انہوں نے ایسا کیا تو میرا پستول ان کے اس ارادے میں ایک بڑی رکاوٹ بن سکتا تھا۔

میں ان لوگوں کی طرف منہ کر کے کھڑا ہوگیا۔ میں اس جزیرے میں اکیلا تھا۔ ڈاکٹر مورو کے بعد حیوان باغی ہو چکے تھے ان کی بغاوت کا ثبوت فرٹ کا مردہ جسم تھا جو میرے سامنے پڑا تھا۔ میں نے چابک فضا میں لہرایا۔ اس کی آواز سے ہجوم میں خوف کی ایک لہر دوڑ گئی۔

''قانون توڑنے والے کو سزا دی جائے گی۔'' میں نے گونجدار آواز بنانے کی کوشش کی۔

''چند آوازوں نے میرے جملے کو دہرایا مگر آدمی نما ریچھ نے زور سے کہا۔ ''سزا کون دے گا؟ چابک والے آقا مر گئے۔ قانون ختم ہوگیا۔''

''نہیں!'' میں نے زور سے کہا۔ ''اب میں سزا دوں گا۔ مرنے والے مجھے تمہارا آقا بنا گئے ہیں۔''

''تم ہمیں سزا نہیں دے سکتے۔ تم بھی ہماری طرح ہو اور اسی کے بنائے ہوئے ہو۔ کیا تم ہمارے ساتھ رہنے نہیں آئے تھے؟'' یہ قانون سکھانے والے کی آواز تھی۔

اس کی منطق بالکل درست تھی میں ایک دن ان کی بستی میں رہنے گیا تھا۔ اور اسی آدمی نما حیوان نے مجھے قانون بھی سکھایا تھا۔ اس لئے میں اس کی نظر میں آدمی جیسا تھا۔ میں ان کے خیال میں ان سے اعلیٰ صفات کا حامل نہیں تھا۔ وہ میرے احکامات ماننے سے منکر تھے۔

میں نے سوچا۔ قانون سکھانے والے کی ان وحشیوں میں بہت عزت ہے۔ اب صرف یہی صورت رہ گئی ہے جس سے میں اپنا رعب قائم کرسکتا ہوں کہ میں اسے سزا دوں گا۔ حالانکہ یہ رعب میں صرف اس لئے قائم کرنا چاہتا تھا کہ میں اس منحوس جزیرے سے تہذیب یافتہ دنیا تک پہنچ سکوں۔ اس کے لئے مجھے وقت درکار تھا اور وہ وقت ان وحشیوں کو اپنے قابو میں رکھ کر ہی حاصل کیا جاسکتا تھا۔

میں نے قانون سکھانے والے کو سزا دینے کا فیصلہ کیا۔ میرے پستول سے شعلہ نکلا اور مجھے منطق سمجھانے والا پیچھے کی طرف گر گیا۔ ہجوم شور مچانے لگا۔ میری حکمت عملی الٹی ہوگئی تھی۔ اس کے بجائے وہ میرے رعب میں آتے، میرے اس عمل سے وہ سب مشتعل ہوگئے۔

بندر نما آدمی اچھلا اور کہنے لگا۔ ''چابک والے آقا نے کہا تھا کہ جو قانون سکھانے والے کو مارے اسے سب مل کر مارو۔''

ڈاکٹر مورو نے کبھی قانون سکھانے والے کے تحفظ کے لئے جو حکم دیا تھا وہ حکم آج میرے لئے موت کا پیغام بن چکا تھا۔ میرے پستول میں اتنی گولیاں بھی نہیں تھیں کہ میں اس غصے سے بے حال اور اپنے دشمن حیوانوں پر قابو رکھ سکتا۔ میں نے چابک دوبارہ لہرایا مگر اس کی آواز سن کر بھی ان کا غصہ ٹھنڈا نہ ہوا۔

اتنا ضرور ہوا کہ وہ قلعہ سے دور ہٹ گئے۔ چاندنی میں ان کی اچھل کود صاف نظر آرہی تھی اور بندر نما آدمی ان کے درمیان کھڑا ہوکر تقریر کررہا تھا۔ وہ یقیناً انہیں میرے خلاف اکسا رہا تھا۔

تھوڑی دیر کے بعد وہ لوٹ گئے۔ ابھی ان میں انسانی صفات موجود تھیں۔ اس لئے وہ رات کو سونے کے عادی تھے۔ میں نے ایک بار پھر قلعے کا چکر لگا کر دروازوں اور کھڑکیوں کی مضبوطی کا جائزہ لیا۔ قلعے میں اس قدر خوراک موجود تھی جو میرے لئے ہفتوں کام آتی۔

اسی رات، میں نے ڈاکٹر مورو کی لاش لکڑیوں کے ایک ڈھیر پر رکھی اور مٹی کا تیل ڈال کر اس میں آگ لگادی۔ اس کے مردہ جسم کو ٹھکانے لگانے کا کوئی اور طریقہ نہیں تھا۔ پھر میں آگ کے ذریعے ان وحشیوں کو بھی ڈرانا چاہتا تھا۔

فرٹ کی لاش اٹھانے کے لئے مجھے لازماً قلعے کا دروازہ کھولنا پڑتا، مگر میں یہ خطرہ مول لینے پر آمدہ نہیں تھا۔

دوسری صبح میں نے فصیل پر چڑھ کر دیکھا تو فرٹ کی لاش وہاں موجود نہیں تھی۔ وحشی کسی وقت اس کی لاش گھسیٹ کر لے جاچکے تھے۔

اب میں قلعہ کے اندر محصور رہتا تھا۔ وحشی اکثر قلعہ کے قریب گھومتے نظر آتے تھے۔ مگر ان پر اس قلعہ کے عذاب گھر ہونے کا اس قدر خوف مسلط تھا کہ ان میں سے کسی نے کبھی اندر آنے کی ہمت نہیں کی۔ اگر کبھی ان کی نظر مجھ پر پڑجاتی تو ان کی نگاہوں میں پائی جانے والی درندگی مجھے صاف طور سے نظر آجاتی تھی۔ اور میں خوف سے لرز جاتا تھا۔

چند ہفتوں کے بعد میں نے ان میں ایک اہم تبدیلی دیکھی۔ ان میں سے اکثر چاروں ہاتھ پاؤں پر چلنے لگے تھے۔ بندر نما آدمی جو پہلے مجھے دیکھ کر کچھ نہ کچھ ضرور بولتا تھا۔ اب زیادہ تر خوں خوں کرنے لگا تھا۔ ان کی حیوانی خصلتیں ان میں لوٹ رہی تھیں۔ ان کے

چہروں پر وحشت آ گئی تھی۔ عجیب مضحکہ خیز صورت تھی۔ وہ دور سے آدمی معلوم ہوتے تھے۔ مگر ان کی ساری عادتیں حیوانوں جیسی ہونے لگی تھیں۔

مجھے ڈاکٹر مورو یاد آتا۔ یقیناً وہ اپنے ناکام تجربات دیکھ لیتا تو دکھ اور رنج ہوتا اور پاگل ہو جاتا۔ اگر محصور ہونے کی یہی کیفیت چند ہفتے مزید جاری رہتی تو میں بھی پاگل ہو جاتا مگر آخر وہ دن طلوع ہوا جس کا میں بے چینی سے انتظار کر رہا تھا۔ میں قلعہ کی فصیل پر یوں ہی ٹہل رہا تھا کہ جنوبی افق پر مجھے کسی جہاز کے مستول نظر آئے۔ جہاز کا رخ جزیرے کی طرف تھا۔ میں اسے خوشی سے آتا دیکھتا رہا۔

کوئی گھنٹے بھر کے بعد وہ جہاز مکمل دکھائی دینے لگا۔ یہ خوشگوار منظر اس قدر مسرت افزا تھا کہ میں اسے اپنی جگہ ساکت کھڑا دیکھ رہا تھا۔

تین گھنٹے کے بعد جہاز مجھے ساحل کے قریب نظر آیا۔ اس وقت مجھے خیال آیا کہ میں انہیں اس خطرے سے آگاہ کردوں جو جزیرے پر موجود تھا۔ میں نے پستول بلند کرکے، ہوائی فائر کیا۔ تھوڑی دیر کے بعد جہاز کی سمت سے بھی پستول چلنے کی آواز آئی۔ انہوں نے میرے پستول کی آواز سن لی تھی اور مجھے مطمئن رہنے کا پیغام دے دیا تھ۔ پھر جہاز سے کچھ لوگ اترتے دکھائی دیئے۔ میری طبیعت چاہی کہ میں قلعہ کا دروازہ کھول کر دوڑ کر ان کی طرف جاؤں مگر دوسرے ہی لمحے میں رک گیا۔ نامعلوم کتنے نادیدہ خطرے قلعہ سے باہر میرے منتظر ہوتے۔ اتنے عرصے کے بعد حقیقی انسانوں کو دیکھ کر میں رو پڑا۔

وہ سب تعداد میں دس تھے۔ اور محتاط انداز میں قلعہ کی طرف بڑھ رہے تھے۔ جب وہ ذرا آگے بڑھ آئے تو میں نے دیکھا کہ ان سب کے ہاتھوں میں رائفلیں تھیں اور ذرا سے کھٹکے پر وہ رک کر ادھر ادھر کا جائزہ لے کر آگے بڑھتے تھے۔ ان کے محتاط قدم دیکھ کر میں مشکوک ہو گیا کہ معلوم نہیں کہ وہ کون لوگ ہیں اور کس غرض سے قلعہ کی طرف آ رہے ہیں! بہرصورت وہ مجھ جیسے آدمی تھے اور میں انہیں اپنی بپتا سنا سکتا تھا۔ لیکن میرا وہم دور ہو گیا۔ ان میں سے ایک نے مجھے دور سے دیکھ لیا اور دوستانہ انداز میں ہاتھ ہلایا۔ میں نے بھی ہاتھ ہلا کر جواب دیا۔ وہ جو لوگ بھی تھے دوست تھے۔ یقیناً یہ وہی جہاز تھا جس کا ذکر ڈاکٹر مورو نے کیا تھا اور میں جس کا منتظر تھا۔

میں نے بھاگ کر دروازہ کھول دیا، جب ہم قلعہ کی چاردیواری میں بیٹھے تھے اور میں ان کو ساری روداد سنا رہا تھا، دور بستی میں شور مچنے کی آواز سنائی دی مگر آج میں ان سے خوفزدہ نہیں تھا۔ ڈاکٹر مورو کے دوست کپتان نے بتایا کہ وہ ساحل پر ڈاکٹر مورو اور فرٹ کو نہ پا کر ہی محتاط ہو گیا تھا۔ اس کے دل میں اندیشے پیدا ہو گئے تھے لیکن صرف اس حد تک کہ ڈاکٹر مورو بیمار ہے یا اس کے بنائے ہوئے آدمی نما حیوان خطرناک ہو گئے ہیں۔

اور پھر جب ہم نے واپسی کے لئے جہاز پر سامان رکھنا شروع کیا تو آس پاس کی جھاڑیوں کے پیچھے ہم سب نے وحشی جانوروں کی نقل و حرکت محسوس کی۔ وہ بار بار ہمیں دیکھنے آتے تھے اور پھر چھپ جاتے تھے ان میں سے بیشتر جانوروں جیسی حرکتیں کر رہے تھے بہت سے انسانی آوازوں کے بجائے حیوانی آوازیں نکال رہے تھے۔ وہ سب تیزی سے جانوروں کی خصلتوں کی طرف لوٹ رہے تھے۔ اگرچہ وہ دیکھنے میں عجیب الخلقت آدمی لگتے تھے مگر اب ان میں حیوانی خصلتیں ابھر آئی تھیں۔

جب جہاز چلا تو وہ سب ساحل پر جمع ہو گئے، میں نے منہ پھیر لیا۔ مجھے ان سب پر رحم آ گیا۔ ڈاکٹر مورو نے ایک ایسی نسل بنائی تھی جو دیکھنے میں آدمی تھی مگر ان کی خصلتیں حیوانوں کی تھیں۔

جزیرہ آہستہ آہستہ نظروں سے اوجھل ہونا شروع ہوا اور ہچکیاں لے کر میں رونے لگا۔ مجھے خود نہیں معلوم کہ میرے اس طرح رونے کی اصل وجہ کیا تھی!



کفن پوش
آسیبی بلی
آخری مرحلہ
بھیانک تجربہ
کمرہ نمبر20
نیک روح
حسین بدروح
بھیانک رات
موت کا تعاقب
ڈاک بنگلہ
شیطان
سرد جہنم
دوسرا سایہ
تجربہ
خونی کاوش
آسیبی گھر
آدم خور

آسیبی آئی لینڈ
آسیب
آسیبی آنکھیں
آسیبی کتاب
موت کی آواز
اندھیرے کی آواز
بزدل روح
بھیانک موت
پراسرار بوڑھا
پراسرار جزیرہ